حدیث کی شرعی حقیقت' حدیث کی دینی اہمیت وضرورت'
اس کی تدوین وحفاظت' اوراس کے معیارِ ردّ وقبول کے متعلق جملہ مباحث
پرنہایت تحقیقی وتفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے نیزان شکوک وشبہات کا نہایت
اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا
انکار کرنے لگتے ہیں!

تدوینِ حدیث

حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

تعارف

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

المیزان
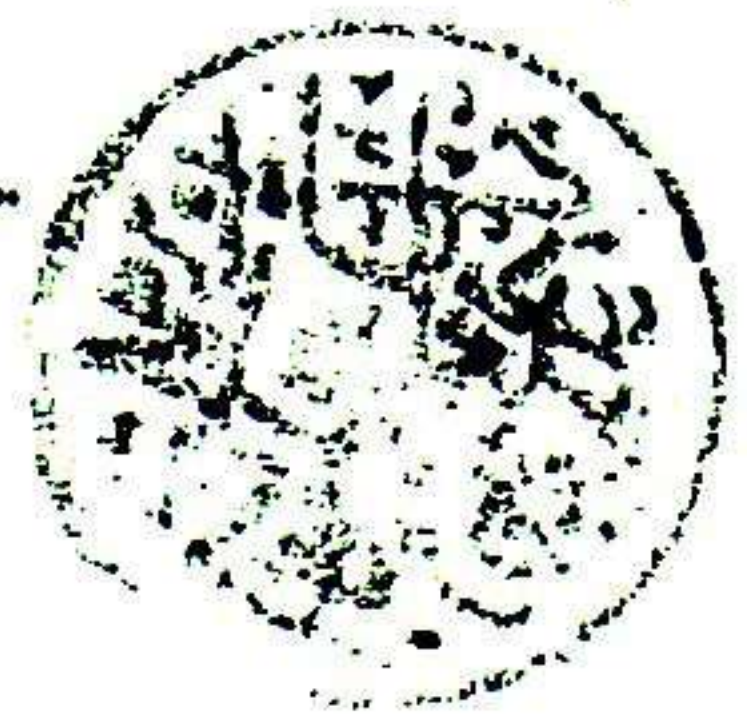
تدوینِ حدیث

جس میں، حدیث کی شرعی حقیقت، حدیث کی دینی اہمیت وضرورت، اس کی تدوین و حفاظت، اور اس کے معیارِ ردّ وقبول کے متعلق جملہ مباحث پر نہایت تحقیقی و تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے نیز ان شکوک وشبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا انکار کرنے لگتے ہیں!

حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

المیزان ناشران و تاجران کتب

الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور پاکستان فون: ۷۲۱۲۷۶۲، ۷۱۲۲۹۸۱-۰۴۲
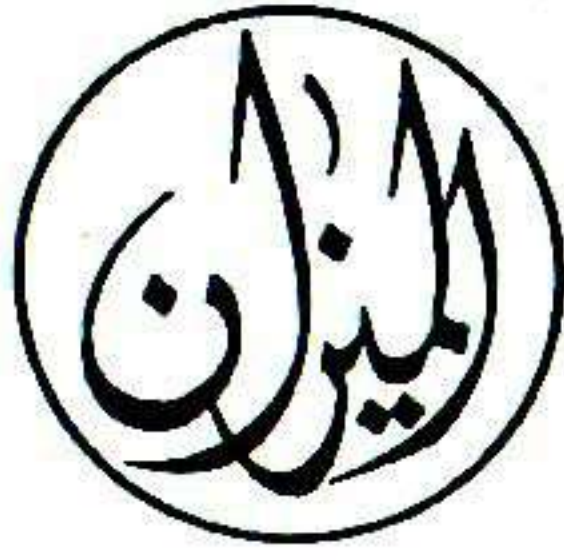
المیزان

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

باہتمام: محمد ادریس اعوان

سلسلہ مطبوعات - ۰۹۶

سن اشاعت ۲۰۰۵ء

محمد شاہد عادل نے

حاجی حنیف پرنٹرز سے چھپوا کر

المیزان اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

عرضِ ناشر

فہم قرآن کے لیے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم کے کسی ارشاد کا مفہوم متعین کرنے کے لیے متکلم کی منشاء تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بات تسلیم کہ ذاتِ خداوندی تک ہماری رسائی ناممکن ہے اور قرآن کریم کے کسی لفظ، جملے اور آیت کے مفہوم و منشاء کے بارے میں ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ اے خدائے قدوس اس سے آپ کی کیا مراد ہے یا اس کے جو مختلف مفاہیم سمجھے جا رہے ہیں ان میں سے کون سا مفہوم آپ کی منشاء کے زیادہ قریب ہے، لیکن اللہ کریم کے پیغام بر تک تو ہمیں رسائی حاصل ہے کیونکہ اللہ کریم کے جس پیغام بر نے ہمیں اللہ کی طرف سے قرآن حکیم کا متن عطا فرمایا ہے، اسی نے اس متن کی تشریح بھی فرمائی ہے اور اس کے اکثر و بیشتر مقامات کی وضاحت بھی اپنے ارشادات، اعمال اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ پیغام بر حضرت رسولِ کریم ﷺ ہیں، جن کے بارے میں رسول اللہؐ کا جملہ بولتے ہی ہم ان کی یہ اتھارٹی تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں۔ جن کا مشن ہی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچائیں اور اس کی شرح و وضاحت کر کے ہمیں اللہ تعالیٰ کی منشاء سے آگاہ کریں۔

ہم آج تک یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ جناب نبی کریمؐ کو اللہ کا نمائندہ تسلیم کر لینے اور قرآن کریم کا متن ہم تک پہنچانے میں مجاز اتھارٹی کے طور پر قبول کر لینے کے بعد اسی قرآن کریم کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں جناب رسول کریمؐ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کو ''حتمی معیار'' تسلیم کرنے میں آخر کونسی رکاوٹ در آتی ہے؟ جبکہ قرآن کریم جن ذرائع سے امت تک پہنچا ہے وہی ذرائع اس کی تشریح میں آپؐ کے ارشادات و فرمودات کو ہم تک منتقل کر رہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو امت تک منتقل کرنے میں قابلِ اعتماد ہیں تو حدیث و سنت کو

امت تک پہنچانے میں کیوں قابلِ اعتماد نہیں ہیں، اور اگر وہ حدیث وسنت کی روایت میں خدانخواستہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو قرآن کریم کی روایت میں کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتے ہیں؟ ہمارے بعض کرم فرما اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم چونکہ تواتر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، اس لیے وہ شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تواتر آخر کن لوگوں کا ہے اور وہ کون افراد ہیں جو اس تواتر میں شامل ہیں۔ کیا یہ تواتر احادیث وسنن کی روایت کرنے والوں سے الگ لوگوں کا ہے؟ اور اگر یہ وہی لوگ ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کے ضمن میں تو وہ لوگ اعتبار اور اعتماد کی سند سے بہرہ ور ہوتے ہیں جبکہ حدیث وسنت کے معاملے میں اس سند اعتماد ووثوق سے محروم ٹھہرتے ہیں، یہ گورکھ دھندہ اور یہ چیستان ہماری فہم سے بالاتر ہے۔

اسی گورکھ دھندے اور چیستان کا حل تلاش کرنے اور اسی گتھی کو سلجھانے کے لیے ''ہم المیزان'' کے پلیٹ فارم سے عالم اسلام کی ایک نادرۂ روزگار علمی شخصیت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ؒ کی شہرہ آفاق تالیف ''تدوین حدیث'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جنہوں نے اس موضوع سے متعلقہ سبھی مباحث کو اپنے خاص اسلوب بیان میں ورطہ تحریر میں لا کر خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ ہم نے اپنی جانب سے پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو اس کے شایان شان شائع کیا جائے۔ تاہم اب یہ کتاب آپ کی دسترس میں ہے۔ دعا ہے کہ یہ ہماری پیشکش اس موضوع کی تفہیم کا موثر ذریعہ ثابت ہو اور آخرت میں یہ ہماری نجات کا سبب ٹھہرے۔ (آمین)

دعاؤں کا خواستگار

محمد شاہد عادل

عرض ناشر اول

ابتدائے اسلام سے آج تک دینِ اسلام پر خارجی اور داخلی حملے اس قدر مسلسل اور پیہم ہوئے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ خود اس کے محافظ نہ ہوتے تو اس کی بقا دو ایک صدی بھی مشکل ہی تھا۔ یہ تاریخی حقیقت اس بات کا پورا یقین دلا رہی ہے کہ قیامت تک اسلام کی شمع فروزاں ہی رہے گی۔ خواہ آندھیوں کی تندی و تیزی کسی درجہ کو پہنچ جائے۔ مگر مبارک ہے وہ زبان و قلم اور دست و بازو جو وقتی فتنوں کو سرنگوں کرنے کے لئے بے باکانہ مستعد ہو جائے۔

ہر دور میں خلافِ اسلام مہموں کی نوعیت جداگانہ رہی ہے اور اسی نوعیت کے اعتبار سے مجاہدینِ اسلام نے سیف و قلم سے یہ معرکے سر کئے ہیں۔ دورِ حاضر کے داخلے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ انکارِ حدیث کا ہے جو دراصل پھیلایا تو گیا مستشرقینِ مغرب کے ہاتھوں، مگر اب خود بعض مسلمانوں کا زورِ قلم اس کی اشاعت میں لگا ہوا ہے، اور غور سے دیکھئے تو یہ اس قدر خطرناک اقدام ہے کہ اس سے اسلام کی بنیاد پر ضرب کاری لگتی ہے۔ جب قولِ رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ جو قرآنِ پاک کی مستند اور معتبر تشریح کا دوسرا نام ہے، معیارِ حجت سے خارج کر دیا جائے تو پھر قرآنِ پاک کی نہ تو کوئی ایک تشریح و توضیح رہ سکتی ہے نہ کسی ایک مفہوم پر ملت کے جمع ہونے کا تصور باقی رہ سکتا ہے۔

انکارِ حدیث کے فتنہ کی مضرت کا احساس بہت سے اہلِ علم و فکر کو ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے کہ بہت سے علماء نے منکرینِ حدیث کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کے مدلل اور مُسکت جواب دیئے۔ لیکن ایک بات کی کمی پھر بھی رہی، وہ یہ کہ فتنہ جس قلم سے پھیلایا جا رہا تھا وہ جدید طرزِ نگارش اور جدید زاویۂ فکر کے مطابق چل رہا تھا اس لئے اس کا سحر زیادہ تھا اور جواب جس قلم سے دیا گیا وہ جدید طرزِ انشاء اور جدید ذہنی بناوٹ سے ناآشنا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جواب کی اصابت کے باوجود اثر انگیزی کم ہی رہی۔

مجلسِ علمی جس کا مطمحِ نظر ہمیشہ سے اسلام کے داخلی اور خارجی فتنوں کی علمی مدافعت رہا ہے، اس فکر میں تھی کہ فتنہ انکارِ حدیث کا رد کسی ایسی ہستی کے زبان و قلم سے ہو جو جدید و قدیم

کا سنگم ہو۔ ہماری مجلس کے مالک مولانا محمد میاں صاحب لائق صد مبارک باد ہیں کہ ان کا ذہن حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہوا جنہوں نے خالص علمی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر قدم اٹھایا تھا اور آج سے کئی برس پہلے چار محاضرات خاص "تدوینِ حدیث" کے موضوع ہی پر جامعہ عثمانیہ کے توسیعی لکچرز کی صورت میں پیش فرمائے تھے۔

حضرت گیلانی قدس سرہٗ چونکہ ایک جدید عالم اور ساتھ ہی جدید علمی دنیا سے بھی پورے باخبر تھے اس لئے ان کی علمی افادات کا رنگ اور اثر عام عُلماء سے کہیں زیادہ ممتاز ہے۔ ان کی وسعتِ معلومات اور ژرف نگاہی، ان کا طریقِ استدلال اور سحرنگاری اپنے مخاطب کے ذہن وفکر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے ہم کو قوی امید ہے کہ حضرت گیلانیؒ کی یہ کاوش فتنۂ انکارِ حدیث کے قلع قمع کرنے میں مؤثر ترین ثابت ہوگی۔

مجلسِ علمی کے پیشِ نظر اشاعت کتب کے ذریعہ نفع اندوزی کبھی بھی نہیں رہی بلکہ اس مجلس کا قیام محض دینِ اسلام کی علمی خدمت کی غرض پر ہوا ہے۔ اور یہی غرض اس وقت "تدوینِ حدیث" کی پیش کش کا محرک بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول و مقبول فرمائے۔

ہم کو انتہائی رنج و ملال ہے کہ حضرت گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے اور ابھی طباعت کا مرحلہ طے بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت مؤلفؒ راہیٔ ملکِ بقا ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مرقد کو انوار سے معمور کرے، اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے کہ وہ دینِ اسلام کے اس دور میں ایک جلیل القدر سپاہی تھے اور اپنی ساری عمر اس راہ میں صرف فرما گئے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ادارۂ مجلس علمی

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

یہ نیرنگیٔ عالم بھی کس قدر حسرت ناک ہے کہ "تدوینِ حدیث" کو پریس کے حوالے کرتے ہوئے جس قلم نے فاضل مؤلف کے اِسمِ گرامی کے ساتھ مدظلہ العالی کے کلمات لکھے تھے آج (۵، جون ۱۹۵۶ئ کو) اسی قلم سے ان حروف کو کاٹ کر رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں سے بدلنا پڑ رہا ہے ۔ نظر اگر اِنَّا لِلّٰہِ کی حقیقت پر نہ ہوتی تو کیا عجب کہ حسرت یاس تک پہنچ جاتی، اور دِل بیٹھ جاتا۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین حدیث کے چار محاضرات اس حقیر کو بھیجتے ہوئے یہ ارقام فرمایا تھا :

"میری غرض یہ ہے کہ آپ کی علمی امداد ان محاضرات کی اشاعت وطباعت میں رہے ترتیبِ صوری کا کلی اختیار آپ کے سپرد کرتا ہوں، آپ کے اختیارِ تمیزی پر مجھے بھروسہ ہے۔ اسی طرح عنوانات کے سلسلے میں بھی آپ کو اختیار دیتا ہوں۔ سورۂ کہف[1] پر آپ نے جو عنوانات قائم کئے تھے، ان ہی کو دیکھ کر میرے حُسنِ ظن میں اضافہ ہوگیا اب آپ جانیں اور مولانا طاسین صاحب[2] ..... اپنا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کی توقع مشکل ہی سے کر سکتا ہوں کہ خاکی آنکھوں سے اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں دیکھنے کی مُہلت مل جائے گی، وقت زیادہ دُور نہیں معلوم ہوتا......"

پھر جب اِس ارشاد کی تعمیل اس ہیچمداں نے کردی اور مُرتّبہ فہرست کی ایک نقل خدمتِ گرامی میں پیش کرنے کی سعادت پائی تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ سَعیٔ حقیر خاطرِ احسن میں جگہ پاگئی اور ان شفقت بھرے الفاظ میں شاباشی ملی :

"ایک ہفتہ سے زیادہ مدت گزری کہ آپ کا وہ کارنامہ میرے پیشِ نظر ہے جو شاید آپ

---

[1] مولانا گیلانی کی نوشتہ تفسیر سورۂ کہف جو اب طبع ہو چکی ہے۔

[2] ناظم "مجلسِ علمی" کراچی جن کی تحریک اور خصوصی توجہ سے مدوینِ حدیث کی کتاب مجلس علمی کی طرف سے شائع ہو سکی! جزاہُ اللہُ عَنْ جَمیعِ المُسْلِمِیْنَ اَحْسَنَ الجزاءِ۔

کے سوا کسی اور سے بن پڑنا آسان نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "متابعات کے بعد شواہد" بس ایک لفظ قابلِ ترمیم نظر آیا۔ آپ جو حدیث کے طالب علم نہیں ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کامیاب فہرست کیسے بنالی جو ہمارے عام مولویوں کے لئے بھی آسان نہ تھی، فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (۲۰ر اگست ۱۹۵۵ء)

"تدوین حدیث" کی زیرِ نظر کتاب اس قدر ضخیم ہوکر بھی تشنۂ تکمیل ہی رہ گئی۔ اس میں ایک اور محاضرہ کا اضافہ ہونا تھا جو حضرت مؤلف قدس سرہ کی طویل علالت کے سبب نہ ہوسکا، چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اسماء الرجال کے فن پر افسوس کہ نہ لکھ سکا، ایک محاضرہ اس کے لئے ضروری تھا معلومات فراہم شدہ ہیں لیکن ترتیب کون دے؟ بندہ کے لئے تو ان چند سطروں کا لکھنا بھی دشوار ہے۔" (۲۰ر اگست ۱۹۵۵ء)

پھر بھی جتنا کچھ مواد جمع فرماگئے وہ اس قدر کافی ووافی ہے کہ اگر کسی نے انکارِ حدیث کی ٹھان ہی نہ لی ہو تو اس کے شکوک وشبہات کی پوری تشفی وتسلی ہوسکتی ہے۔

استاذ الاساتذہ رخصت ہوگئے اور یقین ہے کہ اپنی منہ مانگی مراد بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہی پاگئے ہوں گے مگر جاتے ہوئے انہوں نے اپنی فکر ونظر کا جو سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا وہ بھی ان شاء اللہ زندۂ جاوید اور ان کے حق میں صدقۂ جاریہ بنا رہے گا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

محزون

غلام محمد (عثمانیہ)

کراچی۔ جون ۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

تعارف از سید العلماء سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دیباچہ از حضرت مؤلفؒ

مضمون	صفحہ
موضوع بحث کی تشریح	۲
حدیث کی حقیقت	۳
عام تاریخ اور فن حدیث	۴
حدیث کی مدرسی تعریف	۸
عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات	۱۰
تدوینِ حدیث کے قدرتی عوامل	۱۸
حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد	۲۷
کثرت تعداد کا راویوں کی ثقاہت پر اثر	۳۰
صحابہ کرام حدیث کے زندہ نسخے تھے	۴۲
حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے	۴۵
متابعات و شواہد	۴۶
حدیث کی کتابی تدوین	۵۱
عہد صحابہ کی مدت	۶۵
محدثین کے حافظہ میں شک اور پھر اس شک کی بنا پر انکار	
حدیث حیرت انگیز ہے	۷۰
حضرت ابوہریرہؓ کے حافظہ کی تاریخی توثیق	۷۲
ابن راہویہ کی قوتِ یادداشت	۷۵
ابوزرعہ کی قوتِ یادداشت	۷۶
تحفظِ حدیث کی اہمیت پر حدیثی استدلال	۷۸
تابعین کا طریقِ حفظ	۷۹
قرآن کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا	۸۰
حفاظِ حدیث کی تیاری میں احتیاطیں	۸۳
ہمارے اگلوں کا حافظہ ہم سے کہیں زیادہ قوی تھا	۸۶
قتادہؒ کا دعویٰ اور اس کی تشریح	۸۹
حدیث کا سارا دارومدار قوتِ حافظہ ہی پر نہیں ہے	۹۲
اس دور میں دنیوی ترقی بھی علومِ دینی کی خدمت پر مبنی تھی	۹۴

عنوان	صفحہ
آج محرکاتِ عمل مال، جاہ اور ریاء ہیں اور خیر القرون میں محض حبِ الٰہی اور حبِ رسولؐ کے پاک جذبات تھے،	۱۰۱
قرنِ اولیٰ میں "علم" کے معنی ہی حدیث کے تھے	۱۰۴
اس حصولِ علم کے لئے مالی قربانیاں	۱۰۴
تقریباً سارے محدثین بے مزد خدمتِ حدیث میں مشغول رہے	۱۱۱
تدوین حدیث کا ماحول اور مسئلۂ غلامی کی حقیقت	۱۱۶
مسلمان غلاموں کے لئے ترقی کی ساری راہیں کھلی تھیں	۱۱۶
عرب سیاسی الجھنوں میں پڑ گئے تو موالی قرآن و حدیث کی خدمت میں لگ گئے	۱۱۷
ابن شہاب زہری اور عبدالملک کا تاریخی مکالمہ	۱۲۹
عرب بھی موالی کی علمی خدمات سے مستفید ہونے پر مجبور تھے	۱۳۲
موالی علماء کی دینی جرأت	۱۳۵
موالی کے اقسام	۱۴۱
موالی محدثین کا بے نظیر شوقِ علمی اور ایثارِ مالی	۱۴۵
محدثین علمِ حدیث کی خدمت کو شب بیداری سے افضل سمجھتے تھے	۱۵۸
احتیاط کا حال	۱۶۱
محدثین کے زہد و تقویٰ کی چند مثالیں	۱۶۶
حدیث کے سلسلہ میں تین ضروری مقدمات	۱۷۶
عہدِ صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیانی دور میں حفاظتِ حدیث کی شکلیں	۱۸۲
حفاظت اور کتابت	۱۸۲
محض کتابت کو حفاظتِ کاملہ کا ذریعہ سمجھنا نادانی ہے	۱۹۱
خبر آحاد کا درجہ	۲۰۰
قرنِ اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امرِ اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت تھا	۲۰۹
مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا قول	۲۲۸
کتابت و قلتِ رواۃ حدیث سے متعلقہ بعض اعتراضات کا جواب	۲۲۹
آغازِ اسلام میں خاص افراد تک روایتوں کے محدود رہنے کی حکمت	۲۳۱

عنوان	صفحہ
ممانعتِ تحریرِ حدیث کی روایت خود تحریرِ حدیث پر دلالت کرتی ہے	۲۳۶
مذکورہ بالا ارشادِ نبوی کی حقیقت	۲۳۸
کتابتِ حدیث کی روایات و دلائل	۲۴۵
عمومی طور پر انکارِ حدیث سے	۲۵۲
انکارِ حدیث کی نبوی پیشین گوئی	۲۵۵
حکمِ تحریرِ حدیث اور عصمتِ نبویؐ	۲۵۶
قرآن کو کافی سمجھنے کا مغالطہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ایک خاتون کا سبق آموز واقعہ	۲۶۲
حجیتِ حدیث کے چند قرآنی دلائل	۲۶۴
تاریخ تدوین حدیث	
آنحضرتؐ کے دور میں تدوینِ حدیث	۲۶۶
آنحضرتؐ سے روایت کرنیوالوں کی تعداد	۲۷۵
عہدِ صدیقی اور تدوینِ حدیث	۲۷۶
حضرت ابوبکرؓ نے پانسو حدیثیں قلم بند کیں	۲۷۶
اپنے ذخیرۂ حدیث کو جلا کر سنتِ نبویؐ اور مصلحتِ پیغمبری کی تجدید کی	۲۷۹
تحقیقِ حدیث کے لئے اصولِ شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ نے رکھی،	۲۸۸
تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک اور اہم خدمت	۲۹۴
حدیث سے متعلق عہدِ صدیقی کا ایک اہم وثیقہ اور اس پر مبسوط بحث	۳۱۳
عہدِ فاروقی اور تدوینِ حدیث	۳۳۸
حضرت عمرؓ کی روایات کی تعداد	۳۴۰
حضرت عمرؓ کے کثرتِ روایات سے منع فرمانے کا مقصود،	۳۴۳
البینات کے متعلق اختلاف	۳۷۰
تدوینِ حدیث کا خیال لیکن پھر بربنائے مصلحت تأمل	۳۸۴
عہدِ عثمانی اور تدوین حدیث	۴۰۱
عہدِ مرتضوی اور تدوین حدیث	۴۰۶
صحابیت اور حدیث رسول کے خلاف پہلا ناپاک اقدام	۴۲۱
عہدِ عثمانی میں اس تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ	۴۳۴
عہدِ مرتضوی میں اس کو ختم کرنے کی کوشش	۴۳۹
فتنۂ سبائی کے بعد حدیث کی روایت میں احتیاطی اصول	۴۴۲ تا ۴۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

از سید العلماء مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے، آیات کا شان نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح وتعیین، اجمال کی تفصیل عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین، سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے، اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیات طیبہ؛ اور اخلاق وعادات مبارکہ، اور آپ کے اقوال واعمال اور آپ کے سنن ومستحبات اور احکام وارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال واقوال اور اجتہادات واستنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے علمی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کے بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے موجود وقائم ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ تا قیامت رہے گا۔

مسلمانوں نے آغاز اسلام سے قرآن پاک کے بعد اس علم کو اپنے سینہ سے لگایا اور اپنی پوری محنت، قابلیت اور اخلاص وعقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی قدیم روایات واسناد کی حفاظت کی مثال نہیں پیش کر سکتی اور ایسا ہونا ہی ضروری تھا کیونکہ اسلام قیامت تک کی زندگی لے کر آیا ہے اس لئے اس کے صحیفۂ آسمانی اور حیات نبوی کا رشتہ بھی قیامت کے دامن سے وابستہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کا اظہار قرآن پاک کی اس آیت میں فرمایا ہے:

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ

اور تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کر سکتے ہو، حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول موجود ہے۔

اس آیت پاک سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دائمی ہدایت کے لئے دو ایسی مشعلیں روشن کردی ہیں جو قیامت تک بجھنے والی نہیں ہیں، ان میں سے ایک تو آیات اللہ ہیں یعنی قرآن پاک اور دوسری چیز رسول کا وجود حقیقی وجود بھی اور مجازی بھی، ظاہر ہے کہ کوئی انسان اس دُنیا میں ہمیشہ کے لئے نہیں آیا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے چنانچہ قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کردیا ہے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ — اور ہم نے آپ سے پہلے کسی کیلئے بھی ہمیشہ کی حیات دینا نہیں رکھی۔

اور

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ — آپ بھی مرجائیں گے اور وہ بھی مرجائیں گے۔

لیکن اس موت کے بعد بھی حیاتِ نبویؐ کو مجازاً وہی دوام وقیام نصیب ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کے ہر حرف کو دوام بخشا اور علم حدیث کے اوراق میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اہلِ بصر کو چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دکھائی دیتے ہیں، اسی لئے بزرگوں کا مقولہ ہے "جس گھر میں حدیث کا مجموعہ ہے فکانما فیہ نبی یتکلم (اس گھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی تکلم فرمارہے ہیں)"

اسی بات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مبارک میں ظاہر فرمایا ہے:

اِنِّی تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ (موطا مشکوٰۃ باب الاعتصام بالسنۃ) — میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جن دو کو جب تک مضبوط پکڑے رہوگے گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن پاک اور سنت نبوی دونوں ملکر قیامت تک یہ ہدایت کا سرچشمہ رہے گا۔ دوسری بات اس سے یہ واضح ہوئی کہ اسلام کی صحیح تصویر اور اسلام کی صحیح تعلیم کتاب اور سنت کی باہمی توفیق وتطبیق سے معلوم ہوگی اور جن لوگوں نے یہ چاہا یا چاہیں گے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کریں اور ایک کو مانیں اور دوسرے کا انکار کریں وہ صراطِ مستقیم سے دُور ہوئے اور ہوں گے۔

جن لوگوں کی نظر ملل ونحل اور علم کلام وعقائد اور تاریخ فرق پر ہے وہ آسانی سے اس بات کو مان لیں گے کہ اسلام میں جتنے بدعتی فرقے پیدا ہوئے وہ وہی ہیں جنہوں نے کتاب کو سنت سے یا سنت کو کتاب سے الگ کرنا چاہا خوارج نے کتاب کو مانا اور سنت سے انحراف کیا اور ان کے مقابل کے

فرقہ نے کتاب کو محرف بنا کر چھوڑا اور صرف اپنے ائمہ کی سنت کی پیروی کا دعویٰ کیا۔ اسی طرح معتزلہ نے قرآن کو بتاویل تسلیم کیا اور احادیث سے اعراض کیا اور راہِ راست سے دور ہوئے۔

جو کچھ پہلے ہوا وہ آج بھی ہو رہا ہے۔ سرسید کے زمانے سے احادیث کا فن نا آشنایانِ فن کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ چونکہ ان کے خود ساختہ عقل کے معیار پر جو چیز پوری نہیں اترتی، اگر قرآن پاک کی کوئی آیت ہے تو اس کی دور از کار تاویل اور اگر حدیث ہے تو اس سے انکار کر کے اپنے زعم میں اسلام کے چہرہ سے خلافِ عقل ہونے کا داغ مٹانا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ داغ سمجھ کر خدا جانے اسلام کی صحیح تصویر کے کتنے اجزا کو مٹا چکے ہیں۔

قرآن پاک کے فہم کے نئے دعویدار اس زمانے میں اور بھی پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پاک کو ہر ضرورت اور ہر حکم اور ہر مسئلہ کے لئے کافی اور اپنی عقل اور فہم کو اس کی تفسیر اور تشریح کا فی تر سمجھتے ہیں اور اس طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ احادیث اور فقہ کا سارا دفتر مٹ جائے اور ان کی جگہ ان کے "اجتہادات" اور "استنباطات" قرآنِ پاک کا حقیقی اڈیشن اور اسلام کی صحیح تعلیمات کا مستند مخزن قرار پا جائے۔ سہہا مہہات، ان بدعتیوں اور گمراہوں نے تو مستشرقینِ یورپ کے سفیہانہ اعتراضات کو جو فنِ حدیث پر انہوں نے کئے ہیں اپنا کر سرے سے اس فن کی بیخ کنی شروع کر دی۔ انہیں سے سن کر یہ کہا جاتا ہے کہ حدیثیں تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ڈھائی سو برس بعد قلمبند ہوئی ہیں ان کا کیا اعتبار اور کبھی حدیث کے فنِ رجال کی وثاقت پر اعتراضات کئے جاتے ہیں اور کبھی عقلی حیثیت سے ان پر ایرادات پیش کئے جاتے ہیں اور ان سب کے نتیجہ کے طور پر کوئی نماز کے اوقات کو، اور کوئی نماز کے ارکان کو، کوئی روزہ کی تعداد کو، کوئی حج کے ارکان کو، کوئی قربانی کو، کوئی سمتِ قبلہ کو، کوئی وضو کی ہیئت یا ضرورت کو، کوئی مسلمانوں کے اصولِ وراثت کو بدلنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو ایک نئے اسلام کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بعض آگے بڑھ کر عقائد میں بھی کتر بیونت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بعض تو حیاتِ برزخ کا انکار، گنہگاروں کی شفاعت اور بخشش کا انکار، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عدمِ ایمان سے عدمِ نجات کے مسلم عقائد کا انکار کر رہے ہیں اور عدمِ حجیتِ حدیث کو اپنے مبتدع عقائد کے ثبوت کے لئے ضروری جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کی کھلی شہادت اس سے ملتی ہے کہ صحابہؓ کے آخری زمانے سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں چھوٹے بڑے بدعتی فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کی اور اسلام کے منور آئینہ کو مکدر کر دینا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے لوگوں کو پیدا کیا جنہوں نے بتائید الٰہی ان گرد بیزوں کی ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور ان کے بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اس آئینہ کو ہمیشہ روشن رکھا۔

اس زمانے میں بھی ان بدعتیوں کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کو ہمت، جرأت، بصیرت اور اہلیت و استعداد بخشی جنہوں نے ان کے ہر نیزے کو اپنے سپر سے روکا، ان کے ہر حملہ کا کلہ بکلہ جواب دیا، ان کے ہر اعتراض کو دور کیا اور ان کے ہر شبہ کو دفع کیا۔

اس زمانے میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست، مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رمتع اللہ المسلمین بطول بقائہ، کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے وہ ہر سال اور رسال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقاتِ علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کی مستحق ہیں۔

زیر نظر مجموعہ بھی موصوف کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے زمانہ کی ذہنیت اور مذاق کا لحاظ رکھ کر علم حدیث کی تعریف، علم حدیث کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کے تحریری سرمایہ کے آغاز و انجام اور اس کی تدوین پر محققانہ مباحث لکھے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ملت کیلئے ان کے وجود کو ہمیشہ نافع سے نافع تر بناتا رہے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ہیچمداں

سید سلیمان ندوی — ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ ہجری

فاتحۃ الکتاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

سینکڑوں صفحات میں حدیث کی تدوین کی یہ سرگزشت آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے۔ پڑھنے کے بعد پڑھنے والوں کے قلوب میں جو اثر مرتب ہوگا اصلی چیز تو وہی ہے۔ خود غریب مصنف تجربہ سے پہلے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اس کے کام کی نوعیت بس اسی قدر ہے کہ کتابوں میں عہدِ نبوت وخلافتِ راشدہ کے متعلق حدیث کی تدوین کے سلسلہ میں جو باتیں منتشر اور بکھری ہوئی صورتوں میں پائی جاتی تھیں، ان سب کو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کر کے مسلمانوں کے آگے پیش کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو خود سوچنا چاہیئے کہ ان روایات کی روشنی میں حدیث کے ساتھ ان کی دینی زندگی کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ اس زمانے میں ادھر ادھر کی چند پراگندہ معلومات کے زیر اثر

حدیث کے انکار واقرار کا ایک نیا قصہ

چھیڑ دیا گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد شائد لوگ اسی نتیجہ تک پہنچیں گے کہ انکار واقرار دونوں کے صحیح حدود سے باہر نکل کر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے، یہی اس کا طبعی مقام ہے۔ خصوصاً حدیثوں کا وہ ذخیرہ جس کی اصطلاحی تعبیر "خبر احاد" سے محدثینِ کرام فرماتے ہیں۔ بہر حال قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی قوالب وتشکیلات کے سوا مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعبیر میں اول سے آخر تک "حدیث" بھی شریک ہے، یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس کا انکار وہ بھی نہیں کر سکتے جو مسلمان نہیں ہیں۔ اس واقعہ کا انکار ایک ایسے واقعہ کا انکار ہے جس کا علم تواتر کی راہ سے پھیلا ہوا ہے۔ منکرینِ حدیث اگر اس واقعہ کے منکر ہیں، تو وہ خود بھی

جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں، ایک ایسا دعویٰ کر رہے ہیں جسے خود ان کا دل بھی جھٹلا رہا ہے، لیکن انکار سے ان کا مطلب اگر یہ ہے کہ قرآن اور قرآنی مطالبات کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت کسی زمانہ میں خبر احاد کو نہیں دی گئی۔ جن پر حدیثوں کا عام ذخیرہ مشتمل ہے، اگر ان کے انکار کا حاصل یہی ہے تو پھر ان کا یہ انکار ایک ایسا انکار ہے جس کا اقرار ہر زمانے میں مسلمان کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی وہ اسی کے قائل ہیں۔

کاش! حدیث کے انکار و اقرار کا یہ قصہ اگر مصالحت کے اسی اجتماعی نقطہ پر سمٹ کر ختم ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس کتاب کے لکھنے کی غرض پوری ہوگئی۔ فقط وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔ وَاِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ۔

الفقیر الاھمن الجانی

مناظر احسن گیلانی

سابق خادم حدیث فی الجامعۃ العثمانیہ
حیدر آباد دکن

موضوعِ بحث کی تشریح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہئے۔

① حدیث کی حقیقت کیا ہے۔

② اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے، کس زمانے میں شروع ہوئی، اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے۔

③ ابتداء سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

④ اس فن کے متعلق کن جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے۔

⑤ حدیث کے بعد فنِ حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصولِ حدیث کی حقیقت، ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت

سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں، بعض بلکہ شائد زیادہ تر قومیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آئندہ کی طرف بڑھتی رہیں اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں۔ ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور وفکر کرنے کے

لئے گزشتہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے گویا جس طرح جنگل کی زندگی گزاری جاتی ہے، یہ بھی گزارتے ہیں۔ آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جدِ اعلیٰ کون تھے کن کن جنگلوں اور وادیوں، پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے ان کے آبا و اجداد موجودہ مقام تک پہنچے۔ کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلے میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے، جنہوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات اور واقعات سے نفع اٹھایا جائے اور اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گزرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی کوشش کا نام تاریخ ہے۔ ابتدا میں تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے۔ لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں۔ جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں۔ کونے کونے سے قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کے کتبوں کے حروف پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان ہی پر واقعی کہئے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کر لیا ہے، اور بجز چند ارتیابی الطبع خشکی مزاج، خشک دماغ فلسفیوں کے عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

عام تاریخ اور فنِ حدیث

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گزر کر نسلِ انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے، ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رخ پلٹ دیا جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق

و مغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ماضی کے اس مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات و حالات کا تعلق ہے میں حدیث کو انسانیت کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ہاتھ میں بھی ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ وثوق و اعتماد میں تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت شکیوں میں نہیں ہوں جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دیکر ماضی کا انکار کرتے ہیں اور "جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہ نہیں محسوس ہو رہا ہے"۔ اس سوفسطائی نظریہ پر زور دیکر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے اس کی قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آئندہ کی راہ درست کرنے کے لئے ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہیے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ   لوگوں سے پچھلے قصے بیان کیا کرو تاکہ وہ سوچیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے کہ "کسی زمانے کے حالات جب قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانے کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد ہی) ایک دلچسپ تاریخ بن جاتی ہے۔ یورپ کی اکثر تصنیفیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"۔ اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان چین ہو یا ایران ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مورخ نے بیان کیا ہے بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی۔ مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی

تاریخی یادداشت مل سکتی ہے جسے واقعہ کے عینی شاہدوں نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہ راست بیانوں کو خود ان ہی سے سن کر کتابوں میں درج کیا ہو۔ اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ضبط و اتقان، سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا۔ معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جا سکتی ہے تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گزرا ہے مورخ خود ہی اس زمانے میں موجود تھا۔ اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسّر آجاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانے کو تو جانے دیجئے آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے، تعلیم عام ہو چکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ نہیں، آئے دن ایسی ایسی جہالتوں اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانہ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعوی میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے؟ بہت پرانے زمانے کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا۔ ایک نہیں بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے وہاں ایک سخت زلزلہ آیا" اور بے چارے اخبار والے تو شہر خبروں کی جماعت ہے۔ عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک ہیزل کی اینویل جو مشہور کتاب ہے اور ہر قسم کے حوالہ جات کے لئے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے۔ "ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا۔" نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے کہ "اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے"۔ حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلے میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مورخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی ظرافتوں اور بوالعجبیوں

کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

سیاحوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت میں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس سے بے پروا ہو کر دی جاتی ہے کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سمجھ بوجھ، سچائی، راستبازی، میں کیا حال تھا۔ لیکن ان سیاحوں کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے میر شعبۂ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ) کے ڈرائینگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے اور اس کے نیچے جلی خط حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ "بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جو ادیا کے نام سے موسوم ہے ادا کر رہے ہیں"۔ میں نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے۔ تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ ان کی شکل و صورت، لباس، وضع قطع طریقۂ نشست، ہر چیز ہندی مسلمانوں کی تھی لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا اس کے نیچے اس نے یہی عبارت درج کی تھی۔ آخر جب میر شعبہ صاحب باہر تشریف لائے تو ان سے پوچھنے پر معلوم ہے کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لئے محفوظ کیا ہے تاکہ یوروپین سیاحوں کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی میں نمازِ عید کے موقع کی تصویر ہے، ایک مغربی سیاح نے اس عید کو ادیا بنایا، اور ادیا کو خدا جانے کس طرح اس نے بودھ مذہب والوں کی رسم قرار دیکر اخبار میں اپنے اس جدید اکتشاف کا اعلان کیا۔

ان چند تشکیکی مثالوں کے پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی میں دنیا کے موجودہ تاریخی ذخیروں کو بالکلیہ غیر معتبر اور ناقابلِ لحاظ قرار دینا چاہتا ہوں بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا میں "فنِ تاریخ" ہر قسم کے احترام و اعزاز کا مستحق ہے تو "حدیث" جو صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفریں دور کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل و صورت بلکہ ہر خط و خال کی

حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں، جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے بلکہ اس کی حفاظت وصیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے، (جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا) جو دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اُس وقت تک میسر آئے اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔ کس احترام و اعزاز کی مستحق ہونی چاہئے۔

حدیث کی مذہبی تعریف

لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہے اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دورِ وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے۔ گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسومات و عادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر، جادو، ٹوٹکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانے میں کیا اب تک مبتلا ہیں۔ مذہب کے متعلق جن کے دلوں میں اس قسم کے خیالات ہیں حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق میرے ان دعووں کو سن کر ممکن ہے کہ انہیں حیرت ہو۔ اور ان کی حیرت تو چنداں محل تعجب نہیں، اس لئے کہ "جہل" ان مسکینوں کے لئے بڑا عذر ہے لیکن جاننے والوں کو بھی شائد شبہ ہوتا ہوگا کہ مذہب میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) غرض پیغمبرؐ کے اقوال و افعال و تقریر کا نام حدیث ہے اور بعضوں نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور بعضوں نے صحابہؓ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال و افعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مذہبی اور مذہبی تعبیر اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں، بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے۔ ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔ شائد یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے

اس سے انکار نہیں ہے کہ میں نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہیں لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہیں بدلتے۔ جو نہیں جانتے ہیں انہیں تو آئندہ بتایا جائے گا لیکن جو جانتے ہیں کہ حدیث کا تعلق کس ذاتِ گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے، کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ جن الفاظ میں اِس فن کی میں نے تعبیر پیش کی ہے، کیا یہی اصل واقعہ نہیں ہے؟ اسلامی تحریک نے اپنے زمانۂ آغاز سے اس وقت تک مشرق و مغرب کے باشندوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اور کر رہا ہے ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں کوئی نامسلمان بھی کیا حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے جسے میں نے پیش کیا ہے؟

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں، فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے اگر اسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اِسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف "بخاری شریف" کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا نام

اَلْجَامِعُ الصَّحِیْحُ الْمُسْنَدُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ "اُمُوْرِ" رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "وَاَیَّامِہٖ"

رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا۔ یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فنِ حدیث دراصل اس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب

کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔

غالباً حدیث کی حقیقت یا تعریف کے لئے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے۔ درسی کتابوں میں جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کر کے بات کو بتنگڑ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں ان دُور از کار لفظی گورکھ دھندوں میں آپ لوگوں کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا اس لئے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب میں دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ میں عمل میں آئی؟ اسی سوال کے جواب میں آپ کے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آجائیں گے جو تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات

عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ اس امر کی بساطت ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں عموماً ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اسی قسم کی منتشر اور پراگندہ گوناگوں چیزوں سے ہے جن کا احاطہ آسان نہیں ہے۔ بخلاف اس کے حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہے۔ ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے تمام اطراف و جوانب کو صحیح طور سے سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے، اور دوسری طرف ملک نہیں، ملک کی کوئی خاص قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قوم کا کوئی خانوادہ نہیں بلکہ صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے۔ خود اندازہ کیجئے کہ احاطہ و تدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی و دشواری میں کوئی نسبت ہے؟ پہلی صورت میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں، غلطیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت و واقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جا سکتی ہے۔

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخوں یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے۔ بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام و ممالک، سلاطین اور حکومتوں کی تاریخیں ہیں لیکن جن مورخوں کے ذریعہ سے یہ تاریخیں ہم تک پہنچی ہیں، کیا ان میں کسی تاریخ

کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام کے ساتھ تھا؟ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصّہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے عموماً ان تاریخوں کی تدوین یوں ہی ہوئی ہے کہ ابتدا میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات اِدھر اُدھر بکھرے رہے۔ پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن وقیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلمزد کر دیا۔ یہ تو شروع میں ہوا۔ بعد کو جوں جوں ان قلمبند شدہ واقعات پر زمانہ گزرتا گیا اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا پچھلی نسلوں کے لئے وہی تاریخی وثیقہ بن گیا۔ آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر ہے اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہوں، اور سنگی، برنجی، یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانوں نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑی تھی بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا، مگر کیا کیجیے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصے مستثنیٰ بھی ہیں خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور باضابطہ شاہی

---

[1] بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کے بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں "قدیم ہند" کے لئے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں اور پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کر لی جاتی ہیں اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں ان ہی کو دفن کر دیا جاتا ہے پھر کچھ دنوں کے بعد ان ہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے اُن کا اور اُس سے جو نتائج نکلتے ہیں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھا دھند ایمان لا رہے ہیں ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجائش ہے بلکہ سکندر کی لانبی مدفون زرہوں کا افسانا اگر صحیح ہے، تو صرف کتب ہی سے نہیں بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں وہ بھی محل غور و فکر بن جاتے ہیں۔

وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح مسلمان مورخوں کی بنائی ہوئی راہوں پر اس زمانے میں خصوصاً مغربی قومیں نسبتاً زیادہ حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہیں، لیکن کچھ بھی ہو کسی کی تاریخ ہو، ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحب واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کو ذات قدسی صفات سے تھا، یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ کی نبوت پر وہ ایمان لائے تھے۔ آپ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے وہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے وہ سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ میں مخمور تھے۔ یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں، آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہوں کہ بیان کرتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں، کانپتے جاتے ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن اگر کبھی زبان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آگیا، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد اُرتعد وارتعدت ثیابہ تنفخ اوداجہ اغرورقت عیناہ، کانپنے لگتے اور ان کے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں (مستدرک حاکم)

ایک عبداللہ بن مسعودؓ ہی نہیں بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذرؓ کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے مگر منہ سے اوصانی حبی ابو القاسم اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ نکلتے اور چیخ مار مار کر بیہوش ہو جاتے تھے۔ اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اس کے مورخوں میں محبوبیت کا یہ مقام عالی حاصل ہو قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ، ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورۂ بالا تعلقات کے ان براہ راست مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہی اس بات پر کی تھی کہ تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعہ کے ہر ہر جزو، ایک ایک خط و خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔ انہوں نے جس قرآن کو خدا کی شریعت اور قدرت کا قانون یقین کر کے مانا تھا اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اُسے سنو، سن کر یاد رکھو اور اس پر ایمان لاؤ، یقین کرو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں ان کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور ٹھیک من و عن جس طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ — رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ — ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن صرف اس لئے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ — کہدو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں چاہنے لگیگا

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ — تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

سمع و طاعت، اطاعت و اتباع کے ان پُرجلال مطالبوں سے قرآن گونج رہا تھا اور ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے، ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس فیصلہ کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے۔ بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مورخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانے میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مورخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے

مورخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جائیں۔ ہر حاضر غائب کو، اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے۔ قرآنی آیتوں،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی (بہی خواہی) کے لئے تم ظاہر کئے گئے ہو۔ تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے ان کو روکو۔
وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو، جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے، اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

ہی کی یہ تفسیر تھی جو مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے، منیٰ کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے:

نَضَّرَ اللہُ عبداً سَمِعَ مَقَالَتِی فوعاها ثُمَّ أَدَّاها الی مَن لم يَسْمَعْها۔ (صحاح)	تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے، حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے:

ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدهما کتابَ اللہ وسُنّتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔ (صحاح)	میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت، یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جبتک کہ حوض (کوثر) پر میرے سامنے آ جائیں۔

مجمع سے یہ دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہنچا دیا، آسمان کی طرف انگلیاں اٹھاکر ،
اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ. اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ[1] کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے:

اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ (صحاح) — چاہئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے۔

جس دردناک اثرانگیز ماحول میں اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن جذبات و ہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسی اثر کا آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کرکے بطور پیش گوئی آپ فرماتے:

تَسْمَعُوْنَ، وَیُسْمَعُ مِنْکُمْ وَیُسْمَعُ مِنَ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ مِنْکُمْ (ابوداؤد، مستدرک) — تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے، ان سے بھی لوگ سنیں گے۔

نہ صرف عام مجامع میں یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربارِ نبوت میں حاضر ہوا کرتے تھے عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھہرایا جاتا تھا جہاں سے اس واقعہ کے معائنہ اور مشاہدہ کا ان کو کافی موقع مل سکتا ہو جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے، پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا۔ آخر میں رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا، جیسا کہ بخاری میں ہے۔

اِحْفَظُوْھُنَّ وَاَخْبِرُوْھُنَّ مَنْ وَّرَاءَکُمْ۔ — ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہنا۔

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

یَشْمَلُ مَنْ جَاؤُا مِنْ عِنْدِھِمْ وَھٰذَا بِاعْتِبَارِ الْمَکَانِ وَیَشْمَلُ مَنْ یَّحْدُثُ لَھُمْ مِّنَ الْاَوْلَادِ وَغَیْرِھِمْ وَھٰذَا بِاعْتِبَارِ الزَّمَانِ۔ (فتح الباری) — یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جن کے پاس سے یہ لوگ آئے تھے اور یہ بات مکان کے لحاظ سے ہے اور ان آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے جو بعد کو پیدا ہونے والی ہیں اور یہ بات زمانے کے حساب سے ہوگی۔

---

[1] یعنی اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا، کیا میں نے پہنچا دیا، کیا میں نے پہنچا دیا۔ تین دفعہ ارشاد فرمایا۔

اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائلی داخل ہوتے جاتے تھے، دربارِ رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے، وہ انہیں بھی جا کر سکھاؤ۔ صرف استحبابی احکام ہی نہیں بلکہ قرآن کی اس آیت

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۙ

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے اور جو کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ انسانوں کے لئے کتاب میں ہم نے اسے بیان کر دیا ہے یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

کی بنیاد پر صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ (ابو داؤد و ترمذی)

جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی۔

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم کے چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے (بخاری و مسلم و عام صحاح)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ جس ذاتِ گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے بار بار بکثرت ان کی فطرت میں مشہور حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے) کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے مشکل ہی سے چند حدیثیں اس قدر کثیر تعداد صحابہ سے مروی ہوں گی۔ اور یوں بھی قرآن کی رو سے یہ نہایت بدیہی بات تھی جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس فعل کی جرأت کس کو ہو سکتی تھی؟ جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے یوں بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا ہے

ماسوا اس کے جب وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے اور ایک جگہ نہیں، بے شمار آیتوں میں قرآن میں مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ کیا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کیلئے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہو سکتی تھی کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں، یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ تو جس وقت "حدیث" بیان کرنے کے لئے بیٹھتے قبل کچھ بیان کرنے کے مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ

يَبْتَدِئُ أَحَدِيْثَهُ بِأَنْ يَقُوْلَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (اصابج ع)

اپنی حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے: فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرلے۔

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہؓ کو سناتے تھے یا کرکے دکھاتے تھے اس کے متعلق صرف یہ حکم دے کر نہ رہ جاتے کہ تم بھی ان کو یاد رکھا یا کرنا بلکہ اس کی باضابطہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی کس حد تک تعمیل کی جاتی ہے۔ مہمات شریعت اور اساسی امور کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتانے کے بعد فرمایا کہ اچھا میں نے کیا کہا اسے دہراؤ۔ صحابی نے آخری فقرہ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ (ایمان لایا میں اس کتاب پر جو تو نے اتاری، اس نبی پر جسے تو نے بھیجا) میں نَبِيِّكَ کے لفظ کو رَسُوْلِكَ کے لفظ سے بدل دیا جو تقریباً ہم معنی

الفاظ ہیں یعنی بجائے نبی کے رسول کا لفظ استعمال کیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنی زبان مبارک سے نَبِیِّكَ کا لفظ ادا فرمایا تھا حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا، وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں ہے جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی۔ بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ اَنَّهُ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا (جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کرتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے) غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے تمام ارکان یعنی قیام، رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں کی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، مگر نماز سے جب وہ فارغ ہوئے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی) ارشاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے پھر نماز دہرائی لیکن اب بھی اس میں وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسری بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیے ادا کی۔ نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہائے امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے لیکن جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری زندگی اس کے ہر پہلو ظاہر و باطن اندر و باہر کا مورخ بنانا چاہتے تھے، ان پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی تاریخ بھی موجود ہے جس نے اپنے مورخین کی اور راویوں کے بیان و ادا کی خود نگرانی کی ہو، اور ایسی کڑی نگرانی؟

تدوین حدیث کے قدرتی عوامل

تدوین حدیث کے سلسلے میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سے کی ہے اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ کے لئے جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے ٹھوس اور خصوصی اسباب تو یہ تھے لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن بزرگوں کے ہاتھوں علم کے

اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی ان کی اور بھی چند باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سُن چکے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں بلکہ فی الحقیقت مولانا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
ایک آواز میں سوتی بستی جگا دی — نئی اک لگن سب کے دِل میں لگا دی

اس نے صحابہ کرام کی ذہنی قوتوں اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کر ان میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈفرے ہگنس "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیرووں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے سود ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہئے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس کے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے"۔ عُروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی:

اَیْ قَوْمِ وَاللّٰہِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَی الْمُلُوْکِ	لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع
وَفَدْتُّ عَلٰی قَیْصَرَ وَکِسْرٰی وَالنَّجَاشِیْ وَاللّٰہِ	ملا ہے قیصر (روم)، کسریٰ (ایران)، نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر
مَارَاَیْتُ مَلِکًا قَطُّ یُعَظِّمُہٗ اَصْحَابُہٗ مَا یُعَظِّمُ	ہوا ہوں قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ
اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰہِ اِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَۃً	اتنی عظمت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، قسم خدا
اِلَّا وَقَعَتْ فِیْ کَفِّ رَجُلٍ مِّنْھُمْ فَدَلَکَ بِھَا	کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے وہ لیکن ان کے ساتھیوں
وَجْھَہٗ وَجِلْدَہٗ وَاِذَا اَمَرَھُمْ ابْتَدَرُوْا اَمْرَہٗ	میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے
وَاِذَا تَوَضَّأَ کَادُوْا یَقْتَتِلُوْنَ عَلٰی وَضُوْءِہٖ وَاِذَا	مل لیتا ہے محمدؐ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل
تَکَلَّمَ خَفَضُوْا اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَہٗ وَمَا یُحِدُّوْنَ	کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں جب محمدؐ وضو کرتے ہیں تو اس وقت ان
اِلَیْہِ النَّظَرَ تَعْظِیْمًا لَّہٗ۔ (بخاری)	کے وضو کے پانی پر آپس میں الجھ پڑتے ہیں جب محمدؐ بات کرتے ہیں تو ان

کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہ دوست کی نہیں بلکہ ایک دانا دشمن کی شہادت ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس جماعت کے نشہ کا یہ حال ہو، جو احکام و اوامر تو بڑی چیزیں ہیں، تھوک اور وضو کے غسالہ تک کو اپنے اندر پیوست کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے میں گویا باہم الجھ پڑتے تھے، ایک ایک موئے مبارک کے متعلق یہ حال تھا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہ تابعی جنہیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ہاتھ آگیا تھا، فرماتے:

لَأَنْ تَكُوْنَ عِنْدِیْ شَعْرَةٌ مِنْهَا اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا۔ میرے پاس کسی بال کا ہونا، اس سے زیادہ محبوب ہے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب کچھ میرے یہاں ہو۔

جن لوگوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "زندگی" جس کے لئے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیئے گئے تھے، سوچنا چاہئے کہ ان ہی لوگوں نے اس "زندگی" کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا، ایک ایک موئے مبارک بھی جن کے نزدیک دنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب تھا، ان ہی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی غور کرنا چاہئے کہ کیا قیمت تھی۔

اب ایک طرف حضرات صحابہ کرام کے ان جذباتی طوفانوں کو اپنے سامنے رکھئے اور اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ جس عہد میں اس "تاریخ" کی حفاظت واشاعت کی ذمہ داری قدرت کی جانب سے انہیں سپرد ہوئی تھی اس زمانہ میں ان کے پاس کسی قسم کا کوئی دماغی مشغلہ قرآن مجید کے سوا موجود نہ تھا، عرب جاہلیت کی تاریخ ہم سب کے سامنے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس حیرت انگیز مدہش اچانک دماغی بیداری کے زمانہ سے پہلے وہ اور ان کا ملک تقریباً ان عام علمی اور ذہنی مشغلوں سے مفلس تھا جن کا چرچا عموماً حضارت وتمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگرچہ میں اس کا تو قائل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت ہندوستانی بھیلوں اور گونڈوں کی تھی نہ صرف قریش بلکہ اور بھی دوسرے قبائل کے صحیح حالات سے جو واقف ہیں وہ ایک سیکنڈ کے لئے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے بلکہ جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئے گی۔ "جاہلیت" کا یہ ترجمہ کہ وہ لکھنا پڑھنا

نہیں جانتے تھے۔ عربی زبان اور قرآن مجید کے عام محاوروں کے خلاف ہے جو عربوں کی جہالت کا یہ مطلب سمجھتا ہے، وہ دراصل واقعات سے جاہل ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں عرب کا بھی تقریباً وہی حال تھا جو عموماً اس زمانہ میں اگر کامل متمدن نہیں تو نیم متمدن ممالک کا تھا یعنی جس طرح قدیم زمانے میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا اور عام پبلک کو اس سے چنداں تعلق نہیں تھا، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی، کسی ملک میں پادریوں، کسی میں موبدوں، کسی میں برہمنوں، الغرض اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ یہ کام مخصوص تھا، اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب عرب کا بھی یہی حال تھا۔ آئندہ یہ بتایا جائے گا کہ عرب میں بھی ایک خاصی تعداد خواندوں اور نویسندوں کی تھی۔ نہ صرف مرد بلکہ ایام جاہلیت میں بھی بعض عورتیں پائی جاتی تھیں۔ شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ میں اپنے اس دعوے کی تھوڑی بہت تفصیل آگے بھی کروں گا لیکن بایں ہمہ یہ بھی صحیح ہے کہ معمولی نوشت و خواند جو چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھی، اس سے آگے عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لئے اس زمانہ میں کوئی خاص اہم خوراک موجود نہ تھی، اور تھوڑی بہت اگر کچھ تھی بھی تو وہ بہت ادنیٰ درجہ کی تھی۔ ان کا سب سے بڑا مشغلہ شعر و شاعری کا تھا، یا باہم ایک دوسرے پر تفاخر یا توہین کے لئے۔ وہ انساب کے علم سے دلچسپی رکھتے تھے اور بھی ابتدائی نوعیت کی کچھ فنی چیزیں معدودے چند افراد کے پاس تھیں لیکن اسلام نے شریفانہ کردار کا جو معیار مقرر کیا تھا اس میں گانے بجانے، رقص و سرود، مئے نوشی، مفاخرت یا مشاجرت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی، ان کی خمری و فخری فحش و مبالغہ والی شاعری کی بھی اس نے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ایک طرف عربوں کی ذہنی و علمی بھوک کی وہ شدت اور دوسری طرف یونہی اُن کے ملک کا دماغی مشغلوں سے خالی ہونا، چند بچی کھچی ادنیٰ درجہ کی غذائیں جو ان کے پاس موجود تھیں ان کا بھی سامنے سے ہٹ جانا، اور سب کو ہٹا کر اُس شدید دماغی تشنگی کے وقت میں ان کے سامنے صرف قرآن اور مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا علم وفن کے رنگ میں پیش ہونا اور اسی کی کمی و بیشی پر سوسائٹی میں افراد کے مدارج کا قدرتاً مقرر ہو جانا، غور کرنے کی بات ہے کہ ایسے ماحول میں ہر چیز سے ٹوٹ کر ہمہ تن ان ہی دو چیزوں میں اگر وہ ڈوب گئے تھے تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس کے سوا اور

کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا۔

بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں کہ فاقہ کش غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایام جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوششوں کا شکار بنا ہوا تھا، تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو ذکر کیا ہے، ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے، ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لئے دوڑتے پھرتے تھے کہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف ان کے باطنی قویٰ اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا، دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لئے رسد کا ایک ایسا بے تھاہ سمندر ان کے اس غیر آباد قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب آسمانوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا، ان خزائن اور دفائن، غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسریٰ کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے یا وہ دولت جو زمین فرعون (مصر) سے یا ارض شام سے آئی تھی، ستون فی ستین (یعنی ساٹھ گز چوڑا) والا جو ہر نگار بہار نامی ایرانی غالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنہ پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوراکی رسد کا یہ حال تھا کہ عام رمادہ کے قحط میں حضرت عمرؓ نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لئے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایۂ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصے میں حجاز، یمن، یمامہ، بحرین، عراق، شام اور مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے ہیں جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ صرف ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط

عمرو بن العاص رضؓ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کی مانند سرسبز ہو جاتی ہے، ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگیروں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان اموالِ غنیمت کے حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی، تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی تک پہنچتے پہنچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہد نبوت میں جس گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی لیکن ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرنے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کروڑ دو لاکھ لگائی گئی تھی۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے انتقال کے وقت ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے لیکن فراخی و فراغبالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ثلث مال سے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی کو (جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی) چار چار سو دینار دیئے جائیں۔ صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو وہی عرب تھے جن کے پاس ہزار کے اوپر عدد کے لئے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی یا اپنے ملنے جلنے والے احباب و اعزہ کو دے ڈالتی تھی۔ عام تاریخی کتابوں میں بکثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

بہرحال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت اور آمدنی کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گزشتہ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ ان کے دل میں لگائی گئی تھی اس کی تسکین کے لئے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت نے مہیا کر دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا

کہ مال و دولت کی اس فراوانی نے ان ہی صحابیوں کی دوسری اور تیسری پشت میں ان امیرانہ مشاغل کو پیدا کر دیا جو اس کے لازمی نتائج ہیں[1]۔ لیکن ہم جن لوگوں سے بحث کر رہے ہیں ان میں ایک ایسا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ کردار کے اس بلند اسلامی معیار کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور اس کی شہادت ان کی زندگی سے ملتی ہے بجائے رنگ رلیوں کے ان کے مصارف وہی تھی جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کئے تھے۔ ہر ایک نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ وہی عبدالرحمن بن عوفؓ جن کا ذکر ابھی گزرا، مشہور بات ہے کہ اپنے ذاتی روپے سے خرید خرید کر انہوں نے تقریباً تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا تھا، اور ازیں قبیل سب کا یہی حال تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں اکثر خصوصاً جن کا زیادہ میلان تعلیم قرآن اور تدوین حدیث کی طرف تھا ان کی تمام جائدادوں اور مالی ذرائع کی نگرانی بھی قہرمانوں اور قیموں کے سپرد تھی، وہی وصول کرتے تھے اور وہی اس کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنے کام کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ جو ترجمان القرآن حبر الامۃ وغیرہ عالمانہ القاب سے ملقب ہیں اور تدوین حدیث میں ان کا بڑا حصہ ہے، ان کے ایک بھائی عبیداللہ کی طبیعت کا میلان تو جود و سخا کی طرف تھا کہا جاتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہزاروں روپے لوگوں کو دے دیتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ تم پر میرا حق ہے، بولے کیا؟ اس نے کہا کہ تم چاہ زم زم پر پانی پی رہے تھے، چہرہ پر دھوپ پڑ رہی تھی، میں نے اپنی چادر سے سایہ کر دیا تھا! بولے ہاں تیرا احسان یاد ہے۔ قیم (داروغہ) کو آواز دی، پوچھا تیری تحویل میں اس وقت کتنی رقم ہے؟ دس ہزار درہم نقرئی اور دو سو طلائی دینار ہیں! اس نے جواب دیا۔ حضرت عبیداللہ نے حکم دیا سب اس شخص کو دے دو۔ اور یہ ان کا عام حال تھا۔ لیکن وہی دولت جسے عبیداللہ اس طریقہ سے خرچ کرتے تھے ان کے بڑے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرماتے تھے۔ بخاری میں ان کے مشہور شاگرد ابو جمرہ سے مروی ہے کہ صرف اس لئے تاکہ

---

[1] قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں روایت درج کی ہے کہ فارس کے غنائم جن میں الجواہر، اللولو، والذہب والفضہ کی کثیر مقدار تھی حضرت عمرؓ کے سامنے جب ان کا ڈھیر لگایا گیا تو رونے لگے اور فرمایا کہ جس قوم کو یہ چیزیں ملیں بالآخر ان میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ضرور ہے۔

ابن عباسؓ کی آواز[1] دوسروں تک وہ پہنچایا کریں، حضرت نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ ابو جمرہ کیلئے مخصوص فرما دیا تھا۔ اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جب مسند درس پر جلوہ فرما ہو چکے تھے، لیکن یہی ابن عباسؓ باوجود اس ثروت و دولت کے اپنے طلب حدیث کے دنوں کو یاد کر کے فرماتے :

كُنْتُ لَآتِي الرَّجُلَ فِي الْحَدِيْثِ يَبْلُغُنِيْ أَنَّهٗ سَمِعَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجِدُهٗ قَائِلًا فَأَتَوَسَّدُ رِدَائِيْ عَلٰى بَابِهٖ تَسْفِي الرِّيْحُ التُّرَابَ عَلٰى وَجْهِيْ حَتّٰى يَخْرُجَ فَإِذَا خَرَجَ قَالَ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ ؟ فَأَقُوْلُ بَلَغَنِيْ حَدِيْثٌ عَنْكَ أَنَّكَ تُحَدِّثُهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَسْمَعَهٗ مِنْكَ فَيَقُوْلُ هَلَّا بَعَثْتَ إِلَيَّ حَتّٰى آتِيَكَ فَأَقُوْلُ أَنَا أَحَقُّ إِلَيْكَ۔

(دارمی)

حدیث کی طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس جاتا جن کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا، ہوائیں دھول اڑا اڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں اور میں اسی حال میں پڑا رہتا تا اینکہ خود وہ صاحب باہر نکل آتے، باہر نکل کر (جب مجھے دیکھتے) تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کیسے تشریف لائے ہیں، میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تم کوئی حدیث روایت کرتے ہو، میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں۔ جواب میں وہ صاحب کہتے، آپ کسی کو بھیج دیئے ہوتے میں خود حاضر ہو جاتا۔ میں کہتا کہ تمہارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں۔

صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ تابعین، تبع تابعین نیز دوسرے ائمہ اور بزرگوں نے اس فن کی تدوین میں کیا کیا مشقتیں برداشت کی ہیں ان کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس مثال کے پیش کرنے کی غرض اس وقت صرف یہ تھی کہ دولت و امارت نے ان کو امیرانہ چونچلوں میں الجھا نہیں دیا تھا بلکہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی آمدنی کا اکثر حصہ اسی علم کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی

[1] بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ابو جمرہ چونکہ فارسی جانتے تھے اس لیے حضرت ابن عباس کی باتوں کا ترجمہ عربی نہ جاننے والوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ دونوں کام کرتے ہوں۔

اس علمی ولولہ کی کیفیت یہ تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لئے کہ ان کا بچہ فن حدیث کا عالم ہو جائے ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں۔ اس موقعہ پر عہد صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا۔ غالباً فوج میں ملازم تھے، لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا۔ تقریباً سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کر کے وہ کسی نوکری پر طویل مدت کے لئے باہر چلے گئے۔ پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی۔ جس وقت جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ پیچھے لڑکا پیدا ہوا امام ربیعہ رکھا گیا۔ اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے کہ انہوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی؟ یہی قرآن وحدیث کی خدمت۔ فروخ جب گھر واپس ہوئے تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری جیسے لوگ جنہیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے۔ فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے۔ دو تین دن کے بعد بیوی سے اپنے گزشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا۔ بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے، کچھ دم لے لو تو انہیں نکالوں، لیکن ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہائے درس میں گشت تو لگانا۔ دوسرے دن انہوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہنچے تو خدا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے۔ تو خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ گھر پہنچے اور بیوی سے حال بیان کیا۔ بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا؟ میں نے تمہارے روپے اس کی تعلیم پر خرچ کر دیئے۔ فروخ نے اپنی بیوی کے فعل کی تحسین کی۔

علم حدیث کی تفصیل و تدوین واشاعت ونشر میں عہد صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں اس کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے میں اس وقت صرف دماغوں کو ادھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہد صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی دخل ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام ے

دو یار زیرک واز بادۂ کہن دو منے ‏ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

کے ماحول میں انجام پا سکتا ہے چہ خورد بامداد فرزندم کے سوال کے ہتھوڑوں سے چور دلوں میں بجز خاص استثنائی صورتوں کے عموماً ایسے پراگندہ روزوں سے پراگندہ دماغی ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

خصوصاً جو واقعۂ خاص اس علم کے ساتھ پیش آیا ہے اس کے لئے تو یہ ہونا زیادہ ضروری تھا کیونکہ چند گنے گنائے آدمیوں سے اس کا تعلق نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو استثنائی قانون کا ممکن تھا کہ ظہور ہوتا لیکن آپ کو آئندہ معلوم ہوگا کہ تاریخ کے اس بسیط اور مختصر حصہ کے بیان کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اب تک حدیث کے ابتدائی راویوں یعنی صحابۂ کرام کے کیفی حالات و خصوصیات سے میں بحث کر رہا تھا لیکن اس تاریخ کے مورخوں کا جو مقداری امتیاز ہے میرے خیال میں تدوین کے "قدرتی عوامل" میں غور و فکر کے لئے ان کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ اس فن کی ایک ایسی امتیازی شان ہے جس کی نظیر فن تاریخ ہی میں نہیں دوسرے علوم میں بھی بمشکل مل سکتی ہے ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ مشہور فقرہ کہ "کوئی قوم نہ دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اَسْمَاءُ الرِّجَال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

اسماء الرجال اور اس کی ضرورت کی تفصیل تو آگے آئے گی میں اس وقت آپ کی توجہ اس تاریخ کے اساسی مورخوں کی تعداد اور ان کی مختلف نوعیتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد

غور کیجئے، انصاف سے کہنا چاہئے کہ علمی دنیا کے ہاتھ میں آج تاریخ کا جتنا کچھ بھی سرمایہ ہے، وہی جس کی تعلیم و تعلم پر جامعات اور یونیورسٹیوں میں اور نشر و اشاعت و تدوین و ترتیب پر تصنیف گاہوں اور مطابع و اشاعتی اداروں میں، حکومتوں اور عام پبلک کی جانب سے بلا مبالغہ ہر سال کروڑ ہا کروڑ روپے صرف ہو رہے ہیں اور ان تمام مصارف کا شمار بہترین علمی خدمتوں میں ہے اور بلا شبہ یہ بہت بڑی علمی خدمت ہے لیکن تھوڑی دیر کے لئے اپنے اس علمی و فنی سرمایہ کا جائزہ لیجئے، قدیم ہو یا جدید، تاریخ کے

کسی حصہ پر نظر ڈالئے کہ ابتداء میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی، قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے عینی شاھدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے۔ بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصّہ ایسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے تاہم مان لیجئے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے، ان تاریخوں کے ابتدائی راویوں کی تعداد بمشکل ایک دو سے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے وہ کوئی پرانے زمانے کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتبہ، پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی سنگی یا برنجی تختی، یا از یں قبیل کوئی اور چیز ہے۔ یقینی سے یقینی تر چیز کسی شخص کی ذاتی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے۔ اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی بیوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے عینو فسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں، اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام گفتنیوں کے اندراج کا بھی التزام کیا گیا ہو یا یوں کہئے کہ صاحب شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلہ[۱] والوں کے معلومات بھی اس میں بیان کئے گئے ہوں، لیکن ان سب سے بھی اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جب بھی اس یقینی ترین تاریخی سرمایہ و خود نوشت سوانح عمری کی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ پر نسیان و ذہول، بھول چوک کی راہیں جتنی کھلی ہوئی ہیں ظاہر ہے لیکن اب آئیے تاریخ کے اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالئے جس کا نام "حدیث" ہے جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ واقعات حاصل کئے گئے، ہیں ان کی تعداد کیا تھی؟ ابھی اس سلسلۂ روایت کی بعد کی کڑیوں سے بحث نہیں بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے جو خود اس واقعہ

---

[۱] یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ؎ اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے،
ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں، دیوان تو انکا دیکھا ہے۔ کی طرف تلمیح ہے۔

میں شریک ہے انہوں نے اس کو دیکھا اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو، یا ایک مرید اپنے پیر کو، یا صاف لفظوں میں کہئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجیب و غریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی؟ علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں، ان سے یہی سوال پوچھا گیا، جواب میں انہوں نے فرمایا:

تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَآهُ وَسَمِعَ مِنْهُ زِيَادَةٌ عَلٰى مِائَةِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِّنْ رَجُلٍ وَّامْرَأَةٍ كُلُّهُمْ قَدْ رَوٰى عَنْهُ سِمَاعًا اَوْ رُؤْيَةً (اصابہ جلد ا صـ۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضورؐ کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب حضورؐ سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابن ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے بلکہ ان خاص اصحاب کی تعداد ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے۔ حدیث تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سن لیا جاتا ہے اور لوگ گزر جاتے ہیں لیکن مقابلہ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہو سکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بمشکل متجاوز ہو سکتی ہے اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسہ پر آج کروڑہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیال تو کیجئے کہ کہاں ایک لوقا[1] ایک مرقس یا ایک سنجے گاڑی بان کا بیان اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ان بکھری ہوئی کثرتوں کے سمیٹنے والے

---

[1] مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑی بان کا نام ہے جو ہندوؤں کی مشہور کتاب گیتا کا سری کرشن سے تنہا راوی ہے۔ محض اس کی روایت کی بنیاد پر ہندو گیتا کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔

صرف ایک دو ہیں۔ ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور ان کی سچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے تصویر اتارنے کے لئے ارد گرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں۔

چہ نسبت خاک را بعالم پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرتِ تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر

سب سے پہلی بات تو یہی ہے، ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے، جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں ممکن ہے، پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی بھی ایک بڑی جماعت شریک ہے تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مورخین صرف مرد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے محض وہی واقعات پہنچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی کے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے ان کے متعلق کوئی واضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا ہو یا خلوت کا، کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا۔ راویوں کی کثرت اور ان کی مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دوست ہی نہیں آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ "یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔" یہ باسورتھ اسمتھ کی شہادت ہے جس کا اظہار اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (ص۲۰۱) میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر میں ہو یا اندر میں، قدرت نے ایسے اسباب فراہم کر دیئے تھے کہ صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابل ذکر مذاہب یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں

پہنچا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی و تکمیلی زد دین دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں اس کے سمجھنے کے لئے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی، اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا باہر میں بھی اور اندر میں بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف بھی ہیں۔ عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ ایک واقعہ کے جب بہت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ اگر صحابہ کرام کے جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان کی بنا پر یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ قرآن میں قانون شہادت کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا ہے، ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں جہاں راویوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا ورنہ ان کے نظائر جن سے معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زُرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے ظاہر ہے کہ صحبت مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لحہ یا ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ سارا مجمع رہتا۔ اگرچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تقریباً ایک لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہؓ کی رہتی تھی یا غزوات و اسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے ان کی ظاہر ہے کہ اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی، بیس ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار، تین ہزار، چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عموماً رہی ہے۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداءً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک خاص گروہ آپ کے ساتھ تھا لیکن جس وقت غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے۔ کعب بن مالکؓ جو اس سفر میں رفاقت سے محروم رہے تھے اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں ان ہی کی زبانی منقول ہے، اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا:

وَالنَّاسُ کَثِیْرٌ لَا یُحْصِیْہِ دِیْوَانٌ ۔ لوگ بکثرت تھے، کسی دفتر میں ان کی تعداد منضبط نہ تھی۔

بہر حال مدینہ منورہ میں بالآخر اچھی خاصی جماعت باہر کے مہاجرین کی بھی جمع ہوگئی لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کو ہر وقت اپنے مختلف مشاغل کی وجہ سے مجلس مبارک میں حاضری میسر نہیں آتی تھی، کسی وقت کوئی رہتا تھا، کسی وقت کوئی۔ اب اگر راویوں کی تعداد دو چار پر ختم ہو جاتی تو وہ ذخیرہ جمع ہو سکتا تھا جو آج جمع ہوا ہے، یہ واقعہ ہے کہ گرد و پیش میں ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رہنے، آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ یا کسی قول کے محفوظ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور اپنی مذکورہ بالا ذمہ داریوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تو یہ عام قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اپنی حاضری کے دنوں میں اس عجیب و غریب شخصی تاریخ کے متعلق جن واقعات کا علم حاصل ہوتا تھا، دوسرے دن اپنے غائب رفیق کو من و عن سنا دیا کرتے تھے۔ بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

کُنْتُ اَنَا وَجَارٌ لِّیْ مِنَ الْاَنْصَارِ فِیْ بَنِیْ اُمَیَّۃَ بْنِ زَیْدٍ وَھِیَ مِنْ عَوَالِی الْمَدِیْنَۃِ وَکُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُوْلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ یَوْمًا وَاَنْزِلُ یَوْمًا فَاِذَا نَزَلْتُ جِئْتُہٗ بِخَبَرِ ذٰلِکَ الْیَوْمِ مِنَ الْوَحْیِ وَغَیْرِہٖ وَاِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِکَ۔

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کے عوالی کی بستیوں میں سے ہے۔ ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوتے، ایک دن میں حاضری دیتا۔ میں جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ابتداءً اسلام میں محدود معاشی ذرائع ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ مہاجرین بیچاروں کو اپنے اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لئے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا۔ جس گاؤں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا، یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑے بننے کی کارگاہیں تھیں، سخ نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارخانہ تھا۔ انصار عموماً اپنے باغوں اور کھیتوں پر کام

کرتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی جو اپنے در گھر سے جدا ہو کر نو مسلموں کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صُفّہ نامی جو مدرسہ قائم فرمایا تھا اُس میں داخل ہو جاتے تھے، ان کے قیام وطعام کا نظام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کے خوش باش لوگ کیا کرتے تھے۔ اس لئے معاشی افکار سے الگ ہو کر ان کا زیادہ کام یہی تھا کہ قرآن سیکھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وسنن یاد کریں۔ اسی جماعت کے سرگروہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ لوگوں کو ان کی کثرتِ روایت پر کبھی تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے:

إِنَّكُمْ تَزْعُمُونَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يُكْثِرُ الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللهُ الْمَوْعِدُ إِنِّي كُنْتُ امْرَأً مِسْكِيناً أَصْحَبُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مِلْءِ بَطْنِي وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ وَكَانَتِ الْأَنْصَارُ يَشْغَلُهُمُ الْقِيَامُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ (بخاری)	تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے، مگر قسم ہے خدا کی کہ میں ایک غریب مسکین آدمی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف پیٹ پر پڑا رہتا تھا، درآنحالیکہ مہاجرین بازاروں کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت) میں الجھے رہتے۔

ایک دوسرے موقع پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سلسلے میں وہ کیا کرتے تھے، خود تفصیل فرماتے ہیں:

قَدِمْتُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَيْبَرَ أَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ زِدْتُ عَلَى الثَّلَاثِينَ فَأَقَمْتُ مَعَهُ حَتَّى مَاتَ وَأَدُورُ مَعَهُ بُيُوتَ نِسَائِهِ وَأَخْدِمُهُ وَأَغْزُو مَعَهُ وَأَحُجُّ. (ابن سعد)	میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوا، اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی، پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کر لیا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگا رہتا، آپ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے تو میں آپ کے ساتھ ہوتا، ہر وقت آپ کی خدمت کرتا، حج میں اور جہاد کے سفروں میں آپ کے ساتھ جاتا۔

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گزری، بعد کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں:

وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنْ كُنْتُ لَاَعْتَمِدُ عَلَى الْاَرْضِ بِكَبِدِیْ مِنَ الْجُوْعِ وَاَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰى بَطْنِیْ۔	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگا لیتا اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا۔

کبھی فرماتے:

رَاَیْتُنِیْ اُصْرَعُ بَیْنَ مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَحُجْرَةِ عَائِشَةَ فَیُقَالُ مَجْنُوْنٌ وَمَا بِیْ جُنُوْنٌ اِنْ هِیَ اِلَّا الْجُوْعُ۔ (صحاح)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے درمیان میں چکرا کر گر پڑتا۔ خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق، وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا۔

مگر یہ سب کچھ گزر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کرکے آرام اٹھا رہے ہیں، مگر تیس بتیس سال کا یہ دوسی یمنی نوجوان

موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

کہہ کر بیٹھ گیا تھا، اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حتی توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب النعلین والسواک والوسادۃ تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو ابن مسعودؓ کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ:

اَنَّهٗ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِمَا نَرٰی مِنْ دُخُوْلِهٖ وَدُخُوْلِ اُمِّهٖ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ	وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی رہتی تھی۔

ان کو دربارِ رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ

علی ترفع الحجاب وتسمع سوادی. (اصابہ)

ابن مسعود! تم پردہ کو اٹھا کر میرے حجرہ میں آسکتے ہو اور تنہائی کی گفتگو سُن سکتے ہو۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو نو سال تک مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں رہے۔ اوران کے سوا بھی حضورؐ کے موالی مثلاً رافع، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو بہت کم مجلس رسالت کی حاضری سے محروم رہتے تھے۔ یہ تو مردوں میں، اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا، جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن امور کا علم براہِ راست حاصل نہ ہوتا تھا ان کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کرتے تھے اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی۔ خود حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ

كَانُوا يَعْرِفُونَ لُزُومِي فَيَسْأَلُونِي عَنْ حَدِيثِهِ مِنْهُمْ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ. (ابن سعد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان کے پوچھنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں اور عثمانؓ بھی علیؓ بھی طلحہؓ بھی زبیرؓ بھی۔

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے، جس میں خلفائے راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھی ہے۔ مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ اگر ان کو کوئی علم ہو تو بیان کریں۔ ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گزرا، حالانکہ نو سال تک صحبتِ نبوی میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقعہ ملا ہے، لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا،

أَنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

کیا آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا :

مَا کُلُّ مَا نُحَدِّثُکُمْ بِہٖ سَمِعْنَاہُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ کَانَ یُحَدِّثُ بَعْضُنَا بَعْضًا۔ (مستدرک حاکم)

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں بیان کرتے ہیں، سب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)۔

اور یہ بھی تھا بہت بڑا عظیم نفع حضرات صحابہ کی کثرت تعداد کا۔ ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا۔ اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانے میں نہیں بلکہ خود باہم ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے اپنے علمی نقص کی تکمیل کے لئے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کئے ہیں اور قرآن نے اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا اور خاص طور پر حدیث کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ خود بیان کرتے ہیں :

بَلَغَنِیْ حَدِیْثٌ عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَابْتَعْتُ بَعِیْرًا فَشَدَدْتُ عَلَیْہِ رَحْلِیْ ثُمَّ سِرْتُ اِلَیْہِ شَہْرًا حَتّٰی قَدِمْتُ الشَّامَ فَاِذَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ اُنَیْسٍ الْاَنْصَارِیُّ فَاَتَیْتُ مَنْزِلَہٗ وَاَرْسَلْتُ اِلَیْہِ اَنَّ جَابِرًا عَلَی الْبَابِ فَرَجَعَ اِلَیَّ الرَّسُوْلُ فَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَخَرَجَ اِلَیَّ فَاعْتَنَقْتُہٗ وَاعْتَنَقَنِیْ قَالَ قُلْتُ حَدِیْثٌ بَلَغَنِیْ عَنْکَ اَنَّکَ سَمِعْتَہٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْمَظَالِمِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پہنچی۔ میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوا کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ شام پہنچا اور عبد اللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہنچی تھی، ان) کے گھر پہنچا اور اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے آدمی نے واپس آکر پوچھا کہ کیا جابر بن عبد اللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں! عبد اللہ بن انیس باہر نکل پڑے، دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔ پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعے سے ایک حدیث پہنچی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لَمْ اَسْمَعْهُ اَنَا مِنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الحدیث (جامع بیان العلم ابن عبد البرص ۹۳)

سے مظالم کے متعلق آپ نے سنی ہے اور میں نہیں سن سکا ہوں۔ عبد اللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبد اللہ نے پوری حدیث سنائی)۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفونِ قسطنطنیہ[1] کا ہے کہ ایک حدیث انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود سنی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا۔ آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربارِ رسالت میں موجود تھے لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ سن کر حیرت ہو گی کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لئے حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں:

حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ سَتْرِ الْمُسْلِمِ لَمْ یَبْقَ اَحَدٌ سَمِعَهُ غَیْرِیْ وَغَیْرُكَ۔

مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جسے تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں، حدیث یہ تھی، مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا خِزْیَةً سَتَرَهُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ وہ سنتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

---

[1] قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے پڑے تھے جس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور یقین ہو گیا کہ آخری وقت ہے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کو لیکر مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں آخری نقطہ جہاں تک تمہاری رسائی ہو، اسی میں مجھے دفن کر دینا۔ جنازہ لیکر مسلمانوں نے حملہ کیا [illegible] غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے۔ وہیں قبر کھود کر حضرت کو دفن کر دیا گیا۔ محمد فاتح نے جب [illegible] قسطنطنیہ فتح کیا تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی۔

فَاَتٰی اَبُوْ اَیُّوْبَ رَاحِلَتَهٗ فَرَکِبَهَا وَانْصَرَفَ اِلَی الْمَدِیْنَةِ وَمَاحَلَّ رَحْلَهٗ۔ (۹۴- جامع)

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث سنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے، آپ نے (مصر میں) اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان اباسعید رحل فی حرف یعنی حدیث کے ایک حرف کی تصحیح کے لئے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ کوچ کیا۔ دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے

اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحَلَ اِلٰی فُضَالَةَ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰهِ وَهُوَ بِمِصْرَ فَقَدِمَ عَلَیْهِ وَهُوَ یَمُدُّ لِنَاقَةٍ لَّهٗ فَقَالَ مَرْحَبًا قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اٰتِكَ زَائِرًا وَّلٰكِنْ سَمِعْتُ اَنَا وَاَنْتَ حَدِیْثًا مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجَوْتُ اَنْ یَّكُوْنَ عِنْدَكَ مِنْهُ عِلْمٌ۔ (دارمی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صحابی فضالہ بن عبداللہ کے پاس مصر پہنچے۔ فضالہ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے، انہوں نے خوش آمدید کہا۔ صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں بلکہ ہم نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی تھی۔ میں یہ امید لیکر آیا ہوں کہ وہ تمہیں یاد ہوگی۔

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا۔ باقی ایسے کم سن اصحاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے یا ان کے معاصر یا تلامذہ جنہیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما باوجود قرابتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاش حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے صحابہ کی کثرتِ تعداد کے اس فائدے کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ذریعے سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے، اس سلسلے میں اپنے ایام طلب کے قصے بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

هَلُمَّ فَلْنَسْاَلْ اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ

چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّهُمُ الْيَوْمَ كَثِيْرٌ۔ — سے چل کر دریافت کریں کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیکن ان کے رفیق بخت کے چھوٹے تھے، بولے:

يَا ابْنَ عَبَّاسٍ اَتَرَى النَّاسَ يَحْتَاجُوْنَ اِلَيْكَ وَفِي النَّاسِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (دارمی)

ابن عباس کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے، حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گزرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں۔ بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباسؓ مرجع انام بن گئے تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے اور کہتے تھے، كَانَ هٰذَا الْفَتٰى اَعْقَلَ مِنِّيْ (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند تھا)۔ تابعین میں سعید بن المسیب، مسروق وغیرہ، جن کے حالات آگے آرہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب سے امام مالک راوی ہیں:

اِنِّيْ كُنْتُ لَاَسِيْرُ اللَّيَالِيَ وَالْاَيَّامَ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ۔ (جامع)

میں حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لئے کوچ کیا) ان تابعیوں کی نزاکتِ ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بسا اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہنچتی جو شرفِ صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہو چکا ہوتا، لیکن اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس صحابی سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ زندہ ہیں تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہنچ کر کوشش کرتے کہ براہِ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں۔

دارمی نے ابوالعالیہ سے یہ روایت درج کی ہے:

كُنَّا نَسْمَعُ الرِّوَايَةَ بِالْبَصْرَةِ عَنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ نَرْضَ حَتّٰى رَكِبْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَسَمِعْنَاهَا

ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے حوالہ سے سنتے تھے مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کر لیتے تھے جب تک سوار ہو کر مدینہ پہنچ کر خود ان صحابیوں

مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ (دارمی) کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے۔

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے بلکہ عام تابعین کے طرزِ عمل کا بیان ہے۔ طلب حدیث کے لئے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا کہ بطور امورِ عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہو گیا یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں انہیں مخاطب کر کے بطورِ طیب کے فرماتے:

خُذْهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ الرَّجُلُ يَرْحَلُ فِيْمَا دُوْنَهَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ (ابن سعد) بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لیلو ورنہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لئے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا عوامل و موثرات سچ پوچھئے تو بجائے خود ان میں ہر ایک حدیث یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے، لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہو گئے ہوں؟ اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعوے کو بھی اپنے سامنے رکھ لیجئے کہ:

مَذْهَبُ الْعَرَبِ اَنَّهُمْ كَانُوْا مَطْبُوْعِيْنَ عَلَى الْحِفْظِ مَخْصُوْصِيْنَ بِذٰلِكَ ۔ (جامع) عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ ان کی فطری عادت سی تھی، اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔ بدوؤں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حَرْفٌ فِيْ تَامُوْرِكَ خَيْرٌ مِّنْ عَشْرَةٍ فِيْ كُتُبِكَ (دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لَيْسَ بِعِلْمٍ مَا حَوَى الْقِمَطْرُ ۔۔۔ مَا الْعِلْمُ اِلَّا مَا حَوَى الصَّدْرُ

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے ۔۔۔ نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو۔

دوسرا کہتا ہے ؎

اِسْتَوْدَعَ الْعِلْمَ قِرْطَاسًا فَضَيَّعَهُ ۔۔۔ وَبِئْسَ مُسْتَوْدَعُ الْعِلْمِ الْقَرَاطِيْسُ

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا۔ علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے ؎

عِلْمِی مَعِی حَیْثُ مَا یَمَّمْتُ اَحْمِلُہٗ　　بَطْنِی وِعَاءٌ لَہٗ لَا بَطْنُ صَنْدُوْقٍ

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اٹھائے لئے جاتا ہوں، میرا باطن اس علم کا محافظ ہے نہ کہ شکمِ صندوق۔

اِنْ کُنْتُ فِی الْبَیْتِ کَانَ الْعِلْمُ فِیْہِ مَعِی　　اِذَا کُنْتُ فِی السُّوْقِ کَانَ الْعِلْمُ فِی السُّوْقِ

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے، جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے، اس میں جلا پیدا ہوجاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے۔ اسی لئے یہ مسلم ہے۔ اِنَّ الْعَرَبَ قَدْ خُصَّتْ بِالْحِفْظِ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے) ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں کتابی قوموں کیلئے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبد البر لکھتے ہیں :

كَانَ اَحَدُ هُمْ يَحْفَظُ اَشْعَارَ بَعْضٍ فِیْ سَمْعَةٍ وَّاحِدَةٍ۔　　ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کرلیا کرتے تھے۔

ابن عباسؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنادوں اور سنادیا۔ حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ

اِنِّیْ لَاَمُرُّ بِالْبَقِیْعِ فَاَسُدُّ اُذُنَیَّ مَخَافَةَ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهَا شَیْءٌ مِّنَ الْخَنَا فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلَ اُذُنَیَّ شَیْءٌ قَطُّ فَنَسِيْتُهٗ۔　　میں بقیع کی طرف گزرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کرلیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ ان میں کوئی فحش بات داخل ہوجائے، کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی

(ابن عبد البر) داخل نہیں ہوئی ہے، جسے میں بھول گیا ہوں۔

شعبی بھی یہی کہتے تھے:

مَا كَتَبْتُ سَوْدَاءَ فِي بَيْضَاءَ وَمَا اسْتَعَدْتُ حَدِيثًا مِنَ النِّسْيَانِ۔ (ابن سعد) میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی۔

غیروں پر تو حجت نہیں ہو سکتی، لیکن علماء اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے انا له لحافظون کا اعلان کیا تھا، اسی نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔ اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دربار رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ اور دعا کے ذریعہ سے ان کا حافظہ ایسا ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے، تقریباً شہرت کے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔

صحابہ کرام حدیث کے زندہ نسخے تھے،

بہر حال صحابہ کا ذوق اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرنے کی کوشش اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اس کے بعد میں دعویٰ کروں کہ جن واقعات اور حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرتؐ سے ہوا تھا، صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرتؐ کے زندہ مثنی بنے ہوئے تھے اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضورؐ کی زندگی عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی تو کیا میرے اس دعوے کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے؟ پس تدوین حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابہ کرام کی زندگی تھی اور یہ تھی حفاظت حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو نقل تھے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں، ہم کتابوں

میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ ہیں نے حضرت حذیفہؓ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا :

حَدِّثْنَا بِاَقْرَبِ النَّاسِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَدْيًا وَدَلًّا نَلْقَاهُ فَنَأْخُذُ عَنْهُ وَنَسْمَعُ مِنْهُ۔

مجھے بتایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز وروش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے؟ تاکہ میں ان سے ملوں، ان سے علم حاصل کروں، حدیثیں سنوں۔

ایک معاصرؔ[1] دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

اَقْرَبُ النَّاسِ هَدْيًا وَدَلًّا وَسَمْتًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنُ مَسْعُوْدٍؓ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز وروش چال ڈھال وضع وانداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعودؓ ہیں۔

صرف اُن ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت وقانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہو بہو تصویر اتارنے کے لئے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور سے مشہور ہے :

كَانَ يَتَتَبَّعُ اٰثَارَهٗ فِيْ كُلِّ مَسْجِدٍ صَلّٰى فِيْهِ وَكَانَ يَعْتَرِضُ بِرَاحِلَتِهٖ فِيْ طَرِيْقٍ رَأٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ نَاقَتَهٗ۔ (اصابہ)

جن جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (راستوں) میں نمازیں پڑھی تھیں، ابن عمرؓ ان مقامات کو تلاش کرتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ راہ میں جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رُخ پھیرا تھا۔ ابن عمرؓ بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لئے اونٹ سے کہیں اتر کے بیٹھے تھے تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمرؓ اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے۔ اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے۔

يَسْأَلُ مَنْ حَضَرَ اِذَا غَابَ عَنْ قَوْلِهٖ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول وفعل سے یہ غائب

---

[1] فن تنقید رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے جس کی تعبیر "المعاصرة اصل المنافرة" (ہم عصری باہمی نفرت کی بنیاد ہے) کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے۔ اس لئے معاصر کی معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

وَفِعْلِهٖ ۔ (اصابہ) رہتے تو جو لوگ اس وقت حاضر ہوتے ان سے پوچھ لیتے ۔

امام مالکؒ سے ان کے شاگرد یحییٰ نے ایک دن پوچھا کہ :

اَسَمِعْتَ الْمَشَائِخَ یَقُوْلُوْنَ، مَنْ اَخَذَ بِقَوْلِ ابْنِ عُمَرَ لَمْ یَدَعِ الْاِسْتِقْصَاءَ قَالَ نَعَمْ ۔ (اصابہ)

کیا آپ نے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ان کا خیال تھا جس نے ابن عمرؓ کے قول کو اختیار کیا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی تکمیل میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ؟ بولے ہاں !

یہ استقصا یا سیرتِ طیبہ کی کامل "تصویرکشی" یا "ہو بہو نقل" آتارنا، نصب العین تو سب ہی کا تھا لیکن ہر شخص کے لئے اس کا میسر آنا آسان نہیں ہے ۔ تاہم اسی کے ساتھ جتنے بھی صحابی تھے ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا ۔ اور اسی بنیاد پر میں ہر صحابی کو دراصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں اجازت دیجیئے تو اڈیشن قرار دیتا ہوں ۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض اڈیشن بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی اور اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے صحیح ہے تو ایمان واسلام اور جوش عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ عہدِ نبوت میں ہی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے، اس کے کامل وناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی ۔ کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصہ ایسا موجود ہے جس کے عینی شاہد اتنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں ؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی ؟ کاملیت کے اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو لیکن کمیت اور مقدار کے لحاظ سے ہر شخص جانتا ہے کہ ان تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں ہر سال اس کی تعداد میں اَضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہو رہا ہے ۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ کا عکس نہیں ہے ؟ آج بھی کوئی مسلمان ہندوستان کے کسی کوردہ دیہات میں جو نمازیں پڑھتا ہے، قسم کھا کر کہہ سکتا ہے اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچا ہے کہ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھاتا ہے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے، وہی کہتا ہے جو حضورؐ کہتے تھے، وہی پڑھتا ہے، جو

حضورؐ پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضورؐ جھکتے تھے، اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے جس طرح حضور رکھتے تھے اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال و عقائد کو قیاس کر لیجئے، کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھی بات کلمہ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جز، تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے

اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لئے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں، تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل، وضو، عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات، محذورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ خلفاً عن سلف تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ پہنچا ہے، لیکن اس مسئلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جز کو مسلسل روایت کے ذریعہ سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے۔ اب روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی ہیں ان کو اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعہ سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسری

نسل تک منتقل کیا ہے، دونوں کو سامنے رکھئے، ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ حصہ جس کی منتقلی اس اتفاقی تعامل کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی ہے، اس کے لئے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی، عہدِ صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داستان آپ سن چکے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی، صحابۂ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

متابعات اور شواهد

اسی کے ساتھ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے۔ اصطلاح حدیث میں روایت کے اس طریق عمل کا نام متابعت تھا اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق وتوثیق کے لئے شاگرد اپنے استاذ کے رفیقوں اور ہمعصروں سے بھی جو روایت کرتا ہے ان کا نام اصطلاحاً متابعات وشواہد ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا محدثین میں توابع وشواہد کے جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا رہا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سات سو طریقوں سے مروی ہے یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی سندیں سات سو ہیں اور یہ عدد بھی ایک خاص نقطہ نظر سے ہے ورنہ اس حدیث کے طرق دراصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا، محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے جس کا قصہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیگا۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم میں امام مسلم کا نقطہ نظر زیادہ تر اسی عمل پر مرکوز رہا ہے۔ خیر یہ تو بعد کو ہوا لیکن عہدِ صحابہ میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے اس طریقہ کے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ

غیر متواتر حدیثوں کا بھی جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے نیلاؤ تتان میں ایک ایک حدیث کے راوی آٹھ آٹھ دس دس صحابی ہیں۔ مشہور محدث امام ترمذی نے اپنی کتاب میں جہاں اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کی ہیں، اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کو بیان کر کے آخر میں بتاتے ہیں کہ کن کن صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ اور یہ تو واقعہ کے عینی شاہدوں یا ہمعصروں کی تعداد ہے۔ بعد کو صحابہ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوتا چلا گیا ان کا تو شمار کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہمارے پاس بحمداللہ ایسی ایک نہیں متعدد کتابیں موجود ہیں جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آج دنیا میں کون ہے جو گزرے ہوئے واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی وثوق و اعتماد کے ان آہنی ذرائع کو پیش کر سکتا ہے؟ باسورتھ اسمتھ حدیث کی اسی تاریخی وثاقت کو دیکھ کر یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے کہ کوئی شخص یہاں (سیرت نبویؐ) کے متعلق نہ خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے۔" (لائف آف محمدؐ از باسورتھ اسمتھ ص۱۰) لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی، ایک اہم نقطہ بحث کا ابھی باقی ہے، قبل اس کے کہ میں ادھر توجہ کروں، ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے چلوں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حدیث کی ابتدائی نوعیت کسی علم کی نہیں تھی، متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے آنحضرت سے کچھ سنا یا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یا تو بضرورت انھوں نے کبھی اس کا اظہار کر دیا یا بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ جیسے گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنی ریٹائرڈ زندگی میں نوجوانوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے عہد جوانی کے قصے دل بہلانے اور گرمیٔ بزم کیلئے بیان کرتے ہیں، یوں ہی العیاذ باللہ حدیث کی ابتدا ہوئی بعد کو پھر بتدریج لوگوں نے اس کو ایک علم بنا لیا!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور سیرت طیبہ کو جو تعلق قرآن اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی بنیاد پر مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی زندگی سے تھا، آپ اس کا حال سن چکے۔ کیا اس کے بعد کوئی ایک سکنڈ کے لئے بھی سوچ سکتا ہے کہ خدانخواستہ کسی زمانہ میں بھی آپ کے اقوال و اعمال خصوصاً عہد صحابہ میں اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے جیسا کہ اس شیطانی وسوسہ کا اقتضا ہے؟ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کے ذمہ دار تھے کہ قرآن کی تعمیلی شکل اور اس کے تشریحی مطالب کو خود اپنی زندگی کے

نمونوں سے مسلمانوں کو بتائیں اور مسلمان بھی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں کہ ان کو اپنی زندگی کا جزبنائیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں۔ ایسی صورت میں دیوانوں کے سوا اس قسم کے اوہام میں اور کون مبتلا ہوسکتا ہے؟ ماسوا اس کے خود عہد نبوت میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں، قرآن اور سنن وسیرت کے سیکھنے سکھانے کے لئے ایک باضابطہ تعلیم گاہ صُفّہ کے نام سے قائم تھی، جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک ہوتی تھی۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام ابوھریرہ، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم عہد صحابہؓ میں انجام دیتے تھے، مسلمان ہو ہو کر باہر سے لوگ آتے تھے اور حسب ضرورت اس مدرسہ میں قیام کرکے اپنے گھر جاتے تھے۔ خود قرآن میں اس کا حکم بھی دیا گیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (توبہ)

پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر آبادی میں سے ایک گروہ نکل آئے، تاکہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور واپس جاکر اپنے لوگوں کو ڈرائے ہوسکتا ہے کہ لوگ اس کے بعد پارسائی اختیار کریں۔

اس مدرسہ میں انہیں کن کن باتوں کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی؟ حدیثوں میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ فردہ بن ملیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے اور بعد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مراد زبید، مذحج کے گورنر بناکر بھیجے گئے، ان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے:

جَاءَ مِنَ الْيَمَنِ وَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَفَرَائِضَ الْإِسْلَامِ وَشَرَائِعَهُ۔ (ابن سعد)

یمن سے آئے اور قرآن اور اسلام کے فرائض وقوانین کی تعلیم حاصل کی۔

اور یہ تو ان لوگوں کی تعلیم کا طریقہ تھا جو خود مدینہ چلے آتے تھے۔ لیکن جو نہیں آسکتے تھے، ان کیلئے آستانۂ نبوت سے باضابطہ معلمین بھیجے جاتے تھے، اسی سلسلے میں بئر معونہ اور رجیع کے معلموں کا مشہور واقعہ ہے جن میں ان بیچارے معلموں کو دھوکہ دے کر شہید کردیا گیا تھا۔ ان کے سوا حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ منجملہ اور اغراض کے تعلیمی غرض سے بھی یمن بھیجے گئے تھے۔ حضرت معاذؓ کو جو حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی قَوْمِیْ اَدْعُوْھُمْ اِلَی اللّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَاَعْرِضُ عَلَیْھِمْ شَرَائِعَ الْاِسْلَامِ۔ (مستدرک)

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف اس لئے بھیجا کہ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بلاؤں اور ان پر اسلامی قوانین پیش کروں۔

الغرض قرآن کے ساتھ ساتھ شرائع اسلام یعنی قرآن کے احکام کی تعمیلی شکل جو صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کر کے بتایا کرتے تھے، عہد نبوت ہی میں ان دونوں کی حیثیت مستقل علم کی ہو چکی تھی۔ حدیث کا ذخیرہ جس میں تعلیم و تعلّم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں ابھارا ہے۔ آج کل کی لیڈرانہ تقریروں میں تو اس کے تحت داغ اور امیر کی شاعری اور شکسپیئر اور کالی داس کے ڈراموں تک کی تعلیم حاصل کرنے کو داخل کر دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ زیادہ تر ان سے مراد قرآن اور سنت ہی کی تعلیم تھی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ ان تمام مرکزی شہروں میں جہاں جہاں اسلام کی حکومت پہنچ چکی تھی اور حضرات صحابہ کرامؓ کی مختلف جماعتیں وہاں جا کر توطن پذیر ہو گئی تھیں جن میں خود مدینہ منورہ، مکہ معظمہ یمن، یمامہ، بحرین، دمشق، کوفہ، بصرہ، مصر کو خاص اہمیت حاصل ہے، جلیل القدر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہروں کے جوامع میں قرآن کے ساتھ ساتھ روایت حدیث کے باضابطہ حلقے قائم کر دیئے تھے، مدینہ منورہ میں مردوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمات اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں، اسی طرح دمشق میں حضرت ابو درداءؓ، کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ بصرہ میں عمران بن حصینؓ، ازیں ہر مرکزی شہر میں ان اغراض سے تعلیمی حلقے جاری ہو چکے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا ذوق روایت تو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جمعہ کے دن بھی چونکہ مسجد میں عام مسلمانوں کا بڑا مجمع جمع ہو جاتا تھا، اس مجمع کو غنیمت خیال کر کے تقریباً ہر جمعہ میں قبل اس کے کہ امام خطبہ کیلئے منبر پر آئے، آپ کا یہ عام قاعدہ تھا جیسا کہ حاکم کی مستدرک میں روایت ہے کہ

كَانَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ يَقُوْمُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلٰی جَانِبِ الْمِنْبَرِ ثُمَّ يَقْبِضُ عَلٰی رُمَّانَةِ الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ قَالَ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ

جمعہ کے دن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر کے ایک کنارے کھڑے ہو جاتے پھر منبر کا گوشہ تھام کر فرماتے فرمایا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے، فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے،

وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَاِذَا سَمِعَ بَابَ الْمَقْصُوْرَۃِ بِخُرُوْجِ الْاِمَامِ جَلَسَ۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، فرمایا الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے "پھر جب انہیں محسوس ہوتا کہ مقصورہ[1] کے دروازے سے امام نکل رہا ہے، بیٹھ جاتے۔

ابن سعد کی ایک تابعی سے روایت ہے کہ

دَخَلَ مَسْجِدَ حِمْصَ فَاِذَا بِحَلْقَۃٍ فِیْھِمْ رَجُلٌ جَمِیْلٌ وَضَّاحُ الثَّنَایَا وَفِی الْقَوْمِ مَنْ ھُوَ اَسَنُّ مِنْہُ وَھُمْ یُقْبِلُوْنَ عَلَیْہِ یَسْتَمِعُوْنَ کَلَامَہٗ فَسَاَلْتُہٗ مَنْ اَنْتَ فَقَالَ اَنَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ۔ (ابن سعد)

وہ (شام کے مشہور شہر) حمص میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت آدمی جن کے دانت الگ الگ تھے لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجمع میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اس حسین آدمی سے عمر میں بڑے ہیں اور اس پر جھکے ہوئے اس کی باتیں سن رہے ہیں، میں نے پوچھا تم کون ہو؟ بولے میں معاذ بن جبل ہوں۔

بصرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب کا بیان ہے:

اَتَیْتُ الْبَصْرَۃَ فَدَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَاِذَا اَنَا بِشَیْخٍ اَبْیَضِ الرَّاْسِ وَاللِّحْیَۃِ مُسْتَنِدًا اِلٰی اُسْطُوَانَۃٍ فِیْ حَلْقَۃٍ یُحَدِّثُھُمْ۔ (ابن سعد)

میں بصرہ پہنچا اور مسجد میں داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے آدمی جن کے سر اور داڑھی کے بال سپید تھے مسجد کے ستون سے پیٹھ لگا کر ایک حلقہ میں بیٹھے ہوئے حدیثیں بیان کر رہے ہیں۔

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ

کَانَ لِجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ حَلْقَۃٌ فِی الْمَسْجِدِ النَّبَوِیِّ یُؤْخَذُ عَنْہُ الْعِلْمُ۔ (اصابہ جلد ا ص۲۱۳)

مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک حلقۂ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

اور یہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اکابر اصحاب میں ہیں۔ اس کے بعد پھر کون کہہ سکتا ہے کہ "فن حدیث" کی حیثیت عہد نبوت یا عہد صحابہ میں باضابطہ علم کی نہیں بلکہ افواہی قصوں کی سی تھی۔

---

[1] خلفاء پر جب اچانک حملے ہونے لگے تو مسجد میں ایک کمرہ خاص بنا دیا جاتا تھا جس میں خلیفہ سنتیں وغیرہ پڑھتے اور اس سے باہر ہو کر منبر پر آتے، اسی کو مقصورہ کہتے تھے۔

حدیث کی کتابی تدوین

بہرحال یہاں تک تو فن حدیث کے وثوق و اعتماد کے صرف دو ذریعوں پر بحث ہوئی یعنی ایک تعامل دوسری روایت۔ لیکن آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے اور دنیا کے اس کاغذی دور میں عموماً گدگدی اسی کی اٹھتی ہے دل ہی دل میں لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی لیکن کتابی شکل میں آخر تاریخ کا یہ حصہ کب آیا۔ گویا اسی زمانہ کو تدوین حدیث کا آغاز قرار دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ گزشتہ بالا ساز و سامانوں کے ہوتے ہوئے شاید اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، بلکہ کتابت کے متعلق جو عربی مذاق تھا اس کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اور بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ فقہ و حدیث کے مشہور امام اوزاعی تو فرمایا کرتے تھے:

كَانَ هٰذَا الْعِلْمُ شَيْئًا شَرِيْفًا اِذَا كَانَ مِنْ اَفْوَاهِ الرِّجَالِ يَتَلَاقَوْنَهٗ وَيَتَذَاكَرُوْنَهٗ فَلَمَّا صَارَ فِي الْكُتُبِ ذَهَبَ نُوْرُهٗ وَصَارَ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ۔

(جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۹۸)

حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا جب لوگوں کے منہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں اسی کا مذاکرہ کرتے رہتے تھے، لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہو گئیں اس کا نور اور اس کی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہنچ گیا جو اس کے اہل نہیں۔

اور اسی لئے تاریخ حدیث کے بیان کرنے والوں نے حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب سے ہوا اس کی طرف بہت کم توجہ کی، لیکن آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو نہیں جانتے ہیں ان مسکینوں کو تو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس حدیث کا کیا اعتبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سو برس بعد مدون ہوئی، اچھے پڑھے لکھے لوگ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بیچارے امام بخاری اور مسلم کے سن وفات کو پیش کر دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک سب سے پہلے حدیثوں کو جس نے قلمبند کیا وہ یہی حضرات تھے۔ اور یہ تو خیر جاہلوں کی باتیں ہیں، لیکن بعض محدثین کے بیانات سے عموماً ارباب واقفیت بھی اس مغالطہ

میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلے جس نے حدیث مدون کی وہ ابن شہاب زہری ہیں، جن کا زمانہ پہلی صدی کے اختتام کا ہے۔ گویا یہ لوگ ایک سو برس پیچھے ہٹ کر کتابت حدیث کی تاریخ کو لے جاتے ہیں اس زمانے کے مطالبوں سے پریشان ہو کر بعض بزرگوں نے جب زیادہ کد و کاوش کنج وکاؤ سے کام لیا تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ زیادہ تو نہیں لیکن حدیثوں کا تھوڑا بہت حصہ عہد صحابہ بلکہ عہد نبوت میں بھی قید تحریر میں آگیا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ ان لوگوں کو اپنی تائید میں یہ مغالطہ مل جاتا ہے کہ عہد نبوت وصحابہ میں تحریری ساز و سامان ہی کہاں تھا، تھوڑا بہت جو تھا، اسی کی حیثیت کے مطابق کچھ چیزیں قید تحریر میں آگئی ہوں گی۔ کتابت و تحریر کے سامانوں کی اس زمانہ میں عرب کے اندر کیا حالت تھی، یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ شروع میں بھی اسکی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور اس وقت اگر تفصیل سے کام لیتا ہوں تو بات بہت طول ہو جائیگی، اس کے لئے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن کم از کم جو قرآن پڑھتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ عرب جو قرآن کا ماحول ہے اس کے متعلق تحریری سامانوں کے اس افلاس کا کس طرح یقین کر سکتا ہے۔ بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن (پڑھی جانے والی چیز) ہو، فاتحہ کے بعد جس کی پہلی سورت کی پہلی آیت کا دوسرا لفظ کتاب ہو، اور مسلسل کتاب زبر، اسفار، قراطیس، لوح کا ذکر تقریباً ہر بڑی سورت میں بار بار آتا ہو، پہلی آیت جو پیغمبر پر نازل ہوئی، اس میں پڑھنے لکھنے، قلم تک کا ذکر موجود ہو، نشانی (مداد) دوات، سفرہ، کاتبین، سجل کا ذکر جس کتاب میں پایا جاتا ہو، کون خیال کر سکتا ہے کہ یہ کتاب ایسے لوگوں میں اتری جو نوشت و خواند سے ایسے عاری تھے جیسے جنگل کے بھیل اور گونڈ ہیں۔ سر دست صرف اسی ایک قرآن کے اندرونی اشارہ پر اکتفا کر کے میں اب اپنے دعوی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ علی تواتر اور روایت ان دو ذریعوں کے سوا حدیث کی کوئی معمولی مقدار نہیں بلکہ اس وقت ہمارے پاس اس تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے، اس کا غالب ترین حصہ (کم از کم نمبر اول کی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے) خود اس کے عینی شاہدوں کے زمانہ میں زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں سے قید تحریر میں آچکا تھا اور اس کے بعد اس دعوے پر یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ ان واقعات کا ایک بڑا حصہ جس طرح تواتر کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل

ہوتا چلا آرہا ہے اور روایت کے متابعاتی وشواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجودہ شکل میں آیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قید تحریر میں آکر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور ابتک باقی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے کہ ابتداء میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھ لیا ہو، لیکن بعد کو یہ کتابی ذخیرے ضائع ہو گئے اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دارومدار رہ گیا ہو اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلمبند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعًا واقعات کے خلاف بلکہ جس طرح گلستاں جب سے سعدی نے لکھی اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہو گئی ہو اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اُسے دوبارہ قید تحریر میں لایا ہو، جیسا کہ تورات وغیرہ کے متعلق ایک دفعہ نہیں بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو چار چار سو سال کے لئے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہو گیا اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش کی گئی، احادیث کے اس کتابی ذخیرہ پر بحمد اللہ یہ حادثہ کبھی نہیں گزرا۔

بہرحال یہ تو میرا دعویٰ ہے، اس دعوے کے ثبوت کے جو ذرائع میرے پاس ہیں، اب انہیں پیش کرتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ اور باتیں بیان کی جائیں۔ پہلے یہ سن لینا چاہئے کہ اس وقت امت کے ہاتھ میں حدیثوں کا جو معتبر اور قابلِ اعتماد ذخیرہ موجود ہے اس کی مقدار اور ان حدیثوں کی تعداد کیا ہے؟ یوں تو عام طور سے جہاں حدیث کے حافظوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو نامعتبر یا ردشدہ حدیثوں کے سوا جو قابلِ اعتماد حصہ محفوظ تھا اس کی تعداد سات لاکھ کے اوپر تھی، اسی طرح امام ابوزرعہ جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے۔ امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انہیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح اور ایک لاکھ صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں، لیکن ان

بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں کیا اُس کا مقصود بھی وہی ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چونکہ ناواقف ہیں اس لئے انہیں حیرت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انہوں نے اپنی کتاب میں سب کو درج کیوں نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے ابتداء سے متابعات و شواہد کی کثرت کا طریقہ مروج ہو گیا تھا یعنی ایک ایک حدیث کو جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا محدثین ان تمام طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی یہ اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے بجائے ایک کے طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے۔ مثلاً انما الاعمال بالنیات کی حدیث جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، واقعہ کے لحاظ سے ایک حدیث ہے لیکن محدثین چونکہ سات سو طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں اس لئے بجائے ایک کے صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے، اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ حدیثوں کے ان عجیب و غریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے، دوسرے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتدا میں حدیث جس کے لفظی و لغوی معنی بات کے ہیں۔ اس کا اطلاق محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظاتِ طیبہ پر کیا جاتا تھا، مگر پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آپؐ کے افعال و تقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا اسی طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور فیصلوں، بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بھی لوگوں نے حدیث کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے تدریجاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی تعداد ہے، صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں:

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْمُتَقَدِّمِيْنَ كَانُوْا يُطْلِقُوْنَ اسْمَ	متقدمین کی بڑی جماعت عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق،
الْحَدِيْثِ عَلٰى مَا يَشْمَلُ اٰثَارَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ	ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی جس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین
وَتَابِعِيْهِمْ وَفَتَاوٰهُمْ وَيَعُدُّوْنَ الْحَدِيْثَ الْمَرْوِيَّ	کے آثار و فتاویٰ سب ہی داخل ہیں، نیز ایک ہی حدیث جو دو

بِاَسْنَادٍ بَیْنَ حَدِیْثَیْنِ۔ (ص ۹۳) سندوں سے مروی ہوتی اُسے وہ حدیث قرار دیتے تھے۔

اور یہی مراد ہے ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اِنَّ الْمُرَادَ بِھٰذَا الْعَدَدِ الطُّرُقُ لَا الْمُتُوْنُ (تلقیح ص ۱۸۷) یعنی ان اعداد سے مقصد حدیثوں کے متن کی مقدار نہیں ہے بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔

یہ حدیث کے ان بڑے بڑے اعداد کا حال ہے لیکن واقعی وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کہاں لاکھ، دو لاکھ، چار لاکھ کی باتیں تھیں اور اب سنئے کہ امام بخاری کی صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد لے دے کے یہ مشکل دو ہزار چھ سو دو ہے اور امام مسلم کی حدیثوں کی تعداد کل چار ہزار ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلم میں بخاری کے سوا چار ہزار حدیثیں ہیں بلکہ زیادہ تر دونوں کی روایتیں مشترک ہیں، اور یہ تو ان دو بڑی کتابوں کی حدیثوں کا حال ہے، مؤطا امام مالک جسے بعض لوگ صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں اس کی کل حدیثوں کی تعداد صرف چھ سو ستانوے ہے۔ بہرحال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ، مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں ان کی تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہے اور یہ رطب و یابس کے مجموعہ کی تعداد ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر کے ابن جوزی نے نہیں، جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے، بلکہ حاکم جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں، ان کا بیان ہے کہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اب حاکم کی اس رپورٹ کو اپنے سامنے رکھئے اور اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان خطوط اور معاہدوں، امان ناموں، جاگیر و قطائع کے فرامین کے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے اور حدیث کی جو تعریف ہے ان پر وہ بھی صادق آتی ہے حدیث کے اس کتابی ذخیرہ کے سوا عہد نبوت و قرون صحابہ میں حدیث کا کتنا سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا؟ دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی لیکن کیا کیا جائے، واقعہ یہی ہے کہ دس ہزار نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت اور عہد صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخر آپ جوڑ لیجئے۔ محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی یادداشت کے لئے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع میں ان کے اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمریؓ جن کو طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ نے عمرو عیار کے نام سے بہت مشہور کر دیا ہے، ان کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں:

تَحَدَّثْتُ عِنْدَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ بِحَدِیْثٍ فَاَنْکَرَهٗ فَقُلْتُ اِنِّیْ قَدْ سَمِعْتُهٗ مِنْكَ فَقَالَ اِنْ کُنْتَ سَمِعْتَهٗ مِنِّیْ فَهُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدِیْ فَاَخَذَ بِیَدِیْ اِلٰی بَیْتِهٖ فَاَرَانَا کُتُبًا کَثِیْرَةً مِّنْ حَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ ذٰلِكَ الْحَدِیْثَ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُكَ اِنْ کُنْتُ حَدَّثْتُكَ بِهٖ فَهُوَ مَکْتُوْبٌ عِنْدِیْ۔

(جامع)

میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ انہوں نے اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے، بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرہ میں لے گئے۔ مجھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں، اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں نے اگر کوئی حدیث تم سے بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اس روایت کو درج کیا ہے، اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابو ہریرہؓ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں ان کے پاس موجود تھا۔ جب یہ معلوم ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اس کے بعد اگر کہا جائے کہ پانچ ہزار سے اوپر حدیثیں اس وقت لکھی ہوئی تھیں تو کیا اس روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ؟ اور صرف ایک نسخہ نہیں، دارمی جو حدیث کی مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ ان کی حدیثوں کا تیار کر کے خود ان کو پڑھ کر سنایا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ بَشِيْرِ بْنِ نَهِيْكٍ قَالَ كُنْتُ اَكْتُبُ مَا اَسْمَعُ مِنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ فَلَمَّا اَرَدْتُ اَنْ اُفَارِقَهُ اَتَيْتُهُ بِكِتَابِهِ فَقَرَأْتُهُ عَلَيْهِ وَ قُلْتُ لَهُ هٰذَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ

حضرت بشیر بن نہیک سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیثیں میں سنا کرتا تھا، انہیں لکھ لیا کرتا تھا۔ جب میرا ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا تو ان کی حدیثوں کو ان کے سامنے پڑھ گیا اور آخر میں کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو آپ سے میں سنی ہیں، بولے، ہاں۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ ہیں جو یمن کے اُمراء میں سے تھے، ایک زمانے تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانے میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی حدیثوں کے یہ نسخے تیار ہو چکے تھے۔ اور ان کا تو پتہ چلا ہے ورنہ ابوہریرہ رضؓ جن کے شاگردوں کی تعداد امام بخاری نے آٹھ سو کے قریب بتائی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنوں نے اس کام کو کیا ہوگا۔ خود حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے لئے جب نسخہ تیار کیا تھا تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے شاگرد ایسا نہ کرتے۔ اور اس سے بھی میں اور آگے بڑھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک یہ بیان درج ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَكْثَرَ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّيْ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنیوالا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (یعنی انکی حدیثوں کی تعداد مجھ سے بھی زیادہ ہے)

جس کے معنی یہ ہوئے کہ عبداللہ بن عمرو کی مرویات کی تعداد خود حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتی اعتراف کی بنیاد پر ان کی حدیثوں سے زیادہ تھی۔ جب ان کی حدیثیں پانچہزار سے زائد ہیں تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کی تعداد پانچہزار تین سو چوہتر سے یقیناً زائد ہونی چاہئے۔ بخاری کے صریح الفاظ کا یہ تقاضا ہے۔ اب سنئے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کا کیا حال ہے۔ بخاری کی اسی حدیث میں ابوہریرہ رضؓ ہی کا یہ بیان درج ہے کہ وہ لکھا کرتے

تھے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعہ کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہوں نے اسے جمع کیا تھا یا وفات کے بعد لیکن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جن کی حدیثوں کی تعداد حضرت ابوہریرہؓ ہی کے بیان کے مطابق ان کی حدیثوں سے زیادہ اور کثیر ہے۔ ان کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ خود براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ آپ کی حدیثیں لکھا کرتے تھے، ان کا اپنا بیان ہے جس کا حافظ ابن عبدالبر، ابن سعد بلکہ ابوداؤد وغیرہ سب نے ذکر کیا ہے، میں حافظ ابن عبدالبر کی روایت درج کرتا ہوں، خود حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں:

قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَکْتُبُ کُلَّ مَا اَسْمَعُ مِنْکَ؟ قَالَ نَعَمْ. قُلْتُ فِی الرِّضَاءِ وَالْغَضَبِ؟ قَالَ نَعَمْ فَاِنِّیْ لَا اَقُوْلُ فِیْ ذٰلِکَ کُلِّہٖ اِلَّا حَقًّا۔	میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا "وہ سب کچھ" جو آپ سے سنتا ہوں، لکھ لیا کروں؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ خوشی اور غصہ دونوں حالتوں کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں، آپؐ نے فرمایا ہاں، کیونکہ میں ان سب حالات میں حق کے سوا کچھ نہیں بولتا۔

اس روایت میں "اکتب کل ما اسمع" وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں" قابل غور ہے، جس کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات خواہ رضا یا رغبت کے حال کی ہو، لکھ لیا کرتے تھے۔ محدثین میں ان کی یہ کتاب "صحیفۂ صادقہ" کے نام سے مشہور ہے اور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ خود بھی اپنی اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ مجھے اس وقت حوالہ یاد نہیں ہے لیکن خیال آتا ہے کہ کسی کتاب میں میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز کیا ہوا تھا۔ واللہ عالم بالصواب

ابھی مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن صرف اسی حد تک میں ٹھہر جاؤں تو گزشتہ بالا وثائق کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اول درجہ کی صحیح روایتوں کی جو تعداد حاکم نے بیان کی ہے، یعنی انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار ہے بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

اَلْاَحَادِیْثُ الَّتِیْ فِی الدَّرَجَۃِ الْاُوْلٰی لَا تَبْلُغُ عَشَرَۃَ اٰلَافٍ (توجیہ النظر ص۹۳)	اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی۔

جس کا یہ مطلب ہوا کہ دس ہزار سے کم ہی ہیں۔ اور معلوم ہو چکا کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو مجموعہ جمع ہوا، اس کی روایتوں کو پانچہزار تین سو چوہتر سے تو یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے اور ایسے موقع پر یہیں اس کا بھی خیال کرنا چاہیئے کہ عام محاوروں میں "اکثر" کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے محض ریاضیاتی زیادتی مراد نہیں ہوتی۔ یعنی صرف دو تین عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہو سکتی بلکہ اکثریت معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتی ہے۔ گویا حاکم نے صحیح حدیثوں کی جو تعداد بیان کی ہے قریب قریب یہ باور کرنا چاہیئے کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اتنی مقدار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی قلمبند کر چکے تھے اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جو حال تھا اس کے حساب سے ان کے لئے یہ کام دشوار بھی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی جب شام و مصر میں ان کو عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی کتابیں ملیں تو ان سے منتخب کر کے انہوں نے ایک بڑا دفتر تیار کیا تھا اور اس کا نام انہوں نے صحیفۂ یرموکیہ رکھا تھا۔ کسی موقعہ پر ان کی اس کتاب کا ذکر آئے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔

بہر حال پھر بھی ابھی تک میرے نتیجہ کی حیثیت فی الجملہ قیاسی نتیجہ کی ہے۔ لیکن اب آگے سنئے۔ جن صحابیوں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، اس فہرست میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایکہزار دو سو چھیاسی ہے۔ دارمی میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ اپنی اولاد سے جنکی ایک بڑی تعداد تھی فرمایا کرتے:

يَا بَنِيَّ قَيِّدُوْا هٰذَا الْعِلْمَ۔ — میرے بچو! اس علم حدیث کو قلمبند کر لیا کرو۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا۔ صرف اسی قدر نہیں، دارمی ہی میں منقول ہے کہ

رَأَيْتُ اَبَانَ يَكْتُبُ عِنْدَ اَنَسٍ رض — میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایت مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے:

كُنَّا اِذَا اَكْثَرْنَا عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ — ہم جب حضرت انس رض سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس

تَعَالٰی عَنْهُ فَاَخْرَجَ اِلَیْنَا مُحَالَاعِنْدَ فَقَالَ هٰذِهٖ سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَکَتَبْتُهَا وَعَرَضْتُهَا عَلَیْهِ (مستدرک حاکم)

سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔

تھوڑے رد و بدل سے یہ الفاظ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں. اگر یہ روایت صحیح ہے اور حضرت انس کے متعلق کتابتِ حدیث کی جن دلچسپیوں کا تذکرہ دارمی سے میں نے پہلے نقل کیا ان کو دیکھتے ہوئے صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو عہدِ نبوت میں علاوہ صادقہ کے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کے قلمبند ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے. بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر کے انہوں نے ان روایتوں کی توثیق بھی کرائی تھی. کیا اب بھی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، عہد صحابہ میں بلکہ عہد نبوت ہی میں ان کے قلمبند ہو جانے پر کوئی شک کر سکتا ہے؟

مگر یہ داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے. حضرت انسؓ ہی کی طرح دوسرے مکثر صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی روایتوں کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے تلقیح میں لکھا ہے، ایک ہزار پانچسو چھ ہے۔ یہ تو پہلے گزر چکا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسجد نبویؐ میں درس کا ایک حلقہ تھا۔ اب ان کی روایتوں کے بھی قلمبند ہونے کا حال سنئے۔ صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے کہ حج کے متعلق انہوں نے ایک کتاب جمع کی تھی. نیز حافظ ابن حجر نے تہذیب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے ایک شاگرد وہب بن منبہ تھے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہمام (جن کے صحیفہ ہمام کا ذکر گزر چکا) کے بھائی تھے اور انہوں نے اپنے استاذ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کو قلمبند کیا تھا۔ اسی طرح سلمان بن قیس یشکری نے بھی حضرت جابرؓ کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور بڑے بڑے بزرگوں مثلاً شعبی اور سفیان وغیرہ نے قیس سے اس کو سنا بھی تھا. خود استاد نے کتاب لکھی تھی تو شاگرد اس کی اتباع کیوں نہ کرتے.

عورتوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثوں کی ہے.

محدثین نے ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار دس بتائی ہے۔ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق تو ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنی حدیث جمع کی تھی، اگرچہ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ فرائض جن کے مسائل کا حل بغیر حسابی قاعدوں کے ناممکن ہے، با آسانی حل فرماتی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے پیچیدہ مسائل پوچھوا بھیجتے تھے۔ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدہ کے ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو شعر برجستہ سنا دیتی تھیں، حدیث کی اشاعت کا شوق ان کا بے نظیر ہے مگر خود اپنی حدیثوں کے جمع کرنے کا حال معلوم نہیں ہوا لیکن ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے عروہ بن زبیر جن کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ شروع میں انہوں نے بھی اپنے علم کو ایک کتاب میں قلمبند کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کا ہونا ضرور ہے کہ سب سے بڑا سرمایہ ان کا یہی تھا لیکن افسوس ہے کہ واقعہ حرہ میں جبکہ مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا تھا، غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے قصداً اپنی کتاب ضائع کر دی، بعد کو پچھتاتے تھے اور کہتے تھے:

لَوَدِدْتُ اَنِّی کُنْتُ فَدَیْتُهَا بِاَهْلِیْ وَمَالِیْ۔ اچھا ہوتا کہ میں اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اسی کتاب پر فدا کر دیتا۔ (تہذیب جلد ۷، صفحہ ۱۸۳)

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عہد صحابہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مجموعہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ اگرچہ عروہ کی راہ سے یہ مجموعہ ضائع ہو گیا لیکن حضرت عائشہ کی دوسری مشہور خاتون شاگرد جن کا نام عمرہ بنت عبد الرحمٰن ہے، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہ کے باب میں ان کا شمار عروہ کے برابر برابر تھا، ان ہی عمرہ بنت عبد الرحمٰن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مشہور فرمان کی بنیاد پر جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے جمع کر لیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوبکر کے نام حضرت کا فرمان آیا تھا:

اَنْ یَّکْتُبَ لَهٗ مِنَ الْعِلْمِ مِنْ عِنْدِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ۔ عمرہ بنت عبد الرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لئے لکھ کر تیار کریں۔

اور قاسم بن محمد کے پاس بھی وہی حضرت صدیقہ ہی کی حدیثوں کا زیادہ سرمایہ تھا کہ آپ کے والد

محمد بن ابی بکر ان کے ایام طفلی ہی میں مشہور فتنہ میں شہید ہو چکے تھے۔ اس لئے یتیم بھتیجے کی پرورش حضرت عائشہ رضی نے فرمائی تھی، ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، سب کچھ ان ہی سے سیکھا تھا۔ بہرحال حضرت عائشہ کی حدیثیں ان ہی دونوں کے ذریعہ سے ابوبکر بن محمد نے جمع کیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ نے ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ گو حضرت عروہ کی کتاب جل گئی لیکن عمرہ بنت عبدالرحمن کی راہ سے حضرت عائشہ کا جو علم قلمبند ہوا تھا وہ باقی رہا۔ مکثرین (یعنی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار سے اوپر ہے) ان میں اکثروں کے حدیثی سرمایہ کے متعلق عہد نبوت و صحابہ ہی میں قلمبند ہونے کا حال معلوم ہو چکا۔ اب صرف دو تین اور رہ جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ نمبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایتوں کا ہے یعنی دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں ان کی طرف منسوب ہیں پہلے تو خود ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رافع سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے لکھا کرتے تھے۔ ان کے مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل نقل کی ہے۔

اَنَّ نَفَرًا قَدْ مَرَّ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ بِكُتُبٍ مِنْ كُتُبِهٖ فَجَعَلَ يَقْرَأُ عَلَيْهِمْ

حضرت ابن عباس رض کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلمبند ہو چکا تھا لفظ "کتب" جو جمع کا صیغہ ہے، قابل غور ہے۔ ایک کتاب نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چند کتابیں تیار کی تھیں اور ان کے متعلق تو صحیح مسلم تک میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علی رض کے فیصلوں اور فتوی کا ایک بڑا حصہ لکھا ہوا ان کے پاس لایا گیا۔ ابن سعد ہی میں روایت یہ بھی ہے کہ ابن عباس کی وفات کے بعد جو علم انہوں نے چھوڑا وہ ایک بار شتر تھا۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس "بار شتر" کے کتابی مجموعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیثوں کا ذخیرہ نہ تھا۔ خود ابن عباس کے ممتاز ترین رشید شاگرد سعید بن جبیر سے دارمی طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ بیان منقول ہے کہ وہ ان کی حدیثوں کو لکھا کرتے تھے، کاغذ ختم ہو جاتا تو جو چیز ملتی حتی کہ ہاتھ پر ہی لکھ لیتے، بعد کو گھر جا کر کاغذ پر اتارتے۔ سعید بن جبیر ان کے علم کے سب سے بڑے راوی ہیں، جب وہ لکھا کرتے تھے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ابن عباس رض کی شاید ہی کوئی حدیث لکھنے سے رہ گئی ہو۔

ان کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کا نمبر ہے۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایکہزار چھ سو تیس ہے۔ ابتک مجھے کوئی تحریری ثبوت اس کا تو نہیں ملا کہ خود ابن عمر نے اپنی حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن دارمی ہی کی یہ روایت ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ سلمان بن موسیٰ کا یہ بیان ہے کہ انہوں نے

اَنَّہٗ رَأٰی نَافِعًا مَوْلٰی ابْنِ عُمَرَ عَلٰی عِلْمِہٖ وَیَکْتُبُ بَیْنَ یَدَیْہِ۔ ابن عمرؓ کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔

نافع کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عمرؓ کے چہیتے آزاد کردہ غلام تھے تیس سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ امام مالک کی ان ہی روایتوں کو جو نافع، ابن عمر کے ذریعہ سے وہ روایت کرتے ہیں بعض لوگ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) قرار دیتے ہیں۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ابن عمر کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعہ سے یقیناً قلم بند ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ابن عباس و ابن عمر کے زمانہ تک بنی امیہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس میں تصنیف و تالیف بلکہ ترجمہ تک کا چرچا مسلمانوں میں عام طور پر ہو چکا تھا ان بزرگوں کی حدیثوں کا نہ قلمبند ہونا البتہ محل تعجب ہے پھر جب دلائل موجود ہیں تو انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اور یہ حال تو ان بزرگوں کی حدیثوں کا ہے جو مکثرین کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے سوا دوسرے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا شمار اس طبقہ میں نہیں ہے، ان میں ایک نہیں سے، متعدد صحابیوں کے متعلق ثابت ہے کہ صرف ایک دو حدیث نہیں بلکہ ان کے بھی اچھے خاصے مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے جن میں بعض تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے تھے، مثلاً وائل بن حجر صحابی جو حضر موت کے شاہزادوں میں تھے مدینہ آکر مسلمان ہوئے اور کچھ دن قیام فرما کر جب واپس جانے لگے تو طبرانی صغیر میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا جس میں نماز روزہ شراب سود وغیرہ کے احکام تھے۔ دوسری طویل چیز جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی لکھوائی ہوئی ہے اس کا تو ذکر بخاری تک میں ہے، آپ میں سے کون نہیں جانتا کہ حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا اور اچھا خاصا طویل ہے۔ ابو شاہ یمنی صحابی کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ خطبہ ان کو خود لکھوا کر دیا۔ بخاری کی روایت سے شائد شبہ ہو سکتا ہے کہ پورے خطبہ کی نقل کا شائد حکم نہیں دیا گیا تھا۔ امام اوزاعی جو سیر کے امام ہیں ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوایا گیا تھا؟ بولے ہاں۔

هٰذِهِ الْخُطْبَةُ الَّتِي سَمِعَهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (عینی ص۵۷۲)	یعنی وہی خطبہ جسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا (لکھوا کر دیا گیا)

دارمی ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجے تھے۔ دارمی کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى اَهْلِ الْيَمَنِ اَنْ لَّا يَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ وَلَا طَلَاقَ قَبْلَ مِلَاكٍ وَلَا عِتَاقَ حَتّٰى يَبْتَاعَ (ص۲۹۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا کہ قرآن پاک کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے اور قبل مالک ہونے کے (یعنی نکاح کے) طلاق نہیں ہے اور جب تک غلام خریدا نہ جائے اس کے آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اس کتاب میں جب اتنے تفصیلی مسائل تھے تو اسلام کے عام فرائض و واجبات کا ہونا تو زیادہ اغلب ہے اسی طرح کنز العمال میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائی گئی جس میں فرائض، صدقات، دیات (یعنی قتل کے خون بہا کا قانون) وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں، اسی طرح حافظ ابن حجر نے تہذیب میں حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے کہ

رَوٰى عَنْ اَبِيْهِ نُسْخَةً كَبِيْرَةً (تہذیب ج۴ ص۱۹۸)	اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھیں۔ خصوصاً کبیرہ کے لفظ سے اس کی تائید ہوتی ہے ورنہ چند حدیثوں کے متعلق ظاہر ہے کہ نسخہ کبیرہ کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا۔ ترمذی نے کتاب الاحکام میں ایک روایت "باب الیمین مع الشاہد" کے سلسلہ میں جو درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خزرج کے مشہور سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس کے حوالے سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے اس لئے کہ قبل الاسلام

کتاب یعنی لکھنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔ بخاری کی ایک روایت سے جو کتاب باب الصبر علی القتال میں مروی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صحابی رضؓ بھی اپنی حدیث لکھا کرتے۔ اسی طرح بخاری، ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفہ کا ذکر پایا جاتا ہے جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں "شریعت" کے بعض اہم مسائل تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیان فرمائے تھے۔ تلاش اور تتبع سے اگر اور کام لیا جائے تو اس قسم کے کتابی ذخیروں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے لیکن بالفعل اپنے بیان کے پہلے حصہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں اور مقالہ کے دوسرے مباحث کا تذکرہ انشاءاللہ تعالیٰ دوسرے حصہ میں کیا جائے گا جس میں سب سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ جب حدیث کے کتابی ذخیروں کا اتنا بڑا سرمایہ عہد نبوت و صحابہ میں جمع ہو چکا تھا اور حدیث کی عام کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا۔ پھر باوجود اس کے لوگوں کو یہ مغالطہ کس بنیاد پر ہوا کہ سب سے پہلے حدیث کی کتابی تدوین ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے اختتام میں عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ کے فرمان سے شروع کی۔

عہدِ صحابہؓ کی مدت

عہد نبوت اور عہد صحابہ میں ان گراں مایہ معلومات کی حفاظت جن اعتمادی ذرائع کے سپرد رہی، ان کا تفصیلی ذکر آپ سن چکے۔ اب سوال صرف وقفہ کی اس محدود مدت تک رہ جاتا ہے جو صحاح ستہ وغیرہ حدیث کی عام کتابوں کے مصنفین سے پہلے اور عہد صحابہ کے بعد بیچ میں گزری ہے، کیونکہ صحاح کی ان کتابوں کے بعد ظاہر ہے کہ ان روایتوں کی حیثیت جن پر حدیث کی یہ کتابیں مشتمل ہیں، متواتر روایتوں کی ہو گئی ہے، مثلاً صحیح بخاری کے متعلق یہ بات کہ محمد بن اسمٰعیل ہی کی تصنیف کی ہوئی ہے، یہ ایک ایسا متواتر واقعہ ہے جس میں شک کی گنجائش قطعاً اسی طرح نہیں جیسے گلستان بوستان نامی کتابوں کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شیخ سعدی کی کتابیں نہیں ہیں، صحاح بلکہ حدیث کی عام متداول کتابوں کا

یہی حال ہے، گویا سمجھنا چاہئے کہ پچھلے ہزار سال بلکہ ہزار سے بھی زیادہ مدت سے حدیث کی کتابوں کی روایتیں ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بلند تر ہو چکی ہیں، لے دے کر جیسا کہ میں نے عرض کیا، گفتگو کی گنجائش جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ وقفہ کی اسی محدود مدت میں پیدا ہو سکتی ہے جو عہد صحابہ کے بعد اور حدیث کی کتابوں کے ان مصنفین کے عہد سے پہلے درمیان میں گزری ہے اور اب اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا سوال اس سلسلے میں یہی ہو سکتا ہے کہ خود اس وقفہ کی مدت کتنی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یوں تو ایک سے زائد صحابیوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ سو سال بلکہ سو سال کے بعد بھی دنیا میں موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور آپؐ کے خلوت وجلوت کے مشاہدات وتجربات کے بیان کرنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سو سال تک پیغمبرؐ کے بعد زندہ رہے بلکہ بعض تو ایک سو پر بھی ایک سال کا، بعض دو سال کا بعض تین سال کا اضافہ کرتے ہیں۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد پیغمبر کی زندگی کے نمونوں کی قولاً وفعلاً کامل ایک صدی تک حضرت انسؓ امت میں اشاعت کرتے رہے ہیں، اسی طرح یہ بھی مانا گیا ہے کہ ہرماس بن زیاد باہلی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو بارہ سال تک اور محمود بن ربیع صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سو نو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہے ہیں، چوتھے صحابی اس سلسلے کے حضرت ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کا نام عامر بن واثلہ ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ آخری صحابی ہیں جن پر صحابہ کا دور ختم ہو گیا۔ حافظ ابن حجر نے جریر بن حازم جو ایک معتبر اور ثقہ راوی ہیں ان کی یہ چشم دید شہادت نقل کی ہے:

كُنْتُ بِمَكَّةَ سَنَةَ عَشْرٍ وَمِائَةٍ فَرَأَيْتُ جَنَازَةً فَسَأَلْتُ عَنْهَا فَقِيلَ أَبُو الطُّفَيْلِ (ج ۷ ص ۱۱۰)	میں ۱۱۰ھ ہجری میں مکہ معظمہ میں تھا، اسی زمانہ میں میں نے ایک جنازہ دیکھا، دریافت کیا یہ کن کا جنازہ ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ ابو الطفیل (صحابی) کا جنازہ ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک سو بیس سال تک حضرت

ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل میں صحابیت کی یادگار موجود تھی۔

پھر جیسے سیاسی مرکزیت کی وجہ سے کسی بادشاہ کی حکمرانی کا سارا زمانہ اسی بادشاہ کا دور اور عہد سمجھا جاتا ہے، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی بھی جس زمانہ تک پائے گئے ہیں اس زمانہ کو ہم عہد صحابہ نہ قرار دیں، آخر مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیاسی نہ سہی دینی مرکزیت کا جو مقام صحابہ کو حاصل تھا وہ سلاطین کی سیاسی مرکزیت سے کیا کم تھا۔ سو یہاں تو حال کی صورت یہ ہے کہ ان ہی معدودے چند اصحاب کی حد تک یہ مسئلہ محدود نہیں ہے بلکہ آپ کے سامنے میں ایک تختہ پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کتنے صحابی کتنے سالوں تک مسلمانوں کو اپنے ان معلومات اور مشاہدات سے مستفید کرتے رہے ہیں جن کا براہ راست علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ان بزرگوں کو میسر آیا تھا۔

تختہ ان صحابیوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسّی سے سو سال تک زندہ رہے ہیں

نمبر شمار	نام صحابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہنے کی مدت	جائے قیام ووفات
۱	سائب بن یزید رضہ	۸۴ سال تک	مدینہ منورہ
۲	مرثد بن عبداللہ رضہ	۷۹ "	"
۳	عبداللہ بن بسر المازنی رضہ	۸۶ "	حمص (شام)
۴	سہل بن سعد الساعدی رضہ	۸۱ "	مدینہ منورہ
۵	عبداللہ بن ابی اوفی رضہ	۷۷ "	کوفہ
۶	عتبہ بن عبد السلمی رضہ	۷۷ "	"
۷	مقدام بن معدیکرب رضہ	۷۷ "	شام
۸	عبد بن الحارث بن جزء رضہ	۷۷ "	مصر
۹	ابوامامۃ الباہلی رضہ	۸۶ "	حمص (شام)
۱۰	عبداللہ بن جعفر رضہ	۸۰ "	مدینہ منورہ

نمبر شمار	نام صحابی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہنے کی مدت	جائے قیام و وفات
۱۱	عمرو بن حریث رضہ	۷۵ سال تک	کوفہ
۱۲	ابو واقد اللیثی رضہ	۷۵ "	"
۱۳	عمرو بن سلمہ الجرمی رضہ	۷۵ "	بصرہ (شام)
۱۴	واثلۃ بن الاسقع رضہ	۷۵ "	مصر
۱۵	عقبۃ بن الندر رضہ	۷۴ "	بصرہ
۱۶	عبداللہ ابن حارث رضہ	۷۸ "	بادیۃ العرب
۱۷	زید بن الخالد الجہنی رضہ	۶۸ "	حمص
۱۸	عرباض بن ساریہ رضہ	۶۵ "	شام
۱۹	ابو ثعلبۃ الخشنی رضہ	۶۵ "	مدینہ منورہ
۲۰	ابو سعید الخدری رضہ	۶۴ "	بادیہ
۲۱	سلمۃ بن الاکوع رضہ	۶۴ "	مدینہ منورہ
۲۲	رافع بن خدیج رضہ	۶۴ "	"
۲۳	محمد بن حاطب رضہ	۶۴ "	"
۲۴	ابو جحیفہ رضہ	۶۴ "	"
۲۵	سعید بن خالد الجہنی رضہ	۶۳ "	"
۲۶	اسمار بنت ابی بکر رضہ	۶۳ "	"
۲۷	عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضہ	۶۳ "	"
۲۸	عوف بن مالک الاشجعی رضہ	۶۳ "	"
۲۹	برار بن عازب رضہ	۶۲ "	"
۳۰	جابر بن عبداللہ انصاری رضہ	۶۸ "	"

اس فہرست میں چاہا جائے تو ابھی اور اضافہ کیا جا سکتا ہے، تاہم ان تیس ناموں کے ساتھ ان چار بزرگوں کو بھی ملا لیجیے، جن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ سو سال سے بھی برس دو برس زیادہ عہدِ نبوت کے بعد زندہ رہے اور اس کے بعد سوچیے کہ اتنی بڑی تعداد صحابیوں کی کیا استثنائی مثال کہلانے کی کسی طرح بھی مستحق ہو سکتی ہے؟ کیا اتنی بڑی تعداد کے متعلق یہ دعویٰ کہ بچے کھچے اکے دکے آدمی آخر میں رہ گئے تھے، کسی حیثیت سے بھی درست ہو سکتا ہے؟

بہرحال تدوینِ حدیث کی تاریخ میں یہ واقعہ کافی اہمیت رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک سو سال تک کوئی زمانہ ایسا نہیں تھا جو آنحضرتؐ کے صحابیوں سے خالی رہا ہو بلکہ اس طویل عرصے میں ہر اس مقام پر جسے گونہ مرکزیت حاصل تھی اس طبقہ کے کافی لوگ وہاں پائے گئے ہیں، نبوت کے متعلق جس کے تجربات و مشاہدات، براہ راست معلومات و ذاتی مسموعات کا نام حدیث ہے، یہی نہیں بلکہ حدیث کا بڑا ذخیرہ جن صحابیوں سے منقول ہے اصطلاحاً جنہیں مکثرین کہتے ہیں یعنی ہزار یا ہزار سے اوپر جن کی روایتیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں، گزشتہ صفحات میں ان کی فہرست پیش کر چکا ہوں آپ پھر اس فہرست کا بھی جائزہ لیجیے اور جو تختہ اب میں نے پیش کیا ہے اس سے مقابلہ کیجیے، آپ پائیں گے کہ مکثرین صحابہ میں سے بجز تین کے سب کے سب اس پیش کردہ تختے میں بھی موجود ہیں۔

باقی مکثرین میں سے تین حضرات یعنی ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس میں شک نہیں کہ نسبتاً ان بزرگوں کی عمریں دوسرے مکثرین کے مقابلہ میں تھوڑی ہیں لیکن یہ کمی بھی کتنی ہے؟

جب ہمیں معلوم ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد ابن عباسؓ اٹھتر سال تک حضرت ابوہریرہؓ ایک سال کم ستر سال تک، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دو سال کم ستر سال تک حدیث کی نشر و اشاعت کے کام انجام دیتی رہی ہیں تو عام صحابہ کے لحاظ سے نہ سہی، مگر حدیثوں کی روایت کا جن صحابیوں سے تعلق ہے ان کے متعلق تو بہرحال یہی ماننا پڑے گا کہ پیغمبر کے بعد کامل سو سال پر ان کا عہد مشتمل ہے۔

بہرکیف اگر یہ مان بھی لیا جائے جیسا کہ عوام سمجھتے ہیں کہ ان صحابیوں کے مشاہدات اور روایات

صحاح ستہ اور عہد صحابہ کو سب سے پہلے صحاح کے مصنفین ہی نے قلمبند کیا ہے اور یہ کہ وقفہ کی اس درمیانی مدت میں ان روایتوں کا دارومدار صرف یاد کرنے والوں کے حافظہ اور قوت یادداشت ہی پر رہا جب بھی زیادہ سے زیادہ مدت اس درمیانی وقفہ کی بمشکل سوا اور ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی رہتی ہے کیونکہ صحاح ستہ کے مصنفین کے عہد میں اور مذکورہ بالا صحابیوں کے عہد میں آپ کو اس سے زیادہ فاصلہ نظر نہ آئے گا۔ حاشیہ میں ان مصنفین کے سنہ ولادت[1] اور سنہ وفات کو درج کردیتا ہوں۔ ان سنین کو اور صحابہ کے متعلق جو تختہ میں نے پیش کیا ہے دونوں کو سامنے رکھ کر فاصلہ کی مدت کا اوسط نکالئے، جس نتیجہ تک میں پہنچا ہوں انشاء اللہ آپ بھی اس نتیجے تک پہنچیں گے۔

محدثین کے حافظہ میں شک اور پھر اس شک کی بنا پر انکارِ حدیث حیرت انگیز ہے

شروع میں اگرچہ بہ تفصیل یہ دکھایا جاچکا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقہ معلومات جنہیں آج حدیث کی کتابوں میں ہم پاتے ہیں، ان کے متعلق یہ خیال سرے سے بے بنیاد ہے کہ صحاح کی موجودہ کتابوں سے پہلے بجائے سفینوں کے صرف سینوں سے سینوں ہی تک منتقل ہوتے رہے، لیکن تھوڑی دیر کے لئے اسی عامیانہ خیال کو تسلیم بھی کرلیا جائے جب بھی میں نہیں سمجھتا کہ ان معلومات کو قطعی طور پر مسترد کردینے کے لئے اتنی وجہ کیسے کافی ہوسکتی ہے کہ سو ڈیڑھ سو سال تک بجائے کاغذ کے بے جان اوراق کے زندہ انسانوں کے زندہ حافظوں نے ان کی حفاظت کی، آخر آدمی کا حافظہ ہے۔ شمع کے ان پروانوں کا حافظہ تو نہیں ہے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ جلنے کے بعد فوراً ان پروانوں کے حافظہ سے جلنے کا خیال

---

[1] صحیح بخاری کے مؤلف امام محمد بن اسماعیل بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ، امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ، ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ، ابن ماجہ کی ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ، ترمذی کی وفات ۲۷۹ھ میں ہوئی ہے۔ ان میں سب سے پچھلے نسائی ہیں، ان کی ولادت ۲۱۵ھ اور وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی ہے۔

نکل جاتا ہے اسی لئے جلنے کے بعد بار بار پھر اسی شمع پر گرتے ہیں۔ شاعروں نے شمع و پروانے کے اسی تعلق کا نام عشق رکھ چھوڑا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہم اسی انسان کی بینائی، شنوائی اور دوسری قوتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان ہی معلومات پر آدمی کی زندگی اور زندگی کے پورے کاروبار کا دار و مدار ہے۔ دیکھنے میں آنکھوں پر سننے میں کانوں پر، سونگھنے میں ناکوں پر، چکھنے میں زبانوں پر ہم بھروسہ کرتے ہیں پھر ایک حافظہ اور یادداشت ہی کی قوت بدگمانیوں کا شکار کیوں بنی ہوئی ہے، کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ کچھ دن کے لئے کسی چیز کا حافظہ کی قوت کے سپرد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ان ساری ضمانتوں سے وہ محروم ہو گئی جن کی ضرورت اعتماد اور بھروسہ کے لئے قدرتاً انسانی فطرت محسوس کرتی ہے۔

میں خود اپنی ذمہ داری پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن ہندیات کے مشہور محقق ابوریحان بیرونی کے حوالہ سے یہ بات جو نقل کی گئی ہے[1] کہ جس زمانے میں بیرونی ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ دن پیشتر ایک کشمیری پنڈت نے پہلے پہل ویدوں کو کتابی قالب عطا کیا تھا، ورنہ اس سے پہلے ویدوں کا سارا دار و مدار ان پنڈتوں کے حافظہ پر تھا جو نسلاً بعد نسل اس کے اشلوکوں کو زبانی یاد کرتے چلے آ رہے تھے۔

اس کشمیری پنڈت سے پہلے زبانی یادداشت کی شکل میں وید کتنے زمانے تک رہی؟ اس سوال کے جواب میں خود وید کے ماننے والے ہندوؤں کی جس طویل قطار کو پیش کرتے ہیں ہم لاہوتی یافت کا انہیں ہندسی رمز قرار دیتے ہوئے اور ان کے سمجھنے سے معذوری کا اقرار کرتے ہوئے اسی کو اگر صحیح مان لیں جو آجکل کے مغربی مستشرقین کہتے ہیں یعنی ویدوں کے ظہور کے ابتدائی زمانے کو متعین کرتے ہوئے یورپ کے ارباب تحقیق کا جو یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے گیارہ بارہ سو سال آگے وید کی تاریخ نہیں بڑھتی، جب بھی البیرونی کی مذکورہ بالا شہادت کا مطلب کیا ہوا؟ ہم جانتے ہیں کہ البیرونی گیارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں یعنی ۱۰۳۰ء میں ہندوستان پہنچا تھا، اس لحاظ سے

---

[1] مشہور فاضل عبداللہ بن یوسف علی صاحب نے ہندوستانی اکاڈیمی میں جو لیکچر ہندوستان کے ازمنۂ وسطی کی معاشرت اور اقتصادی حالت پر دیا تھا اور اس لیکچر کے سننے والوں میں ہندو مذہب کے بھی مستند پنڈت اور مؤرخین بھی موجود تھے اسی تقریر میں انہوں نے البیرونی کے حوالہ سے مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے۔ دیکھو لیکچر مذکور ص۱۰

مستشرقین کی تحقیق کی بنیاد پر گویا یہ ماننا پڑے گا کہ کم از کم دو ہزار سال تک ہندو دھرم کی یہ بنیادی کتاب کاغذ اور سیاہی، قلم و دوات کی منت کشی سے آزاد رہی ہے۔

وید اور اس کی تعلیمات کے متعلق دوسرے جہات اور پہلوؤں سے چاہے کچھ بھی کہا جائے لیکن اس کے ماننے والوں میں محض اس بنیاد پر میں تو نہیں سمجھتا کہ شک اندازی کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے کہ ایسی کتاب کا کیا اعتبار جس کے مضامین اور اشلوکوں کو دو ہزار برس تک برہمنوں اور پنڈتوں نے صرف یاد کر کے محفوظ رکھا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک اس کو یوں ہی منتقل کرتے چلے آئے ہوں، اوروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا لیکن مسلمانوں کی طرف سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس اعتراض کی جرأت وہ کیسے کر سکتے ہیں، ان کے پاس قرآن کے حفظ کا رواج اب تک زندہ ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مکتوبہ قرآن کے الفاظ پر حالانکہ زیر و زبر، پیش، جزم اور تشدید الغرض ہر قسم کے حرکات لگا دیئے گئے ہیں لیکن باوجود اس کے یہ بالکل ممکن ہے کہ مکتوبہ اور لکھے ہوئے قرآن کا پڑھنے والا بعض الفاظ کے پڑھنے اور سمجھنے میں غلطی کر جائے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ قرآن کے حفاظ عموماً اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی آسمانی کتاب کو زبانی یاد کرنے کا دستور جس مذہبی ذوق کی وجہ سے مسلمانوں میں اب تک باقی ہے دوسری قوموں میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ کرسٹن نے اپنی تاریخ "ایران در عہد ساسانیاں" میں لکھا ہے کہ ہرمز چہارم ایرانی بادشاہ کے سامنے ایک عیسائی پیش ہوا جسے عہد قدیم و جدید کے سارے نوشتے زبانی یاد تھے۔ بادشاہ نے بائبل کے اس حافظ کو انعام سے بھی سرفراز کیا تھا دیکھو کتاب مذکور (ص۵۴۵) ہم یہ نہیں جانتے کہ یہود و نصاریٰ میں اپنی کتابوں کی زبانی یاد کرنے کا یہ رواج اب بھی باقی ہے یا نہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے بعض برہمنوں کے نام کے آخر میں دوبے چوبے چتر ویدی یا تر ویدی وغیرہ کے جو لاحقات پائے جاتے ہیں یہ علامتیں ہیں اس بات کی کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد نے کسی زمانے میں وید کو زبانی یاد کیا تھا کہتے ہیں کہ چاروں وید کو جو زبانی یاد کرتے تھے وہ چتر ویدی یا چوبے اور تین کے یاد کرنے والے تر ویدی، دو کے یاد کرنے والے دوبے کہلاتے تھے۔ گویا یہ اسی قسم کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اپنے نام کے اول یا آخر میں قاضی یا مفتی کا لفظ اب بھی اسی وجہ سے بڑھاتے ہیں کہ وہ

خود تو قاضی یا مفتی نہیں ہوتے لیکن ان کے خاندان میں قاضی یا مفتی کسی زمانہ میں گزرے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظہ کی تاریخی توثیق

حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کے تیس پاروں کے حفظ کا رواج خود حدیث کی تاریخ کی ان شہادتوں کی زندہ توثیق ہے جو ہماری کتابوں میں حدیث کے راویوں کی قوت یادداشت اور حافظے کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ آخر آپ ہی بتائیے کہ تیس تیس پاروں کے بیشمار زندہ حفاظ کو دیکھ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حافظے کے اس امتحانی نتیجہ کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے جسے امام بخاریؒ نے کتاب الکنیٰ میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مروان بن الحکم جو دمشق کی مروانی حکومت کا سب سے پہلا حکمران ہے اسی کے سکریٹری ابوالزعزہ کا بیان ہے کہ ایک دن مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو طلب کیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کثرت سے جو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اسی سلسلے میں مروان کچھ شکوک و شبہات میں مبتلا تھا، بہرحال بلانے پر حضرت ابوہریرہؓ تشریف لائے۔ مروان نے ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے سکریٹری ابوالزعزہ کو حکم دے رکھا تھا کہ پردہ کے پیچھے دوات قلم اور کاغذ لیکر بیٹھ جائے۔ میں ابوہریرہؓ سے حدیثیں پوچھوں گا جو حدیثیں وہ بیان کریں ان کو تم لکھتے چلے جانا یہی کیا گیا۔ مروان چھیڑ چھیڑ کر حضرت ابوہریرہؓ سے حدیثیں پوچھنے لگا۔ ابوہریرہؓ بیان کرتے جاتے تھے اور پس پردہ ابوالزعزہ لکھتا چلا جاتا تھا ان حدیثوں کی تعداد کیا تھی، خود ابوالزعزہ کا بیان ہے:

فجعل یسأل وانا اکتب حدیثا کثیرا — پس مروان ابوہریرہؓ سے پوچھنے لگا اور میں نے بہت سی حدیثیں لکھ لیں۔

بہرحال "حدیثا کثیرا" (بہت سی حدیثوں) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کی کافی معقول تعداد تھی جو اس وقت قلمبند ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ بیچارے کو قطعاً مروان کی اس پوشیدہ کارروائی کی خبر نہ تھی، مجلس برخواست ہو گئی حضرتؓ چلے گئے اور مروان نے حدیثوں کے اس مجموعہ کو بحفاظت تمام رکھوا دیا، سال بھر کے بعد ابوالزعزہ کہتے ہیں کہ مروان نے ابوہریرہؓ کو دوبارہ طلب کیا اور مجھے حکم دیا کہ مکتوبہ حدیثوں کے اسی مجموعہ کو لیکر پردہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں ان ساری ہی حدیثوں کو پھر پوچھوں گا، دیکھو اب کی دفعہ وہ کیا بیان کرتے ہیں تم ان مکتوبہ حدیثوں سے ان کو ملاتے جانا۔ حکومت کی طرف سے ابوہریرہؓ کا گویا یہ امتحان تھا۔

امتحان لیا گیا نتیجہ کیا نکلا؟ ابوالزعزعہ ہی کی زبانی سنئے۔ ابوالزعزعہ کے بیان کے بجنسہ الفاظ ہی کو میں نقل کر دیتا ہوں جو یہ ہیں:

فَتَرَكَهُ سَنَةً ثُمَّ اَرْسَلَهُ اِلَيْهِ وَاَجْلَسَنِي وَرَاءَ السِّتْرِ فَجَعَلَ يَسْأَلُهُ وَاَنَا اَنْظُرُ فِي الْكِتَابِ فَمَا زَادَ وَلَا نَقَصَ۔ (کتاب الکنی بخاری ص۳۳)

پس مروان نے نوشتہ حدیثوں کے مجموعہ کو سال بھر تک رکھ چھوڑا، سال بھر کے بعد مجھے پھر پسِ پردہ بٹھا کر حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھنے لگا، اور میں کتاب میں دیکھتا جاتا تھا، پس ابوہریرہؓ نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کم کیا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی ان حدیثوں کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں بتایا جاسکتا کہ واقعی ان کی صحیح تعداد کیا تھی، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ چند قلیل روایتیں نہیں تھیں، کثیر روایتوں کا یہ مجموعہ تھا، لیکن قریب قریب اسی کے ابن شہاب زہری کے جس امتحانی واقعہ کا تذکرہ اسماء الرجال کی کتابوں میں کیا گیا ہے، یعنی اسی مروانی حکومت کے فرمانروا ہشام بن عبدالملک نے زہری کا جو امتحان لیا تھا اس میں تو تصریح کی گئی ہے کہ چار سو حدیثوں کا یہ مکتوبہ مجموعہ تھا۔ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جیسے مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں اور ان کی قوت یادداشت کو جانچنا چاہا تھا اسی طرح اپنے عہدِ حکومت میں ہشام نے بھی ابن شہاب زہری کا امتحان کرنا چاہا۔ اس نے امتحان لینے کی یہ ترکیب اختیار کی کہ ایک دن دربار میں زہری کسی ضرورت سے آئے ہوئے تھے، اس نے خواہش ظاہر کی شاہزادے یعنی اسکے لڑکے کیلئے کچھ حدیثیں لکھا دیجئے، زہری راضی ہو گئے کاتب بلایا گیا اور زہری نے جیسا کہ الذہبی نے لکھا ہے:

فَاَمْلَى عَلَيْهِ اَرْبَعَ مِائَةِ حَدِيْثٍ (تذکرہ ج۱ ص۱۰۲) زہری نے چار سو حدیثیں شاہزادے کے لئے لکھوا دیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مہینے کے بعد ہشام کے دربار میں پھر جب زہری پہنچے تو بڑے افسوس کے لہجہ میں ہشام نے کہا، اِنَّ ذٰلِكَ الْكِتَابَ ضَاعَ (یعنی وہ کتاب جسے آپ نے لکھوا کر شاہزادے کو دی تھی وہ گم ہو گئی) زہری نے کہا، تو یہ پریشانی کی کیا بات ہے، کاتب کو بلوائیے پھر لکھوا دیتا ہوں یہی ہشام کی غرض تھی، کاتب بلایا گیا وہیں بیٹھے بیٹھے زہری نے پھر ان ہی چار سو حدیثوں کو لکھا دیا۔ پہلا مسودہ درحقیقت

غائب نہیں ہوا تھا، یہ ہشام کی ایک ترکیب تھی۔ جب زہری دربار سے اٹھ کر باہر گئے تو ہشام نے پہلی کتاب سے دوسری دفعہ لکھائے ہوئے نوشتے سے مقابلہ کیا (معلوم ہوا کہ) ایک حرف بھی زہری نے نہ چھوڑا تھا۔ قَابَلَ بِالْكِتَابِ الْأَوَّلِ فَمَا غَادَرَ حَرْفًا وَاحِدًا (ص۔۔)

بلاشبہ زُہری کے حافظہ کا یہ کمال تھا اور جیسا کہ میں نے کہا، حفاظِ قرآن کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو اس امتحانی نتیجہ کے ان الفاظ پر یعنی فَمَا غَادَرَ حَرْفًا وَاحِدًا (جو کچھ پہلی کتاب میں زہری نے لکھوایا تھا اس کے ایک حرف کو بھی دوسری کتاب میں نہیں چھوڑا تھا) اس پر ممکن ہے لوگ تعجب کرتے مگر آج جس کا جی چاہے چار سو حدیثوں کے مجموعے سے بڑا مجموعہ یعنی پورے قرآن کو آپ کسی حافظ سے سن کر لکھتے جائیے اور اسی عمل کو دوبارہ کیجیے یعنی سن کر لکھیے، اس کے بعد قرآن کے ان دونوں نسخوں کا باہم مقابلہ کیجیے یقیناً آپ بھی فَمَا غَادَرَ حَرْفًا (نہ چھوڑا اس نے ایک لفظ بھی) کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے۔[1]

ابن راہویہ کی قوت یادداشت

امام بخاری کے استاد ابن راہویہ کے تذکرے میں حفظ اور یادداشت ہی کے سلسلے میں لوگ اس قصے کا ذکر کرتے ہیں کہ مشہور خراسانی امیر عبداللہ بن طاہر کے دربار میں ابن راہویہ کی ایک دوسرے عالم سے بعض مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، کسی کتاب کی عبارت کے متعلق دونوں میں اختلاف پیدا ہوا، اس پر ابن راہویہ نے امیر عبداللہ سے کہا کہ اپنے کتب خانہ سے فلاں کتاب منگوائیے، کتاب منگوائی گئی، ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس کے بعد لکھا ہے کہ امیر عبداللہ کو خطاب کر کے ابن راہویہ نے کہا کہ

---

[1] ان لوگوں کیلئے جو کہتے ہیں کہ صحاح کے مصنفین سے پہلے حدیثیں قلمبند نہیں ہوئی ہیں، اور جن شواہد اور دلائل سے ان کے اس بے بنیاد دعوے کی تردید کی گئی ہے انکا ذکر تو گزر ہی چکا لیکن ضمناً ان ہی دو واقعوں پر غور کیجیے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کے تین نسخوں کا پہلے ذکر کر چکا ہوں جو ان کی زندگی میں تیار ہو چکے تھے۔ مروان والے واقعے میں مانا کہ ان کی کل حدیثیں کے لکھنے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن "حدیث کثیر" مروان کے سکریٹری ابوالزعزعہ کو اس وقت بھی خود انہوں نے لکھوایا گویا صحابی کی لکھائی ہوئی حدیث کی ایک کتاب یہ بھی تھی جو مروان کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ تھی۔ اسی طرح گو زُہری صحابی نہیں ہیں لیکن براہ راست استفادہ کرنے والوں میں ہیں۔ ابن عمر، انس بن مالک، سہل بن سعد وغیرہ صحابیوں کے شاگرد ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نہیں بلکہ زہری کی چار سو حدیثوں کے یہ دو نسخے ہشام بن عبدالملک کے کتب خانہ میں تھے اور دونوں خود زہری کے لکھوائے ہوئے تھے اور اس قسم کے واقعات کیا ایک دو ہیں، لوگ پڑھتے نہیں یا غور نہیں کرتے ورنہ پہلی صدی ہجری میں اس قسم کی چھوٹی بڑی حدیث کی خدا جانے کتنی کتابوں کا پتہ چل سکتا ہے جس کا ذکر دوسرے واقعات کے ضمن میں اتفاقاً کر دیا گیا ہے۔

عُدَّ مِنَ الْكِتَابِ اِحْدٰى عَشْرَةَ وَرَقَةً — کتاب کے گیارہ ورق شمار کر کے پلٹیے اور گنیے، ساتویں سطر
ثُمَّ عُدَّ سَبْعَةَ اَسْطُرٍ (جلد ۲ صفحہ ۴۱۳) — میں وہی ملے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔

دیکھا گیا جو کچھ ابن راہویہ کہہ رہے تھے وہی بات کتاب میں نکلی۔ کہتے ہیں کہ امیر عبداللہ نے ابن راہویہ کو خطاب کر کے کہا کہ:

عَلِمْتُ اَنَّكَ قَدْ تَحْفَظُ الْمَسَائِلَ وَ — یہ چیز تو مجھے معلوم ہی تھی کہ مسائل آپ کو خوب یاد ہیں لیکن تمہاری
لٰكِنِّي اَعْجَبُ لِحِفْظِكَ هٰذِهِ الْمُشَاهَدَةَ — قوت یادداشت اور حفظ کے اس مشاہدے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن راہویہ کی قوت یادداشت اور چیزوں کے اتنے وضوح کے ساتھ ان کے دماغ میں محفوظ رہنا حیرت انگیز ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ ہر اسلامی شہر اور قصبہ میں قرآن کے ایسے حافظ آج بھی بآسانی آپ کو مل سکتے ہیں جو ٹھیک ابن راہویہ کی طرح آپ کو پارہ سورہ رکوع کے حوالے سے ہر اس آیت کا پتہ دے سکتے ہیں جو ان سے پوچھی جائے اور سچ تو یہ ہے کہ خود حفظ حدیث کے متعلق بھی ابن راہویہ کی مثال واحد مثال نہیں ہے۔

ابو زرعہ کی قوت یادداشت

حافظ ابو زرعہ الرازی جو حدیث و رجال کے مشہور ائمہ میں ہیں ابن ابی حاتم نے ان کا یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ابن وارہ جن کا اصلی نام محمد بن مسلم ہے اور فضل بن العباس جو فضلک الصائغ کے نام سے مشہور تھے دونوں حافظ ابو زرعہ کے پاس حاضر ہوئے، دونوں میں کسی مسئلہ پر بحث ہونے لگی، ابن وارہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک حدیث پیش کی، فضلک نے کہا کہ حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں، ابن وارہ نے پوچھا کہ پھر صحیح الفاظ اس حدیث کے کیا ہیں؟ فضلک کے نزدیک حدیث کے جو الفاظ تھے ان کو دہرا دیا۔ دونوں کی گفتگو ابو زرعہ خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے، آخر ابن وارہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے کہ آپ فرمائیے، واقعی حدیث کے الفاظ کیا ہیں؟ انھوں نے پھر بھی اعراض ہی سے کام لینا چاہا، لیکن جب اصرار ابن وارہ کا حد سے زیادہ بڑھ گیا تب ابو زرعہ نے کہا کہ ذرا میرے بھتیجے ابوالقاسم کو بلائیے، ابوالقاسم بلائے گئے، حافظ ابو زرعہ نے ان سے کہا کہ:

اُدْخُلْ بَيْتَ الْكُتُبِ فَدَعِ الْقِمَطْرَ الْأَوَّلَ وَالثَّانِيَ وَالثَّالِثَ وَعُدَّ سِتَّةَ عَشَرَ جُزْءًا وَ ائْتِنِي بِالْجُزْءِ السَّابِعَ عَشَرَ (تہذیب جلد، صفحہ ۳۳)

کتب خانہ جاؤ، پھر پہلے دوسرے تیسرے بستے کو چھوڑ کر اس کے بعد جو بستہ ہے اس سے کتاب نکالو گن کر سولہ جز کے بعد سترہواں حصہ جو کتاب کا ہے میرے پاس لاؤ۔

ابو القاسم گئے اور حسب ہدایت مطلوبہ جزء نکال لائے۔ لکھا ہے کہ حافظ ابو زرعہ نے اوراق الٹے اور حدیث جس صفحہ پر تھی اس کو نکال کر ابن وارہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ابن وارہ نے پڑھا اور اقرار کیا کہ غلطنا (یعنی واقعی میں ہی برسر غلطی تھا) اس واقعہ کے ساتھ حافظ ابو زرعہ کے اس دعوے کو پیش نظر رکھیے، جسے ابن حجر نے ابو جعفر التستری کے حوالہ سے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ وہ ان سے کہتے تھے:

اِنَّ فِي بَيْتِي مَا كَتَبْتُهُ مُنْذُ خَمْسِيْنَ سَنَةً وَلَمْ اُطَالِعْهُ مُنْذُ كَتَبْتُهُ وَاِنِّي لَاَعْلَمُ فِي اَيِّ كِتَابٍ هُوَ فِي اَيِّ وَرَقَةٍ هُوَ فِي اَيِّ صَفْحٍ هُوَ فِي اَيِّ سَطْرٍ هُوَ۔ (تہذیب جلد، صفحہ ۲۳)

پچاس سال ہوئے جب میں نے حدیثیں لکھی تھیں اور وہ میرے گھر میں رکھی ہوئی ہیں، لکھنے کے بعد اس پورے پچاس سال کے اندر ان حدیثوں کا میں نے پھر دوبارہ مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن جانتا ہوں کہ حدیث کس کتاب میں ہے اس کتاب کے کس ورق میں ہے کس صفحہ میں ہے کس سطر میں ہے۔

یہ بات کہ پچاس سال کے عرصہ میں دوبارہ یاد کی ہوئی اور لکھی ہوئی حدیثوں کے دہرانے اور دیکھنے کا موقعہ حافظ ابوزرعہ کو نہ ملا۔ اس پر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ ان حدیثوں کا یاد رہ جانا یقیناً قوت یادداشت اور حافظہ کی پختگی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے اور مثال کے بغیر واقعات کے ماننے میں ہچکچانے والی عقل شاید آسانی کے ساتھ حافظ ابوزرعہ کے اس دعوے کو مشکل ہی سے تسلیم کر سکتی تھی، اگر قرآن کے حفاظ میں ایسے افراد نہ پائے جاتے جنہوں نے یاد کرنے کے بعد پھر قرآن کو کبھی کھول کر نہیں دیکھا لیکن جس آیت کو جس وقت جی چاہے پوچھ سکتے ہیں اور اسی تفصیل کے ساتھ یعنی کس پارے کس سورہ کس رکوع کی یہ آیت ہے آپ کو وہ جواب دے سکتے ہیں، بلکہ ان میں بعض تو ایسے حافظ بھی دیکھے گئے ہیں کہ برسوں کے بعد تراویح سنانے کا موقعہ ان کو ملا ہے لیکن دن کے دور کئے بغیر انہوں نے پورا قرآن تراویح میں سنا دیا۔ اگرچہ عام طور پر اس قسم کے حفظ کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ورنہ عام قاعدہ حافظوں کا یہی ہے کہ کم از کم ایک دفعہ

دن کو دُور کرلینا یعنی جو کچھ رات کو سنانے والے ہیں اس کو ایک دفعہ دہرا لینا عام حالات میں ضروری ہے۔ پورے قابو یافتہ ہو کر قرآن سنانے کا عام قاعدہ یہی ہے۔

تحفظِ حدیث کی اہمیت پر حدیثی استدلال

بہرحال کم ہی سہی لیکن قرآن کے حفاظ میں اس قسم کے افراد جب پائے جاتے ہیں تو جس زمانے میں حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا عام دستور مسلمانوں میں مروج تھا اگر حدیث کے حافظوں میں ایسی مثالیں پائی جاتی تھیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کسی چیز کو یاد کر لینے کے بعد اس قسم کے تجربات میں اتنی ندرت نہیں باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ ان کے متعلق شبہ کیا جائے اور شک اور شبہ کی بیماری ہی کسی میں ہو تو خدا کا شکر ہے کہ قرآن کے حفظ کی زندہ مثالوں سے ان کے شکوک کا باسانی ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک جیسے اس وقت تک قرآن کو زبانی یاد کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے، زمانے تک قرآن کے ساتھ حدیثوں کو بھی زبانی یاد کرنے کا بھی دستور جاری رہا ہے اور پیغمبرؐ کی حدیثوں کے حفظ کا یہ ذوق خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پیدا کرایا ہوا تھا۔ صحاح کی مشہور حدیث کہ "خدا تر و تازہ رکھے اس شخص کو جو لوگوں سے ہماری حدیثوں کو سنتا ہے" اس کے بعد ارشاد ہے "فحفظھا" (پھر ان حدیثوں کو یاد کر لیتا ہے) یا جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو جو حاضر نہیں ہیں میری حدیث اور میری باتیں پہنچاتے چلے جائیں۔ اس میں بھی ہے کہ

فَاِنَّهٗ لَعَلَّهٗ اَنْ يُّبَلِّغَهٗ مَنْ هُوَ اَوْعٰى لَهٗ اَوْ مَنْ هُوَ اَحْفَظُ لَهٗ۔	کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہنچانے والا ایسے آدمی کو پہنچا دے جو اس سے زیادہ اس کا یاد رکھنے والا ہو، یا زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو

صحابہ کرامؓ بھی اپنے شاگردوں کو اور ان لوگوں کو جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنا کرتے تھے یہ کہا کرتے تھے:

اِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُحَدِّثُنَا فَنَحْفَظُ فَاحْفَظُوْا كَمَا كُنَّا نَحْفَظُ (جامع بیان العلم ص۶۴)	تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے، پس تم لوگ بھی اسی طرح حدیثوں کو زبانی یاد کیا کرو جیسے ہم یاد کیا کرتے تھے۔

تابعین کا طریق حفظ

امام مالک صحابہؓ سے استفادہ کرنے والے حضرات کے دستور کو بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ ان میں بعض لوگ حدیثوں کو لکھ کر یاد کرتے اور جب یاد ہو جاتی تھیں تو مٹا دیتے تھے (دیکھو جامع بیان العلم) اور یہ دستور زمانے تک جاری رہا۔ ابن سیرین کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا بھی قاعدہ تھا کہ حدیثوں کو لکھ لیتے

فَاِذَا حَفِظَهٗ مَحَاهٗ (طبقات ابن سعد) مگر جب یاد کر لیتے تو پھر اس کو مٹا دیتے۔

خالد الحذاء کے حالات میں بھی ہے وہ خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ بڑی حدیثوں کو میں پہلے لکھ لیتا ہوں۔

فَاِذَا حَفِظْتُهٗ مَحَوْتُهٗ (ابن سعد جلد قسم دوم) پھر جب ان کو یاد کر لیتا ہوں تو نوشتہ کو مٹا دیتا ہوں۔

ان میں بعض لوگوں سے تو صراحۃً اس قسم کے الفاظ منقول ہیں مثلاً ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث کا قول نقل کیا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ:

یَنْبَغِیْ لَنَا اَنْ نَّحْفَظَ حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَمَا نَحْفَظُ الْقُرْاٰنَ (تاریخ دمشق) ہم لوگوں کو چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اسی طرح یاد کریں جیسے ہم قرآن یاد کرتے ہیں۔

ذہبی نے مشہور حافظ حدیث ابن خزیمہ کے متعلق یہ الفاظ ابو علی نیشاپوری کے حوالے سے نقل کئے ہیں کہ

کَانَ ابْنُ خُزَیْمَۃَ یَحْفَظُ الْفِقْهِیَّاتِ مِنْ حَدِیْثِهٖ کَمَا یَحْفَظُ الْقَارِئُ السُّوْرَۃَ (تذکرۃ الحفاظ جلد) فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے تھے جیسے قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

ذہبی ہی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ اپنے دادا ابو اسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ

کُنْتُ اَحْفَظُ حَدِیْثَ اَبِیْ اِسْحَاقَ کَمَا اَحْفَظُ السُّوْرَۃَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (صفحہ ۱۹۹) ہم ابو اسحاق کی روایت کردہ حدیثوں کو اس طرح یاد کرتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں یاد کی جاتی ہیں۔

شہر بن حوشب کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ احمد عبد الحمید بن بہرام کے پاس شہر کی حدیثوں کا ذخیرہ تھا اور ان کو

کَانَ یَحْفَظُ کَاَنَّہٗ یَقْرَأُ سُوْرَۃَ الْقُرْاٰنِ ساری حدیثیں زبانی یاد تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

قرآن کی کوئی سورۃ پڑھ رہے ہوں۔ (تہذیب، صفحہ ۱۸۲ جلد ۴)

ابو داؤد الطیالسی جن کی مسند دائرۃ المعارف حیدرآباد میں طبع بھی ہو چکی ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اَسْرُدُ ثَلَاثِیْنَ اَلْفَ حَدِیْثٍ وَلَا فَخْرَ (ص ۱۸۳ ج ۴) (میں تیس ہزار حدیثیں فرفر سناتا ہوں اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے) اسی طرح مشہور تابعی قتادہ کے ترجمہ میں امام بخاری اور ابن سعد وغیرہ نے جو یہ قصہ نقل کیا ہے کہ سعید بن عروبہ سے قتادہ نے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورۂ بقرہ سناتا ہوں۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سُنا، ایک حرف کی بھی غلطی قتادہ نے نہ کی پھر مجھ کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ

لَاَنَا لِصَحِیْفَۃِ جَابِرٍ اَحْفَظُ مِنِّیْ لِسُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ (تاریخ کبیر بخاری صفحہ ۱۸۲ جلد ۴)

حضرت جابر بن عبداللہ کی نوشتہ حدیثوں کا مجموعہ جس کا نام صحیفہ تھا وہ سورۂ بقرہ سے بھی مجھے زیادہ یاد ہے۔

یہ جابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی صحابی ہیں جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ ان ہی جابر بن عبداللہ صحابی کی حدیثوں کا مجموعہ عہد صحابہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ قتادہ عہدِ صحابہ کے اسی مکتوبہ مجموعہ حدیث کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ قرآن کی سورۂ بقرہ سے بھی زیادہ مجھے وہ یاد ہے۔

قرآن کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا

بلکہ روایات سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حفظ کرنے والے بچوں کو شروع ہی سے جیسے قرآن کے حفظ میں لگا دیا جاتا ہے اسی طرح قرآن کے ساتھ حدیث بھی بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھی اور صحابہ ہی کے عہد میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ابن عباسؓ کے غلام عکرمہ جن کی تعلیم پر ابن عباسؓ نے خاص توجہ کی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ تابعین کے عہد میں چند ممتاز ائمہ میں ایک بہت بڑے امام کی حیثیت عکرمہ کی ہو گئی تھی۔ اپنی تعلیمی سرگزشت بیان کرتے ہوئے عکرمہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

کَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَضَعُ الْکَبْلَ فِیْ رِجْلِیْ عَلٰی تَعْلِیْمِ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ (تذکرہ صفحہ ۹۰)

ابن عباسؓ میرے پاؤں میں قرآن اور حدیثوں کی تعلیم دینے کے لئے بیڑی ڈال دیتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اپنے بچوں کو بعض لوگ بچپن ہی سے حدیث یاد

کرنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ ابن سیرین بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جن کے والد نے بچپن ہی سے ابوہریرہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ ابن سیرین کے ایک بھائی یحییٰ نامی بھی تھے، دونوں بچوں کی قوتِ یادداشت اور حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ابوہریرہؓ نے کیا تو یحییٰ میں زیادہ صلاحیت نظر آئی، کہتے ہیں کہ:

فَكَنَّاهُ اَبُوْهُرَيْرَةَ لِحِفْظِهٖ (ابن سعد ج ۱۵) — ابوہریرہؓ نے یحییٰ کی یادداشت دیکھ کر ان کی کنیت رکھی۔

جیسے قرآن کے حفظ میں سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں حفظ کا کام جتنا استوار اور مضبوط ہوتا ہے عمر ہونے کے بعد یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ:

طَلَبُ الْحَدِيْثِ فِي الصِّغَرِ كَالنَّقْشِ فِي الْحَجَرِ (جامع ص ۸۲ ج ۱) — بچپن میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنا ایسا ہے جیسے پتھر میں نقش کرنا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کے خلیفہ اور شاگرد رشید علقمہ خود اپنے متعلق فرماتے:

مَا حَفِظْتُ وَاَنَا شَابٌّ فَكَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ فِيْ قِرْطَاسٍ اَوْ وَرَقَةٍ (جامع ص ۸۲ ج ۱) — اپنے نوجوانی کے زمانہ میں جو چیزیں میں نے زبانی یاد کر لی تھیں ان کی حالت ایسی ہے کہ کاغذ یا ورق میں لکھے ہوئے گویا وہ میرے سامنے ہیں۔

اور صرف یاد کر لینا ہی کافی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یاد کرنے کے بعد بار بار ان ہی کی یاد کی ہوئی حدیثیں کو دہراتے رہنا یہ بھی ایسا مسئلہ تھا جس کی ہر استاذ اپنے شاگردوں کو تاکید کرتے ہوئے اصرار کرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے، فرمایا کرتے تھے:

اَكْثِرُوْا ذِكْرَ الْحَدِيْثِ فَاِنَّكُمْ اِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا يَدْرُسْ عِلْمُكُمْ (جامع جلد ۱ ص ۱۰۱) — حدیث کو بار بار دہراتے رہو اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارا علم فرسودہ ہو کر مٹ جائے گا۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے:

تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَاِنَّ حَيَاتَهٗ مُذَاكَرَتُهٗ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، صفحہ ۱۴۱) — بار بار حدیث کو دہراتے رہو کیونکہ اس کو زندہ رکھنے کی یہی شکل ہے۔

ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ — بار بار حدیث کو دہراتے رہو۔

حسن بصری اپنے شاگردوں کو فرماتے کہ یاد رکھو:

غَائِلَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ وَتَرْكُ الْمُذَاكَرَة (جامع ۱۱۲) — علم کی آفت اس کا بھول جانا ہے اور دہرانے کو چھوڑ دینا۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بھی اپنے تلامذہ سے کہتے:

إِنَّ إِحْيَاءَ الْحَدِيْثِ مُذَاكَرَتُهُ فَتَذَاكَرُوْا (جامع، صفحہ ۱۱۱) — حدیث کو زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بار بار دہرایا جائے پس چاہیئے کہ تم لوگ دہراتے رہو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ یاد کی ہوئی حدیثوں کو بار بار دہرانا یہ بھی حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے فرائض میں داخل تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ درس کے رفقار باہم مل جل کر یاد کی ہوئی حدیثوں کا اعادہ کریں ایک سے غلطی ہو تو دوسرا اس کی اصلاح کر دے۔ باہمی مذاکرے کے اس طریقہ کا صحابہ ہی کے زمانے میں رواج پڑ گیا تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ کا حلقہ درسِ حدیث جو مسجدِ نبوی میں قائم تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے عطا کہتے ہیں کہ

كُنَّا نَكُوْنُ عِنْدَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ فَيُحَدِّثُنَا فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِ تَذَاكَرْنَا حَدِيْثَهُ (ابن سعد، جلد ۵، صفحہ ۳۵۴) — ہم لوگ جابر بن عبداللہ کے پاس ہوتے یعنی ان سے حدیثیں سنتے پھر جب ان کے حلقہ سے باہر نکل آتے تو ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باہم مل کر ہم لوگ دہراتے۔

استاد کے پاس سے اٹھ جانے کے بعد باہم ایک دوسرے کے ساتھ حدیثوں کا جو مذاکرہ کرتے تھے اس مذاکرے کی نوعیت کیا ہوتی تھی۔ سعید بن جبیر سے کسی نے پوچھا کہ ابن عباسؓ سے جتنی باتیں روایت کرتے ہو کیا سب براہ راست ان سے پوچھ کر تم نے سیکھی ہیں؟ بولے کہ نہیں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کی مجلس میں حدیثیں بیان کی جاتیں، میں خاموش بیٹھا سنتا رہتا۔ جب لوگ حلقے سے اٹھ کر چلے جاتے اور يَتَحَدَّثُوْنَ فَأَحْفَظُ (ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۱۷۹) اور باہم ان ہی حدیثوں کا جب لوگ مذاکرہ کرتے تو میں ان حدیثوں کو یاد کر لیتا

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بار بار اپنی پڑھی ہوئی حدیثوں کو لوگ اتنا دہراتے تھے کہ دوسروں کو بھی وہ حدیثیں محض ان کے یاد کرنے اور دہرانے کی وجہ سے یاد ہو جاتی تھیں۔

"حفاظِ حدیث" کی تیاری میں احتیاطیں

اور صرف یہی نہیں بلکہ قرآن حفظ کرنے والوں کا آموختہ جیسے سنا جاتا ہے، صحابہ اور تابعین ہی کے عہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے یاد کرنے والوں کا بھی آموختہ لوگ سنتے تھے۔ عروہ بن زبیر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علم کے راوی ہیں، ان ہی کا حال ان کے صاحبزادے ہشام بن عروہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد مجھے اور میرے دوسرے بھائیوں عبداللہ، عثمان و اسمٰعیل وغیرہ کو حدیثیں پڑھا دیتے پھر ہم سے دوبارہ سنتے اور کہتے کہ

كَرِّرُوا عَلَيَّ وَكَانَ يَعْجَبُ مِنْ حِفْظِي (تاریخ کبیر بخاری ص۲۲) — جو کچھ تم نے پڑھا اور یاد کیا ہے وہ مجھے سناؤ اور وہ (یعنی ہشام کے والد عروہ) میری (یعنی ہشام کی) یادداشت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے

ابن عباس کے شاگرد سعید بن جبیر بھی کہتے تھے کہ ابن عباسؓ مجھ سے فرماتے:

اُنْظُرْ كَيْفَ تُحَدِّثُ عَنِّي فَإِنَّكَ قَدْ حَفِظْتَ عَنِّي حَدِيثًا كَثِيرًا (ابن سعد ص۱۷۹ ج۶) — مجھے بتاؤ کہ مجھ سے تم حدیثیں کس طریقہ سے روایت کرو گے۔ کیونکہ تم نے بہت ذخیرہ حدیثوں کا مجھ سے سن کر یاد کیا ہے۔

سعید ہی کا بیان ہے کہ شروع میں ابن عباسؓ نے مجھ سے آموختہ سننا چاہا تو میں گھبرایا، میری اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ

أَوَلَيْسَ مِنْ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ أَنْ تُحَدِّثَ وَأَنَا شَاهِدٌ فَإِنْ أَصَبْتَ فَذَاكَ وَإِنْ أَخْطَأْتَ عَلَّمْتُكَ (ابن سعد ص۱۷۹ ج۶) — کیا حق تعالیٰ کی یہ نعمت نہیں ہے کہ تم حدیث بیان کرو اور میں موجود ہوں، اگر صحیح طور پر بیان کرو گے تو اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے اور اگر غلطی کرو گے تو میں تم کو بتا دوں گا۔

اسی لئے تاکہ یاد کرنے والوں کو یاد کرنے میں سہولت ہو، چند حدیثوں سے زیادہ ایک دن کا سبق عموماً نہیں ہوتا تھا۔ زہری اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ

لٰكِنِ الْحِفْظُ لَهُ بِالتَّدْرِيجِ قَلِيلًا قَلِيلًا (تدریب الراوی ص۱۸۱) — چاہئے کہ بتدریج حدیثوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے یاد کیا جائے۔

لکھا ہے کہ اس موقعہ پر زہری اس مشہور حدیث کو بھی یاد دلاتے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے یعنی

خُذُوا مِنَ الْأَعْمَالِ مَا تُطِيقُونَ — کام کا بوجھ بس اتنا اٹھاؤ جسے تم برداشت کر سکتے ہو۔

وہ یہ بھی کہتے کہ :

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ جُمْلَةً فَاتَهُ جُمْلَةً (تدریب ۱۵۱) جو ایک ہی دفعہ چاہتا ہے کہ سارے علم کو نگل جائے وہ سب کو کھو بیٹھتا ہے۔

سلیمان تیمی کے تذکرہ میں ذہبی نے لکھا ہے کہ چند خاص شرائط کے ساتھ اپنے حلقہ درس میں طلبہ کو شریک ہونے کی اجازت دیتے تھے پھر ان کے معیار پر جو پورے اترتے ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا حق دار وہی قرار پاتے تھے لیکن باوجود اس کے

فَحَدَّثَهُ خَمْسَةَ اَحَادِیْثَ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۲) صرف ایک دفعہ میں کل پانچ ہی حدیثیں سناتے۔

اسی طرح مشہور تابعی ابوقلابہ کے تذکرہ میں ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ان کے شاگرد خالد بیان کرتے تھے کہ

كُنَّا نَأْتِي اَبَا قِلَابَةَ فَاِذَا حَدَّثَنَا ثَلَاثَةَ اَحَادِيْثَ قَالَ قَدْ اَكْثَرْتُ (ابن سعد ۱۳۵) ہم ابوقلابہ کے پاس جاتے، تین حدیثیں بیان کرنے کے بعد کہتے کہ بہت ہو گیا۔

اور زہری کا یہ بیان جو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے :

اِنَّمَا الْعِلْمُ حَدِيْثٌ اَوْ حَدِيْثَانِ (تدریب ۱۵۱) علم تو کل ایک حدیث یا دو حدیثیں ہو سکتی ہیں۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو حدیثوں سے زیادہ وقت واحد میں وہ نہیں سکھاتے تھے، بڑی سے بڑی مقدار جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے وہ "امیر المومنین فی الحدیث شعبہ" کے متعلق یحیٰی بن سعید القطان کا بیان ہے کہا کرتے تھے :

لَزِمْتُ شُعْبَةَ عِشْرِيْنَ سَنَةً فَمَا كُنْتُ اَرْجِعُ مِنْ عِنْدِهِ اِلَّا بِثَلَاثَةِ اَحَادِيْثَ وَعَشَرَةٍ اَكْثَرُ مَا كُنْتُ اَسْمَعُ مِنْهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ (خطیب ۱۳۶) شعبہ کے حلقہ میں بیس سال تک میں پابندی کے ساتھ شریک رہا، اس تمام عرصے میں میں نے دیکھا کہ ان کے پاس جتنی حدیثیں روز سن کر ہم گھر لوٹتے، ان کی تعداد تین سے دس تک ہوتی تھی۔

اپنے اس طریق پر محدثین کو کتنا اصرار تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابراہیمؒ موصلی کے صاحبزادے اسحاق کو حدیث کا جب شوق ہوا تو عباسی دربار کے مشہور وزیر یحیٰی بن خالد برمکی سے اسحاق نے چاہا کہ سفیان بن عیینہ سے سفارش کریں لیکن سفیان پانچ حدیثوں سے زیادہ ایک دن میں پڑھانے پر راضی نہ ہوئے

لے عباسی دربار کا مشہور مغنی ہے، شاید اسی لئے اس کے بیٹے کو سفارش کی ضرورت پیش آئی۔ لکھا ہے کہ یحیٰی برمکی نے سفیان سے پہلی دفعہ جب اس کا ذکر کیا کہ اسحاق کو بھی حدیث پڑھایئے تو انہوں نے ناپسند کیا تھا بعد کو راضی ہوئے لیکن دستور روزانہ جتنی حدیثوں کے سکھانے کا تھا اس دستور سے ہٹنے پر راضی نہ ہوئے، زیادہ سے زیادہ دس تک پہنچے۔

یحییٰ نے سفیان سے جب بہت اصرار کیا تو سات تک پہنچے اور ان کی تاکید والحاح جب حد سے بڑھ گئی تو مجبوراً راضی ہوئے کہ اگر سویرے اسحاق میرے پاس آیا کریں گے تو روزانہ دس حدیثیں پڑھا دوں گا (ابن عساکر ج ۲ ص ۱۵)

اور محدثین کا کام حدیثوں کے متعلق صرف اساتذہ کے حلقوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ عام قاعدہ یہی تھا کہ ایام طلب کی مشغولیتوں سے فارغ ہونے کے بعد پڑھی اور یاد کی ہوئی حدیثوں کو اسی طرح دہراتے رہتے تھے جیسے قرآن کے حافظ بھی حفظ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا دور کرتے رہتے ہیں یاد کی ہوئی حدیثوں کے دور کا اصطلاحی نام "مذاکرہ" تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کا رواج صحابہ ہی کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ ابن عباسؓ اپنے تلامذہ کو مذاکرہ کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے کہ

مُذَاكَرَةُ الْعِلْمِ سَاعَةً خَيْرٌ مِّنْ اِحْيَاءِ لَيْلَةٍ (تدریب ۱۵۱) — عبادت میں شب بیداری سے زیادہ بہتر ہے کہ علم کو دُہرایا جائے

اور شاید اس لئے کہ قرآن بکثرت لوگوں کے پاس لکھا ہوا اس زمانے میں موجود تھا بخلاف حدیثوں کے کہ زیادہ تر اس کی بنیاد حفظ اور یاد پر تھی۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ تو یہاں تک فتویٰ دیتے کہ

مُذَاكَرَةُ الْحَدِيْثِ اَفْضَلُ مِنْ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ (تدریب ۱۵۱) — حدیث کو بار بار دہراتے رہنا قرآن پڑھنے سے بھی زیادہ بہتر ہے

اسی قسم کی ہدایتوں کا یہ اثر اور نتیجہ تھا کہ سننے والا اگر کوئی نہ ملتا تو بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ مکتب خانے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے حدیثیں سناتے۔ اسمٰعیل بن رجاء کے حال میں لکھا ہے کہ

اِنَّهٗ كَانَ يَجْمَعُ صِبْيَانَ الْكُتَّابِ فَيُحَدِّثُهُمْ لِئَلَّا يَنْسٰى حَدِيْثَهٗ (جامع ص ۱۱۰ وابن سعد وغیرہ) — اسماعیل مکتب خانے کے بچوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے حدیث اس لئے بیان کرتے تاکہ وہ بھول نہ جائیں۔

عطار خراسانی کے متعلق بھی قریب قریب اسی کے یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ یعنی

اِذَا لَمْ يَجِدْ اَحَدًا اَتَى الْمَسَاكِيْنَ فَحَدَّثَهُمْ يُرِيْدُ بِذٰلِكَ يَحْفَظُ (جامع جلد ا صفحہ ۱۱۱) — جب کوئی ان کو نہ ملتا تو غربا کی جماعت میں آکر حدیث بیان کرتے۔ مطلب حدیثوں کو یاد رکھنا تھا۔

بعض لوگ گھر کی چھوکریوں کے سامنے اپنے محفوظات کو دہراتے، ان سے کہتے بھی جاتے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ میں یہ چیزیں نہ آرہی ہوں گی لیکن میری غرض تو اپنے علم کو تازہ کرنا ہے اور یہ ابراہیم نخعی کے اس مشورے کی گویا تعمیلی شکل تھی جو اپنے شاگردوں کو وہ دیا کرتے تھے کہ

اِذَا سَمِعْتَ حَدِيْثًا فَحَدِّثْ بِهٖ حِيْنَ	جب کوئی حدیث تم سنو تو چاہئے کہ سننے کے ساتھ ہی دوسروں سے اسکا ذکر کرنا
تَسْمَعُهٗ وَلَوْ اَنْ تُحَدِّثَ بِهٖ مَنْ لَا يَشْتَهِيْهِ	شروع کر دو خواہ اس قسم کے آدمی کے سامنے کیوں نہ ہو جو تم سے حدیث سننا نہ بھی چاہتا ہو

کہتے کہ اس طرح دہرانے سے یوں سمجھو کہ تم حدیث کو اپنے سینے میں لکھ رہے ہو (جامع صلاا)

خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر "حدیث" سے تعلق رکھنے والی علمی جماعت کے لئے ان چند چیزوں کو جو ضروری قرار دیا جاتا تھا یعنی کہا جاتا تھا کہ

اَوَّلُ الْعِلْمِ الْاِسْتِمَاعُ ثُمَّ الْاِنْصَاتُ ثُمَّ	علم (یعنی علم حدیث) میں پہلا کام تو سننا ہے، پھر کان لگانا،
الْحِفْظُ ثُمَّ النَّشْرُ (جامع، صفحہ ۱۱۸)	پھر یاد کرنا، پھر عمل کرنا اور آخر میں اشاعت۔

عبداللہ بن مبارک، فضیل بن عیاض، سفیان ثوری وغیرہ سب ہی سے مذکورہ بالا الفاظ منقول ہیں۔ بظاہر ان اقوال میں "حفظ" سے مقصد یہی ہے کہ سننے کے بعد سنی ہوئی حدیثوں کو چاہئے کہ محدث زبانی یاد کرے، جس کا طریقہ وہی تھا جو بیان کیا گیا۔

عام طور پر صحیح حدیث کے شرائط کو بیان کرتے ہوئے عدالت اور حفظ وغیرہ کے الفاظ کتابوں میں لوگوں کو جو ملتے ہیں تو بظاہر "حفظ" کے اس لفظ سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ راوی کے حافظہ کو غیر معمولی طور پر قوی ہونا چاہئے گویا عام اور معمولی حافظہ والے لوگ "صحیح حدیث" کے راوی بن ہی نہیں سکتے یہی اس کا مطلب ہے لیکن دراصل یہ ایک مغالطہ ہے بلکہ یہاں غرض حفظ سے وہی ہے کہ "راوی" نے حدیث کے یاد کرنے میں پوری توجہ اور محنت صرف کی ہو خواہ حفظ اور یادداشت کی قوت اس کی معمولی ہو یا غیر معمولی۔ یاد کر لینے کے بعد معمولی حافظہ والے آدمی کی یاد کی ہوئی چیز اسی طرح بھروسہ اور اعتماد کے قابل ہو جاتی ہے جیسے غیر معمولی حافظہ والوں کے محفوظات پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ قرآن کے حفاظ جس کی بہترین زندہ مثالیں ہیں۔

ہمارے اگلوں کا حافظہ ہم سے کہیں زیادہ قوی تھا

اگرچہ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ نسبت پچھلوں کے اگلوں کا حافظہ زیادہ قوی تھا، خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ قدیم عرب کے باشندوں کا سمجھا جاتا ہے کہ یادداشت کی قوت زیادہ بہتر تھی یا نوشت و خواند کا رواج عرب میں کم

تھا، لوگ زیادہ تر حافظہ کی قوت سے کام لینے کے عادی تھے، اور قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جتنا زیادہ کام لیا جاتا ہے عام طور پر وہی زیادہ بالیدہ اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ جیسے برعکس اس کے جس قوت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے بتدریج وہ کمزور ہونے لگتی ہے۔ میکانیکی اور دخانی و برقی سواریوں کے اس دور میں جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اب آدمی میں پیادہ یا اونٹ گھوڑوں کی بیٹھ پر مسافت کے قطع کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے جو پچھلی نسلوں کے ان افراد میں پائی جاتی تھی جن کی رسائی عصرِ حاضر کی سواریوں تک نہیں ہوئی تھی یا یہ سمجھا جائے کہ جیسے انسان کی عام فطری اور جبلی قوتوں میں بعض استثنائی غیر معمولی مظاہر کی پیدائش اگرچہ ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہے لیکن ان سے جب کام لیا جاتا ہے تو وہ منظر عام پر آجاتے ہیں اور دنیا کو ان سے واقف ہو جانے کا موقعہ مل جاتا ہے، اسی قانون کے تحت حافظے کی غیر معمولی قوتوں سے کام لینے کا مسلمانوں کو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق مل گیا اور اسی استعمال کی وجہ سے عجیب وغریب تجربات انسانی قوت حفظ و یادداشت کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کو ہوئے۔ اسماء الرجال کی کتابوں سے انتخاب کر کے ان تجربات کو ایک جگہ اگر جمع کر دیا جائے تو فطرت انسانی کے اس خاص پہلو کے متعلق معلومات کا ایک حیرت انگیز مجموعہ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ کمّاً وکیفاً آدمی کا حافظہ ارتقار کے کن حدود تک پہنچ سکتا ہے اس کا ان معلومات کی روشنی میں پتہ چل سکتا ہے مثلاً ایک نہیں ایسے حفاظ کی متعدد مثالیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ سن لینے کے بعد بات کا بھولنا ان لوگوں کے لئے ناممکن تھا ابن شہاب زہری یہ کہتے ہوئے کہ ایک دفعہ سن لینے کے بعد آج تک دوبارہ پھر اسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت مجھے کبھی نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی حدیث کے متعلق مجھے شک ہوا، خود اپنا ذاتی تجربہ اپنے حافظہ کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ کل ایک دفعہ ایک حدیث کے بعض الفاظ میں مجھے شک سا محسوس ہوا۔

فَسَأَلْتُ صَاحِبِيْ فَإِذَا هُوَ كَمَا قُلْتُ (تذکرہ ۱۰۳) میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا تب معلوم ہوا کہ صحیح وہی تھا جو میں کہتا تھا۔

یا امام بخاری کے متعلق ان کے رفیق درس جن کا حاشد بن اسمٰعیل نام تھا، خود اپنا یہ ذاتی مشاہدہ جو نقل کرتے تھے کہ بخاری ابھی غلام (نوعمر) ہی تھے اور ہمارے ساتھ حدیث کے ایک حلقہ میں شریک ہوئے حاشد کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کا تو قاعدہ یہی تھا کہ استاد حدیثیں بیان کرتا جاتا تھا اور ہم لوگ لکھتے جاتے تھے،

لیکن بخاری کو ہم نے دیکھا کہ بجائے لکھنے کے چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں اور لکھتے نہیں۔ ان کے اس حال کو دیکھ کر کچھ دن تو ہم لوگوں نے صبر سے کام لیا مگر جب ایک زمانہ اسی حال میں گزر گیا تب ساتھیوں نے ان کو ٹوکنا شروع کیا کہ بے کار درس کے حلقہ میں تم کیوں آتے ہو جب کچھ لکھتے ہی نہیں۔ بخاری لوگوں کے اس اعتراض کو سن کر کچھ جواب نہیں دیتے خاموش گزر جاتے۔ حاشد کہتے ہیں کہ آخر ایک دن لوگوں نے جب ان کو بہت زیادہ چھیڑا تو دیکھا کہ غصہ آگیا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ تم لوگوں کا کیا مطلب ہے، لاؤ جو کچھ تم لوگوں نے لکھا ہے، لے کر بیٹھ جاؤ اور سنو میں سب کو زبانی سنا دیتا ہوں۔ حاشد کا بیان ہے کہ

فَزَادَ عَلٰی خَمْسَۃِ عَشَرَ اَلْفِ حَدِیْثٍ فَقَرَأَہٗ کُلَّھَا عَنْ ظَھْرِ قَلْبٍ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص۱۲۳) پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں اس بندۂ خدا نے زبانی سنا ڈالیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک دفعہ سن لینے کے بعد امام بخاری کے حافظہ کو یاد رکھنے کے لئے دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال ابن عباس زہری شعبی وغیرہ محدثین کے حافظہ کا لوگوں نے بیان کیا ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کا کہیں ذکر کیا ہے۔ اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حافظے کی یہ مثالیں نادر اور عجیب ضرور ہیں لیکن اگر تلاش کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس قسم کی استثنائی مثالیں ہر زمانے میں مل سکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ کو کہیں نہ کہیں ایسے افراد مل جائیں جن کے یاد رکھنے کے لئے صرف ایک دفعہ کسی شعر یا گفتگو وغیرہ کا سن لینا کافی ہو۔ شاہجہاں نامہ میں شاہجہاں بادشاہ کے عہدِ حکومت کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عین الدولہ نے شاہی دربار میں ترہت (بہار) کے دو زنار دار (برہمن) کو پیش کیا جن کی خصوصیت یہ تھی کہ

ہر دو دہ بیت ہندی را کہ دہ شاعر بتازگی گفتہ باشند و گوش زد ہیچ کس نہ شدہ باشد بہ یک شنیدن یاد می گیرند و آن ابیات را بہماں ترتیبے کہ شعراء گفتہ و خوانندہ باشند از بر خوانند (بادشاہ نامہ جلد ۲ ص۲۶)

خود شاہجہاں نے دونوں کا امتحان لیا اور "چونکہ بغرض مقدس رسیدہ بود بوقوع آمد" بادشاہ نے انعام واکرام کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔

حافظے کے مذکورہ بالا تجربے میں جن خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، قریب قریب یہ وہی بات ہے،

جو امام بخاری کے متعلق بغداد کے علما کو تجربہ ہوا تھا۔ واقعہ مشہور ہے کہ سو حدیثوں کے متن اور سند کو الٹ پلٹ کر کے امام کے سامنے سو آدمیوں نے پیش کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ امام بخاری ہر حدیث کو سن کر پہلے تو یہ کہتے رہے کہ میں اس سے ناواقف ہوں، جب سوالات ختم ہوئے تب امام متوجہ ہوئے اور پوچھنے والوں کی جو ترتیب تھی اسی ترتیب سے اس کی طرف رخ کر کے فرماتے کہ تم نے یہ حدیث پوچھی تھی جس کی سند تم نے یہ بیان کی لیکن یہ اس حدیث کی سند نہیں ہے بلکہ فلاں حدیث کی ہے، صحیح سند اس حدیث کی یہ ہے۔ ایک سے سو تک ہر ایک کا آپ نے تفصیلی جواب مذکورہ بالا طریقے کے التزام کے ساتھ دیا۔ آخر جب یہ ہو سکتا ہے تو بے چارے ترہت کے ان زناردار وں کی یادداشت کے اس کمال میں کیوں شک کیا جائے۔

ہم عام حافظہ والے لوگ ان استثنائی مظاہر کے آثار و نتائج کا واقعہ یہ ہے کہ صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ حافظ ابوزرعہ رازی جن کا ذکر ابھی کچھ دیر پہلے گزرا ہے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ کسی ستم ظریف نے خدا جانے اس کو کیا سوجھی کہ اس مضمون کا حلف اٹھا لیا، یعنی "حافظ ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں زبانی اگر یاد نہ ہوں تو اس کی بیوی کو طلاق ہے"۔ یہ کہنے کے بعد بے چارے حافظ صاحب کے پاس وہ آیا، پریشان تھا کہ حلف اٹھانے کو تو میں نے اٹھا لیا ہے لیکن بیوی قبضے میں رہتی ہے یا نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابوزرعہ کی حدیث دانی پر کسی نے اعتراض یا شک کیا تھا، غصہ میں ان کے اس عقیدت مند نے طلاق کا حلف اٹھا لیا ہوگا۔ بہرحال وہ آیا اور مسئلہ کی جو صورت تھی بیان کی۔ جواب میں سن رہا تھا، حافظ ابوزرعہ اسی سے فرما رہے ہیں کہ

تَمَسَّكْ بِامْرَأَتِكَ (تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۲۴) اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھ (یعنی طلاق واقع نہ ہوئی تیری بیوی تیرے نکاح میں ہے)

ظاہر ہے کہ ذرا سا بھی شک حافظ کو اگر اس میں ہوتا کہ ایک لاکھ حدیثیں انکو یاد نہیں ہیں تو جس شخص پر شرعاً اسکی بیوی حرام ہو چکی تھی محض اپنے نام و نمود یا اپنے بھرم کو باقی رکھنے کے لئے اس قسم کا فتویٰ قطعاً نہیں دے سکتے تھے۔

قتادہ کا دعویٰ اور اس کی تشریح

بہرحال آپ کو اختیار ہے کہ حفاظ حدیث کی ان مثالوں کو چاہے ان عام استثنائی مثالوں کے ذیل

میں شمار کیجئے، یا مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ کا جو یہ دعویٰ تھا کہ

اَعْطَى اللّٰهُ هٰذِهِ الْاُمَّةَ مِنَ الْحِفْظِ مَالَمْ يُعْطِ اَحَدًا مِّنَ الْاُمَمِ خَاصَّةً خَصَّهُمْ بِهَا وَكَرَامَةً اَكْرَمَهُمْ بِهَا۔ (زرقانی جلد ۵ صفحہ ۳۹۵)	حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس امت کو (یعنی امت محمدیہ اسلامیہ کو) حفظ اور یادداشت کی غیر معمولی قوت سے سرفراز فرمایا ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں کے درمیان (امت اسلامیہ) کا یہ خاص امتیازی سرمایہ ہے جس کے ساتھ خدا نے اس کو مختص کیا اور حق تعالیٰ کی یہ نوازش ہے جس سے یہ امت نوازی گئی ہے۔

آپ بھی یہی مان لیجئے کہ آخری دین ہونے کی وجہ سے اسلام کی اساسی بنیادوں کو قدرت نے جیسے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے اتنا مستحکم اور استوار کر دیا کہ آئندہ خواہ کچھ بھی اب گزر جائے، لیکن ابتدائی بنیادیں دینِ اسلام کی اتنی مضبوط اور گہری ہیں کہ ان کی وجہ سے اسلام کا دنیا سے مٹ جانا عقلاً بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہی بات کہ دنیا کے سارے ادیان و مذاہب جن کی تاریخ سے ہم واقف ہیں سب کو صدیوں کے بعد ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ حکومت و سلطنت کی قوت سے اس کو امداد پہنچائی جائے، لیکن پندرہ بیس سال کے اندر اندر دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس آخری دین کی تبلیغ و اشاعت، استحکام و استواری میں اپنے سارے مادی ذرائع و وسائل کو وقف کئے ہوئے تھی۔ یقیناً عہدِ فاروقی تک پہنچتے ہوئے اسلامی حکومت روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن چکی تھی کیونکہ مشرق و مغرب کی دونوں عالمگیر قوتیں (رومن امپائر اور پرشین امپائر) فاروقی حکومت کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات آج ہزار سال کے بعد صدیوں تک بالکلیہ اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ تر و تازہ حال میں جو نظر آ رہے ہیں، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اسلام کی ابتدائی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ اب خواہ اس واقعہ کو لوگ بخت و اتفاق کا نتیجہ چاہیں قرار دیں یا اسلام کو جس قدرت نے بنی آدم کے آخری دین ہونے کی حیثیت عطا کی ہے، اسی کی طرف سے سمجھا جائے کہ قصداً و ارادۃً یہ انتظام کیا گیا تھا۔ قتادہ بے چارے چونکہ مسلمان تھے، اسلام کو خدا کا دین مانتے تھے اس لئے نہ صرف دوسروں ہی کے متعلق بلکہ خود اپنے حافظہ کے متعلق صبح و شام ان کو مسلسل جو تجربات ہوتے رہتے

تھے سب کو تائیدِ غیبی کے ظہور کی ایک شکل یقین کرتے تھے۔ خود ان ہی کے متعلق لکھا ہے کہ بصرہ جو ان کا وطن تھا وہاں کے علمائے وقت سے استفادہ کے بعد مدینہ منورہ سعید بن المسیب تابعی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پہنچے۔ معلومات سے قتادہ کا دماغ پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا۔ مدینہ آنے کی غرض اضافہ کے ساتھ ساتھ ان ہی معلوماتِ حاصلہ میں زیادہ جلا پیدا کرنا تھا۔ سعید بن المسیب سے سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ انہوں نے چھیڑ دیا۔ مہمان خیال کر کے کچھ دن تو سعید کچھ نہ بولے۔ جو کچھ پوچھتے جواب دیتے جاتے تھے مگر بات جب برداشت سے باہر ہو گئی تب ذرا غصہ کے لہجہ میں سعید نے کہا کہ "جو کچھ تم نے اب تک دریافت کیا ہے ان کو تم یاد کر چکے؟" مطلب یہ تھا کہ صرف تم پوچھتے ہی چلے جاتے ہو، جو کچھ اب تک سن چکے ہو اسے یاد بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس پر قتادہ نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ جی ہاں، جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا مجھے سب یاد ہے، اسی کے ساتھ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فقط وہی چیزیں نہیں جو سعید سے سنی تھیں بلکہ سعید کے سوا جس جس مسئلہ کے متعلق دوسرے علماء سے انہوں نے اس وقت تک جو کچھ سنا تھا، سب سنانا شروع کر دیا۔ طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ قتادہ کہتے جاتے تھے:

سَاَلْتُكَ عَنْ كَذَا فَقُلْتَ فِيْهِ كَذَا وَ سَاَلْتُكَ عَنْ كَذَا فَقُلْتَ فِيْهِ كَذَا وَ قَالَ فِيْهِ حَسَنٌ كَذَا۔ (جلد ۷ صفحہ ۲ قسم دوم)

آپ سے (یعنی سعید بن المسیب سے) میں نے فلاں بات پوچھی، اس کا جواب آپ نے یہ دیا۔ اور فلاں بات دریافت کی اس کا جواب آپ نے یہ دیا۔ اس مسئلہ میں حسن (بصری ان کے بصری استاد) نے مجھے یہ بتایا تھا

سعید بن المسیب کی شخصیت حالانکہ خود بھی غیر معمولی تھی لیکن قتادہ کے حافظہ کی اس آہنی فولادی گرفت کو دیکھ کر فرمانے لگے:

مَا كُنْتُ اَظُنُّ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ مِثْلَكَ

میں نہیں سمجھتا تھا کہ تجھ جیسے آدمی کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے

یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ آخر سعید بن المسیب کو قتادہ کے سامنے یہ اقرار کرنا پڑا۔

اِرْتَحِلْ يَا اَعْمٰى فَقَدْ نَزَفْتَنِيْ

اندھے[1] اب تم اپنے وطن کی راہ لو مجھے تو تم نے نچوڑ ہی لیا یعنی کچھ باقی نہ چھوڑا۔

---

[1] قتادہ مکنون البصر (نابینا) تابعی تھے، اسی کی طرف سعید نے اشارہ کیا ہے۔

سعید بن المسیب نے قتادہ کی غیر معمولی یادداشت کی قوت کو دیکھ کر یہ جو کہہ دیا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ تجھ جیسے آدمی کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، شاید یہ یا اسی قسم کی دوسری باتوں نے قتادہ میں یہ خیال پیدا کردیا ہو کہ حافظوں کے جن غیر معمولی آثار و نتائج کا تجربہ اس زمانے میں ہو رہا ہے یہ اسلام کی کوئی خصوصیت خاصہ ہے۔

حدیث کا سارا دارومدار قوت حافظہ ہی پر نہیں ہے

کچھ بھی ہو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سارے محدثین اسی قسم کی غیر معمولی قوتیں حفظ اور یادداشت کی رکھتے تھے، بلکہ انسانی کمالات کی جو عام حالت ہے، یعنی ان میں اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر درجے کے لوگ ہوتے ہیں، یہی حال یادداشت کی اس قوت میں محدثین کا بھی تھا۔ آخر جہاں غیر معمولی حافظوں کی ان مثالوں کا کتابوں میں تذکرہ پایا جاتا ہے، وہیں ان کتابوں میں محدثین ہی کے متعلق ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں، مثلاً الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن یمان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

كَانَ يَحْفَظُ فِي الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ خَمْسَ مِائَةِ حَدِيْثٍ ثُمَّ نَسِيَ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ كَانَ سَرِيْعُ الْحِفْظِ سَرِيْعُ النِّسْيَانِ (جلد ۱ صفحہ ۲۶۳)

ایک ایک نشست میں پانچ پانچ سو حدیثیں ان کو یاد ہو جاتی تھیں مگر ان کو بھول بھی جاتے تھے، محمد بن عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ وہ زود حفظ اور زود فراموش تھے (یعنی اُن کو یاد بھی جلد ہو جاتا تھا اور فوراً بھول بھی جاتے تھے)

اور یہ تو خیر یاد کرنے کے بعد فوراً بھول جاتے تھے علی بن الحسن بن شقیق جو صحاح کے راویوں میں ہیں، ان بیچارے کے حافظہ کا آخری انجام تو عجیب ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ عبداللہ بن المبارک کی کتابیں فرفر زبانی سناتے تھے۔ ذہبی نے یہ لکھنے کے بعد کہ

كَانَ جَامِعًا[1] يُعَدُّ مِنْ اَحْفَظِهِمْ لِكُتُبِ عَبْدِ اللّٰهِ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۳۷)

وہ ایک جامع عالم تھے، عبداللہ بن المبارک کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔

---

[1] جَامِعًا کا مطلب یہ ہے کہ علاوہ اسلامی علوم کے یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے بھی بڑے عالم تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کتب الانجیل والتوراۃ (خود اپنے ہاتھ سے انجیل و تورات بھی لکھی تھی) دراصل ان کو اہل کتاب سے مناظرے کا شوق تھا اور اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ براہ راست انجیل و تورات کے مطالعہ کرنے والے لوگ مسلمانوں میں خصوصاً ابتدائی صدیوں میں نہیں پائے جاتے تھے۔ علی بن الحسن دوسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں تھے ۲۱۵ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ (تذکرہ ص ۳۳۷)

لیکن آخر عمر میں جو ستر سے متجاوز تھی، ان ہی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ

صَارَ لَایُمْکِنُهٗ اَنْ یَقْرَأَ فَبَقِیَ یُحَدِّثُ بِالْحَدِیْثَیْنِ وَالثَّلَاثَةِ (تذکرہ صفحہ ۳۴۲) — پڑھنے کی ہی سکت باقی نہیں رہی تھی، بمشکل دو تین حدیثوں کے سنانے تک ان کی پرواز محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اس قسم کے واقعات اگر اسماء الرجال کی کتابوں سے ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو جیسا کہ میں نے کہا، بنی آدم کی قوت یادداشت کی مختلف النوعیت والآثار اقسام کا ایک عجیب وغریب مرقع سامنے آجائے گا۔ میرے مقصد کے لئے مندرجہ بالا چند مثالیں کافی ہیں۔ ضمناً ان چند مثالوں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حفظ و یادداشت کی بعض غیر معمولی قوتوں کا ہماری کتابوں میں جو ذکر کیا گیا ہے، مثلاً امام بخاری یا حافظ ابوزرعہ یا زہری وغیرہ کے حافظوں کے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں بعض بدگمانوں کو ان پر شاعری کا جو دھوکہ لگا ہے وہ کتنا بے بنیاد ہے۔ ان کو سمجھنا چاہئے کہ محض حدیث کے راوی ہونے کی وجہ سے بطور خوش اعتقادی کے خصوصاً اسماء الرجال کی کتابوں میں قطعاً کسی کی تعریف نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعہ جن لوگوں میں جن کمالات کا پتہ چلا ہے، ان کے متعلق کمالات کا اعتراف کیا گیا ہے اور جن میں نقائص کا سراغ ملا ہے ان کی طرف نقائص کا انتساب کیا گیا ہے۔ آخر بخاری یا زہری کے حافظہ کی تعریف ائمہ رجال نے اگر اسی لئے کی ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے وہ راوی ہیں تو راوی ہونے کا شرف کیا یحییٰ بن یمان اور علی بن الحسن بن شقیق کو حاصل نہیں ہے؟ آئندہ ان مسائل کے تفصیلی ذکر کا موقعہ جب آئیگا تو وہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ حدیث کے ان راویوں کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر جن سے روایت کی صحت وعدم صحت کا تعلق ہے، ائمہ نقد نے کتنی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں، جس کا جی چاہے ان کی کتابوں میں پڑھ سکتا ہے اور انشاء اللہ اپنے مقام پر خود اس کتاب میں کافی سرمایہ اس کا آپ کو ملے گا۔

خیر گفتگو اس مسئلے میں ہو رہی تھی کہ حدیث کے راویوں میں حفظ و یادداشت کی غیر معمولی قوت رکھنے والوں کے اس فطری ملکہ سے بھی مدد ملی ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ حدیث کا سارا دار و مدار حفظ کی ان ہی غیر معمولی قوتوں پر تھا، قطعاً ایک خلاف واقعہ دعویٰ ہوگا بلکہ یاد کرنے والے جیسے قرآن کو اس وقت تک یاد کرتے چلے آرہے ہیں، یہی طریقہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی تھا یعنی ایک ایک دو دو آیتوں کو یاد کرتے ہوئے

سورہ، پارہ اور آخر میں پورے قرآن کے جیسے لوگ حافظ ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ حدیثوں کے یاد کرنے کا بھی یہی قاعدہ تھا۔ یاد کرنے کے بعد جیسے لوگ قرآن کا بار بار دور کرتے رہتے ہیں، اسی طرح اپنی اپنی محفوظہ حدیثوں کا محدثین بھی دور کیا کرتے تھے اور تدریجی طور پر یاد کرنے کا یہ ایسا عام طریقہ ہے کہ بالفرض اگر غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں سے استفادہ کا موقعہ حدیث کی روایت میں نہ بھی ملتا جب بھی باطمینان تمام معمولی حافظہ رکھنے والوں کی یاد پر بغیر کسی دغدغہ کے اسی طرح ہم کو بھروسہ کرنا چاہئے جیسے معمولی حافظہ رکھنے والے حفاظِ قرآن کے حفظ پر ہم بھروسہ کرتے ہیں۔

اس دور میں دُنیوی ترقی بھی علوم دینی کی خدمت پر مبنی تھی!

اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج جب دین اور اخروی ثواب کے سوا قرآن کے حفظ پر آمادہ کرنے والی کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہی ہے بلکہ دین باختوں کا ایک گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو حفظ قرآن کے رواج کے متعلق اس قسم کی باتیں صراحۃً یا کنایۃً پھیلاتا رہتا ہے کہ مسلمان بچوں کے وقت کی بربادی کا ذریعہ بنا ہوا ہے، لیکن ہمت شکنی کی ان تمام کوششوں اور حوصلہ شکنی کے اس انتہائی مخالفانہ یاس انگیز ماحول میں بھی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانوں کا ایک طبقہ اس وقت تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کو حفظ قرآن کی راہ میں نذر گزران رہا ہے، آئندہ اس بچے کے سامنے مستقبل کن حالات کو پیش کرے گا ان سے قطعاً بے پرواہ ہو کر یاد کرانے والے اپنے بچوں سے قرآن یاد کرا رہے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ لاکھوں لاکھ حفاظِ قرآن ہر سال اسلامی دنیا میں تیار ہوتے رہتے ہیں۔

اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دینی بلندیاں ہی نہیں بلکہ اسی قرآن اور حدیث کے جاننے اور ان کے یاد کرنے پر دنیا کی ترقیاں بھی جب مبنی تھیں اس وقت کا کیا حال ہوگا۔ دور کیوں جائیے، ابن شہاب زہری جن کا مختلف حیثیتوں سے اب تک ذکر آچکا ہے۔ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ان کے حالات کو درج کرتے ہوئے خود ان ہی کی زبانی اس قصہ کو درج کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مروانیوں کے پہلے خلیفہ **عبدالملک بن مروان** کا عہدِ حکومت جیسا کہ لوگوں کو معلوم ہے خصوصاً اس کی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں مدینہ منورہ کے لئے انتہائی فقر و فاقہ آلام و مصائب کا زمانہ تھا، واقعۂ حرہ

کے جرم میں مدینہ منورہ والوں کو مجرم ٹھہرایا گیا اور اس جرم کی شدت میں دوسرے اسباب کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہوا تھا، سب کا نتیجہ یہ تھا کہ مدینہ والوں پر حکومت نے زندگی کی سہولتوں کی ساری راہیں بند کردی تھیں۔ زہری کے والد مسلم بن شہاب کا شمار بھی ممتاز مجرموں کی فہرست میں تھا، اس لئے نسبتاً ان کے گھرانے کی حالت اور بھی زیادہ زبوں تھی۔ لکھا ہے کہ آخر میں معاشی مشکلات سے تنگ آکر زہری نے سفر کا ارادہ کیا، چاہا کہ گھر سے باہر نکل کر قسمت آزمائی کریں۔

مدینہ سے روانہ ہو کر سیدھے دار السلطنت دمشق پہنچے لیکن یہاں بھی کوئی جاننے پہچاننے والا نہ تھا کسی جگہ سفر کے ساز و سامان کو رکھ کر کہتے ہیں کہ میں جامع مسجد آیا۔ مسجد میں مختلف حلقے قائم تھے نسبتاً جو حلقہ سب سے بڑا تھا اسی میں میں بھی شریک ہو کر بیٹھ گیا، اتنے میں ایک شخص جو دیکھنے میں بھاری بھر کم غیر معمولی طور پر پُر رعب اور وجیہ معلوم ہوتا تھا، مسجد میں داخل ہوا اور جس حلقہ میں میں بیٹھا ہوا تھا اسی طرف اس نے رُخ کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کو دیکھ کر لوگوں میں جنبش پیدا ہوئی، خوش آمدید کہتے ہوئے لوگوں نے اسے جگہ دی۔ بیٹھنے کے بعد اس شخص نے کہنا شروع کیا کہ آج امیر المؤمنین (عبد الملک) کے پاس ایک خط آیا ہے اور اسمیں ایک ایسے مسئلہ کا ذکر ہے جس کی وجہ سے وہ اتنے متردد ہیں کہ شاید خلافت کے بعد اس قسم کی علمی الجھن میں وہ کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ یہ دراصل ام الولد کے متعلق ایک مسئلہ تھا، آلِ زبیر میں ایک جھگڑا پیدا ہوا تھا جس میں فیصلہ کی ضرورت تھی، عبد الملک جس کی زندگی کا کافی حصہ طلب علم میں گزرا تھا اس قسم کے مسائل میں اپنے معلومات سے کافی مدد لیا کرتا تھا، مگر اس مسئلہ میں پوری بات اسے یاد نہیں رہی تھی، کچھ یاد تھی اور کچھ نہ تھی، چاہتا تھا کہ کسی کے پاس مسئلہ کا صحیح علم ہو تو اس سے استفادہ کیا جائے اور اس چیز نے اس کو سخت دماغی تشویش میں مُبتلا کر رکھا تھا۔ اس کے دربار میں اہلِ علم کا جو گروہ تھا، کوئی اس کی تشفی نہ کرسکا۔ مسجد میں یہ صاحب جو آئے تھے، عبد الملک کے معتمد خاص قبیصہ بن ذویب تھے، مسجد میں اسی لئے آئے تھے کہ شاید خلیفہ کی اس حدیث کا کسی کے پاس پتہ چلے۔ زہری نے سننے کے ساتھ ہی کہا کہ اس حدیث کے متعلق میرے پاس کافی معلومات ہیں۔ قبیصہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور اسی وقت زہری کو حلقہ سے اٹھا کر

ساتھ لئے ہوئے شاہی دربار میں پہنچے خلیفہ کو بشارت سنائی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ مل گئی پھر زہری کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان سے پوچھئے، حدیث اور اس کے متعلقہ معلومات آپ کے سامنے عرض کریں گے۔ عبدالملک نے سعید بن المسیب سے اپنی طالب العلمی کے زمانے میں حدیث سنی تھی۔ زہری نے کہا کہ ان ہی سے میں بھی اس حدیث کو روایت کرتا ہوں۔ پھر پوری حدیث اور اس کی تفصیلات کو عبدالملک کے سامنے زہری نے پیش کیا۔

اپنی بھولی ہوئی باتیں عبدالملک کو یاد آتی چلی جاتی تھیں اور جن جن چیزوں میں شک تھا، زہری کے بیان سے اس کا ازالہ ہو رہا تھا، عبدالملک کا دماغ ہلکا ہوا اور اب اس نے زہری کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ نام اور پتہ زہری نے اپنا بتایا، ان کے والد جو حکومت کے سر برآوردہ مخالفین میں تھے، ان کے نام کو سنتے ہی عبدالملک کا چہرہ بدل گیا اور شکایت کے الفاظ اس کی زبان سے نکلنے لگے۔ زہری نے سورۂ یوسف کی آیت یاد دلائی جو اپنے بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام نے فرمائی تھی یعنی لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ الآیۃ بہر حال زہری کے علم سے عبدالملک کچھ اس درجہ متاثر ہو چکا تھا کہ ناراضی اس کی دیر تک باقی نہ رہ سکی اور معافی کا اعلان کرتے ہوئے حال پوچھا، جو گزر رہی تھی زہری کو اس کے اظہار کا موقعہ ملا۔ اس وقت کی ضرورتیں تو خیر پوری ہو گئیں جن کی ایک طویل فہرست ابونعیم نے نقل کی ہے۔ درحقیقت دربار میں ان کی یہی رسائی آئندہ فراغ بالیوں کا ذریعہ بنی۔ ان کو بنی امیہ کی حکومت سے جاگیر بھی ملی تھی، نقد تنخواہ کے سوا جب تک زندہ رہے، بنی امیہ کے خلفاء یہ یقین رکھتے ہوئے کہ طبعًا اس شخص کا میلان بنی ہاشم کی طرف ہے اور اپنے اس جذبہ کو زہری نے کبھی چھپایا بھی نہیں جب کبھی ایسا موقعہ آتا علانیہ وہ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے بنی ہاشم کے ساتھ ان کی ہمدردیاں نمایاں ہو جاتی تھیں لیکن ان کے علم و فضل سے خلیفہ اور خلیفہ کا دربار اتنا متاثر تھا کہ مسلک کا یہ اختلاف حکومت کی قدر افزائیوں کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ بنی امیہ کے کچھ حکمرانوں کا دور زہری کے سامنے گزرا، ہر ایک کے زمانے میں وہ معزز اور محترم رہے بلکہ ہشام جس کا قیام زیادہ تر بجائے دمشق کے رفاصہ میں رہتا تھا، ایک مدت تک اس نے اپنے ساتھ رکھ کر رفاصہ کے شاہی کیمپ میں ان

سے علم حاصل کیا۔[1]

اور خود یہ قبیصہ بن ذویب جو مسجد سے زہری کو دربار خلافت میں لے گئے تھے، خلیفہ کی معتمدی خاص کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ان کی ترقیوں میں منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اس خصوصیت کو بھی دخل تھا کہ ان کا شمار بھی وقت کے ممتاز محدثین میں تھا۔ ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

كَانَ ثِقَةً مَامُوْنًا كَثِيْرَ الْحَدِيْثِ (جلد ۵، صفحہ ۱۳۱)

قبیصہ ثقہ اور ان لوگوں میں تھے جن پر بھروسہ اور اعتماد کیا جاتا تھا، حدیث کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔

امام بخاری نے ان ہی کے متعلق اپنی تاریخ میں یہ فقرہ نقل کیا ہے:

كَانَ قُبَيْصَةَ اَعْلَمَ النَّاسِ بِقَضَاءِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رضہ (تاریخ کبیر صفحہ ۱۷۵)

زید بن ثابت صحابی کے فیصلوں کے قبیصہ سب سے بڑے عالم تھے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانے کے حکمرانوں کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہو جیسا کہ ابن سعد نے نافع کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہوئے کہ جوانی کے زمانے میں عبدالملک سے زیادہ مستعد چست و چالاک جوان مدینہ میں میں نے نہیں دیکھا۔ آگے ان ہی کی زبانی عبدالملک کی ایک نمایاں خصوصیت وہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ

وَلَا اَطْلَبَ لِلْعِلْمِ مِنْهُ (ابن سعد ج ۵ ص ۱۷۱)

اور نہ اس سے زیادہ علم کا طالب کسی کو پایا۔

انتہا یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں ابن ذکوان کے اس قول کو عبدالملک کے متعلق درج کیا ہے۔

كَانَ عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ مَرْوَانَ رَابِعَ اَرْبَعَةٍ فِى الْفِقْهِ وَالنُّسُكِ فَذَكَرَ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ وَعُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ وَقُبَيْصَةَ بْنَ ذُؤَيْبٍ وَعَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ. (جلد ۳ صفحہ ۱۷۵)

یعنی علم فقہ (جو اس زمانہ میں زیادہ تر آثار و حدیث کی تعبیر تھی) اور عبادت گزاری میں چار ممتاز نوجوان جو مدینہ میں تھے، ان میں ایک عبدالملک بن مروان بھی تھا، پھر چاروں کے نام کی یہ فہرست بتائی سعید بن المسیب عروہ بن زبیر قبیصہ بن ذویب عبدالملک بن مروان۔

---

[1] دمشق اس زمانہ میں وبائی طاعون کا اکثر شکار رہتا تھا، دمشق کے طاعون سے محفوظ رہنے کی تدبیر خلفائے بنی امیہ نے یہ نکالی تھی کہ صحرائے شام میں شاہی محل تعمیر کئے گئے تھے۔ اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔ اسی کا نام رصافہ تھا۔ وبائی ایام میں حکومت کا دفتر رصافہ میں منتقل ہو جاتا تھا۔

گویا علمی حیثیت سے ذکوان کے نزدیک عبدالملک، سعید بن المسیب اور عروہ بن زبیر جیسے مسلم تابعی علماء کی صف میں اس وقت تک داخل تھا، جب تک مدینہ منورہ میں طلب علم کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس عہد میں "معلم العلماء" جسے مانا گیا تھا یعنی عمر بن عبدالعزیز، جو ظاہر ہے کہ مروانی حکمرانوں ہی میں سے ایک تھے۔

اور بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ تو خیر عہد صحابہ و تابعین کا زمانہ تھا، اس کے بعد عباسیوں کا جو دور آیا گو اس میں شک نہیں کہ عباسیوں کے عہد میں عقلی علوم و فنون کا بھی زور بندھا اور کیسا زور، لیکن قرآن اور حدیث سے عباسی خلفاء کے تعلقات بھی کافی گہرے تھے۔ عباسی حکومت کا معمار صادق یعنی ابوجعفر منصور دوانیقی کے متعلق تو الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں یہ دلچسپ لطیفہ بھی نقل کیا ہے، یعنی یہ بیان کرتے ہوئے کہ

اَنَّ اَبَا جَعْفَرِ الْمَنْصُوْرَ كَانَ يَرْحَلُ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ قَبْلَ الْخِلَافَةِ۔	ابوجعفر منصور خلیفہ ہونے سے پہلے طلب علم میں سفر کیا کرتا تھا۔

لکھا ہے کہ اس زمانے میں کسی محدث کے مکان میں ابوجعفر داخل ہونے لگا، ان کے دروازہ پر جو دربان تھا اس نے کہا کہ میں یوں اندر جانے نہ دوں گا جب تک کہ دو درم میرے حوالہ نہ کرو گے۔ ابوجعفر جیسے جو، رس فطرۃً ممسک و بخیل آدمی کے لئے اور وہ بھی طالب العلمی کے دنوں میں دو درم کا ادا کرنا آسان نہ تھا لیکن علم کا شوق بھی غالب تھا، دربان سے خوشامد کرتے ہوئے کہنے لگا کہ بھائی مجھے چھوڑ دے میں بنی ہاشم کے خاندان کا آدمی ہوں، مگر دربان نے نہ مانا اور درم کا تقاضا جاری رکھا۔ ابوجعفر نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا (عباسؓ) کے خاندان کا آدمی ہوں، اس پر بھی مطالبہ دربان نے جاری ہی رکھا، تب ابوجعفر نے کہا کہ میں قرآن کا عالم ہوں مگر دربان کا دل اس سے بھی متاثر نہ ہوا۔ ابوجعفر نے کہا کہ میں فقہ اور فرائض کا بھی عالم ہوں۔ لیکن دربان کم بخت پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا، مجبوراً ابوجعفر کو مطلوبہ درم ادا کرنے پڑے۔ قصہ گزرنے کو تو گزر گیا لیکن ابوجعفر کے ساتھیوں کو اس رد و کد کا جب علم ہوا اور معلوم ہوا کہ دو درم کے واسطے اس شخص نے بنی ہاشم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن و فرائض و فقہ

ساری چیزوں کی آڑ لینے اور وسیلہ بنا کر کام نکالنے کی ناکام کوشش کی تو اسی دن سے لوگوں نے اس کو دونق (پیسہ) جس کی جمع دوانیق ہے، اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے :

فَلُقِّبَ بِأَبِي الدَّوَانِيقِ (معرفۃ للحاکم صفحہ ۲۱۲) — "ابوالدوانیق" (پیسوں کا باپ) اسی لقب سے وہ مشہور ہو گیا

اور اسی دوانیق کی نسبت سے کبھی "الدوانیقی" بھی اس کو کہتے تھے۔ بعض موقعوں پر اپنی اس نسبت سے وہ خوش بھی ہوا ہے[1]۔ اسی ابوجعفر کے زمانے میں حجاج بن ارطاۃ جو محدث اور فقیہ تھے خطیب نے نقل کیا ہے کہ

مَكَثَ الْحَجَّاجُ بْنُ أَرْطَاةَ يَعِيشُ مِنْ غَزْلِ أَمَةٍ لَهُ كَذَا وَكَذَا مِنْ سَنَةٍ (جلد ۸، صفحہ ۲۲۶) — حجاج بن ارطاۃ کا گزارہ سالہا سال تک ان کی ایک چھوکری پر تھا جو کات کر ان کے لئے سامان معیشت مہیا کرتی تھی۔

لیکن یہی حدیث اور آثار کا علم تھا جس کی بدولت ان ہی حجاج بن ارطاۃ کے متعلق یہ بھی دیکھا گیا جیسا کہ خطیب ہی راوی ہیں :

ثُمَّ خَرَجَ أَبُو جَعْفَرٍ مَعَ ابْنِهِ الْمَهْدِيِّ إِلَى خُرَاسَانَ فَقَدِمَ بِسَبْعِينَ مَمْلُوكًا (ص ۲۲۶) — پھر ابوجعفر (عباسی خلیفہ) نے حجاج بن ارطاۃ کو اپنے بیٹے مہدی کے ساتھ خراسان روانہ کیا۔ خراسان سے جب حجاج واپس آئے تو اس وقت ستر غلاموں کے وہ مالک تھے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والے جس زمانے میں اس تماشے کو دیکھ رہے تھے قطع نظر دین کے دنیا ہی کے لئے انسان کی فطرت ان حالات میں جو کچھ کر سکتی ہے، کیا اس سے باز آ سکتی تھی۔ دیکھا جا رہا تھا کہ ایک غریب اندھا آدمی ہے لیکن کرۂ زمین کا اپنے وقت میں جو سب سے بڑا مطلق العنان فرمانروا تھا، وہ اسی نابینا کے ہاتھ دھلا رہا ہے، میرا اشارہ مشہور محدث ابو معاویہ الضریر کے اس قصے کی طرف ہے جس کا ذکر خود ابو معاویہ براہ راست علی بن مدینی سے کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہارون الرشید کے ساتھ ایک دن میں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے جب فارغ ہوا تو محسوس ہوا کہ دھلانے کے لئے کوئی میرے ہاتھ

---

[1] کہتے ہیں کہ بغداد کا شہر جس قطعۂ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا پہلے کچھ غیر آباد سا مقام تھا۔ دجلہ کے ساحل پر بعض تارک الدنیا عیسائی فقیروں اور راہبوں کی دیر (خانقاہیں) بنی ہوئی تھیں۔ شروع شروع میں اس مقام کے محل وقوع کو پسند کر کے شہر بسانے کا ارادہ ابوجعفر نے جب کیا تو علاقے کے بعض ان ہی عیسائی درویشوں سے بھی اس نے رائے لی۔ اس پر ایک راہب نے کہا کہ ہماری بعض کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ "دوانیق" نامی کوئی بادشاہ اس کو بسائے گا۔ یہ سن کر ابوجعفر بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا کہ یہ نام تو میرا ہی ہے۔ تاریخ بغداد اور دوسری تاریخوں میں ابوجعفر کی کنجوسیوں کے بیسیوں قصے منقول ہیں۔

پر پانی ڈال رہا ہے، لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ کون ہے کہ خود ہی پانی ڈالنے والے نے پوچھا، ابو معاویہ! تمہارے ہاتھ پر پانی کون ڈال رہا ہے؟ میں نے عرض کیا، میں پہچان نہ سکا کہ کون ہے۔ جواب میں میرے کانوں میں یہ آواز آئی کہ "میں ہی پانی ڈال رہا ہوں" ابو معاویہ کہتے ہیں کہ میں سناٹے میں آگیا اور بے ساختہ بول اٹھا "آپ یا امیر المومنین"؟ ہارون نے جواب میں کہا کہ

اِجلالًا لِلعِلمِ (تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۸) (ہاں میں ہی ہوں) علم کا احترام مقصود ہے۔

یہی ابو معاویہ کہتے ہیں کہ ہارون کے سامنے میں حدیث بیان کرنے لگتا تو ہارون ادب کے ساتھ بیٹھ جاتا اور جتنی دفعہ بھی میرے منہ سے قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کے الفاظ نکلتے، ہارون صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَیِّدِیْ کہتا جاتا (دیکھو تاریخ بغداد، جلد ۱۴، صفحہ ۹)

ان قصوں کو کہاں تک کوئی بیان کر سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس علم کو خلفاء وقت عوام کے حلقوں میں ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر فخر کے ساتھ خود سیکھا کرتے تھے، یہی ہارون ہے۔ عاصم بن علی جو بخاری کے راویوں میں ہیں، ذہبی نے نقل کیا ہے کہ حدیث کے املاء کی مجلس بغداد میں ان کی کبھی اتنی بڑی ہو جاتی تھی کہ جس میدان میں وہ املاء کراتے تھے، اس کی پیمائش سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمی اس میں شریک ہوئے تھے۔ عوام کی اسی مجلس میں ہارون الرشید کو بھی دیکھا جاتا تھا کہ کھجور کے ایک ٹیڑھے درخت کے تنے پر بیٹھا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لکھنے کا ثواب حاصل کر رہا ہے (دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۵۹) یہی حال مامون الرشید کا تھا بلکہ جو حالات مامون الرشید کے لوگوں نے لکھے ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی کا نہیں بلکہ حدیث کا بھی شاید وہ حافظ تھا، نوعمری ہی میں اس کا یہ حال تھا کہ عبداللہ بن ادریس محدث کے گھر باپ کے حکم سے وہ اور امین الرشید دونوں پہنچے۔ ابن ادریس نے سو حدیثیں ان کو سنائیں۔ سن لینے کے بعد ابن ادریس کو مخاطب کر کے مامون نے کہا کہ

یَا عَمِّ اَتَاْذَنُ لِیْ اَنْ اُعِیْدَهَا مِنْ حِفْظِیْ تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۹) چچا! کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں اپنی یاد سے ان کل سنائی ہوئی حدیثوں کو دہرا دوں۔

ابن ادریس نے سنانے کی اجازت دی۔ مامون نے اسی وقت کل حدیثیں ان کو سنا دیں۔ واللہ اعلم

مامون الرشید کا حافظہ آیا اتنا قوی تھا کہ ایک دفعہ سن لینا یاد رہ جانے کے لئے کافی ہو گیا یا پہلے سے یہ حدیثیں اسے زبانی یاد تھیں۔ دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس ہے۔ آپ مامون کے حالات پڑھئے، اس قسم کی بیسیوں چیزیں ان کی سوانح عمریوں میں ملتی ہیں۔

آج محرکاتِ عمل مال، جاہ اور ریاء ہیں اور خیر القرون میں محض حب الٰہی اور حب رسولؐ کے پاک جذبات تھے

بہرحال یہ چند مثالیں تو اس زمانے کے ان بدگمانوں کے لئے میں نے درج کی ہیں جو اپنے زمانے کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ انسانی اعمال واشغال اور اس کی ساری کوششوں کے آخری محرکات حب مال و جاہ ہی ہیں بلکہ آج کل تو اور بھی مختصر کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ شکمی یا زیادہ سے زیادہ جنسی مطالبوں کے سوا آدمی کے ارادے اور عمل میں حرکت اور جنبش کسی اور ذریعے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

لیکن ظاہر ہے کہ ناپاکوں کو پاکوں پر اور شیر کو شیر پر قیاس کرنے کے قدیم مغالطہ کے سوا یہ اور کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیغمبر سے روٹھے ہوئے، ان کی تعلیمات سے ٹوٹے ہوئے مسکینوں کا وہ گروہ جو بھنگ و بو یا اسی قسم کے چند گنے چنے محسوسات کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہا ہے اور ان ہی میں کروٹیں بدلتے ہوئے دم توڑ دیتا ہے۔ ان کو یہ واقعہ ہے کہ ان بلند احساسات اور ان احساسات کے قدوسی ولاہوتی محرکات کا قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا جو انبیاء علیہم السلام کو علم کے ایک جدید مستقل ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، اب وہ پیغمبروں ہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں، اس طرح دیکھتے ہیں اور اس طور پر سنتے ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد پھر کسی کے دیکھنے کا ان میں انتظار باقی نہیں رہتا پیغمبر سے سن لینے کے بعد پھر کسی سے وہ کچھ سننا نہیں چاہتے۔ صحیح مسلم ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بصرہ کی چھاؤنی کے معلم بنا کر عہد فاروقی میں بھیجے گئے تھے اور وہیں قیام فرما لیا تھا کہتے ہیں کہ بصرہ ہی کی کسی مجلس میں انسانی فطرت کے جذبۂ شرم و حیا کا ذکر ہو رہا تھا حضرت عمرانؓ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث:

اَلْحَیَاءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ ۔ نہیں حاصل ہوتا ہے حیا سے مگر صرف خیر اور بھلائی۔

اسی سلسلہ میں سنا رہے تھے کہ حاضرینِ مجلس میں سے ایک صاحب جن کا نام بشیر بن کعب تھا یمن کے رہنے والے تھے اور حمیری خانوادے سے ان کا نسلی تعلق تھا، جس میں اسلام سے پہلے بھی لکھنے پڑھنے کا کافی رواج تھا۔ بشیر کی نظر سے حکمت و اخلاق کی بعض کتابیں گزری تھیں چونکہ اخلاقی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سن لینے کے بعد ان سے اتنی سی غلطی ہوئی کہ بعض پرانی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے بولے کہ جی ہاں ان کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اس جذبہ کی پرورش آدمی میں سکون و وقار کی کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن کبھی کبھی ضعف اور کمزوری کا سبب بھی حیا کا جذبہ بن جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمرانؓ کو اس کے بعد دیکھا گیا کہ چہرہ ان کا سُرخ ہے اور فرما رہے ہیں کہ

أُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — میں تو تجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتا ہوں

وَتُعَارِضُ فِيهِ وَتُحَدِّثُ عَنْ صُحُفِكَ۔ — اور تو مقابلہ کرتے ہوئے اپنے صحیفوں اور کتابوں کی باتیں بیان کرتا ہے۔

بات شاید بہت زیادہ بڑھ جاتی لیکن مجلس والوں نے کہنا شروع کیا:

إِنَّهُ مِنَّا يَا أَبَا نُجَيْدٍ إِنَّهُ لَا بَأْسَ بِهِ (صحیح مسلم) — کوئی مضائقہ اور اندیشہ کا مقام نہیں، یہ تو ہم ہی میں سے ہیں اے ابا نجید۔ (ابو نجید حضرت عمرانؓ کی کنیت تھی)

تب قصہ رفت و گزشت ہوا۔ قریب قریب اسی کے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس واقعہ کی نوعیت ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن عمرؓ کے صاحبزادے بلال بن عبداللہ بیٹھے ہوئے تھے، اسی مجلس میں ابن عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے:

لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ — مسجد میں عورتوں کا جو حصہ ہے، اس سے ان کو نہ روکو۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت کی نمازمیں شریک ہونے کے لئے عورتیں اگر مسجد آنا چاہیں تو ان کو ثواب سے محروم نہ کرو اور مسجد آنے سے نہ روکو۔ بلال ابھی جوان تھے اور ان کے عہد تک حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی وجہ سے ان کی رائے اس کے خلاف تھی یہ ممکن تھا کہ اپنی رائے کو کسی اور طریقے سے پیش کرتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن لینے کے بعد کہنے لگے کہ

"مگر میں تو اپنی بیوی کو مسجد آنے سے روکوں گا، پھر جس کا جی چاہے اپنی بیوی کو آزاد چھوڑ دے۔"

ابن عمرؓ کا یہ سننا تھا کہ خود بلال راوی ہیں، میری طرف متوجہ ہوئے اور تین دفعہ لعنك الله (خدا کی تجھ پر لعنت ہو) کہتے ہوئے فرمانے لگے :

"مجھ سے تو سن رہا ہے کہ میں کہہ رہا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکا جائے اور تو کہتا ہے کہ میں ان کو روکوں گا۔"

بلال کا بیان ہے کہ یہ فرما کر ابن عمرؓ رونے لگے اور غصہ میں اٹھ کر چلے گئے (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۱۸۳) بعض روایتوں میں ہے کہ جب تک بلال زندہ رہے ابن عمرؓ نے ان سے گفتگو نہ کی[1] (دیکھو فتح الباری)

اور یہ قصہ تو خیر عہد صحابہ کا ہے، ہارون الرشید جس کے زمانے میں علوم الاوائل (یعنی اسلام سے پہلے دنیا میں جن فکری وعقلی علوم وفنون کا رواج تھا) ان سے مسلمانوں میں کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، خود اسی عباسی خلیفہ کے زمانے میں بیت الحکمت قائم ہو چکا تھا جس میں ان ہی علوم الاوائل کے تراجم و تالیف کا کام جاری تھا لیکن بایں ہمہ پیغمبر کی حدیث کے ساتھ خود ہارون کے قلب کا کیا تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ وہی ابو معاویہ ضریر یعنی نابینا محدث، ہارون جن کے ہاتھ دھلاتا تھا وہی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن ہارون کی مجلس میں ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میں بیان کر رہا تھا مجلس میں ایک قریشی امیر بھی بیٹھا تھا اس نے حدیث پر ایک عقلی اعتراض کیا، ابو معاویہ بیچارے تو نابینا تھے آنکھوں سے تو ان کو کچھ نظر نہ آیا لیکن ان کے ہوش اڑ گئے جب کان میں بار بار ہارون کی یہ آواز گونجنے لگی :

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں خواتین اسلام کو مسجدوں میں آنے کی اجازت تھی سب سے آگے بالغ مردوں کی صفیں پھر بچوں کی پھر عورتوں کی رہتی تھیں۔ جب اٹھ جاتی تھیں تب مرد صفوں سے باہر نکلتے تھے گو اسی کے ساتھ جب کوئی عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتی کہ سب سے بہتر نماز ہماری کہاں ہوتی ہے، تو آپ فرماتے کہ گھر کے اندرونی کمرے کی نماز دالان کی نماز سے اور دالان کی نماز برآمدے کی نماز سے اور برآمدے کی نماز تمہارے صحن کی نماز سے بہتر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک پردے میں ہو اس میں ثواب زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے عہد نبوت میں عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ لیکن اچانک مسلمانوں میں دولت وثروت کی جو ریل پیل ہوئی تو نئی نسلوں کے اخلاق وعادات کا وہ معیار باقی نہ رہا جو عہد نبوت میں فیض نبوت سے قائم ہو گیا تھا۔ صدیقہ عائشہؓ جو عورتوں کے حقوق کی اسلام میں سب سے بڑی وکیلہ ہیں ان تک کا فتویٰ ہوا کہ جو حال لوگوں کا ہو گیا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیتے۔ بہرحال بتدریج یہ قصہ ختم ہو گیا اور فقہائے اسلام نے حالات کے لحاظ اسی کو بہتر قرار دیا۔

النطع وَالسَّيف زِنْدِيْقٌ وَاللہِ يَطْعَنُ فِيْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ (خطیب جلد ۱ صفحہ ۸)

تلوار اور نطع (یعنی چرمی فرش جس پر بٹھا کر مقتول کی گردن ماری جاتی تھی) خدا کی قسم یہ زندیق (دین سے باغی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر اعتراض کرتا ہے۔

ابو معاویہ کہتے ہیں کہ آخر میں نے پیش قدمی کی، ہارون کو سمجھانے لگا کہ "امیر المومنین کوئی ایسی بات نہیں ہے، بیچارے کی زبان سے بات بے ساختہ اور بلا ارادہ نکل پڑی ہے، بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔" آخر سمجھاتے بجھاتے ٹھنڈا کرتے کرتے اس ناگہانی مصیبت کے ٹالنے میں کامیاب ہوا۔

قرن اولیٰ میں "علم" کے معنی ہی "حدیث" کے تھے

کسی قوم اور امت میں جس علم نے اتنا وزن حاصل کر لیا ہو جس کا تھوڑا بہت اندازہ مذکورہ بالا چند واقعات سے ہو سکتا ہے بلکہ جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس زمانہ میں مطلق "علم" کا لفظ جب بولا جاتا تھا تو اس سے مقصود وہی جدید علم ہوتا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پہنچا تھا۔ ابن سعد نے عطا بن ابی رباحؒ کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہتے تھے:

كَانَ عَطَاءٌ اِذَا حَدَّثَ بِشَيْءٍ قُلْتُ عِلْمٌ اَوْ رَأْيٌ فَاِنْ كَانَ اَثَرًا قَالَ عِلْمٌ وَاِنْ كَانَ رَأْيًا قَالَ رَأْيٌ (جلد ۱ صفحہ ۲۲۵)

عطا جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا کہ علم ہے یا رائے ہے؟ اگر حدیث ہوتی تو کہتے کہ علم ہے اور رائے ہوتی یعنی علماء کے پیدا کئے ہوئے استنباطی نتائج سے اگر اس کا تعلق ہوتا تو کہتے کہ رائے ہے۔

اس حصول علم کیلئے مالی قربانیاں

دراصل اس "علم جدید" کے مقابلہ میں سارے افکار و آراء جو اس سے پہلے دنیا میں پائے جاتے تھے، ان کا نام علم الاوائل رکھ دیا گیا تھا اور علم بھی کیسا؟ میں تو نہیں سمجھتا کہ دنیا میں ایسا علم یا فن اس وقت تک پایا گیا ہے جس کے ایک ایک معمولی مسئلہ کا علم ایک ایک اشرفی خرچ کر کے حاصل کیا گیا ہو، مگر سنئے علم حدیث کا حال سنئے، امام بخاری اور مسلم کے ایک استاد یعقوب بن ابراہیم الدورقی بھی ہیں، ان کے حال میں لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ کی مشہور حدیث جس میں ہے کہ ماء راکد (بند پانی) میں پیشاب کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہی حدیث یعقوب بن ابراہیم کے پاس ایک ایسی خاص سند سے پہنچی تھی جو ارباب فن میں خاص

امتیاز کی نظر سے دیکھی جاتی تھی محض اس امتیاز کا یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خطیب نے النسائی سے نقل کیا ہے کہ

كَانَ يَعْقُوبُ لَا يُحَدِّثُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ — یعقوب اس حدیث کو اس وقت تک بیان نہیں کرتے تھے

اِلَّا بِدِيْنَارٍ (کفایہ صفحہ ۱۵۶) — جب تک کہ ایک دینار ان کے سامنے نہ رکھ دیا جاتا۔

بلکہ تاریخ بغداد میں خطیب ہی نے ابوبکر بن داؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے:

عَزَمْتُ عَلٰى هٰذَا الْحَدِيْثِ ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ — اسی حدیث کے لئے مجھے تین اشرفی خرچ کرنی پڑی تب

حَتّٰى سَمِعْتُهٗ مِنْهُ (جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۸) — ابراہیم سے اس حدیث کے سننے کا مجھے موقعہ ملا۔

گویا ایک دینار کم از کم تھا جو یعقوب کو اس حدیث کے سننے والے پیش کیا کرتے تھے۔ بہر حال میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ جس زمانے میں اس فن کے "معلومات" کی مانگ کی یہ حالت تھی، لوگوں نے دنیاوی منافع اس کے ذریعہ سے نہیں حاصل کئے۔ جب دنیا بھی اسی راہ سے مل رہی تھی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین کے ایک طبقہ نے اس سے ضرور نفع اٹھایا ہے اگرچہ ان کے اس طرز عمل کو عموماً اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن وہ بیچارے اپنا جو عذر بیان کرتے تھے، دنیا کے ضرورتمندوں کو اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے عذر کو سننا چاہئے۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ بدنام اس طبقہ میں دو آدمی ہیں ایک تو مکہ معظمہ کے مجاور اور حافظ حدیث علی بن عبدالعزیز مکی ہیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میرے طرز عمل کے لوگ شاکی ہیں، تو لکھا ہے کہ بیچارے نے شاگردوں کو مخاطب کر کے ایک دن کہا کہ

يَا قَوْمِ اَنَا بَيْنَ الْاَخْشَبَيْنِ — بھائیو! میں دو پہاڑوں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں (یعنی مکہ میں رہتا ہوں،

اِذَا خَرَجَ الْحَاجُّ نَادٰى اَبُوْ — جس کا حال یہ ہے کہ جب حج کرنیوالے اس شہر سے چلے جاتے ہیں تو مکہ کی پہاڑی ابوقبیس اپنے

قُبَيْسٍ قُعَيْقِعَانَ مَنْ بَقِيَ — مقابل والی پہاڑی قعیقعان کو پکارتی ہے کہ اس شہر میں اب کون باقی رہ گئے؟ جواب ملتا ہے

فَيَقُوْلُ بَقِيَ الْمُجَاوِرُوْنَ — کہ صرف وہی لوگ جو حرم کے مجاور ہیں۔ بس ایک پہاڑی دوسرے سے کہتی ہے کہ منطبق

فَيَقُوْلُ اَطْبِقْ (کفایہ صفحہ ۱۵۷) — ہو جاؤ (یعنی ایک دوسرے سے مل جاتی ہے گویا پاٹ بند ہو جاتا ہے اب کوئی آ سکتا ہے نہ جا سکتا ہے)۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ حج کے موسم کے بعد مکہ معظمہ خالی ہو جاتا ہے اور بیرونی دنیا سے اس شہر کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں حجاج جو ان سے علم حاصل کرتے تھے اگر کچھ سرمایہ ان سے لے کر اپنے

پاس میں نہ رکھ لیا کروں تو مکہ جیسے شہر میں ان کی گزر اوقات کی کیا شکل ہو سکتی تھی خصوصاً اس زمانے میں جب آمد و رفت کی ان تمام سہولتوں سے دنیا ناآشنا تھی جن سے اس زمانے میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے جلیل محدث حافظ فضل بن دکین ابو نعیم ہیں، بخاری و مسلم اور صحاح کی کتابیں ان کی حدیثوں سے معمور ہیں، ان سے بھی لوگوں کو اسی کی شکایت تھی کہ حدیث پر معاوضہ لیتے ہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ مخالفانہ نکتہ چینیوں کو سن کر ایک دن بولے کہ

يَلُوْمُوْنَنِيْ عَلَى الْاَجْرِ وَفِيْ بَيْتِيْ ثَلَاثَةَ عَشَرَ — معاوضہ لینے پر لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے

وَمَا فِيْ بَيْتِيْ رَغِيْفٌ (جلد ۸ صفحہ ۲۷۵) — آج تیرھواں دن ہے کہ میرے گھر میں روٹی نہیں پہنچ سکی۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسی حالت میں اگر دینے والوں سے یہ لوگ کچھ لے لیا کرتے تھے تو خود ہی سوچنا چاہئے کہ آخر وہ کیا کرتے۔[1] خصوصاً جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے لحاظ سے میں تو نہیں سمجھتا

---

[1] واقعہ یہ ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ایک زمانے تک اگرچہ قرآن و حدیث کی تعلیم ہی نہیں بلکہ قضا تک کے معاوضہ کو مسلمان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے مگر بایں ہمہ حکومت یا عام مسلمانوں میں جو اصحاب ثروت و دولت تھے وہ دینی خدمات کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک اپنا فرض خیال کرتے تھے اور لینے والوں پر لوگ اعتراض نہیں کرتے تھے جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے اپنا اپنا لوگوں کا مذاق تھا بعض لوگ نہ سلطان سے لیتے تھے نہ اخوان سے۔ سلطان سے مراد حکومت، اور عام مسلمانوں میں جو ان کے عقیدت مند ہوتے تھے ان کو اخوان کہتے تھے۔ بعض لوگ دونوں سے لیتے تھے اور بعض لوگ کسی ایک سے بھی لینا پسند نہ کرتے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان دو بزرگوں سے یعنی ابو نعیم اور علی بن عبد العزیز سے لوگوں کو جو شکایت پیدا ہوئی اس کی وجہ دوسری تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو داد و ستد کے مسئلہ میں ایک ایسی حد پر پہنچ جاتے ہیں جس سے لوگوں کا شاکی ہو جانا ایک طبعی امر ہے۔ کہنے کو اپنے آپ کو اس قسم کے حضرات یہی کہتے ہیں کہ ہم لین دین میں بڑے کھرے ہیں، اس موقعہ پر یہ جملہ کہ حساب جو جو بخشش سو سوان کی زبانوں پر جاری ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کی جبلی کمزوری اور تنگدلی ہوتی ہے، اچھی تعبیروں سے اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہی فضل بن دکین ہیں، خطیب نے نقل کیا ہے کہ معاوضہ تو خیر لیتے ہی تھے حدیہ کرتے تھے کہ ایک ایک درم کو پرکھتے ذرا سا بھی کوئی کھوٹا ہوتا تو اسے واپس کر دیتے اور جب تک کھرا سکہ اس کی جگہ وصول نہ کر لیتے دم نہ لیتے۔ یہی حال علی بن عبد العزیز کا تھا۔ امام نسائی نے ایک دفعہ نہایت سخت لہجہ میں ان کا ذکر کیا لوگوں نے پوچھا کہ کیا ان کی راستبازی پر آپ کو کوئی شبہ ہے، بولے نہیں آدمی تو سچے ہیں عالم ہیں اور ہر طرح سے سچے ہیں، لیکن یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ پڑھنے کے لئے ان کے پاس آئے ان ہی میں بیچارہ ایک غریب آدمی بھی تھا وہ کچھ حاضر نہ کر سکا، تو علی نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ بیچارے نے کہا کہ میرے پاس صرف ایک پیالہ ہے۔ بولے کہ بھائی میرا تو یہی روزگار ہے لاؤ اسی پیالہ کو لاؤ غریب نے لا کر حاضر کر دیا تب علی بن عبد العزیز نے درس شروع کیا۔ دراصل یہی تنگ نظری تھی، لوگ دراصل اسی کے شاکی تھے۔ کیا کیا جائے آدمی میں بسا اوقات ہر طرح کی خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض فطری کمزوریاں بھی ہوتی ہیں، بڑے بڑے فضل و کمال والوں کو اس قسم کی کمزوریوں میں مبتلا پایا گیا ہے۔

کہ یہ بھی کوئی تعجب کی بات ہو سکتی نہ ہے، آج دنیا سے مفت پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہی ختم ہو چکا ہے منجملہ دوسری مزدوریوں کے تعلیمی مزدوری بھی ایک مستقل پیشہ اور روزگار کی حیثیت حاصل کر چکی ہے، معلمی کرنے والے گروہ میں صدفی صد معاوضہ اور مبادلہ ہی پر جب کام کر رہے ہیں تو اس گزرے ہوئے زمانہ میں ہزار ہا ہزار آدمیوں میں سے ایک دو صاحب اور وہ بھی انتہائی مجبوریوں میں مبتلا ہونے کے بعد اگر پڑھنے والوں سے کچھ اجرت لے لیا کرتے تھے تو کم از کم عصر حاضر کے عام دستور کے لحاظ سے خود ہی سوچئے کہ اعتراض یا تنقید کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے، بلاشبہ ہماری کتابوں میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ان بزرگوں کے طرزِ عمل کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا ہے، لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت خال خال معدودے چند افراد اگر اس قسم کے پائے جاتے تھے یعنی پڑھنے والوں سے کچھ اجرت بھی بقدر ضرورت لے لیا کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں صرف وہی نہیں جو کچھ نہیں لیتے تھے بلکہ کافی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی پائی جاتی تھی جو بجائے لینے کے پڑھنے والوں ہی کو دیا کرتے تھے؛ اعتراض کرنے والے اس زمانہ میں معاوضہ لینے والوں پر اگر اعتراض کرتے بھی تھے تو درحقیقت ان ہی بزرگوں کے مقابلہ میں کرتے تھے۔ صحاح کی مشہور کئی ہزار حدیثوں کے راوی جو فقہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں یعنی حفص بن غیاث، الذہبی نے ان کے حالات میں لکھا ہے:

كَانَ يَقُوْلُ مَنْ لَمْ يَأْكُلْ مِنْ طَعَامِيْ لَا أُحَدِّثُهُ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۷۴)	جو میرا کھانا نہ کھائے میں اس کے سامنے حدیث بھی نہیں بیان کروں گا۔

گویا ان کے یہاں حدیث پڑھنے کی شرط ہی یہ تھی کہ پڑھنے والے کو ان کے دسترخوان پر کھانا بھی پڑے گا۔

اسی طرح خطیب نے ایک دوسرے محدث ہیاج بن بسطام کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ

كَانَ الْهَيَّاجُ بْنُ بُسْطَامٍ لَا يُمَكِّنُ أَحَدًا مِنْ حَدِيْثِهِ حَتّٰى يَطْعَمَ مِنْ طَعَامِهِ كَانَ لَهُ مَائِدَةٌ مَبْسُوْطَةٌ لِأَصْحَابِ الْحَدِيْثِ كُلُّ مَنْ يَأْتِيْهِ لَا يُحَدِّثُهُ إِلَّا مَنْ يَأْكُلُ مِنْ طَعَامِهِ (تاریخ بغداد ج ۱۴)	ہیاج بن بسطام سے حدیث اس وقت تک لوگ نہیں سن سکتے تھے جب تک کہ ان کے یہاں کھانا نہ کھالیتے۔ ہیاج کا دسترخوان بہت وسیع تھا حدیث والوں کیلئے عام تھا جو ان کے پاس آتا اکو حدیث نہیں سناتے جب تک ان کے یہاں کھانا نہ کھالیتا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک طبقہ ہی پیدا ہو گیا تھا جو خود تو پیغمبر کی حدیثوں کی نشر و اشاعت میں معروف ہی تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ ان لوگوں کی بھی مالی دستگیری اپنے فرائض میں شامل کئے ہوئے تھا جن کو ان کے علمی مشاغل معاشی کاروبار میں حصہ لینے کا موقعہ باقی نہ رکھا تھا۔ مصر کے مشہور امام جلیل لیث ابن سعد جو علم میں امام مالکؒ کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ امام شافعیؒ تو باوجود شاگرد ہونے کے اپنے استاد مالکؒ پر لیث کو ترجیح دیتے تھے۔ بالاتفاق مورخین نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنی ساری جاگیر کی آمدنی جو تقریباً سالانہ پچیس تیس ہزار اشرفی تھی، اس کا ایک بڑا حصہ محدثین اور حدیث و فقہ کے طلباء پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ صرف امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سالانہ ایک ہزار دینار (اشرفی) التزاماً بھیجا کرتے تھے، وقتاً فوقتاً اور بھی امداد کرتے، کبھی کبھی پانچ پانچ ہزار اشرفیاں امام مالک کے قرض کی ادائیگی کے لئے ان کو بھیجنی پڑی ہیں۔ مصر کے محدث ابن لہیعہ جو اپنے خاص حالات کے لحاظ سے تدوین حدیث کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، کسی موقعہ پر انشاء اللہ ان کا تذکرہ آئے گا، ان بیچارے کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں مکان کے ساتھ کاغذوں کا وہ ذخیرہ بھی جل گیا جس میں ان کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں۔ خطیب ہی کی روایت ہے کہ مکان کی تعمیر کی امداد کے سوا صرف:

بَعَثَ اِلَيْهِ اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ كَاغَذًا بِاَلْفِ دِيْنَارٍ (ص۵)   لیث بن سعد نے ایکہزار دینار کا کاغذ ابن لہیعہ کو بھیجا۔

لیث بن سعد کے دسترخوان پر کھانا کھانے والے طلبہ اور اہل علم کو جو کھانا ملتا تھا، اس کا تذکرہ سننے کے قابل ہے، خطیب ہی راوی ہیں:

كَانَ يُطْعِمُ النَّاسَ فِي الشِّتَاءِ الْهَرَائِسَ بِعَسَلِ النَّحْلِ وَسَمْنِ الْبَقَرِ وَفِي الصَّيْفِ سَوِيْقَ اللَّوْزِ بِالسُّكَّرِ (صفحہ ۹)   سردیوں میں لوگوں کو ہریس کھلاتے تھے جو شہد اور گائے کے گھی میں تیار کیا جاتا تھا اور گرمیوں میں بادام کا ستو شکر کے ساتھ لوگوں کو کھلاتے تھے۔

ان ہی بزرگوں میں موصل کے حافظ معافی بن عمران تھے، باوجود حافظِ حدیث ہونے کے لکھا ہے کہ بڑے جاگیر بھی تھے۔ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب جاگیر سے آمدنی آتی تو اپنے

اصحاب اور تلامذہ کے پاس اُس اُس سے اتنی رقم نکال کر بھیج دیا کرتے تھے، جو ان کے لئے کافی ہوتی تھی۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۶۵)

اور اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے قصوں سے تو شاید ہی رجال کی کوئی کتاب خالی ہوگی یعنی علاوہ محدث وفقیہ ہونے کے یہ اپنے وقت کے بڑے اولوالعزم تاجر بھی تھے۔ لکھا ہے کہ چار مہینے طلب حدیث میں، چار مہینے میدان جہاد میں اور چار مہینے تجارت میں صرف کر کے اپنا سال پورا کرتے تھے۔ برسوں اسی قاعدے کے وہ پابند رہے، تجارت سے کافی آمدنی ہوتی تھی ان ہی مصارف پر یہ آمدنی صرف ہوتی تھی، گو ان کے بذل ونوال کا دروازہ ہر مستحق کے لئے کھلا ہوا تھا لیکن زیادہ تر ان کے حسن سلوک کا تعلق چونکہ حدیث ہی کی خدمت کرنے والوں سے تھا اس لئے ایک دفعہ کسی نے اس تخصیص کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

قَوْمٌ لَهُمْ فَضْلٌ وَصِدْقٌ طَلَبُوا الْحَدِيثَ فَاَحْسَنُوا الطَّلَبَ لِلْحَدِيثِ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِمْ احْتَاجُوا فَإِنْ تَرَكْنَاهُمْ ضَاعَ عِلْمُهُمْ وَإِنْ أَغْنَاهُمْ بَثُّوا الْعِلْمَ لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا أَعْلَمُ بَعْدَ النُّبُوَّةِ أَفْضَلَ مِنَ الْعِلْمِ۔

(تاریخ بغداد جلد ۱ صفحہ ۱۶۰)

ان لوگوں کو برتری بھی حاصل ہے اور سچائی بھی ان میں پائی جاتی ہے انہوں نے حدیث کی طلب میں بہت حسن سلیقہ سے کام لیا ہے اور یہ سب انہوں نے اس لئے کیا کہ لوگوں کو ان کے علم کی ضرورت تھی اور لوگ ان کے محتاج ہو گئے، اب اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو ان کا علم ضائع ہو جائے گا لیکن اگر ان کو آسودہ حال نگر رکھا گیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کیلئے علم کی راہیں ان سے ہموار ہوتی ہیں نبوت کے بعد اس علم سے بہتر شے میں کسی اور چیز کو خیال نہیں کرتا

اسی سلسلہ میں خطیب ہی نے نقل کیا ہے کہ شہر رقہ میں ایک نوجوان رہتا تھا، جب رومیوں کے مقابلہ میں جہاد کے لئے مصیصہ کی سعدی چوکی کو جاتے ہوئے ابن المبارک رقہ سے گزرتے تو یہی نوجوان ان سے حدیث پڑھ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ابن المبارک جب رقہ پہنچے تو حسب دستور وہ نوجوان ملنے نہ آیا۔ لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا، معلوم ہوا کہ کچھ قرض اس پر چڑھ گیا تھا، قرض خواہ نے نوجوان کو جیل ڈلوا دیا۔ ابن المبارک یہ سن کر خاموش ہو گئے، دوسرے دن اس قرض خواہ کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ تمہارا

کتنا قرض فلاں پر رہ گیا ہے؟ بولا دس ہزار درم، اسی وقت ابن مبارک نے یہ رقم ادا کردی اور اسی دن رقہ سے باہر نکل گئے۔ جوان جیل سے چھوٹ کر جب شہر آیا تو معلوم ہوا کہ ابن مبارک آئے تھے اور تجھے پوچھتے تھے لیکن کل ہی روانہ ہوگئے، جوان اسی وقت ان کے پیچھے چل پڑا۔ دوسری یا تیسری منزل پر حضرت سے ملاقات ہوئی۔ بھائی کہاں تھے؟ قرض کی وجہ سے قید ہوگیا تھا! دونوں میں سوال جواب ہوا۔ ابن مبارک نے تب پوچھا کہ پھر رہائی کیسے میسر ہوئی۔ بولا کہ خدا جانے میری طرف سے قرض خواہ کو کس نے رقم ادا کردی۔ ابن مبارک نے سن کر کہا کہ بس خدا کا شکر کرو، کسی سے بھی اللہ میاں نے ادا کرا دیا ہوگا۔ جوان بے چارے کو ابن مبارک کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت ہی نے قرض ادا کردیا تھا۔ اور اس قسم کے بیسیوں پوشیدہ حسن سلوک کے قصے کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں۔ مشہور صوفی حضرت فضیل بن عیاض جو ابن مبارک کے مخلص دوستوں میں تھے، تقریباً ان کے مصارف کے ابن مبارک ہی متکفل تھے۔ ایک دن حضرت فضیل نے ابن مبارک کے تجارتی مشاغل اور ان میں حضرت کا جو انہماک تھا اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ

لَوْلَاكَ وَاَصْحَابُكَ مَا اتَّجَرْتُ اگر تم اور تمہارے اصحاب (محدثین و صوفیہ) نہ ہوتے تو میں ہرگز تجارت نہ کرتا۔

جس سے معلوم ہوا کہ کسی سے لینا تو خیر بڑی بات ہے صرف اس لئے کہ حدیث کی خدمت کرنے والے علماء اور طلبہ کو دوسروں سے لینا نہ پڑے۔ حضرت عبداللہ بن المبارک کی تجارتی کاروبار کی اصل غرض یہی تھی۔ الخطیب نے ابراہیم الحربی کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے ایک اونٹ نظر آیا اور اونٹ والا پوچھ رہا ہے کہ ابراہیم الحربی کا مکان کونسا ہے؟ ابراہیم نے کہا کہ میں ابراہیم ہوں اور اس کا مکان یہی ہے۔ یہ سن کر شتربان اونٹ سے اترا اور دونوں طرف جو بوجھ اونٹ پر لدا ہوا تھا اس کو اتار کر بولا کہ یہ کاغذ ہے خراسان کے ایک آدمی نے میرے حوالہ کیا ہے کہ آپ تک پہنچا دوں۔ ابراہیم نے پوچھا کہ اس شخص کا کیا نام ہے؟ شتربان نے کہا کہ اس نے مجھے قسم دی ہے، نام نہیں بتا سکتا۔ اور کاغذ کے اس طومار کو ان کے حوالہ کرکے روانہ ہوگیا۔[1]

---

[1] ابراہیم الحربی تیسری صدی کے جلیل القدر محدثین میں ہیں، بے نیازی اور اسباب دنیا سے لاپروائی ان کی زندگی کی بڑی

خود حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ابن مبارک فقہ میں شاگرد خاص ہیں۔ ان کا طریقۂ عمل بھی یہی تھا۔ امام صاحب کی تجارت بھی لاکھوں لاکھ روپیہ کی تھی لیکن مقصد ان کا بھی وہی تھا کہ جو اپنی تجارت کا مقصد ابن مبارک بتاتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" مصنفہ مناظر احسن گیلانی)

تقریباً سارے محدثین بے مزد خدمتِ حدیث میں مشغول رہے

اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں انتہائی بلند نظری اور علو ہمتی کی یہ مثالیں ہیں، قدرتاً اس قسم کے افراد کم ہی تھے مگر ایسے لوگ جو پیغمبر کی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ بغیر کسی اجر و مزد کے زندگی بھر کرتے رہے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاوضہ اور اجرت لینے والوں کی مذکورہ بالا چند مثالوں کے سوا تقریباً اس زمانے کے سارے محدثین اور حفاظ حدیث کا یہ عام رویہ تھا، ان ہی بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ان چند لوگوں کو بدنام ہونا پڑا۔ ورنہ تعلیم و تعلم کا موجودہ مستاجرانہ طریقہ اگر اس زمانہ میں بھی اسی طرح عام ہوتا جیسے آج کل ہے تو شاید ان بے چاروں کا کوئی نام بھی نہ لیتا۔ مشہور ہے کہ "حمام میں بھی کیا کسی کے ننگے ہونے کی شکایت کبھی کی گئی ہے"؟ اس سلسلے میں بزرگوں نے جو نمونے چھوڑے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے کوئی ان قصوں کو صحیح باور کر سکتا ہے۔ خیال تو کیجئے ذوق کی اس صفائی کا خطیب نے کفایہ میں نقل کیا ہے کہ مشہور حافظِ حدیث حماد بن سلمہ کا ایک شاگرد بحرِ چین کی تجارتی مہم پر روانہ ہوا اور وہاں سے کافی روپیہ کما کر واپس ہوا حماد استاد تھے بطور تحفہ کے بعض چیزیں ان کی خدمت

خصوصیت تھی۔ خود اپنے ہاتھ سے انہوں نے جو کتابیں لکھیں اور تصنیف کی تھیں، بجائے خود وہ کتب خانہ تھا، جب مرنے لگے تو ان کی لڑکی نے شکایت کی کہ آپ ہمیشہ خلیفۂ وقت اور دوسرے امراء کی امداد کو واپس کرتے رہے، لیکن اب کیا ہوگا؟ بولے کہ اس کمرے کے گوشے میں دیکھو کیا ہے، بیٹی نے کہا کہ کتابیں ہیں۔ ابراہیم نے کہا کہ بارہ ہزار جزو کی ایک کتاب جو حدیث کے لغات اور نوادر کی تحقیق میں ہے جسے میں نے خود لکھا ہے، میرے مرنے کے بعد روزانہ ایک جز بھی بازار بھیجو گی تو درم قیمت اس کی ضرور مل جائے گی۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ بارہ ہزار درم جس کے گھر میں موجود ہوں کیا اس کو محتاج سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے استغنا، سیر چشمی کے بیسیوں واقعات خطیب وغیرہ نے نقل کئے ہیں۔ ایک صاحب دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے ناشتے کا نام نہیں لے رہے تھے، آخر ابراہیم نے کہا کہ بھائی اب آپ اپنے کھانے کا کچھ نظم کیجئے، بندے کے پاس تو ایک روٹی تھی اس کے پتوں سے ناشتہ کا کام لیا گیا تھا اور اب کھانے میں وہی مولی کام آ سکتی (ص ۳۲ ج ۵)

یں لے کر وہ حاضر ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس تحفہ سے خوش ہو کر آئندہ استاد کی توجہ میری طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لیکن سنتے ہیں وہ بے چارہ اپنے تحائف کو لئے کھڑا تھا اور سن رہا تھا۔ حماد فرما رہے ہیں:

اِخۡتَرۡ اِنۡ شِئۡتَ قَبِلۡتُهَا وَلَمۡ اُحَدِّثۡكَ اَبَدًا وَاِنۡ شِئۡتَ حَدَّثۡتُكَ وَلَمۡ اَقۡبَلِ الۡهَدِيَّةَ۔ (کفایہ، صفحہ ۱۵۴)

ان دو باتوں میں سے کسی ایک شق کو قبول کر لو چاہو تو تمہارے تحائف قبول کر لیتا ہوں لیکن پھر حدیث تمہیں کبھی نہیں پڑھاؤں گا اور چاہتے ہو کہ حدیث تمہیں پڑھاؤں تو پھر تحفہ قبول نہیں کروں گا۔

لکھا ہے کہ اس بے چارے نے معذرت کی اور عرض کیا، میں حدیث ہی سنوں گا اور اپنے تحفوں کو واپس لیتا ہوں اور اس قسم کے قصے کہ مثلاً عیسیٰ بن یونس جو رواۃِ حدیث میں بڑے ممتاز مقام کے مالک ہیں، ذہبی نے الامام کے لفظ کے ساتھ ان کو ملقب کیا ہے۔ تین پشتوں سے مسلسل ان کے خاندان میں حفاظِ حدیث پیدا ہوتے چلے آرہے تھے۔ ہارون الرشید کا مشہور وزیر جعفر برمکی خود بیان کرتا تھا کہ میں نے ایک لاکھ درم اس شخص کی خدمت میں پیش کئے، لیکن قطعی طور پر اس نے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں یہ مشہور ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی قیمت میں نے کھائی (تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۲۵۰) ان ہی عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں مامون نے حدیث سننے کے بعد کافی رقم پیش کی لیکن صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا شُرۡبَةَ مَاءٍ (تذکرہ جلد ا صفحہ ۲۵۹) ہرگز نہیں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں۔

الذہبی نے زکریا بن عدی جو صحاح کے راویوں میں ہیں، ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کی آنکھیں دکھنے آئیں، ایک شخص سرمہ لے کر حاضر ہوا، پوچھا کیا تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مجھ سے حدیث سنتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں۔ زکریا نے کہا تب میں تم سے سرمہ کیسے لے سکتا ہوں۔ کیونکہ حدیث سنانے کا معاوضہ ہو جائے گا۔ (دیکھو تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۲۵۸)

ابراہیم الحربی جن کا ذکر ابھی گزرا باوجودیکہ فقر فاقے میں زندگی بسر ہوتی تھی، معتضد باللہ

خلیفۂ وقت نے متعدد بار ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں بھیجیں ہمیشہ شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے ایک دفعہ خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ خود اگر نہیں لیتے ہیں تو اپنے پڑوسیوں میں تقسیم کر دیجئے۔ ابراہیم نے کہا کہ خلیفہ سے عرض کرنا کہ جس چیز کے جمع کرنے کی مصیبت میں نے برداشت نہیں کی تو اس کے خرچ کرنے کی مصیبت میں اپنے آپکو کیوں مبتلا کروں اور آخر میں خلیفہ کے قاصد کو کہا کہ بار بار امیرالمؤمنین بھیجنے کی زحمت برداشت کر رہے ہیں اور مجھے ہر دفعہ واپس کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، ان سے کہہ دیجئو کہ:

اَنْ تَرَكْتَنَا وَاِلَّا تَحَوَّلْنَا مِنْ جِوَارِكَ (ص)   یا تو اس طریقے کو وہ ترک فرمائیں ورنہ آپکی پڑوس سے میں منتقل ہو جاؤنگا

اس سلسلہ میں ابراہیم ایک بخیل آدمی کا ایک پُرلطف قصہ بیان کیا کرتے تھے یعنی یہ کہتے ہوئے کہ علم کے معاوضہ میں بحمداللہ میں نے کبھی کوئی چیز آج تک نہیں لی، صرف ایک دفعہ مجھے لینا پڑا پھر اس قصے کو بیان کرتے جو کافی طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کسی بنئے سے ابراہیم نے کوئی چیز خریدی جس کی قیمت کچھ آنے اور ایک پیسہ طے ہوئی، ابراہیم نے آنے تو ادا کر دیئے پیسہ باقی تھا اتنے میں بنئے کو کچھ خیال آیا بولا کہ ابراہیم بزرگوں کا کوئی ایسا قصہ سناؤ جس سے میرا دل کچھ نرم پڑے۔ ابراہیم نے ایک دلچسپ قصہ سنایا[1]۔ بنیا سن کر بہت متاثر ہوا اور اپنے آدمی سے کہا کہ ابراہیم سے اب ایک پیسہ جو باقی ہے وہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کم کرنا۔ ابراہیم فرماتے تھے کہ بس اسی دن ایک پیسہ کی یہ آمدنی علم کے معاوضہ میں مجھے ہوئی۔

---

[1] خطیب نے اس قصے کو بھی بیان کیا ہے، امام حسن علیہ السلام کی سخاوت سے اس کا تعلق تھا۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت امام ایکدن کسی باغ میں پہنچے جس کا محافظ ایک سیاہ حبشی تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک روٹی تھی، سامنے کتا بیٹھا تھا حبشی کو حضرت نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا ہے خود کھاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا کتے کو دیتا ہے مسلسل وہ یہی کر رہا ہے آپ نے پوچھا کہ تم اس التزام کے ساتھ جو کتے کے سامنے ٹکڑا ڈالتے جا رہے ہو گویا اس کو برابر کا حصہ دار بنا لیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ حبشی نے کہا کہ حضرت کتے کی آنکھ مجھ پر لگی ہوئی ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ اس پر اپنے کو ترجیح دوں حضرت امام حسن کو اس غلام کی یہ ادا ایسی بھا گئی کہ اسی وقت آپ نے اس کا نام اس کے آقا کا نام دریافت کیا اور غلام کے ساتھ باغ کو بھی آپ نے خرید لیا۔ پھر اس حبشی کے پاس آئے اور فرمایا کہ میں نے تجھے بھی خرید لیا ہے اور اس باغ کو بھی حبشی خوش ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اور باغ بھی تجھے بخش دیا۔ حبشی نے سن کر کہا تو حضرت آپ نے جس کی راہ میں یہ باغ مجھے عطا فرمایا اسی کی راہ میں اس باغ کو میں نے بھی دے دیا یعنی خیرات کر دیا۔ بخیل بنیا اس قصے کو سن کر اچھل پڑا اور احسنت یا ابا اسحاق کہتے ہوئے اپنے آدمی سے وہی بات کہی کہ اب ابراہیم سے مزید ایک پیسہ نہ لینا اور نہ ان کی چیز کو کم کرنا (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۴)، شاید اس بخیل کی بخالت پر اس پیسے کی بھی کافی چوٹ پڑی ہوگی، اس نے ابراہیم نے اس پیسے کا واپس کرنا مناسب نہ خیال کیا۔

ان بزرگوں کی سیر چشمی اور بے نیازی کے قصے کتابوں میں اتنے بیان کئے گئے ہیں کہ ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہوسکتی ہے۔ **ایوب سختیانی** جن کا بکثرت حدیثوں کی سندوں میں ذکر آتا ہے اور حفاظِ حدیث کے مشاہیر میں ہیں۔ ذہبی۔ نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کا خلیفہ یزید ابن الولید جس زمانے میں خلیفہ نہ تھا، ایوب میں اور اس میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ جس دن خلافت کے لئے اس کا انتخاب ہوا تو لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر ایوب یہ دعا کر رہے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْسِہٖ ذِکْرِیْ (ص ۱۲۳) پروردگار! میری یاد اس شخص (یعنی خلیفہ) کے دل سے بھلا دے

ذرا وارستہ مزاجیوں کا اس گروہ کے اندازہ تو کیجئے دوست اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت کا بادشاہ منتخب ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کی دوستی سے استفادے کی توقعات قائم کرتے، دعا کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ "پروردگار اس شخص کے دل سے میری یاد بھلا دیجئے"۔

اسی قسم کے ایک واقعہ کا **نصر بن علی** محدث کے تذکرے میں ذہبی نے ذکر کیا ہے، یہ سفیان بن عیینہ وغیرہ کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں۔ لکھا ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ نے ان کے پاس آدمی بھیجا تاکہ قاضی بنانے کے لئے ان کو مستعین کے پاس حاضر کرے۔ ان کو خبر ہوئی، بولے، استخارہ کرلوں تب جواب دوں گا۔ گھر آئے دو رکعت نماز پڑھی، سنا گیا کہ دعا کر رہے ہیں:

"پروردگار! خیر اور بھلائی اگر تیرے ہی پاس ہے تو مجھے اٹھا لے۔"

دعا کر کے سو گئے، جگانے والا جب جگانے کے لئے آیا تو دیکھا کہ واقعی وہ اٹھا لئے گئے۔ یعنی وفات ہوچکی تھی (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۲)

غور کرنے کا مقام ہے ہمتوں کی بلندیاں جن لوگوں میں عروج وارتقار کے اس مقام تک پہنچ چکی تھیں، کیا کوئی دشواری ایسوں کے لئے بھی دشواری باقی رہتی ہے، جن کی رات بھی اپنی رات ہو اور دن بھی اپنا دن ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔

سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہ کے تلامذۂ حدیث میں ایک بزرگ **قبیصہ بن عقبہ** بھی ہیں۔ ذہبی نے "الحافظ الثقۃ المکثر" کے الفاظ سے ان کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ ان ہی کے حال میں لکھا ہے

کہ عباسیوں کے عہد کے امراء میں ابودلف نامی جو بڑے امیر کبیر تھے، ان ہی ابودلف کے صاحبزادے دلف اپنے خدم حشم کے ساتھ ایک دن قبیصہ کے مکان پر حاضر ہوئے۔ اندر تھے، اطلاع دی گئی کہ فلاں امیر آپ سے ملنے آیا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلف کے نام کو سنتے ہی گھر سے نکل پڑیں گے۔[1] لیکن خلافِ توقع دیر تک انتظار کیا گیا وہ باہر نہ آئے، آخر لوگوں نے قریب جا کر کہنا شروع کیا:

اِبْنُ مَلِكِ الْجَبَلِ عَلَى الْبَابِ وَاَنْتَ لَاتَخْرُجُ۔ — جبل (نام صوبہ) کے بادشاہ کا بیٹا دروازہ پر کھڑا ہے اور تم باہر نہیں نکل رہے ہو۔

بہر حال جب لوگوں نے زیادہ ہنگامہ مچایا تو دیکھا گیا کہ گھر سے بایں شان نکل رہے ہیں کہ "چادر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا ہے" دلف سامنے کھڑا تھا اس کے ارد گرد حواشی کے لوگ تھے، سُن رہے تھے کہ قبیصہ کہہ رہے ہیں:

مَنْ رَضِيَ مِنَ الدُّنْيَا بِهٰذَا مَا يَصْنَعُ بِابْنِ مَلِكِ الْجَبَلِ وَاللّٰهِ لَا اُحَدِّثُهُ (ج ا ص ۳۴۰) — جو اس دنیا میں اس ٹکڑے کی طرف اشارہ تھا سے راضی ہو گیا جبل کے بیٹے کی اسے کیا پرواہ۔ خدا کی قسم۔ میں اس شخص کے آگے حدیث بیان نہیں کروں گا

اور یہی واقعہ بھی ہے، مسعر بن کدام بھی کہا کرتے تھے کہ

---

[1] شیر کو شیر پر قیاس کرنے والے عموماً اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سمجھنے والے جسے بسا اوقات کاخ سمجھتے ہیں ان ہی کو اس دنیا میں خاک بلکہ خاک سے بھی بدتر سمجھنے والا ایک گروہ موجود تھا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔

عہد نبوت کے قریب سے جو متاثر تھے وہ تو خیر لیکن جو اس شرف سے محروم تھے ان میں بھی ان مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ ہندوستان ہی میں اورنگزیب کے عہد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کے مشہور بزرگ میاں میر سے ملنے کیلئے اورنگزیب حضرت کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ میاں میر اپنے مریدوں کے ساتھ خانقاہ کے اندر دھوپ میں بیٹھے ہوئے کپڑوں سے جوں نکال رہے تھے اچانک کسی نے اندر خبر پہنچائی کہ شہنشاہ عالمگیر تشریف لا رہے ہیں لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میاں صاحب نے اس کھلبلی کو محسوس کر کے پوچھا، خیر ہے۔ لوگوں نے خبر دی کہ شہنشاہ آ رہے ہیں، مسکرا کر فرمانے لگے لاحول ولاقوۃ میں سمجھا کہ شاید کوئی فربہ جوں دھری گئی اس پر گڑبڑی مچی ہے۔ عالمگیر کے آنے پر اس ہنگامہ کی کیا ضرورت تھی ملنے کے بعد عالمگیر جب واپس ہوئے تو کسی نے میاں میر کے اس لطیفہ کا بادشاہ سے ذکر کیا، سن کر کہا کہ ہاں بھائی: ان لوگوں کی نظر میں ایک موٹی جوں بھی عالمگیر سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

مَنْ صَبَرَ عَلَى الْخَلِّ وَالْبَقْلِ لَمْ يُسْتَعْبَدْ — سرکہ اور بھاجی پر جس نے صبر کر لیا وہ کبھی غلام بنایا نہیں جا سکتا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷)

ہم جیسے لوگ جن کی ایک ایک سانس اور زندگی کا ایک ایک لمحہ دوسروں کے ہاتھ بکا ہوا ہے ان پر احرار کے اس طبقہ کو قیاس کرنا قطعاً صحیح نہ ہوگا۔

جب روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ یاد کرنے والے چند سال میں قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں تو جنہوں نے اپنے سارے وقت کو صرف اپنے ہی قبضے میں رکھا تھا ان کے متعلق کیوں تعجب کیا جاتا ہے، جب کہا جاتا ہے کہ ان کو اتنی حدیثیں زبانی یاد تھیں۔

آپ دیکھ چکے کہ حدیثوں کا بجائے سفینوں کے سینوں ہی کی حد تک محدود رہنے کا دعویٰ جس زمانہ کے متعلق کیا جاتا ہے کلیۃً یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں ہے اور کچھ دن حدیثوں پر ایسے گزرے بھی ہیں تو ان کی مدت ہی کتنی تھی۔ آپ تو حدیثوں کے متعلق بھی بے اطمینانی میں مبتلا کئے جا رہے ہیں پھر جن مذاہب و ادیان کی بنیادی کتابیں یعنی دینِ اسلامی جو حقیقت قرآن کی ہے، یہی حقیقت ان کے ہاں جن کتابوں کی ہے وہ صدیوں ہی نہیں ہزاروں سال تک بجائے سفینوں کے سینوں ہی والی حفاظت ان بنیادی کتابوں کیلئے کافی ہے۔

تدوین حدیث کا ماحول اور مسئلہ غلامی کی حقیقت

مسلمان غلاموں کے لئے ترقی کی ساری راہیں کھلی تھیں

تدوین حدیث کی خدمت جس ماحول میں انجام پائی ہے اس کی جن خصوصیتوں کا ذکر مقصود ہے، ان میں پہلی خصوصیت وہی ہے جس کی عام تعبیر مسئلۂ غلامی سے کی جاتی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غلامی کے مشہور بدنام مسئلہ کو بداندیشوں کی برگندہ باد آنکھوں نے خواہ جس طرح دیکھا یا دکھایا ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی حدود میں پہنچ کر غلامی کی قطعاً وہ حقیقت باقی نہیں رہی جو اس سے پہلے سمجھی جاتی تھی۔ کسی قسم کی بڑائیاں ہوں، ان کے بلند سے بلند ترین زینوں تک پہنچنے سے غلاموں کو اسلام نے صرف

یہی نہیں کہ دوکا نہیں بلکہ جلتے جانے والے جانتے ہیں کہ انسانیت کے اس مظلوم حصے کو پکڑ پکڑ کر ان بلند ترین زینوں تک اسلام نے خود پہنچایا ہے جن پر آزاد مسلمانوں کی رسائی بھی اپنے عہد اقبال و عروج میں آسان نہ تھی، مسلمانوں کی سیاسی و علمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، میں ان ہی سے پوچھتا ہوں کہ ملکی اور سیاسی راہوں میں بادشاہت و فرمانروائی تک اور علمی و دینی راہوں میں امامت و پیشوائی تک پہنچنے والے غلاموں کی اسلام میں کیا کوئی کمی ہے؟ اسی سے اندازہ کیجئے کہ مفتوح قوموں کے ساتھ جہاں اس قسم کے سلوک کی روایتیں بھی بنی آدم کی تاریخ میں ملتی ہیں کہ فاتح کی دینی اور مذہبی کتابوں کا کوئی فقرہ غریب مفتوح کے کان میں کہا جاتا ہے کہ اتفاقاً اگر کہیں پہنچ جاتا تھا تو گرم گرم پگھلے ہوئے رانگ اور سیسے کو اس کے ناپاک کان میں اس لئے بلا دیا جاتا تھا تاکہ آئندہ پھر کسی چیز کے سننے کا موقعہ اپنی زندگی میں اس بدبخت کے لئے باقی نہ رہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ان ہی مفتوح اقوام کے ان افراد کو جو مسلمانوں کے گھر میں غلام بن کر داخل ہوتے تھے، کون نہیں جانتا کہ ان کو قرآن پڑھنے اور پیغمبر کی حدیثوں کے سیکھنے ہی کی اجازت ہی نہیں دی گئی تھی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ خود مسلمانوں کو قرآن پڑھانے والے قرا عموماً ان کے یہی غلام تھے۔ اسی طرح رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ مسلمانوں نے ان ہی غلاموں سے سیکھا اور پڑھا ہے۔

بہرحال اسی عام طریقہ کار کی وجہ سے یعنی قرآن و حدیث اور سارے دینی علوم کے سیکھنے اور سکھانے، پڑھنے اور پڑھانے کی ابتدا ہی سے موالی اور غلاموں کے متعلق حوصلہ افزائیوں سے اسلام کام لے رہا تھا جس کا نتیجہ تھا کہ جیسے اپنے بچوں کو صحابہؓ قرآن پڑھاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے جو کچھ پایا تھا اس کو سکھاتے تھے، بجنسہ اسی طرح ان ہی بچوں کے ساتھ وہ اپنے غلاموں کو بھی قرآن پڑھایا کرتے تھے اور حدیثیں بھی سکھاتے تھے۔

عرب سیاسی الجھنوں میں پھنس گئے تو موالی قرآن و حدیث کی خدمت میں لگ گئے

بالآخر موالی کا یہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیم کی طرف چل پڑا۔ مسلمانوں میں جو فاتح تھے یعنی عرب کچھ تو سیاسی الجھنوں میں ان کی عمومیت مبتلا رہی جو فاتح ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا، ماسوا اس کے ہر ایک کے

ساتھ علاوہ سیاسی جھگڑوں رگڑوں کے خاندانی قصے قضیئے بھی لپٹے ہوئے تھے۔ بخلاف موالی کے کہ قید ہو کر وہ آتے تھے، اس لئے نہ ان کے ساتھ یہ خاندانی قصے تھے اور نہ سیاسی مشغلوں میں بھی الجھنے کا موقعہ خصوصاً اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان کو عموماً ملا۔ اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ان ہی غلاموں کو جوں ہی آزاد ہونے کا موقعہ ملتا تھا اور جیسا کہ معلوم ہے اسلامی قوانین ہی ایسے تھے کہ بکثرت آزادی کے یہ مواقع پیش ہی آتے رہتے تھے تو سب یہی کرتے تھے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تعلقات سے فرصت اور آزادی کو محسوس کر کے ان آزاد شدہ غلاموں کے ایک بڑے طبقہ کو ہم ان علوم و فنون کی تحصیل میں مشغول پاتے ہیں جن میں ان کے اس دین کی بھی ترقیاں مضمر تھیں جسے اپنے فاتحوں کی ملکوتی صحبتوں میں وہ عموماً قبول کر لیتے تھے۔ اور دنیاوی سربلندیوں کی راہیں بھی، دین کا یہی علم ان پر مسلسل کھولتا چلا جاتا تھا۔ تابعین یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے معلومات حاصل کرنے والوں میں مشہور شامی امام مکحول جن کے متعلق کہا جاتا ہے[1]، کہ سندھ سے وطنی تعلق رکھتے تھے، ۱۱۸ھ میں وفات ہوئی، جلالتِ قدر کا ان کے اسی سے اندازہ کیجئے کہ زہری جب اپنے زمانہ کے اہلِ علم کا تذکرہ کرتے تو کہتے کہ حقیقی عالم اس زمانہ میں تین ہی ہیں اور تین میں مکحول کا بھی نام لیا کرتے تھے۔ بہرحال یہی مکحول اپنی تعلیمی روئداد بیان کرتے ہوئے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ

عُتِقْتُ بِمِصْرَ فَلَمْ اَدَعْ بِهَا عِلْمًا اِلَّا حَوَيْتُهُ فِي مَا اَرٰى ثُمَّ اَتَيْتُ الْعِرَاقَ ثُمَّ الْمَدِيْنَةَ فَلَمْ اَدَعْ بِهَا عِلْمًا اِلَّا حَوَيْتُهُ عَلَيْهِ فِيْمَا اَرٰى ثُمَّ اَتَيْتُ الشَّامَ فَغَرْبَلْتُهَا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ س ۱۲۰)

میں مصر میں آزاد کیا گیا، آزاد ہونے کے بعد میں نے یہ کیا کہ مصر میں علم کا جو ذخیرہ تھا جہاں تک میرا خیال ہے اس پر حاوی ہو گیا (یعنی علماء سے اس کو سیکھ لیا) پھر میں عراق پہنچا، عراق کے بعد مدینہ آیا، ان دونوں شہروں میں بھی جو علم پھیلا ہوا تھا اس کو جہاں تک سمجھتا ہوں میں نے سمیٹ لیا، پھر شام آیا اور اس کو تو میں نے چھلنی میں چھان لیا۔

[1] الذہبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ سندھی ہونے کی وجہ سے آخر عمر تک قاف کا تلفظ وہ کاف کرتے رہے جس سے معلوم ہوا کہ پنجاب کے باشندوں کی زبان پر اب بھی قاف کاف کی شکل اختیار کر لیتی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں (دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱)

شاید اختصاراً بعض مقامات کا ذکر اس بیان میں انہوں نے ترک کر دیا ہے کیونکہ ان ہی کے بعض شاگردوں نے یہ الفاظ بھی نقل گئے ہیں یعنی

طِفْتُ الْاَرْضَ فِی طَلَبِ الْعِلْمِ ۔ روئے زمین کا پھیرا میں نے طلب علم میں لگایا ہے (یعنی اسلامی ممالک کے سارے علاقوں کا دورہ علم کی تلاش میں میں نے کیا ہے)

کچھ بھی ہو، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آزاد ہونے کے ساتھ ہی طلبِ علم میں مشغول ہو جانے کا جو دعویٰ مسلمانوں کے غلاموں کے متعلق میں نے کیا تھا اس کی یہ کتنی واضح اور کھلی شہادت ہے۔

اور صرف یہی نہیں ان ہی موالی میں بعضوں کے حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حصولِ آزادی سے پہلے ہی طلبِ علم میں وہ مشغول ہو جاتے تھے۔

رفیع بن فہران جو ابو العالیہ الریاحی کے نام سے مشہور ہیں، ۹۰ھ ہجری میں وفات ہوئی جلیل القدر تابعیوں میں ان کا شمار ہے، اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

کُنْتُ مَمْلُوْکًا اَخْدِمُ اَھْلِیْ فَتَعَلَّمْتُ الْقُرْاٰنَ ظَاھِرًا وَالْکِتَابَةَ الْعَرَبِیَّةَ ۔ ابن سعد ج ۷ ص ۸۲ میں غلام تھا اور اپنے مالک کی خدمت کیا کرتا تھا (اسی زمانہ میں) میں نے قرآن زبانی یاد کر لیا اور عربی خط سیکھ لیا۔

ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علمی مذاق میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ غلاموں کا ایک طبقہ تھا جو آزاد ہونے سے پہلے حفظِ قرآن میں ان کے ساتھ شریک تھا۔ قرآن کے پڑھنے میں غلاموں کا یہ گروہ کتنی محنت برداشت کیا کرتا تھا۔ وہی کہتے تھے کہ

کُنَّا عَبِیْدًا مَمْلُوْکِیْنَ مِنَّا مَنْ یُّؤَدِّی الضَّرِیْبَةَ وَمِنَّا مَنْ یَّخْدِمُ اَھْلَهٗ فَکُنَّا نَخْتِمُ کُلَّ لَیْلَةٍ مَرَّةً ۔ (ص ۸۱) ہم لوگ غلام تھے بعض تو ہم میں مقررہ لگان[1] (جو مالکوں کی طرف سے مقرر کر دیا جاتا تھا) وہ ادا کرتے تھے اور ہم میں بعض اپنے اپنے مالکوں کی خدمت کیا کرتے تھے لیکن بایں ہمہ ہم لوگ ہر شب میں قرآن ایک دفعہ ختم کر لیا کرتے تھے۔

---

[1] لگان میں ضریبہ کا ترجمہ کیا گیا ہے، جیسے زمین کے مالک کاشتکاروں پر لگان لگا دیتے ہیں، یہی طرزِ عمل غلاموں کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا یعنی مہینہ یا ہفتہ یا روزانہ اتنی رقم اپنے آقا کو کما کر ادا کر دیا کریں اس کے بعد جو جی میں آئے کریں۔ عرب اور دوسرے ممالک میں اس کا عام رواج اسلام سے پہلے بھی تھا۔

کہا کرتے تھے کہ خوش قسمتی سے ان کو آخر میں ایک عربی خاتون نے خرید لیا اور ہاتھ پکڑ کر جامع مسجد لے گئی، جمعہ کی نماز کے لئے خطیب منبر پر جا چکا تھا، اس خاتون نے امام اور نمازیوں کو خطاب کر کے کہا کہ :

"لوگو! گواہ رہو، میں نے اس کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیا، اب اس کا جو جی چاہے کرے۔"

پھر کیا تھا علم کا جو شوق اندر دبا تھا دل کھول کر اس کے پورا کرنے کا موقعہ ان کو مل گیا کہتے تھے کہ :

"میرا حال یہ تھا کہ بصرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنتا اور معلوم ہوتا کہ فلاں صحابی جو مدینہ میں ابھی زندہ ہیں، وہ اس کے راوی ہیں تو اس وقت تک چین نہ لیتا جب تک کہ مدینہ پہنچ کر خود ان صحابی سے اس روایت کو نہ سنتا۔" (ابن سعد ج ۷ ص ۸۲)

ہر چیز سے الگ ہو کر آزادی کے ساتھ تحصیل علم کا وسیع میدان ان کے سامنے آ گیا تھا اور جو بلندیاں دین و دنیا کی اس کی بدولت ان کو میسر آئی تھیں اس کو بیان کرتے ہوئے یہی ابو العالیہ کہا کرتے کہ :

"خداوند تعالیٰ کی دو نعمتوں میں سے فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس نعمت کا شکر زیادہ ادا کروں، یعنی ایک نعمت تو یہ ہے کہ خدا نے مجھے مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور اسی کے ساتھ دوسرا انعام خدا کا میرے ساتھ یہ ہوا کہ حروریہ کی جماعت سے اس نے مجھے نجات دی۔" (ص ۸۲)

میں نے جو یہ لکھا کہ خاندانی قصوں قضیوں کے سوا سیاسی بکھیڑوں میں الجھنے کے مواقع موالی کے لئے قدرتاً کم تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ ابو العالیہ کے بیان کے آخری فقرے میں شاید اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حروریہ یعنی خارجیوں کی جماعت جیسا کہ معلوم ہے اسلامی حکومت میں یہ پہلی انارکسٹ[1] جماعت تھی۔ حکومتِ قائمہ کے خلاف شورش و فساد یہی ان کا مشغلہ تھا۔ ان ہی کا دوسرا نام خوارج بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو العالیہ کو ان ہی انارکسٹوں (نزاجیوں) نے شروع میں اپنا ہمنوا بنا لیا تھا، لیکن اس قسم کے سیاسی گھن چکروں کی بے حاصلی بہت جلد ان پر واضح ہو گئی۔

---

[1] یعنی نزاج پھیلانے والی۔

مسلمان ہوجانے کی وجہ سے دینی علوم کی وقعت وعظمت ان کے قلب میں قائم ہوئی اور سیاست کے ان ناپاک گورکھ دھندوں سے نکل جانے کی وجہ سے ان علوم کی تحصیل کا کھلا ہوا میدان ان کو مل گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غریب عربی خاتون کے غلام کو دیکھا گیا کہ صرف صحابی ہی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی عم زاد بھائی حبرالامت ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اسی غلام کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں، جیسا الذہبی نے خود ابوالعالیہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَرْفَعُنِيْ عَلٰى سَرِيْرِهٖ وَقُرَيْشٌ اَسْفَلَ مِنْهُ وَيَقُوْلُ هٰكَذَا الْعِلْمُ يَزِيْدُ الشَّرِيْفَ شَرَفًا وَيُجْلِسُ الْمَمْلُوْكَ عَلَى الْاَسِرَّةِ۔

(ج ۱ ص ۵۸)

ابن عباسؓ مجھے اپنے ساتھ اس تخت پر بٹھالیا کرتے تھے (جس پر وہ خود بیٹھے ہوتے) اور قریش تخت کے نیچے فرش پر بیٹھے ہوتے۔ ابن عباس (تخت پر مجھے بٹھانے کے بعد قریش کے ان لوگوں کی طرف خطاب کر کے کہتے) کہ علم یوں ہی آدمی کی عزت کو بڑھا دیتا ہے وہ بیٹھتا ہے جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس علم نے ان کو اتنی بلندی عطا کی تھی اس کے حصول میں ان ہی دو نعمتوں یعنی اسلام اور فتنہ انگیز سیاست سے نجات، چونکہ ان ہی دونوں کو دخل تھا اس لئے خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے زیادہ ان کی نگاہ میں ان ہی دونوں نعمتوں کو بہت زیادہ اہمیت تھی حالانکہ ملوک بنی امیہ جنہوں نے اسلام کے نظریۂ خلافت کو مسترد کر کے اپنی ساری سیاسی بازی گریوں کا محور اس نصب العین کو بنا لیا تھا کہ بخت واتفاق سے جو حکومت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے، اس کا تسلسل ان ہی کے خاندان میں باقی رہے، پھر اس نصب العین کے تحت جن ناکردنیوں کے ارتکاب پر وہ آمادہ ہوئے ان سے کون ناواقف ہے۔ ایک طرف ان کا یہ حال تھا کہ عرب ہی نہیں، قریشی بلکہ قریشیوں میں بھی بنی ہاشم جن سے قریب ترین رشتہ دار عربی قبائل میں ان کا کوئی نہ تھا، ان کے درپئے آزار تھے، بنی ہاشم کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق تھا، اس راہ میں اس کا خیال بھی ان کے سامنے کبھی نہیں آیا لیکن دوسری طرف جیسا کہ سیاست کا عام قاعدہ ہے، سادہ لوح عوام کی آنکھوں میں نماک جھونک

کر کام نکالنے والے کام نکالتے ہیں۔ دیکھا جا رہا ہے کہ بنی امیہ کے یہی حکمران عربوں کی قدیم جاہلی حمیت جس کا اسلام خاتمہ کر چکا تھا اسی کی مردہ لاش میں نئی روح پھونک رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ موالی جن کا عموماً عربوں سے نسلی تعلق نہ تھا باوجود مسلمان ہونے کے عموماً ان حقوق سے بنی امیہ کے عہد میں محروم کر دیئے گئے تھے جو اسلام ان کو عطا کر چکا تھا، کسی اور سے نہیں امام الائمہ امام ابوحنیفہؒ سے ان کے مشہور شاگرد حسن بن زیاد القاضی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام صاحب فرماتے تھے:

كَانَتْ وُلَاةُ بَنِيْ أُمَيَّةَ لَا يَدْعُوْنَ بِالْمَوَالِيْ مِنَ الْفُقَهَاءِ لِلْفُتْيَا (مناقب الخوارزمی ج ا ص۱)

بنی امیہ کے حکام اور افسروں کا قاعدہ تھا کہ فتویٰ دریافت کرنے کے لئے الموالی کے فقہاء کو نہیں بلایا کرتے تھے۔

اور یہ تو خیر معمولی بات تھی، خیال تو کیجئے بصرہ کے مشہور امام عبداللہ بن عون جن کا تذکرہ کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے کہ

"علم میں وہ اپنے وقت کے امام تھے، خدا پرستی، ریاضت و عبادت میں ان کا شمار چوٹی کے بزرگوں میں تھا، اپنی ایک ایک سانس کی نگرانی کرتے تھے کہ بیکار ضائع نہ ہو۔ الغرض ان کی شان بہت بڑی تھی"۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۴۸)

لیکن جانتے ہیں کہ اسی کبیر الشان، راسخ فی العلم والسالہ، حافظ حدیث، فقیہ جلیل کو محض اس لئے کہ چونکہ نسلاً عرب نہیں بلکہ موالی میں سے تھے بصرہ کے گورنر بلال بن ابی بردہ نے باندھ کر کوڑے سے پٹوایا اور کس جرم میں پٹوایا، ابن سعد نے لکھا ہے:

لِأَنَّهُ تَزَوَّجَ امْرَأَةً عَرَبِيَّةً (ج ۷، ص ۲۶، قسم دوم)

اس لئے پٹوایا کہ ایک عربی نژاد خاتون سے انہوں نے نکاح کیا تھا۔

اسلام نے تو زنا کی سزا تازیانہ مقرر کی ہے، لیکن ایک مسلمان نے ایک مسلمان عورت سے باوجودیکہ نکاح کیا تھا مگر چونکہ نکاح کرنے والا نسلاً عربی نہیں اس لئے عربی خاتون سے اس کے نکاح کو بھی العیاذ باللہ اس جاہلی حکومت نے گویا سفاح ہی قرار دے رکھا تھا اور جب ابن عون جیسے آدمی کے ساتھ حکومت

کا یہ برتاؤ تھا تو عام موالی کا جو حال ہوگا ظاہر ہے[1]۔ مگر اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی بھولنا نہ چاہئے کہ یہ سارا قصہ جو کچھ بھی تھا، وقت کے حکمرانوں تک محدود تھا، ان کو تو عرب سے فی الحقیقت بحث تھی اور نہ غیر عرب سے سروکار تھا، ان کے سامنے اپنی خاندانی چھچھوری خودغرضی کے سوا کوئی بلند نصب العین نہ تھا۔ بنی امیہ نے اپنے زمانے میں عربوں کو ابھار کر کام نکالنا چاہا، ان کے بعد جب عباسی آئے تو اپنے مقاصد کے لحاظ سے عربوں کے دبانے میں ان کو کامیابی نظر آئی پھر کون نہیں جانتا کہ ان ہی

---

[1] الذہبی کے حوالہ سے جیسا کہ میں نے نقل کیا ہے، درحقیقت اپنے وقت کے ابن عون بہت بڑے آدمی تھے رجال وسیر کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ان کے حالات لکھے گئے ہیں علم و فضل زہد و عبادت کے سوا اخلاقی معیار بھی غیر معمولی طور پر بلند تھا۔ لکھا ہے کہ ان کی ایک بڑی قیمتی اونٹنی تھی جسے اس کی خوبیوں کی وجہ سے ابن عون بہت چاہتے تھے اسی پر حج بھی کرتے تھے اور جہادی مہموں پر بھی اسی پر سوار ہو کر تشریف لے جاتے۔ ان کا غلام جو اس اونٹنی کی خدمت کرتا تھا ایک دن ایک کوڑا اس بیچاری کو رسید کیا کہ اس کی ایک آنکھ پھوٹ کر بہہ گئی۔ غلام کے بھی ہوش جاتے رہے، اور دیکھنے والوں نے بھی دل میں کہا کہ آج ابن عون کا دن دیکھنے کا دن ہوگا، یعنی آج بھی ان کو غصہ نہ آئے مشکل ہے۔ بہرحال غلام اونٹنی کے ساتھ سامنے آیا، دیکھا، دیکھ کر، بولے تو صرف اتنا بولے کہ بندۂ خدا چہرے کے سوا مارنے کیلئے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر غلام کی طرف خطاب کر کے فرمایا جا، میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ یہ تھا سارا غصہ جس کا ظہور اس شکل میں ہوا وہی بلال بن ابی بردہ جس نے کوڑے سے ان کو پٹوایا تھا لکھا ہے کہ کسی دن ابن عون سے نہیں سنا گیا کہ بلال کے مظالم کا کسی سے عمر بھر انہوں نے کبھی ذکر کیا ہو۔ ایک دن ان کی مجلس میں کسی صاحب نے بلال کا نام لے کچھ کہنا چاہا، روک کر بولے سنو! لوگ ظالم کے ظلم کا چرچا پھر اس بری طرح شروع کر دیتے ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں کہ آخر میں ظالم ہی مظلوم بن جاتا ہے۔ یہ بلال بن ابی بردہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں بصرہ کے والی و گورنر تھے۔ ایک دلچسپ لطیفہ ابن عون کے متعلق مورخین نے نقل کیا ہے کہ بصرہ میں چند مکانات ابن عون کے تھے جو کرایہ پر چلتے تھے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ عموماً مسلمانوں کو کرایہ پر مکان دینے سے گریز کرتے ہیں۔ وجہ پوچھی گئی، بولے کہ کرایہ دار دل کا قاعدہ ہے کہ ختم ماہ پر کرایہ کی فکر ان کی جان کھانے لگتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے کسی مسلمان کے قلب میں دہشت اور خوف ڈالوں۔ خود اپنے دو منزلہ مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے اور نچلی منزل عیسائیوں کو کرایہ پر دے رکھی تھی۔ کہتے تھے کہ بجائے مسلمانوں کے نصرانیوں کو اپنے نیچے رکھنا زیادہ بہتر خیال کرتا ہوں۔ وفات بھی ان کی عجیب طرح سے ہوئی، جمال جہاں آرا، رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی دید کی تمنا رکھتے تھے۔ آخر ایک دفعہ خواب میں یہ دولت بیدار میسر آئی، آنکھ جس وقت کھلی تو شدت سرور سے اتنے بے خود تھے کہ اوپر سے نیچے اترتے ہوئے قدم کو سنبھال نہ سکے چکرا کر گر پڑے سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے لاکھ اصرار کیا کہ علاج کرائیے لیکن راضی نہ ہوئے۔ غالباً جینے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا، اسی میں وفات ہوئی ہے ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ (ابن سعد ج ۷، ص ۲۹ قسم دوم)

عباسیوں نے اور جو کچھ کیا اس کی داستان تو طویل اور کافی دردناک ہے لیکن عباسیوں کی حکومت کے بانی ابراہیم الامام نے ابو مسلم خراسانی کے نام یہ فرمان جو لکھا تھا، تاریخوں میں اب تک وہ محفوظ ہے یعنی

لَا يَدَعُ بِخُرَاسَانَ مَنْ يَتَكَلَّمُ بِالْعَرَبِيَّةِ — ہر وہ شخص جو عربی بولتا ہو اس کو خراسان میں زندہ نہ چھوڑا جائے۔

(کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۲۷)

لیکن ان حکمرانوں کے حالات کو عام امت مسلمہ کی طرف منسوب کر دینا نہ صرف غلطی بلکہ میرے نزدیک بدترین علمی خیانت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملوک بنی امیہ موالی کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، لیکن خود مسلمانوں کا حال کیا تھا۔ اور تو اور خانوادۂ نبوت کے گوہر شب چراغ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ابن سعد ہی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت والا نے اپنے غلام کو آزاد کیا اور آزاد کرنے کے بعد اپنی صاحبزادی صاحبہ کا اسی مولیٰ سے نکاح کر دیا۔ اسی کے ساتھ اپنی ایک شرعی لونڈی کو بھی آزاد کر کے خود اپنا نکاح اس سے کیا۔ یہ خبر دار الحکومت دمشق پہنچی، عبدالملک حکمرانِ وقت کو حضرت کے اس فعل کی جب خبر ہوئی تو آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا، صرف ایک خط حضرت کے نام لکھا، جس میں آپ کے خاندانی شرافت و نجابت کا ذکر کر کے نکاح کے اسی قصہ پر طنز و طعن سے کام لیتے ہوئے تیز و تند فقرے عبدالملک نے استعمال کئے تھے۔ جواب میں سیدنا الامام نے ارقام فرمایا کہ

قَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ قَدْ أَعْتَقَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ وَتَزَوَّجَهَا وَأَعْتَقَ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ وَزَوَّجَهُ ابْنَةَ عَمَّتِهِ زَيْنَبَ بِنْتَ جَحْشٍ۔

یقیناً تم لوگوں کے لئے بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہودیہ خاتون) صفیہ بنت حیی کو آزاد فرمایا اور ان سے نکاح کیا، اسی طرح زید بن حارثہ (اپنے غلام) کو آزاد کیا اور اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے اسی آزاد شدہ غلام زید کا عقد کر دیا تھا۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۱۵۶)

حضرت امام زین العابدین کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے مولیٰ زید بن اسلم

جن کا مسجدِ نبوی میں تعلیمی حلقہ تھا، عموماً استفادے کے لئے اسی حلقہ میں جاکر شریک ہوتے، بعض جاہلی حمیت والوں نے پوچھا بھی کہ قریش کی مجلس کو چھوڑ کر ایک مولیٰ کے حلقہ میں جاکر آپ بیٹھتے ہیں، اس وقت بھی ارشاد ہوا کہ

جس سے نفع پہنچے، آدمی کو وہیں بیٹھنا چاہئے۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۱۶۰)

ابھی آپ مجھ ہی سے ابوالعالیہ کا وہ قصہ سن چکے کہ صنادید قریش نیچے بیٹھے رہے اور ابن عباسؓ نے ابوالعالیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا۔ ابن سعد میں اسی روایت کا جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ ہی کا یہ واقعہ ہے جہاں کی جامع مسجد میں لاکر ابوالعالیہ کو ان کی مالکہ نے خدا کے نام آزاد کیا تھا، بلکہ اسی میں یہ بھی ہے کہ ابوالعالیہ اس قصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ

دَخَلْتُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ وَهُوَ اَمِيْرُ الْبَصْرَةِ فَنَاوَلَنِيْ يَدَهٗ حَتّٰى اسْتَوَيْتُ مَعَهٗ عَلَى السَّرِيْرِ۔

(ابن سعد ج ۷، ص ۸۲)

میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس زمانے میں وہ بصرہ کے امیر (گورنر) تھے۔ مجھے دیکھ کر ابن عباسؓ نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا (اور پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا) حتیٰ کہ اُس تخت پر بالکل ان کے برابر بیٹھ گیا۔

اسی میں یہ بھی ہے کہ اس وقت ابوالعالیہ معمولی گھٹیا درجے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے[1]۔ اور ایک یہی کیا فاروقِ اعظمؓ کے صاحبزادے ان ہی دنوں میں جب بنی امیہ موالی کے ساتھ وہ سلوک کر رہے تھے جس کی طرف اشارہ کیا گیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا جاتا تھا کہ بنی مخزوم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) مجاہد بن جبر گھوڑے پر سوار ہیں اور ابن عمرؓ ان کی رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ خود مجاہد بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] ابوالعالیہ ہی کا بیان ہے کہ کل پندرہ درم دام ان سارے کپڑوں کا تھا جو میرے جسم پر تھے، پھر پوچھنے پر تفصیل بھی بتائی کہ لنگی کل تین درم میں اس وقت مل جاتی تھی اور رازی کپڑے کا تھان بارہ درم میں خرید کر لیا کرتا تھا، جس سے میری چادر اور عمامہ دونوں بن جاتے تھے۔ ان کے اس بیان سے اس زمانہ میں کپڑوں کی ارزانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ (دیکھو طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۸۴ قسم دوم)

رُبَمَا اَخَذَ نِی ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا بِالرِّکَابِ (تذکرہ ج۱) بسا اوقات ابن عمرؓ میرے گھوڑے کی رکاب تھام لیتے۔
اور یہ اسی علم کا نتیجہ تھا جسے صحابہ کی صحبتوں میں مجاہد نے حاصل کیا تھا، آج بھی ان کا شمار ائمہ مفسرین میں ہے[۱]۔

ظاہر ہے کہ امام زین العابدین، ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اکابر کے مقابلہ میں مسلمانوں کی عام جماعت حکومت کی کیا پرواہ کرسکتی تھی، غلام طبقہ کے علمار کی عظمت و احترام کا عام مسلمانوں میں یہ حال تھا کہ اور تو اور پیغمبرؐ کے شہر مدینہ میں کوفہ کے مولیٰ عالم حکم بن عقبہ جب کبھی تشریف لاتے تو لکھا ہے کہ

خَلَّوْا لَہٗ سَارِیَۃَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
محض حکم کے خیال سے تاکہ ان کو نماز پڑھنے کا موقع ملے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستون کو (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی جگہ) ان کے لئے مدینہ والے خالی چھوڑ دیتے تھے۔ (تذکرہ ج۱ ص۱۱)

ان ہی موالی علمار میں کوفہ ہی کے ایک مشہور عالم حبیب بن ثابت تابعی ہیں، ابو یحیی القتات کے حوالہ سے ذہبی ہی نے نقل کیا ہے کہ طائف کے سفر میں میں ان کے ساتھ تھا۔ ابو یحیی کا بیان ہے کہ جس وقت طائف میں ہمارا داخلہ ہوا تو حبیب کے احترام میں وہاں کی خلقت کچھ اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی کہ
کَاَنَّمَا قَدِمَ عَلَیْھِمْ نَبِیٌّ (تذکرہ ج۱ ص۱۰۹) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوفہ والوں کے یہاں کوئی پیغمبر آگیا ہے۔

موالی کے اس طبقہ کے ساتھ عام مسلمانوں کی اس احترامی گرویدگی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تو مسلمان، حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس زمانے کے یہود و نصاریٰ کا بھی حال یہ ہوگیا تھا کہ منصور بن زاذان جو اسی موالی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، واسط میں قیام تھا، جب ان کی وفات ہوئی تو عباد بن العوام جو اس وقت کم سن تھے اور جنازے میں منصور کے شریک تھے بیان کرتے ہیں کہ

فَرَأَیْتُ النَّصَارٰی عَلٰی حِدَۃٍ وَالْیَھُوْدَ عَلٰی حِدَۃٍ
میں نے منصور کے جنازے میں (مسلمانوں کے سوا) دیکھا کہ عیسائیوں کا ایک گروہ بھی الگ اس جنازے میں شریک ہے اور یہودیوں کا گروہ بھی الگ ہے۔

---

[۱] یہ وہی مجاہد بن جبیر ہیں جنھوں نے بحیرہ روم کے مشہور جزیرہ روڈس میں قیام اختیار کرلیا تھا اور وہیں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ (البلاذری ص ۲۴۴)

اتنا ہجوم تھا کہ عباد کہتے ہیں:

قَدْ اَخَذَ خَالِیْ بِیَدِیْ مِنْ کَثْرَۃِ الزِّحَامِ (تذکرہ ۱۳۳) میرے ماموں نے میرا ہاتھ ہجوم کی کثرت کے خوف سے پکڑ لیا

"مسلمان اور موالی" کا یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ اس پر چاہنے والے چاہیں تو اچھی خاصی کتاب لکھ سکتے ہیں۔ میں نے چند برجستہ مثالیں جو رجال کی عام کتابوں میں درج ہیں ان کا ذکر کر دیا ہے سچ پوچھئے تو ان بے اعتنائیوں کے باوجود جو حکومت ان موالی کے ساتھ اختیار کئے ہوئے تھی لیکن پھر بھی بسا اوقات اسی حکومت کو رائے عامہ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

مصر کے مولیٰ عالم و فقیہ یزید بن حبیب کے حالات میں لکھا ہے کہ بیچارے حالانکہ حبشی خاندان کے آدمی تھے، ابن لہیعہ یہ کہنے کے بعد کہ کَانَ اَسْوَدُ نُوْبِیًّا (یزید سیاہ حبشی تھے) کہتے ہیں کہ کَانَّہٗ فَحْمَۃٌ (گویا یزید کوئلہ تھے) مگر علم و فضل و دیانت و تقویٰ کا جو نور ان سے پھوٹ پھوٹ کر سارے مصر کو منور کئے ہوئے تھا، اس نے مصر میں یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ حکومت کی گدی پر نیا حکمران جب بیٹھتا اور بیعت لینے والے مصر کے باشندوں سے بیعت لینے کے لئے جب آتے تو ہر ایک کا جواب یہی ہوتا کہ یزید بن حبیب اور ان ہی کے ہمعصر ایک دوسرے مولیٰ عالم عُبَیْدُ اللہ بن ابی جعفر جو کچھ کریں گے وہی ہم بھی کریں گے۔ الذہبی نے لیث بن سعد کے حوالہ سے ان کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

هُمَا جَوْهَرَتَا الْبِلَادِ کَانَتِ الْبَیْعَۃُ اِذَا جَاءَتْ لِلْخَلِیْفَۃِ هُمَا اَوَّلُ مَنْ یُّبَایِعُ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۲۲)

یہی دونوں (یعنی یزید اور عبید اللہ) ملک کے تابناک جواہر تھے، جب خلیفہ کی طرف سے بیعت لینے کے لئے لوگ آتے تو یہی دونوں پہلے بیعت کرتے تھے۔

یہی لیث بن سعد جن کا ذکر پہلے بھی کہیں گزر چکا کہ مصر کے امراء میں تھے لیکن جب یزید کا ذکر کرتے تو کہتے کہ

یَزِیْدُ عَالِمُنَا وَیَزِیْدُ سَیِّدُنَا (۰) یزید ہمارے ملک کے عالم ہیں، یزید ہمارے سردار اور پیشوا ہیں

مصر میں لیث بن سعد کا جو مقام تھا اس سے آگاہ ہونے کے بعد "سیدنا" کے اس لفظ کا صحیح وزن آدمی محسوس کر سکتا ہے یا بصرہ کے مشہور محدث ایوب السختیانی جو موالی ہی میں سے تھے، خواجہ حسن بصریؒ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھری مجلسوں میں کہتے:

هُوَسَيِّدُ شَبَابِ أَهْلِ الْبَصْرَةِ (ص ۱۲۳) بصرہ کے نوجوانوں کے سردار وہی ہیں۔

اسی طرح سوار بن عبداللہ کے حوالہ سے ابن سعد نے نقل کیا ہے، کہا کرتے تھے کہ

كَانَ مُحَمَّدُ بْنُ سِيْرِيْنَ وَالْحَسَنُ سَيِّدَيْ أَهْلِ هٰذَا الْمِصْرِ عَرَبِهَا وَمَوْلَاهَا (ابن سعد ج ۷، ص ۱۲۳) محمد بن سیرین اور (خواجہ) حسن بصری (یہ دونوں خاندان موالی سے تعلق رکھتے تھے) اس شہر کے سردار ہیں، عربوں کے بھی اور غیر عربوں کے بھی۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بصرہ کے باشندوں پر ان اقوال کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ بلاشبہ حکومت لاٹھی کے زور سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکاتی تھی۔ لیکن سچ کہا ہارون کی ملکہ زبیدہ نے جب ہارون کے ساتھ سفر میں تھی اور شہر رقہ میں قیام تھا، اسی عرصے میں **عبداللہ بن المبارک** جو علماء موالی ہی میں تھے خبر مشہور ہوئی کہ آج شہر میں آنے والے ہیں۔ لکھا ہے کہ زبیدہ ایک چوبی قصر کے جھروکے سے شہر کے بیرونی سواد کا نظارہ کر رہی تھی کہ اچانک غل شور ہنگامہ کی آواز بلند ہوئی، بقول خطیب اِرْتَفَعَتِ الْغَبَرَةُ وَتَقَطَّعَتِ النِّعَالُ (گرد اڑی، جوتیاں لوگوں کی ٹوٹ رہی تھیں) زبیدہ نے پوچھا کہ قصہ کیا ہے؟ جس وقت یہ جواب دیا گیا کہ ابن المبارک آج رقہ آرہے ہیں، شہر والے ان کے استقبال کو نکلے ہیں، تو کہنے لگی:

هٰذَا وَاللّٰهِ الْمُلْكُ لَا مُلْكَ هَارُوْنَ الَّذِيْ لَا يَجْمَعُ النَّاسَ إِلَّا بِشُرَطٍ وَّ أَعْوَانٍ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۵۷) یہ ہے خدا کی قسم حکومت، نہ کہ ہارون کی حکومت، جس کے لئے لوگ پولیس اور پولیس کے ملازمین کے ذریعہ جمع ہوتے ہیں۔

آخر خود سوچئے یہ روایت حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ **عکرمہ** کے متعلق ابن سعد نے ایوب السختیانی کے حوالہ سے جو نقل کی ہے اگر صحیح ہے کہ عکرمہ جب بصرہ پہنچے تو

فاجمع الناس عليه حتى اصعد فوق ظهر بيت (ج ۵ ص ۲۱۳) لوگ عکرمہ کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے حتیٰ کہ گھر کی چھتوں پر بھی چڑھ گئے۔

اگر سلاطین اور ملوک کے لئے یہ نظارہ قابلِ رشک ہو تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے۔

ابن شہاب زہری اور عبدالملک کا تاریخی مکالمہ

بہرحال ان قصوں کو کوئی کہاں تک بیان کرے، اسلامی تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے معمور ہیں۔ میری غرض ان واقعات کے ذکر سے یہ ہے کہ موالی کا جو طبقہ مسلمانوں میں تھا، ان کے مذکورۂ بالا خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچنا چاہئے۔ نہ صرف دین بلکہ دنیا میں جس علم کی بدولت حکومت کے علی الرغم رفعت و اقتدار کی راہیں ان پر کھل رہی تھیں اس علم کے ساتھ ان کے انہماک و استغراق کی جو کیفیت ہو سکتی ہے کیا کوئی اس کی حد مقرر کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کارنامے بھی ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں کیا کسی وجہ سے ان میں شک کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ عبدالملک بن مروان، مروانی حکمران اور زہری کے جس مکالمہ کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی کہتے ہیں کہ ابن شہاب زہری، عبدالملک کے دربار میں ایک دفعہ پہنچے تو اس نے پوچھا کہ زہری کیا بتا سکتے ہو کہ مسلمانوں کے مختلف امصار اور شہروں میں آج کل سب سے بڑے عالم جو مرجع انام ہوں کون کون لوگ ہیں؟ زہری نے کہا کیوں نہیں۔ فرمایئے کس کس شہر کے ائمہ کو بتاؤں۔ عبدالملک نے حسب ذیل ترتیب سے پوچھنا شروع کیا:

عبدالملک۔ تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟

زہری۔ مکہ معظمہ سے۔

عبدالملک۔ مکہ میں کس شخص کو چھوڑ کر آئے جو اس وقت مکہ والوں کی پیشوائی کر رہا ہے؟

زہری۔ عطار بن ابی رباح۔

عبدالملک۔ عرب خاندان کے آدمی ہیں یا موالی سے ان کا تعلق ہے؟

زہری۔ موالی سے۔

عبدالملک۔ کس چیز نے عطار کو یہ مقام عطا کیا؟

زہری۔ دین اور حدیثوں کی روایت نے۔

عبدالملک۔ ٹھیک ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہیں ہی ایسی کہ آدمی کو پیشوائی عطا کریں۔ خیر بتاؤ کہ یمن کا

امام اور پیشوا مسلمانوں کا آج کل کون ہے ؟

زہری۔ طاؤس بن کیسان۔

عبدالملک۔ کیا عرب سے نسلی تعلق وہ رکھتے ہیں یا موالی سے ہیں ؟

زہری۔ موالی سے۔

عبدالملک۔ اس شخص کو کس چیز نے یہ بڑائی عطا کی ہے ؟

زہری۔ ان ہی باتوں نے جس نے عطاء کو بڑھنے کا موقعہ دیا۔

عبدالملک۔ اچھا مصر کا امام ان دنوں کون ہے ؟

زہری۔ یزید بن ابی حبیب۔

عبدالملک۔ عرب ہیں یا موالی میں سے یہ بھی ہیں ؟

زہری۔ موالی ہی سے ان کا بھی تعلق ہے۔

عبدالملک۔ اور شام کا پیشوا آج کل کون ہے ؟

زہری۔ مکحول

عبدالملک۔ عرب یا موالی ؟

زہری۔ موالی سے ان کا بھی تعلق ہے۔ غلام تھے، قبیلہ ہذیل کی ایک عورت نے ان کو آزاد کیا تھا۔

عبدالملک۔ جزیرہ (یعنی فرات و دجلہ کے درمیانی علاقوں) کا امام کون ہے ؟

زہری۔ میمون بن مہران۔

عبدالملک۔ مولیٰ ہیں یا عربی ؟

زہری۔ مولیٰ۔

عبدالملک۔ خراسان کا سب سے بڑا آدمی آج کل کون ہے ؟

زہری۔ ضحاک بن مزاحم۔

عبدالملک۔ مولیٰ یا عربی ؟

زہری۔ موالی۔

عبدالملک۔ بصرہ کا بتاؤ کہ امام کون ہے؟

زہری۔ حسن بن ابی الحسن (یعنی خواجہ حسن بصری)

عبدالملک۔ موالی ہیں یا عربی؟

زہری۔ موالی۔

عبدالملک۔ ویلک (تجھ پر افسوس ہے) آخر کوفہ میں مسلمانوں کی دینی پیشوائی کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟

زہری۔ ابراہیم النخعی۔

عبدالملک۔ کیا یہ بھی موالی ہیں یا عربی النسل؟

زہری۔ جی ہاں، یہ عربی النسل عالم ہیں۔

عبدالملک۔ اف، زہری اب جا کر تم نے ایک بات سنائی جس سے غم کا بادل میرے دل سے کچھ ہٹا

بعض روایتوں میں ہے کہ عبدالملک نے کہا کہ یہ آخری جواب تم اگر نہ سناتے تو قریب تھا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے۔

اس کے بعد عبدالملک اپنے درباریوں کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا:

"قطعاً یہ موالی (غیر عربی مسلمان) عرب کے سردار اور پیشوا بن کر رہیں گے، یہ ہو کر رہیگا کہ منبر پر ایک موالی چڑھا ہوا خطبہ پڑھ رہا ہے اور اسی منبر کے نیچے عرب بیٹھے ہیں۔"

غیظ و غضب کے لہجہ میں عبدالملک یہ اور اسی قسم کی باتیں جوش میں کہہ رہا تھا، زہری نے تب کہا کہ

"امیرالمؤمنین! یہ اللہ کی بات ہے اور اس کا دین ہے جو بھی اس کا علم حاصل کرے گا اور اس کا عالم بنے گا وہی پیشوا بن جائے گا اور جو اس علم سے بے اعتنائی اختیار کریں گے وہ گریں گے ان کو گرنا پڑیگا۔"

---

[1] اس مکالمہ کا تذکرہ حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۹۸ میں بھی کیا ہے۔ حاکم کے سوا ابن صلاح نے مقدمہ میں، سیوطی نے تدریب میں، سخاوی نے فتح المغیث میں بھی اس قصہ کو دہرایا ہے۔ محدثین کی کتابوں کے علاوہ فقہاء کے طبقات و مناقب میں بھی اس مکالمہ کا رد و بدل سے ذکر ملتا ہے۔ بعض روایتوں میں بجائے عبدالملک کے دوسرے اموی خلفاء کی طرف اس مکالمہ کو منسوب کیا گیا ہے۔ نیز بعض کتابوں میں بجائے ابراہیم کے عربی النسل عالم سعید بن المسیب عالم مدینہ کو قرار دیا گیا ہے۔

عرب بھی موالی کی علمی خدمات سے مستفید ہونے پر مجبور تھے

بیچارے عبدالملک کے لئے موالی کا یہ حال سخت دماغی کوفت کی وجہ بنا ہوا تھا، اسلام نے ہر عربی و غیر عربی کو عام اجازت دے رکھی تھی، بلکہ سب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن پڑھیں، حدیثیں سیکھیں، فقیہ بنیں، اجتہاد کریں، اسی بنیاد پر لوگ سیکھ رہے تھے، سب کو سکھایا جارہا تھا، پڑھایا جارہا تھا اور اپنے اپنے علم اور کمال کے مطابق مسلمانوں میں امتیازی مقامات کے مالک بنتے چلے جارہے تھے، دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ خود عبدالملک کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے معلم کی ضرورت ہوئی۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے عبدالملک کی نظر میں جو آدمی جچا، ان کا تعلق بھی موالی ہی کے طبقہ سے تھا، ان کا نام اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر تھا۔ بیچارہ کیا کرتا، مجبوراً ان ہی کو شہزادوں کا معلم مقرر کرنا پڑا۔ لکھا ہے کہ اس خدمت پر اسماعیل کو مقرر کرنے کے بعد عبدالملک نے کہا:

> "عرب اور غیر عرب (یعنی عجمیوں) کے تعلقات کی جو نوعیت ہو گئی ہے، عجیب ہے۔ مجھے تو اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ان ایرانیوں ہی کو دیکھو، حکومت کی باگ صدہا سال ان کے ہاتھوں میں رہی، اس پورے طویل عرصے میں ان کو ہماری یعنی عرب کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ ایک مردک نعمان بن منذر کا نام لیا جاتا ہے جس سے ایرانی حکومت نے کام لیا تھا اور پھر یہ قصہ بھی زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ اس غریب نعمان کو بھی آخر ایرانی قتل کر کے رہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ کتنے دن ہوئے ہمارے ہاتھ حکومت آئی ہے لیکن غیر عربی اقوام سے مدد لینے پر اس مختصر مدت میں بھی ہم مجبور ہو گئے ہیں، حد یہ ہے کہ تعلیم تک میں ہم ان عجمیوں کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ اسی اسماعیل بن عبید کو دیکھو! امیرالمومنین (مسلمانوں کے بادشاہ) کے بچوں کو پڑھاتا ہے اور کیا پڑھاتا ہے، عربیت سکھاتا ہے۔" (ابن عساکر ج ۲ ص ۲۷)

عبدالملک کے سامنے یہی نکتہ تو اوجھل تھا کہ اسلام صرف عرب کے لئے یا ان کو ساری دنیا کا فاتح بنانے اور دنیا کو ان کا مفتوح بنانے کے لئے نہیں آیا تھا، ایرانی ایران کے لئے اٹھے تھے، اس لئے ایران کے سوا! بھی ان کے دائرۂ حکومت میں تھے کسی کو ابھرنے کا موقع نہ دیتے تھے اور نہ دے سکتے تھے، لیکن

اسلام تو عام انسانیت اور سارے بنی آدم کی زندگی کا پیغام تھا۔ بیچارہ عبدالملک اسلام کو عربیت کا مرادف قرار دینا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسلام لانے کی وجہ سے ان غیر عربی موالی کی نظر میں اتنی بلندی پیدا ہو جاتی تھی کہ حکومت کے ہتھکنڈوں کے شکار بھی وہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان ہی اسماعیل بن عبید کے حال میں لکھا ہے کہ عبدالملک نے بلا کر جب فرمائش کی کہ میرے بچوں کو پڑھاؤ، تمہیں کافی معاوضہ دیا جائے گا۔ روئے زمین کا اس وقت جو سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا، یہ اس کا فرمان ہے لیکن اسماعیل نے انتہائی سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ

"امیرالمومنین! میں معاوضہ کیسے لے سکتا ہوں، مجھے ام الدرداء نے ابوالدرداء صحابی کے حوالہ سے یہ روایت سنائی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قرآن کی تعلیم پر جو اُجرت لے گا قیامت کے دن اس کے گلے میں آگ کی کمان چڑھائی جائے گی۔"

استغنا اور بے نیازی کے اس جواب کو سن کر عبدالملک اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا کہ

"قرآن کی تعلیم کا معاوضہ میں نہیں دوں گا، نحو وغیرہ سکھاؤ گے، اس کا معاوضہ پیش کروں گا۔" [1]

سخاوی نے فتح المغیث میں ایک بدوی کا لطیفہ نقل کیا ہے جو بصرہ آیا تھا۔ لوگوں سے اسی بدو نے پوچھا کہ یہاں کا سب سے بڑا آدمی مسلمانوں کا پیشوا آج کل کون ہے؟ جواب میں خواجہ حسن بصری کا نام لیا گیا۔ بولا کہ عرب ہیں یا موالی سے تعلق رکھتے ہیں؟ کہا گیا کہ موالی میں ہیں۔ گھبرا کر بدوی نے کہا کہ پھر اتنا بلند ہونے کا موقعہ اس کو کیسے مل گیا۔ واللہ اعلم یہ جواب کس نے دیا، لیکن حکیمانہ فقرہ تھا، بدوی سے کہا گیا:

سَادَهُمْ بِحَاجَتِهِمْ اِلٰی عِلْمِهٖ وَعَدَمِ احْتِیَاجِهٖ اِلٰی دُنْیَاهُمْ۔	عربوں کو حسن بصری کے علم کی ضرورت تھی، اور اس کو عربوں کی (مفتوحہ دنیا) کی حاجت نہ تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ (باوجود عربی نہ

[1] اسماعیل بن عبید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں افریقہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ابن عساکر کا بیان ہے کہ افریقہ کے عام باشندے جو بربر کہلاتے تھے، ان ہی اسماعیل بن عبید کی کوشش سے مسلمان ہوئے۔
(تاریخ دمشق ج ۳ ص ۲۷)

(فتح المغیث ص ۴۹۹) ہونے کے) ان کا سردار بن گیا۔

کہتے ہیں کہ یہ سن کر بدو ہنسا اور بولا:

هٰذَا لَعَمْرُكَ هُوَ السُّوْدَدُ۔ تمہاری زندگی کی قسم یہ ہے سرداری۔

خواجہ حسن بصری نے اپنے علم اور معلومات کا مسلمانوں کو کس حد تک محتاج بنا دیا تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ علی بن زید جو مکہ کے مشہور رئیس عبداللہ بن جدعان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اسی لئے لوگ ان کو علی بن زید ابن جدعان کہا کرتے تھے، انہوں نے صحابہ کو دیکھا تھا۔ ۱۳۱ھ ہجری میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ آخر زمانہ میں بصرہ کو وطن بنالیا تھا۔ بہرحال ان ہی علی بن زید کی رائے ابن سعد نے خواجہ حسن بصری کے متعلق یہ نقل کی ہے، کہتے تھے کہ

لَوْاَنَّ الْحَسَنَ اَدْرَكَ اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاحْتَاجُوْا اِلٰى رَأْيِهٖ۔ (ابن سعد ج ۷، ص ۱۱۷)

اگر حسن بصری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا زمانہ پالیتے (یعنی عالم ہونے کے بعد صحابہ کا زمانہ پاتے) تو قطعاً صحابہ بھی ان سے رائے لینے (اور فتوی پوچھنے میں) محتاج ہو جاتے۔

کسی غیر صحابی مسلمان اور وہ بھی جو موالی سے تعلق رکھتا ہو اس کی یہ انتہائی منقبت اور تعریف ہو سکتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حسن بصری کے متعلق متعدد طرق سے لوگوں نے اس قصہ کو جب نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص انس بن مالکؓ سے ان کے آخر عمر میں کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو بجائے جواب دینے کے فرماتے:

سَلُوْا مَوْلٰنَا الْحَسَنَ ہمارے مولیٰ حسن سے پوچھو۔

لوگ عرض کرتے کہ حضرت ہم تو آپ سے دریافت کرتے ہیں اور آپ فرمادیتے ہیں کہ ہمارے مولیٰ حسن سے پوچھو۔ جواب میں حضرت انسؓ فرماتے:

اِنَّا سَمِعْنَا وَسَمِعَ فَحَفِظَ وَنَسِيْنَا (ابن سعد ج، ص ۱۲۸ قسم اول)

ہم نے بھی سنا اور اس نے بھی، مگر ہم بھول گئے اور اس نے یاد رکھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت انسؓ کے اس قول کو جو حسن بصری کے حق میں ایک بہترین سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف لوگوں نے نقل کیا ہے لیکن حضرت انسؓ کا حسن کی طرف لوگوں کو واپس کرتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ مولیٰ کا اضافہ اور آخر میں اسی مولیٰ کے متعلق یہ اعتراف کہ تم نے بھی سنا اور اس نے بھی سنا، پر ہم بھول گئے اور اس نے یاد رکھا" کچھ تعجب نہیں کہ فاتح عرب اور مفتوح غیر عرب میں جو فرق پیدا ہو گیا تھا اس کی طرف بھی اس اعتراف میں کچھ اشارہ ہو۔

موالی علماء کی دینی جرأت

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جس علم کا حال اس زمانہ میں یہ تھا خود سوچنا چاہئے کہ اسی علم کے حصول میں کس برسوں کا یہ طبقہ جسے حکومت گرانا چاہتی تھی کیا کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا رکھ سکتا تھا اس طریقہ سے مسلمانوں کو اپنا محتاج اس طبقہ نے بنا لیا اور مسلمانوں خصوصاً عرب کے پاس جو دنیا تھی اس کے ساتھ پیغمبر کی حدیث کے ان خدام کا جو حال تھا اس کی عام مثالیں پہلے گزر چکی ہیں کہ کس طرح دولتمندوں کی دولت کو استغنا اور بے نیازی کی ٹھوکروں سے وہ ٹھکراتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم ہمارے محتاج ہو لیکن ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ بے نیازیوں کے ان مظاہرات میں علماء موالی کا جو حصہ تھا رجال کی کتابوں میں آپ کو اس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے۔ وہی یزید بن حبیبؒ مصری جن کے متعلق گزر چکا کہ ایک حبشی غلام تھے۔ ذہبی نے ان ہی کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ یزید ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ عوام کے قلوب میں ان کا جو مقام تھا اس کو دیکھتے ہوئے اس زمانہ میں بنی امیہ کی حکومت کی طرف سے مصر کا جو عرب گورنر تھا جس کا نام حوثرہ بن سہیل تھا اس نے ضروری خیال کیا کہ ان کے گھر عیادت کے لئے خود جائے۔ آیا۔ یزید بیٹھے ہوئے تھے۔ گورنر نے مزاج پرسی کے بعد یزید سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ کھٹمل کا خون کپڑے میں اگر لگا ہو تو اس کپڑے میں نماز جائز ہوگی یا نہیں؟ یزید نے حوثرہ کے اس سوال کو سن کر لکھا ہے کہ منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ حوثرہ جواب کا انتظار کر کے جانے کے لئے جب کھڑا ہوا تب یزید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

تَقْتُلُ كُلَّ يَوْمٍ خَلْقًا وَتَسْأَلُنِي عَنْ دَمٍ   روزانہ خدا کی مخلوق کو تو قتل کیا کرتا ہے اور مجھ سے آج

الْبَرَاغِيْثِ۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۲۲) کھٹمل کے خون کے متعلق مسئلہ پوچھتا ہے۔

بجز اس کے کہ خاموشی کے ساتھ ان کی تلملا دینے والی اس تعریض کو حوثرہ نے سن لیا۔ کچھ نہ بولا، اور چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔

اس بھی زیادہ دلچسپ لطیفہ **طاؤس بن کیسان** کا ہے، ان کا مستقر جیسا کہ معلوم ہے، یمن تھا، بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ تھا اور وہ بھی ان کا جبروتی عہد جب ان کی دولت کا طاغیہ حجاج مسلمانوں پر مسلط تھا، یمن کا گورنر اس زمانے میں اسی حجاج کا بھائی محمد بن یوسف تھا۔ قصہ یہ پیش آیا کہ کسی وجہ سے طاؤس بن کیسان اور ان کے ساتھ یمن کے دوسرے عالم وہب بن منبہ محمد بن یوسف کے دربار میں پہنچے، موسم سردیوں کا تھا، خصوصًا اس دن بڑے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ محمد بن یوسف نے کرسی منگوائی، طاؤس کرسی پر بیٹھے، سردی کا خیال کر کے محمد بن یوسف نے غلام کو آواز دی کہ فلاں دوشالہ لاؤ، لایا گیا۔ محمد نے حکم دیا کہ طاؤس کے اوپر اس کو ڈال دیا جائے۔ غلام نے یہی کیا۔ تماشہ یہیں سے شروع ہوتا ہے راوی کا بیان ہے کہ طاؤس منہ سے کچھ نہ بولے لیکن

لَمْ یَزَلْ یُحَرِّكُ كَتِفَیْهِ حَتّٰی اَلْقٰی عَنْهُ۔ دونوں مونڈھوں کو مسلسل طاؤس نے ہلانا شروع کیا تا اینکہ دوشالہ بالآخر ان کے کندھوں سے گر پڑا۔

لکھا ہے کہ محمد بن یوسف ان کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں آگ بگولا ہو رہا تھا۔ لیکن طاؤس کا جو اثر رائے عامہ پر تھا اس نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ کچھ بولتا۔ صرف ٹیڑھی، ترچھی نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا رہا۔ جب وہب اور طاؤس باہر نکلے تو وہب نے کہا کہ بھائی تم نے تو آج غضب ہی کر دیا آخر اس میں کیا بگڑتا تھا کہ اس دوشالے کو آپ لے لیتے۔ خواہ مخواہ اس شخص کی آگ میں آپ نے اشتعال دیا۔ آپ کو اس دوشالے کی ضرورت نہ تھی تو باہر نکل کر فروخت کر دیتے اور دام غربا و مساکین میں تقسیم فرما دیتے۔ طاؤس نے کہا کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا کہ لینے کی حد تک تو طاؤس کے فعل کو لوگ دلیل بنالیں گے لیکن جو طریقۂ عمل اس دوشالے کے ساتھ میں اختیار کرتا، اسے ترک کر دیں گے تو شاید میں یہی کرتا۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵)

استغنار و بے نیازی کے یہ واقعات کچھ ان ہی چند موالی کے ساتھ مختص نہیں ہیں بلکہ ان کے تمام سر برآوردہ بزرگوں میں آپ اسی شان کو پائیں گے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ لوگ موالی اور حکومت یا حکومت کے امراء اور عہدیداروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی اس نوعیت کو سامنے رکھ کر اگر سوچیں گے تو سمجھ سکتے ہیں کہ جس علم کی بدولت عامہ مسلمین میں عظمت وجلال کے ان مقامات کو موالی کا یہ طبقہ حاصل کر رہا تھا اگر اس راہ میں معمولی بے احتیاطیاں بھی ان سے سرزد ہوتیں تو سر پھروں کے اس گروہ کے سر پر حکومت اور حکومت والے کیا ایک بال بھی باقی رکھ سکتے تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ ملوک بنی امیہ اپنے طریقۂ حکومت کے لحاظ سے جس حد تک قابل ملامت والزام ہوں لیکن پھر بھی اس دعوے سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے بادشاہ اور ان کے دینی و دنیوی حقوق کے محافظ ہیں۔ واقع میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں لیکن کہتے یہی تھے۔ بلکہ بدگمانی میں زیادہ اغراق سے اگر کام نہ لیا جائے تو ان کے سیاسی اغراض پر جن امور سے زد نہیں پڑتی تھی ان میں جہاں تک میرا خیال ہے کہنے کے ساتھ کرنے میں بھی وہ پیچھے نظر نہیں آتے۔ یہی عبدالملک بن مروان ہے اور اس کی حکومت کا عہد ہے مسلمانوں میں ان لوگوں کی طرف سے جو اسلامی نام رکھ رکھ کر مختلف قسم کی اندرونی دسیسہ کاریوں میں مشغول تھے ایک ترکیب وضع حدیث کی بھی جاری ہوئی یعنی مسلمانوں کے دین کو بگاڑنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جعلی روایتیں اور جھوٹی باتیں منسوب کر کر کے پھیلانے والوں نے پھیلانا شروع کیا، جس کا تفصیلی قصہ تو آگے آرہا ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس فتنے کے مقابلے میں جہاں ابن مبارک کے الفاظ میں "جہابذۃ الحدیث" آستین چڑھا کر کھڑے ہو گئے وہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وضع احادیث کے مراکز جو عموماً بصرہ و کوفہ وغیرہ میں تھے، ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالملک اپنے منبر سے اعلان کر رہا ہے کہ

قَدْ سَالَتْ عَلَيْنَا اَحَادِيْثُ مِنْ قِبَلِ هٰذَا الْمَشْرِقِ لَا نَعْرِفُهَا۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۱۰۴)	اس مشرق کی طرف سے ایسی حدیثیں بہ بہ کر ہماری طرف آرہی ہیں جنہیں ہم نہیں پہچانتے۔

یا اسی عبدالملک نے خالص سیاسی اغراض کے تحت جہاں لوگوں کو قتل کیا تھا وہیں حارث بن سعید الکذاب جیسا کہ اربابِ علم سے مخفی نہیں ہے، اسی لئے اس کو دار پر کھینچا کہ عبدالملک اپنے آپ کو مسلمانوں کے دین کا بھی محافظ سمجھتا تھا، یا غیلانؔ دمشقی کو عبدالملک کے بیٹے ہشام نے جو قتل کیا تو بجز اس جرم کے کہ پیغمبر کے دین میں غیلانؔ رخنہ اندازیاں کیا کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کر کر کے حدیثیں عوام میں پھیلاتا تھا میں تو نہیں جانتا کہ اس کا کوئی اور جرم تھا[1]۔ بنی امیہ کے بعد عباسی خلفاء کے عہد میں بھی ہم اس باب میں اسلامی حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو زندہ پاتے ہیں، ابوجعفر منصور نے اسی وضعِ حدیث کے جرم میں محمد بن سعید مصلوب کو سولی دی۔ مہدیؔ، رشیدؔ، مامونؔ وغیرہ خلفاء عباسی کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پیغمبر کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہو کر پھیل نہ جائے، اس کی کڑی نگرانی حکومت ہمیشہ کرتی رہی۔ نہ صرف سلاطین و ملوک بلکہ ہر صوبہ کے وُلاۃ اور حکام بھی اس مسئلہ میں کسی رو رعایت کو جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے، روا نہیں رکھتے تھے۔ بیان بن زریق کو بنی امیہ کے مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری نے جو قتل کیا تھا، اسی طرح عباسیوں کی طرف سے بصرہ میں محمد بن سلیمان جب حاکم تھا تو مشہور حدیث ساز (یعنی وضاع) عبدالکریم بن ابی العوجاء کو اسی نے وضعِ حدیث کے جرم میں قتل کرایا تھا اور سلاطین یا صوبے کے ولاۃ ہی نہیں بلکہ اس قسم کی روایتوں سے مثلاً خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے کہ

إِسْمٰعِيلُ بْنُ إِسْحَاقَ الْقَاضِي ضَرَبَ الْهَيْثَمَ بْنَ سَهْلٍ عَلٰى تَحْدِيثِهِ عَنْ حَمَّادِ بْنِ زَيْدٍ وَأَنْكَرَ عَلَيْهِ ذٰلِكَ (ج ۱۴ ص ۶۱)	قاضی اسماعیل بن اسحاق نے ہیثم بن سہل کو اس وجہ سے پٹوایا کہ حماد بن زید کے حوالہ سے وہ حدیث روایت کرنے لگا تھا۔ قاضی اسماعیل اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی نگرانی کا فرض قاضیوں کے سپرد تھا،

بہرحال کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو بجائے خود یہی ایک صورت حال ایسی ہے جو ان روایات اور حدیثوں کے اعتماد کی کافی ضمانت بن سکتی ہے، جن کا ایک بڑا حصہ ان ہی موالی محدثین کے ذریعہ مسلمانوں

---

[1] رجال کی عام کتابوں میں ان لوگوں کے حالات پڑھئے۔

میں منتقل ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی بے احتیاطی بھی اس راہ میں کم از کم ملوک بنی امیہ کے لئے بے چارے موالی کی دار و گیر کے لئے ایک دینی دستاویز بن جاتی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت عامہ مسلمین کی مزاحمت بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی لیکن علم و فضل کے ساتھ ان کی سیر چشمیاں، حکومت کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اس سے ان کی بے نیازیاں، اسی کے ساتھ خالص اسلامی زندگی کے جو نمونے اس طبقے کی طرف سے مسلسل پیش ہو رہے تھے۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ ابن عساکر کی روایت ہے کہ ہارون الرشید کے پاس جعلی حدیثوں کے بنانے کا مجرم ایک زندیق پیش ہوا۔ مجرم نے کہا کہ امیر المومنین میرے قتل کا حکم آپ کس وجہ سے دے رہے ہیں؟ ہارون رشید نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو تیرے فتنوں سے محفوظ کرنے کے لئے میں نے یہ حکم دیا ہے۔ اس پر زندیق نے کہا کہ میرے قتل کرنے سے کیا ہوگا کیونکہ

اَیْنَ اَنْتَ مِنْ اَلْفِ حَدِیْثٍ وَضَعْتُھَا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّھَا مَا فِیْھَا حَرْفٌ نَطَقَ بِہٖ۔ (تاریخ دمشق ج ۲ ص ۲۵۴)	ایک ہزار جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف میں منسوب کر چکا ہوں، ان حدیثوں کا کیا کیجئے گا جن میں پیغمبرؐ کا ایک لفظ بھی تو نہیں ہے۔

مطلب اس کا یہ تھا کہ ان جھوٹی اور بنی حدیثوں کو مسلمانوں میں میں چلتا کر چکا ہوں، مجھے قتل بھی کر دو گے تو کیا ہوگا، حدیثیں تو مسلمانوں میں پھیل چکی ہیں۔ لکھا کہ اس وقت بے ساختہ ہارون کے دل

---

[1] ان پاجیوں کو جب حکومت گرفتار کرتی اور زندگی سے مایوس ہو جاتے تو اس قسم کے شوشے بھی چھوڑ دیتے تھے کہ میں اتنی جھوٹی حدیثیں پھیلا چکا ہوں۔ مقصود اس سے ان کا یہ ہوتا تھا کہ چلتے چلاتے ایک ایسا فقرہ کہہ دو جس سے مسلمانوں میں صحیح حدیثوں کے متعلق بھی بدگمانی پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ تر اس میں بھی یہ کذب بیانی ہی سے کام لیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ اپنی جگہ پر یعنی موضوع حدیثوں کے باب میں آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا کہ سند کا قصہ حدیثوں کے ساتھ کچھ ایسا لگا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات کو منسوب کر کے یہ خیال کرنا کہ ان کی گھڑی ہوئی حدیثیں مسلمانوں میں مروج ہو جائیں گی آسان نہ تھا۔ ایسے مقررہ اصول محدثین کے تھے کہ ان کے معیار پر جانچنے کے ساتھ ہی سچ جھوٹ سے الگ ہو جاتا تھا۔ اس کو جعل سازوں کا یہ گروہ بھی جانتا تھا لیکن ان کا مقصود تو صرف مسلمانوں کو دہشت اور بدگمانی کے فتنے میں مبتلا کرنا ہوتا تھا۔ تفصیل ان مسائل کی آگے آ رہی ہے۔ یہاں اجمالاً اس لئے اشارہ کر دیا گیا کہ بعض وسواسی دماغوں کے لئے اتنی سی بات بھی بدگمان بن جانے کے لئے کبھی کافی ہو جاتی ہے۔

نے اس فتنے سے جن دو بزرگوں کے سایہ کے نیچے پناہ ڈھونڈھی ان میں ایک ، نام عبداللہ بن المبارک اسی عالم کا تھا جو طبقۂ موالی سے تعلق رکھتے تھے ۔ بہرحال ہارون نے بھی اسی لب ولہجہ میں کہا کہ

أَيْنَ أَنْتَ يَا عَدُوَّ اللهِ مِنْ أَبِي إِسْحَاقَ الْفَزَارِيِّ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ الْمُبَارَكِ يَتَخَلَّلَانِهَا فَيُخْرِجَانِهَا حَرْفًا حَرْفًا۔

(ابن عساکر ج ۲ ص ۲۶۴)

ارے خدا کے دشمن! تو ہے کس خیال میں ۔ ابو اسحاق فزاری اور عبداللہ بن المبارک ان تمام حدیثوں کو چھلنی میں چھانیں گے اور ایک ایک حرف (تیری جعلی حدیثوں کا) پھوڑ پھوڑ کر نکال پھینکیں گے ۔

اور یہ تھا الموالی کی خدمات کا وہ غیر معمولی وزن کہ عباسی فرمانروا ، وہ بھی ہارون الرشید ، مرو کے ایک عجمی غلام مبارک کے لڑکے کے وجود پر فخر کر رہا ہے ۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بقول عباس بن مصعب جیسا کہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے :

خَرَجَ مِنْ مَرْوَ أَرْبَعَةٌ مِنْ أَوْلَادِ الْعَبِيدِ مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا هُوَ إِمَامُ عَصْرِهِ . عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَمُبَارَكٌ عَبْدٌ ، وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ مَيْمُونِ الصَّائِغِ وَمَيْمُونٌ عَبْدٌ ، وَالْحُسَيْنُ بْنُ وَاقِدٍ وَوَاقِدٌ عَبْدٌ ، وَأَبُو حَمْزَةَ مُحَمَّدُ بْنُ مَيْمُونِ الْعَسْكَرِيُّ وَمَيْمُونٌ عَبْدٌ ۔

(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۹۹)

مرو کے شہر سے چار آدمی غلاموں کی اولاد میں ایسے نکلے کہ ان میں ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا یعنی عبداللہ بن المبارک[۱] اور مبارک غلام تھے ۔ ابراہیم[۲] بن میمون الصائغ اور میمون غلام تھے ۔ حسین[۳] بن واقد اور واقد غلام تھے ۔ ابو حمزہ[۴] محمد بن میمون العسکری اور میمون غلام تھے ۔

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اپنے آخری دین کی حفاظت کے لئے "موالی" کی شکل میں قدرت نے ان راستباز مخلص رضا کاروں کا ایک گروہ ہی پیدا کر دیا تھا جس نے ہر چیز سے الگ ہو کر اپنی ساری توانائیوں کو دین کی خدمت پر مرتکز کر دیا تھا ۔ تقریباً مسلمانوں کے اکثر شہروں اور آبادیوں کا یہی حال ہے ۔ زہری اور عبدالملک کے اس تاریخی مکالمے کے سوا جس کا ابھی ذکر گزرا ، ابن صلاح نے زید بن اسلم کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کے حوالہ سے تو یہ کلی دعویٰ نقل کیا ہے کہ

لَمَّا مَاتَ الْعَبَادِلَہ صَارَ الْفِقْہُ فِی جَمِیْعِ الْبُلْدَانِ اِلٰی جَمِیْعِ الْمَوَالِی اِلَّا الْمَدِیْنَۃَ فَاِنَّ اللہَ خَصَّہَا بِقُرَشِیٍّ فَکَانَ فَقِیْہُ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیَّبِ غَیْرَ مُدَافِعٍ۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۶۲)

جب عبادلہ[۱] کا انتقال ہوگیا تو سارے اسلامی علاقوں میں علم فقہ کے مرجع و مرکز موالی ہی بن گئے، بجز مدینہ منورہ کے مدینہ منورہ کو اللہ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ اس شہر کا فقیہ ایک قریشی نژاد عبادلہ کے بعد ہوا یعنی سعید بن المسیب جن کو بالاتفاق لوگوں نے مدینہ کا فقیہ تسلیم کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ دعوی کی اس کلیت میں اغراق کا پہلو پیدا ہوگیا ہو جیسا کہ ابن صلاح نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور ابراہیم نخعی، عامر شعبی وغیرہ عربی النسل علماء[۲] کا تذکرہ کر کے عبدالرحمن کے اس دعوے پر تنقید بھی کی ہے لیکن کلیت نہ سہی اکثریت کا تو کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً لفظ "الموالی" کے اطلاق میں اس وسعت کو اگر پیش نظر رکھا جائے جو اس زمانہ میں لفظ موالی کے استعمال میں پائی جاتی تھی۔

موالی کے اقسام

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے موالی کا اطلاق ان غیر عربی لوگوں پر ہوتا تھا جو خود یا ان کے آبا و اجداد

---

[۱] عبادلہ ایک اصطلاحی لفظ ہے چار صحابی جو علم قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ میں ممتاز تھے اور ان میں ہر ایک کا نام عبداللہ تھا ان ہی کی جمع عبادلہ بنالی گئی تھی یہ عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ تھے۔

[۲] یہ الموالی کا لفظ عربی زبان کا عجیب لفظ ہے، بیسیوں معانی کے ساتھ یہ بھی عربی زبان کے ان الفاظ میں ہے جن سے متضاد معانی سمجھے جاتے ہیں یعنی اسی مولیٰ کے معنی جہاں غلام کے ہیں وہاں مولیٰ آقا کو بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہنے والے خداوند تعالیٰ کو بھی مولیٰ تعالیٰ کہتے ہیں۔ پھر غلام کی دو قسمیں مولیٰ کے تحت میں داخل ہیں یعنی ایک تو براہ راست غلاموں کو بھی موالی کہتے ہیں۔ نیز اسلام کی تاریخ کے چند عجائب میں ایک طرفہ یہ ہے کہ آزاد ہونے کے ساتھ ان آزادیوں سے مستفید ہوتے ہوئے جو مفتوح اقوام کے افراد کو اسلام نے دے رکھا تھا بہت جلد ان آزاد ہونے والے غلاموں کی معاشی حالت اتنی بلند ہوجاتی تھی کہ چند ہی دنوں کے بعد غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے لگتے تھے، اسی طرح یہ غلاموں کے غلام جو مولی الموالی کہلاتے تھے اسی طرح آزاد ہو کر غلام خریدتے اور آزاد کرتے۔ اس سلسلہ میں ابن سعد نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن حنین جو زہری وغیرہ کے اساتذہ میں ہیں، لوگ عموماً ان کو حضرت عباسؓ کے موالی میں شمار کرتے ہیں حالانکہ درحقیقت حضرت عباسؓ پانچویں درجہ میں ان کے آقا ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے شماس نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا، شماس نے مسحل نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا، مسحل نے مشقب نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا اور مشقب نے حنین نامی غلام کو خرید کر آزاد کیا تھا مگر دنیا میں لوگ حنین کو حضرت عباسؓ کا مولیٰ کہہ دیتے تھے۔

(ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۱)

غلام ہونے کے بعد آزاد ہو جاتے تھے، اسی طرح موالی میں اس قسم کے لوگ بھی شریک تھے جن کا نسلاً کسی عربی قبیلہ سے تعلق نہ ہوتا تھا اور وطن ان کا عرب سے باہر کسی ملک میں ہوتا۔ اسلامی علاقے کے امن وامان، عدل وانصاف کا شہرہ سن کر مسلمان ہونے کے بعد عربی قبائل کی آبادیوں مثلاً کوفہ، بصرہ وغیرہ کو وطن بنانا چاہتے تو کسی عربی قبیلہ سے دوستی اور باہمی امداد ومعاونت کا معاملہ اور معاہدہ کر کے رہ پڑتے۔ پھر جس قبیلہ سے ان کا تعلق ہوتا اسی قبیلہ کی طرف ان کو منسوب بھی کر دیا جاتا تھا اور اسی قبیلہ کے موالی میں وہ شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح جس عربی مسلمان کے ہاتھ پر غیر عربی آدمی اسلام لاتا تو جو قبیلہ اس عربی النسل آدمی کا ہوتا تھا اسی قبیلہ کی طرف اس نو مسلم عجمی مسلمان کو بھی منسوب کر دیتے تھے۔ اور یوں اسی قبیلے کے موالی میں ان کو داخل کر لیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ امام المحدثین امام بخاری جو نسلاً ترکی نژاد عالم ہیں وہ الجعفی کی نسبت کے ساتھ جو مشہور ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے جیسا کہ سیوطی نے تدریب میں لکھا ہے:

لِاَنَّ جَدَّهٗ کَانَ مَجُوْسِیًّا فَاَسْلَمَ عَلٰی یَدِ الْیَمَانِ بْنِ اَخْنَسِ الْجُعْفِیِّ (ص ۲۶۷)

امام بخاری کے دادا مجوسی (آتش پرست پارسی) تھے پھر یمان بن اخنس الجعفی کے ہاتھ پر اسلام لائے اس لئے وہ بھی جعفی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

امام ابو حنیفہ کے متعلق بھی ان کے پوتے اسمٰعیل بن حماد کا یہی دعویٰ تھا۔

بہر حال اسلام کی وجہ سے جو موالی ہوتے تھے ان کو موالی الاسلام کہتے تھے، اور امداد باہمی کے معاہدہ کی وجہ سے مولیٰ کہلانے والے مولی الحلف سمجھے جاتے تھے۔ اور غلامی والے مولیٰ کو مولی العتاقہ کہتے تھے۔ نووی نے لکھا ہے کہ گو موالی کے لفظ کا اطلاق سب ہی پر ہوتا ہے لیکن

مَوْلٰی عِتَاقَه هُوَ الْغَالِبُ۔ (تقریب ص ۱۶۷)

مولیٰ کے لفظ کا اطلاق زیادہ تر مولیٰ عتاقہ ہی پر کیا جاتا ہے، یعنی آزاد شدہ غلام، یہی مفہوم اس لفظ کا زیادہ عام اور غالب ہے۔

اس تفصیل سے میری غرض یہ ہے کہ اسلام کی ان ابتدائی صدیوں میں "موالی" کی یہ عجیب وغریب طاقت دینی علوم کی حفظ ونگرانی، تبلیغ واشاعت کے لئے قدرت کی طرف سے جو مہیا ہو گئی تھی ا

میں گو زیادہ تعداد تو ان ہی لوگوں کی تھی جنہوں نے یا جن کے خاندان نے غلامی کے بعد آزادی حاصل کی اور اسلام کے عطا کردہ حقوق سے مستفید ہوتے ہوئے حکومتِ وقت کی بے اعتنائیوں کے باوجود مسلمانوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ سب ہی غلام اور غلاموں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ایک گروہ ان میں دوسری قسم کے موالی کا بھی تھا، چونکہ نسلاً عرب قبائل سے ان بے چاروں کا بھی رشتہ نہ تھا۔ اس لئے حکومت کا نقطۂ نظر ان کے ساتھ بھی قریب قریب وہی تھا جو غلاموں کے ساتھ اور غلاموں کی نسل کے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس نقطۂ نظر کے قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی، وہ جتنا ان کو گرانا چاہتی تھی، اسلام ان کو اسی قدر بلند سے بلند تر کرتا چلا جاتا تھا۔ آپ ہی خیال کیجیے کہ جہاں حال یہ ہو کہ بخارا کا رہنے والا ایک نومسلم جس کا نام بشیر تھا، بخارا سے بہ تلاش روزگار مسلمانوں کی نئی چھاؤنیوں اور نئی آبادیوں کی طرف رُخ کرتا ہے حالات مساعدت کرتے ہیں، بنی امیہ کے طاغیہ حجاج بن یوسف اس کے پکائے ہوئے کھانے کو پسند کرتا ہے۔ حجاج کے باورچی خانہ میں اس کا تقرر ہو جاتا ہے، کوفہ میں اس طریقہ سے اس بیچارے کو قیام کا موقعہ مل جاتا ہے، ساتھ اس کے اس کا لڑکا ہُشیم نامی بھی ہے۔ ہشیم کوفہ کے تعلیمی حلقوں میں آنا جانا شروع کرتے ہیں۔ غریب باورچی اپنے بچے کے اس علمی ذوق کو پسند نہیں کرتا چاہتا تھا کہ مجھ سے طباخی کے کچھ گُر سیکھے، یہ اس بچّے کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ اسی عرصے میں ہشیم بیمار پڑتے ہیں۔ اسی زمانہ میں واسط کے قاضی ابوشیبہ کے حلقۂ درس میں ہشیم آمد و رفت رکھتے تھے۔ بیمار ہو جانے کی وجہ سے حلقۂ درس میں شریک نہ ہوسکے تو قاضی صاحب نے ساتھیوں سے پوچھا وہ نوجوان ہشیم کیوں نہیں آ رہا ہے؟ لوگوں نے علالت کی خبر دی۔ قاضی پر ہشیم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اتنا اثر تھا کہ اسی وقت ہشیم کی عیادت کے لئے روانہ ہوئے۔ بشیر باورچی گھر ہی میں تھا، اطلاع دی گئی کہ قاضی ابوشیبہ تمہارے بچے کی عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ گھبرا کر باہر نکلا۔ واقعی شہر کے قاضی کو دروازے پر کھڑا پایا۔ ان کی خواہش پر اندر لے گیا۔ جب عیادت کر کے قاضی رخصت ہوئے تب بشیر نے ہشیم کو خطاب کر کے کہا کہ

يَا بُنَيَّ قَدْ كُنْتُ أَمْنَعُكَ مِنْ طَلَبِ الْحَدِيثِ فَأَمَّا الْيَوْمَ فَلَا۔ صَارَ الْقَاضِي يَجِيءُ إِلَى بَابِي مَتَى أَمَّلْتُ أَنَا هٰذَا؟ (خطیب ج ۱۴ ص ۸۷)

بیٹے! تجھے علم حدیث کے سیکھنے سے میں روکا کرتا تھا مگر آج کے دن کے بعد نہیں، شہر کا قاضی میرے دروازے پر آنے لگا، مجھے اس کی کہاں امید تھی؟

اور باورچی کے اسی لڑکے کا ذکر اس وقت تک حفاظِ حدیث کے سلسلہ میں ان الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے، جیسا کہ الذہبی نے ان ہی الفاظ سے ان کا تذکرہ شروع کیا ہے:

اَلْحَافِظُ الْكَبِيرُ مُحَدِّثُ الْعَصْرِ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۹)

حدیث کے بہت بڑے حافظ اپنے وقت کے محدث۔

ثابت ہوا کہ اس باورچی کے لڑکے کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ عبداللہ بن المبارک جیسے محتاط ناقد کو کہنا پڑا:

مَنْ غَيَّرَ الدَّهْرُ حِفْظَهُ فَلَمْ يُغَيِّرْ حِفْظَ هُشَيْمٍ۔ (ص ۲۳۰)

زمانہ یعنی بڑھاپے کی وجہ سے کسی کا حافظہ متاثر بھی ہو گیا ہو لیکن ہُشَیم ان لوگوں میں ہیں جن کے حافظہ میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔

اور یہ تھیں قدرت کی وہ مخفی کاروائیاں جن کے ذریعہ سے اپنے آخری پیغمبر کے متعلقہ معلومات کی حفاظت و اشاعت کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں کے رکھنے والے دماغوں اور دلوں کو مختلف گوشوں سے اکٹھا کر کے اسی خدمت میں ان کو وہ مشغول کر رہی تھی۔ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ جو بڑے بننے اور بڑھنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ دنیا میں بڑھنے سے ان کو روکا جاتا تھا تو قدرتاً وہ دین اور دینی علوم کو لے کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ بصرہ کے ایک تابعی بزرگ جن کا نام فرقد تھا اپنے شاگردوں کو خطاب کر کے کبھی فرماتے بھی تھے:

إِنَّ مُلُوكَكُمْ يُقَاتِلُونَكُمْ عَلَى الدُّنْيَا فَدَعُوهُمْ وَالدُّنْيَا۔ (صفوۃ الصفوہ ابن جوزی ج ۳ ص ۱۹۶)

تمہارے سلاطین تم سے دنیا کے متعلق جھگڑتے اور لڑائیاں کرتے ہیں پس مناسب ہے کہ ان کو اور ان کی دنیا کو ان ہی کے لئے چھوڑ دو

انتہا اس ذوق کی یہ تھی کہ موالی میں وہی نہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا بلکہ جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کے اندر بھی اس علم کے طلب اور حصول کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔

موالی محدثین کا بے نظیر شوق علمی و ایثار مالی

میں یہ کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ پہلے بھی کہا ہے کہ اسلامی شہروں کے امن و امان، فراغ بالی و فراخی کے چرچوں کو سن سن کر عرب کے باہر کے لوگ بھی عرب میں آکر آباد ہو رہے تھے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ ایک عیسائی طبیب جو شام کا رہنے والا تھا، اس نے طبابت کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا اور مشہور قریشی خاندان آل جبیر بن مطعم سے موالاۃ کا رشتہ اس نے قائم کرلیا تھا۔ یہ پہلی صدی ہجری کے اختتام کا زمانہ تھا، نام اس عیسائی طبیب کا عبدالرحمٰن اور کنیت اس کی ابو داؤد تھی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں قیام کے باوجود آخر وقت تک عیسائی ہی رہا، کوہ صفا کی طرف حرم کی مسجد کا جو مینار تھا، اسی مینار کے نیچے اس کا مطب تھا۔ کعبہ سے اس قرب کے باوجود کفر پر اس کا اصرار عجیب تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے بطور ضرب المثل کے یہ فقرہ مشہور ہوگیا تھا کہ

اَکْفَرُ مِنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ — یعنی فلاں آدمی عبدالرحمٰن نصرانی سے بھی زیادہ کافر ہے۔

بہرحال خود تو یہ عیسائی ہی رہا اور مرا بھی اسی حال میں، لیکن مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے کا یہ اثر پڑا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے بچے سب مسلمان ہو چکے تھے۔ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے باپ ہی کے اشارے سے وہ مسلمان ہوئے تھے۔ لکھا ہے کہ بچپن ہی میں اپنے بچوں کو

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَةَ وَالْقُرْاٰنَ وَالْفِقْهَ — لکھنے کی اور قرآن و فقہ کی تعلیم ان کو دلاتا تھا۔

یہ بھی لوگوں کا بیان ہے کہ

وَيَحُثُّهُمْ عَلَى الْاَدَبِ وَلُزُوْمِ اَهْلِ الْخَيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (ابن سعد ج ۵ ص ۳۶۵) — اپنے بچوں کو اس کا شوق دلاتا کہ ادب سیکھو اور مسلمانوں میں جو نیک کردار ہستیاں ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔

اسی عبدالرحمٰن نصرانی کے بچوں میں داؤد جس کی وجہ سے اس نے اپنی کنیت ابوداؤد رکھی تھی، علاوہ دوسرے اسلامی علوم کے خصوصیت کے ساتھ حدیث میں خاص امتیاز انہوں نے حاصل کیا تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ

وَكَانَ كَثِيْرُ الْحَدِيْثِ (۰) — حدیث کا کافی ذخیرہ ان کے پاس تھا۔

وقت کے مستند ائمہ اور شیوخ سے داؤد نے اس علم کو حاصل کیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ان کے اساتذہ میں ہشام بن عروہ، ابن جریج، معمر بن خثیم، عمرو بن دینار وغیرہ کا نام لیا ہے اور داؤد کے شاگردوں میں توہم دوسروں کے ساتھ امام شافعی اور عبداللہ بن المبارک جیسی مشہور ہستیوں کو بھی پاتے ہیں جو داؤد کے استناد و جلالت شان کے لئے کافی ہے۔ ابن حبان نے ان کی توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان متقنا من فقهاء اهل مكة ۔ (تہذیب ج ۲ ص ۱۹۲)

بڑے سنجیدہ آدمی تھے، مکہ کے فقہاء میں ان کا شمار تھا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر الحدیث ہونے کے ساتھ "فقہ" میں بھی ان کی قابلیت مسلم تھی، سیرت و کردار کے لحاظ سے یہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجر نے ابراہیم بن محمد الشافعی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

ما رأیت احدا اعبد من فضیل بن عیاض، ولا اورع من داؤد بن عبدالرحمٰن ولا افرس فی الحدیث من ابن عیینه ۔ (۰)

میں نے فضیل بن عیاض سے زیادہ عبادت گزار، اور داؤد بن عبدالرحمٰن (النصرانی) سے زیادہ پرہیزگار، اور ابن عیینہ سے زیادہ حدیث کے فن میں ہوشیار آدمی نہیں دیکھا۔

فضیل بن عیاض اور ابن عیینہ جیسے اکابر کے ساتھ داؤد کا تذکرہ خود ہی بتا رہا ہے کہ اس لحاظ سے بھی مسلمانوں میں ان کا کیا مقام تھا۔

اور اس قسم کے واقعات مثلاً ابن سعد نے دمشق کے محدث عبدالرحمٰن بن میسرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ خواب میں ایک دفعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ان کو نصیب ہوئی خیال گزرا کہ اس سے بہتر موقعہ اور کیا ملے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے عبدالرحمٰن نے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن کس چیز کی دعا کرائی جائے؟ جب یہ سوال ان کے سامنے آیا تو اس وقت دنیا اور آخرت کی باتوں میں سے ایسی بات جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرائی جائے ان کی سمجھ میں یہی آئی، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

یانبی اللہ ادع لی اکون عقولا للحدیث ودعاءً له ۔ (ابن سعد ج ۷، ص ۱۶۳ قسم دوم)

اے اللہ کے نبیؐ! میرے لئے دعا فرمائیے کہ حدیث کی سمجھ مجھ میں پیدا ہو جائے اور اس کا ظرف میں بن جاؤں (یعنی حدیثیں مجھے محفوظ ہو جائیں)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں "طلب حدیث" کے ساتھ لوگوں کے دل و دماغ کے متعلق کیا نوعیت تھی۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ بیداری تو بیداری خواب میں بھی اسی کا ذوق ان پر مسلط رہتا تھا۔ لوگ سوچتے نہیں ورنہ جن معلومات کی جستجو اور تلاش میں لوگوں کا یہ حال ہو کہ نہ وقت کی ان کو پرواہ ہوتی تھی نہ مال کی، اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی جو دی جا سکتی تھی، دینے والے دے رہے تھے۔ عبدان جن کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ الحافظ الامام رحلۃ الوقت، خود اپنا حال بیان کرتے تھے کہ اپنے سینکڑوں اساتذہ میں سے صرف ایوب کی حدیثوں کی تلاش میں

رحلت البصرة ثمانی عشرة مرة (تذکرہ ج ۲ ص ۲۳۳) شہر بصرہ کا اٹھارہ دفعہ میں نے سفر کیا۔

ابو حاتم رازی جو علل کے امام ہیں، لکھا ہے کہ رحل وھو امرد، یعنی سبزہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طلب حدیث میں وطن سے نکل پڑے۔ برسوں سفر میں رہتے، وطن واپس لوٹتے اور پھر روانہ ہو جاتے۔ خود ان کا بیان الذہبی نے نقل کیا ہے کہ

اول ما رحلت اقمت سبع سنین ۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۲)

پہلی دفعہ گھر سے جب طلب حدیث میں نکلا تو سات سال تک سفر ہی میں رہا۔

کہتے تھے کہ شروع میں کتنے میل چلا اس کا خیال رکھا تھا۔ تین ہزار میل تک تو میں گنتا رہا لیکن پھر گننا چھوڑ دیا۔ پیدل کتنی لمبی لمبی مسافتیں اس راہ میں انہوں نے طے کی تھیں اس کا اندازہ اسی سے کیجیے، خود ہی بیان کرتے تھے کہ

خرجت من البحرین الی مصر ماشیا ثم الی الرملة ماشیا ثم الی طرطوس ولی عشرون

بحرین سے مصر پیدل گیا، پھر رملے سے طرطوس کا سفر بھی پیدل ہی کیا۔ اس وقت میری عمر بیس

سنۃ۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۲) سال کی تھی۔

اطلس اٹھا کر دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ بحرین (عرب) سے مصر، مصر سے رملہ (فلسطین) اور رملہ سے طرسوس کا فاصلہ کتنے ہزار میلوں کا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس قسم کے بے سنگ میل والے سفر میں کن کن حالات سے لوگوں کو گزرنا پڑتا تھا خصوصًا اس زمانہ میں جب مواصلات کے موجودہ ذرائع سے دنیا محروم تھی۔ ان ہی ابوحاتم رازی نے اپنے ایک سفر کا قصہ یہ بیان کیا ہے، جسے ذہبی نے نقل کیا ہے، میں اسی سے ترجمہ کرتا ہوں۔ ابوحاتم کہتے ہیں:

"میں اور میرے چند رفقا جہاز سے اترے، خشکی پر پہنچنے کے بعد دیکھا تو زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ کیا کرتے، ساحل سے پیادہ پا ہم لوگ روانہ ہوئے۔ تین دن تک چلتے رہے، لا ناکل شیئًا۔ (قطعًا اس عرصہ میں کچھ نہ کھایا) آخر ایک رفیق جو زیادہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر تھے بیہوش ہو کر گر پڑے، ملا کر ہم لوگوں نے ان کو جھنجوڑا، ہلایا، لیکن کسی قسم کی جنبش اور حرکت ان میں محسوس نہ ہوئی، مجبورًا بے چارے کو اسی حال میں چھوڑ کر آگے بڑھے، تھوڑی دیر چلنے کے بعد چکرا کر آخر میں بھی گر ہی گیا۔ اب ایک رفیق اکیلا رہ گیا۔ ساحل سمندر کے کنارے کنارے یہ سفر ہو رہا تھا، مجھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھا۔ دور سے سمندر میں اس کو ایک جہاز نظر آیا۔ دریا کے کنارے جا کر اس نے رومال ہلانا شروع کیا، جہاز والے متوجہ ہوئے اور چند آدمی اس سے اتر کر اس رفیق سے ملے، حال پوچھا۔ پیاس سے اس کا برا حال تھا، پانی کی طرف اشارہ کیا۔ جہاز والوں نے اس کو پانی پلایا، جب کچھ اس کے ہوش بجا ہوئے، تب اس نے کہا کہ میرے اور دو رفیقوں کی خدا کے لئے خبر لیجئے۔ جہاز والے اس کی راہ نمائی میں اس جگہ پہنچے جہاں میں گرا ہوا پڑا تھا۔ منہ پر چھینٹے دیئے گئے، اس وقت مجھ کو ہوش آیا۔ مجھے پانی پلایا گیا، پھر اس بے چارے ضعیف العمر آدمی کے پاس لوگ پہنچے، ان کو بھی ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۲)

رحلات اور اسفار طویلہ کے یہ قصے کیا کسی ایک دو آدمی تک محدود ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ "رحلت" یعنی طلب حدیث میں سفر کرنا اس علم کے لوازم میں سے تھا جس کے بغیر کوئی محدث محدث بن ہی نہیں سکتا تھا۔ کسی بڑے ممتاز آدمی کا حال اٹھا کر دیکھئے ایک طویل فہرست ان کے رحلات کی آپ کو نظر آئے گی۔ امام بخاری ہی ہیں۔ یہ لکھنے کے بعد کہ بچپن ہی میں امام بخاری نے عبداللہ بن المبارک کی کتابیں زبانی یاد کرلی تھیں، الذہبی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

رحل مع امه واخته سنة عشر ومائتين بعد ان مرویات بلده من محمد بن سلام و المسندی ومحمد بن یوسف البیکندی و سمع ببلخ من مکی بن ابراهیم وببغداد من عفان وبمكة من المقری وبالبصرة من ابی عاصم و الانصاری وبالکوفة من عبد الله وموسی و بالشام من ابی المغیرة والفریابی وبعسقلان من آدم وبحمص من ابی الیمان وبدمشق من ابی مسهر۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۲)	اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ ۲۱۰ھ ہجری میں سفر کیا، یہ سفر امام نے ان حدیثوں کے سننے کے بعد کیا تھا جنہیں اپنے شہر (بخارا) کے علماء محمد بن سلام، مسندی اور محمد بن یوسف بیکندی سے وہ روایت کرتے تھے۔ امام نے بلخ میں مکی بن ابراہیم سے، بغداد میں عفان سے، مکہ میں مقری سے، بصرہ میں ابو عاصم اور الانصاری سے، کوفہ میں عبداللہ اور موسیٰ سے، شام میں ابو المغیرہ و فریابی سے، عسقلان میں آدم سے، حمص میں ابو الیمان سے، دمشق میں ابو مسہر سے حدیثیں سنیں۔

حالانکہ یہ فہرست قطعاً غیر مکمل ہے، اس میں نہ مدینہ کا نام ہے اور نہ یمن کا اور نہ بہت سے دوسرے شہروں کا، جہاں امام بخاری حدیث ہی کی جستجو میں گئے۔ تاہم اس ناقص فہرست میں بھی آپ کو بخارا اور بیکند (جو امام بخاری کا وطن ہے) اس کے سوا بلخ، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، حمص، دمشق جیسے شہروں کے نام درج ملتے ہیں، جن میں ہزارہا ہزار میل کے فاصلے ہیں۔ الخطیب نے امام کے علمی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

رحل فی طلب العلم الی سائر محدثی الامصار (ج ۲ ص ۱۲۲)	علم کی طلب میں تمام اسلامی شہروں کا امام بخاری نے سفر کیا۔

امام بخاری کے بعد اسی طرح حافظ **ابو زرعہ** کے تذکرے میں ذہبی ہی لکھتے ہیں کہ حرمین، عراق، شام، جزیرہ، خراسان، مصر میں وہ گھومتے رہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، کسی محدث و حافظ کا تذکرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان مقامات اور بلاد کی ایک طویل فہرست آپ کو مل جائے گی جہاں ان کی علمی تشنگی ان کو لئے لئے پھرتی تھی۔ غریب الوطنی کی عام صعوبتوں کے سوا جن سے پردیسی مسافر کو بہر حال دو چار ہی ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کے لمبے لمبے طویل سفر اور سفر ہی نہیں بلکہ طلب علم کے لئے چونکہ سفر کیا جاتا تھا اس لئے لازماً ایک ایک جگہ میں ان لوگوں کو مہینوں اور بسا اوقات برسوں بسر کرنے پڑتے تھے۔ آج بھی تعلیمی سفر اختیار کرنے والے طلبہ جو یورپ و امریکہ جاتے ہیں، دو دو چار چار سال بعد وطن واپس ہوتے ہیں تو اندازہ کرنا چاہئے اس زمانہ کا اور طلب علم کے اس حال کا کسی موقعہ پر ذکر آچکا ہے کہ ایک ایک حدیث کے لئے مدینہ سے مصر کا لوگ سفر اختیار کرتے تھے یا کسی شہر میں سال سال بھر اس لئے پڑے رہے کہ جس سے حدیث کو حاصل کرنا چاہتے تھے وہ وہاں موجود نہ تھے۔ خصوصاً حفاظ کا جو یہ عام دستور تھا کہ روزانہ دس پانچ حدیثوں سے زیادہ نہیں بیان کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ لوگوں کو ایک ایک استاد کے پاس کتنے دن ٹھہرنا پڑتا ہوگا۔ علی الخصوص ذخیرۂ حدیث کے بڑے سرمایہ داروں کے پاس **یحیی بن سعید القطان** خود اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ صرف ایک استاد کے پاس ان کو دس سال گزارنے پڑے۔ خطیب نے بجنسہ یہ الفاظ ان سے نقل کئے ہیں:

لزمت شعبة عشر سنة (تاریخ بغداد ج۱۴ ص۱۳۶) — شعبہ کے پاس میں دس سال تک ٹھہرا رہا۔

مؤطا کے نسخۂ خاص کے راوی قعنبی **امام مالک** سے یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

کان الرجل یختلف الی الرجل ثلثین سنة فیتعلم منه (حلیة الاولیاء ص ۳۲۰) — آدمی کا قاعدہ تھا کہ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت رکھتا تھا، جب علم سیکھتا تھا۔

بظاہر ان الفاظ سے امام مالک نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کا یہ عام حال ہو کہ لوگ ایک ایک استاد کے پاس تیس تیس سال تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے خود امام مالک ہی کے متعلق نافع بن عبداللہ کے حوالہ سے حلیہ ہی میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ

جالست مالکا اربعین سنة او خمسا و ثلثین کل یوم ابکر و اہجر وا روح ۔ (حلیۃ الاولیاء ص ۳۲۰)

میں امام مالک کے پاس چالیس یا پینتیس سال تک بیٹھتا رہا، روزانہ صبح کو بھی حاضر ہوتا دوپہر کو بھی پچھلے پہر بھی۔

زہری کہا کرتے تھے:

مسست رکبتی رکبة سعید بن المسیب ثمان سنین۔ (حلیہ ج ۱ ص ۳۶۲)

سعید بن المسیب کے زانو سے زانو ملا کر میں نے آٹھ سال گزارے ہیں۔

اور اس پر بھی یہ حال تھا کہ بعض دفعہ جیسا کہ زہری سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ

تبعت سعید بن المسیب فی طلب حدیث ثلثة ایام۔

ایک حدیث کی تلاش میں سعید بن المسیب کا پیچھا میں نے تین دن تک کیا، غالباً تین دن کے فاصلہ پر کہیں سعید تھے

جن لوگوں کے ذوق جستجو کا یہ حال ہو جیسا کہ عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ اپنے متعلق کہتے تھے کہ ایک قرآنی آیت کے شانِ نزول کی تلاش میں چودہ سال سرگرداں رہا، آخر اس کا پتہ چلا کر چھوڑا۔ (فتح القدیر شوکانی ج ۱ ص ۴)

ذرا اس راہ کے وارستہ مزاجوں کے شوق بے پروا کو ملاحظہ فرمائیے، حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ ایک صاحب جن کا نام **غالب القطان** تھا، بصرہ کے رہنے والے تھے، تجارت کا کاروبار کرتے تھے، تجارت ہی کے سلسلہ میں ایک دفعہ کوفہ پہنچے۔ اگرچہ حدیث کے باضابطہ طالب العلم نہ تھے لیکن اس علم کا گونہ ذوق رکھتے تھے. خیال گزرا کہ جب تک کوفہ میں قیام ہے، محدثِ کوفہ اعمش کے حلقہ میں حدیثوں کے سننے کا اگر موقعہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے. یہی سوچ کر اعمش کے حلقہ میں آمد و رفت کرتے رہے. کہتے ہیں کہ کام جس کے لئے آیا تھا، جب ختم ہو گیا تو جس دن کی صبح کو کوفہ سے روانگی کا ارادہ تھا، میں نے اس صبح کی رات اعمش ہی کے پاس گزاری. تہجد کے وقت میری بھی آنکھ کھل گئی، اس وقت اعمش قرآن کی ایک آیت کا

بار بار اعادہ کر رہے تھے[1] اور اس آیت کے متعلق کچھ کہتے بھی جا رہے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس آیت کے سلسلے میں کوئی خاص علم (یعنی حدیث) ان کے پاس ہے۔ صبح کو جب رخصت ہونے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت رات قرآن کی جس آیت کو بار بار دہرا دہرا کر آپ پڑھ رہے تھے اور اسی کے ساتھ کچھ فرماتے جاتے تھے، کیا اس باب میں آپ تک کوئی حدیث پہنچی ہے؟ میں آپ کے پاس قریب قریب ایک سال سے آ جا رہا ہوں لیکن اس حدیث کا ذکر آپ نے نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ اب جا رہا ہوں اس حدیث کو بھی سنا دیجئے غالب کہتے ہیں کہ یہ سننے کے ساتھ ہی اعمش کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ "خدا کی قسم ایک سال تک تو اس حدیث کو تم سے میں نہیں بیان کروں گا۔"

بس یہی سننے کی بات ہے۔ آئے ہوئے ہیں تجارتی اغراض سے، طلب علم مقصود بھی نہیں ہے، لیکن ایک حدیث کے سننے کا شوق غالب میں پیدا ہو گیا، چونکہ اعمش کی زبان سے قسم نکل گئی تھی اس لئے شوق کی تکمیل کی اس کے سوا اور کوئی دوسری شکل نہ تھی کہ اعمش کی قسم کی تکمیل کے انتظار میں کاروبار کے نفع و نقصان سے قطع نظر کر کے پورا سال کوفہ میں گزار دیں یا پھر اس شوق ہی سے دست بردار ہو جائیں۔ بات کوئی بڑی بھی نہ تھی، ایک حدیث کا معاملہ تھا اور وہ بھی تفسیری حدیث کا جس کی محدثین کی نگاہوں میں اتنی اہمیت بھی نہیں۔ مگر دنیا میں تاریخ کا یہ وہ دور تھا، جس میں ایک ایک بات جو کسی نہ کسی حیثیت سے پیغمبرؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی قدر و قیمت کا یہ حال تھا کہ غالب القطان کہتے ہیں کہ

فَاَقَمْتُ وَكَتَبْتُ عَلٰى بَابِهٖ ذٰلِكَ الْيَوْمَ۔ — میں ٹھہر گیا (وطن کی واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا) اور اعمش کے دروازے پر اس دن کی جو تاریخ تھی اسے لکھ دیا

اور ہفتے دو ہفتے، مہینہ دو مہینے نہیں کامل بارہ مہینے اس انتظار میں گزارتے رہے کہ سال کے پورے

---

[1] یہ سورۂ آل عمران کی آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" تھی ۱۲ منہ وَاَنَا اَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ بِهٖ وَاَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ هٰذِهِ الشَّهَادَةَ وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيْعَةٌ وَاِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔

ہونے کی تاریخ کب آتی ہے۔ وہی کہتے ہیں کہ

فَلَمَّا مَضَتِ السَّنَةُ قُلْتُ يَا اَبَا مُحَمَّدٍ قَدْ مَضَتِ السَّنَةُ (جامع ص ۹۹)

جب سال گزر گیا تو میں نے عرض کیا کہ اے ابو محمد! (اعمش کی کنیت تھی) سال گزر گیا۔ (اب وعدہ پورا کیجئے)

آخر اعمش سے اس حدیث[1] کو سن لینے کے بعد وہ گھر واپس لوٹے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس روایت پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت ہے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے محض یونہی کسی عام معمولی تاریخی روایت کی حیثیت سے اس قصہ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے بلکہ باضابطہ مسلسل سند جو غالب قطان پر جا کر منتہی ہوتی ہے اس سند کے ساتھ اس واقعہ کو انہوں نے خود قطان کی زبانی نقل کیا ہے۔ جہاں تک سند کے رُواۃ ہیں میرے خیال میں سب ہی معتبر اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔

اس عہد کے واقعات اس سلسلہ میں جو پیش آئے ہیں سب کا استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ چیدہ چیدہ چند روایتیں میں نے اس لئے درج کی ہیں کہ جس زمانے میں حدیث کے ساتھ قلوب کے تعلقات کی یہ نوعیت ہو، ایک ایک حدیث کے لئے مکانی ہوں یا زمانی ہر قسم کے فاصلے صفر کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ غور کرنا چاہئے کہ حفظ حدیث کے متعلق جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں کیا کسی حیثیت سے بھی ان پر تعجب و تحیر درست ہو سکتا ہے؟ جب حدیث کے مقابلے میں اس علم کے حاصل کرنے والے کسی دوسرے کام کو کام اور کسی دوسری ضرورت کو ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے، اور یہ حال تو ان کی جفاکشی اور وقتی قربانیوں کا تھا۔ اسی راہ میں قربانی کرنے والوں نے جو مالی قربانیاں پیش کی ہیں وہ ان سے کیا کچھ کم تھیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ایک استاذ فی الحدیث جن کا نام ہیثم بن جمیل تھا اور بڑے بڑے حفاظ وقت سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، عبداللہ بن المثنی الانصاری جیسے اکابر شریک ہیں۔ بہرحال ان ہی ہیثم بن جمیل کے تذکرے میں خطیب نے لکھا ہے کہ

اَفْلَسَ الْهَيْثَمُ بْنُ جَمِيْلٍ فِيْ طَلَبِ الْحَدِيْثِ مَرَّتَيْنِ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۵۶)

ہیثم بن جمیل علم حدیث کی طلب میں دو دفعہ افلاس اور بے نوائی کے شکار ہوئے (یعنی ایک پیسہ بھی گرہ میں نہ رہا سب خرچ کر ڈالا)

---

[1] قال۔ حدثنی ابو وائل عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجاء بعمال العبد یوم القیامة فیقول اللہ تعالی عبدی عهد الی وانا احق من وفی بالعهد ادخلوا عبدی الجنة۔ ۱۲

ہیثم کا اصل وطن بغداد تھا، شاید مالی دقتوں کی وجہ سے یا واللہ اعلم کس وجہ سے شام کے شہر انطاکیہ میں آکر بعد کو مقیم ہو گئے تھے ۲۱۲ھ میں وفات ہوئی۔ امام مالک کے مشہور استاد ربیعۃ الرائے کے متعلق امام مالک ہی کا قول حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے نقل کیا ہے یعنی امام مالک یہ فرماتے ہوئے کہ

"اس علم میں (حدیث میں) کمال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ آدمی ناداری اور فقر کا مزہ چکھے"۔

نظیر میں اپنے استاد ربیعہ کا حال بیان کرتے کہ

"اسی علم کی تلاش و جستجو میں ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ آخر میں گھر کی چھت کی کڑیاں تک ان کو بیچنی پڑیں اور اس حال سے بھی گزرنا پڑا کہ مزبلہ (جہاں خس و خاشاک آبادی کی ڈالی جاتی ہے) سے منقی یا کھجوروں کے ٹکڑے چن چن کر کھاتے"۔ (جامع ج ۱ ص ۹۷)

گھر کی کڑیوں کے بیچنے کے سلسلے میں قصہ قاضی **ابو یوسف** کا یاد آتا ہے جس کا ذکر حنفی طبقات کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ یعنی امام ابو یوسف پر ایک زمانہ وہ بھی گزرا تھا کہ کھانے کو جب کچھ نہ رہ گیا تو سسرال کے گھر کے چھپر کی کڑی نکال کر بازار بھیجی تاکہ جو پیسے اس سے حاصل ہوں ان سے خوراک کا سامان کیا جائے۔ بظاہر بی بی صاحبہ جو شاید گھر کی مالکہ تھیں انہوں نے تو اجازت دے دی تھی، لیکن قاضی صاحب کی ساس کو اپنے سعادت مند لائق کماؤ داماد کی اس حرکت کی جب خبر ہوئی تو کہتے ہیں کہ بڑی بی سے نہ رہا گیا اور کچھ بول بیٹھیں، لکھا ہے کہ قاضی صاحب کی غیرت میں اسی واقعہ سے حرکت پیدا ہوئی، پھر علم نے جہاں تک ان کو پہنچایا اس سے کون ناواقف ہے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے بھی قاضی صاحب کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔ خود کہتے تھے کہ

"میرے ساتھ پڑھنے والوں کی یوں تو کافی جماعت تھی لیکن بھائی جس بیچارے کے دل کی دباغت دہی سے کی گئی تھی، نفع اسی نے اٹھایا"۔

پھر خود ہی دل کی اس دباغت کا مطلب یہ بیان کرتے کہ

ابو العباس (سفاح) عباسی کے ہاتھ میں خلافت کی باگ جب آئی (اور کوفہ کے قریب ہی ہاشمیہ میں) اس نے قیام اختیار کیا تو اس نے مدینہ منورہ سے اہل علم و فضل کو وہیں طلب کیا (میں نے

اس موقعہ کو غنیمت خیال کیا) اور ان لوگوں کے پاس استفادے کے لئے حاضر ہونے لگا،
میرے گھر کے لوگ میرے کھانے کا انتظام یہ کر دیتے تھے کہ چند روٹیاں ٹھوک لی جاتی تھیں
اور دہی کے ساتھ بندہ کھا کر سویرے درس وافادے کے حلقوں میں حاضر ہو جاتا لیکن جو
اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان کے لئے ہریسہ یا عصیدہ تیار ہولے تب اس کا ناشتہ کر کے
جائیں گے، ظاہر ہے کہ ان کے وقت کا کافی حصہ اسی کی تیاری میں صرف ہو جاتا تھا اسی لئے جو
چیزیں مجھے معلوم ہو سکیں ان سے یہ عصیدہ اور ہریسہ والے حضرات محروم رہے۔ (جامع ج ا ص ۹۷)

خیر یہ تو ایک ذیلی قصہ تھا، میں ذکر ان محدثین کی مالی قربانیوں کا کر رہا تھا، فن رجال کے امام الائمہ
یحییٰ بن معین کے حال میں لکھا ہے کہ ان کے والد نے جو اس زمانے کے کسی والی کے سکریٹری تھے
کافی سرمایہ حاصل کیا تھا، جس وقت ان کی وفات ہوئی تو دس لاکھ پچاس ہزار درم صاحبزادے کے
لئے چھوڑ کر مرے، بیچارے کا خیال ہو گا کہ اس روپے سے یحییٰ عیش و آرام کی زندگی بسر کرے گا لیکن
کسی قصبہ یا محلہ کے رئیس بن کر مر جاتے، خدا نے ان کو اتنا چھوٹا بنا کر پیدا نہیں کیا تھا، رہتی دنیا
تک ان کا نام عظمت و احترام سے لیا جائے گا کہ اللہ کے آخری رسول ؐ کی حدیثوں کو اغلاط اور آلودگیوں
سے پاک و صاف کیا۔ قسمت میں تو ان کے یہ لکھا ہوا تھا۔ یہ سارا سرمایہ جو باپ سے ان کو ملا تھا، جانتے
ہیں اس کا استعمال یحییٰ نے کیا لیا۔ الخطیب نے اپنی متصل سند سے روایت درج کی ہے کہ

فانفقه كله على الحديث حتى لم يبق له نعل يلبسه.

(ساڑھے دس لاکھ درم کی ساری رقم) یحییٰ بن معین نے علم حدیث کے حاصل کرنے میں خرچ کر ڈالی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخر میں ان کے پاس چپل تک باقی نہ رہا جسے وہ پہنتے۔ (یعنی ننگے پاؤں پھرنے لگے) (ج ۱۴ ص ۱۷۸)

اور یہ قصہ کہ آخر میں اتنا بھی نہ رہا کہ چپل خرید کر پہن سکیں، ایک یحییٰ بن معین ہی کے ساتھ مختص نہیں
ہے۔ یہی امام بخاری کیا امام بخاری یونہی ہو گئے تھے؟ ان کے ایک رفیق درس عمر بن حفص الاشقر
کے حوالے سے خطیب نے لکھا ہے کہ

"بصرہ میں ہم محمد بن اسماعیل (یعنی امام بخاری) کے ساتھ حدیث لکھا کرتے تھے (یعنی استادوں

سے سن کر حدیث روایت کرتے تھے) چند دنوں کے بعد محسوس ہوا کہ بخاری کئی دن سے درس میں نہیں آرہے ہیں، تلاش ہوئی کہ بیچارے کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ جہاں مقیم تھے ڈھونڈتے ہوئے ہم لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑے ہیں، بدن پر لباس نہیں ہے (یعنی جس لباس کو پہن کر لوگ باہر نکلا کرتے تھے) دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ

قد نفد ما عندہ ولم یبق معہ شیٔ۔	جو کچھ ان کے پاس تھا سب ختم ہوچکا کچھ باقی نہ رہا جس سے لباس تیار کرتے۔

آخر ہم لوگوں نے مل کر رقم جمع کی اور خرید کر کپڑا لائے تب پہن کر بخاری پھر ہم لوگوں کے ساتھ درسگاہ آنے جانے لگے۔" (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳)

یہی حادثہ **امام احمد بن حنبل** کے ساتھ پیش آیا۔ مکہ معظمہ میں سفیان بن عیینہ کے پاس جس زمانہ میں پڑھتے تھے، ان کے رفقاء کا بیان ہے کہ ایک دن دیکھا کہ خلاف معمول احمد بن حنبل درس سے غائب ہیں، حال دریافت کرنے کے لئے ان کی فرودگاہ پر پہنچے، اندر چھپے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ سارا کپڑا ان کا چوری ہوگیا[1] اور دام بھی گرہ میں نہیں ہیں۔ روایت کے بیان کرنے والے صاحب جن کا نام علی بن الجہم تھا، کہتے تھے کہ میں نے امام کی خدمت میں اشرفی پیش کی، عرض کیا کہ چاہے ہدیۃً قبول فرمائیے یا قرضاً لیجئے۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ تب میں نے کہا کہ معاوضہ لے کر میرے لئے کچھ کتابت ہی کر دیجئے، اس پر راضی ہوگئے۔ علی بن جہم نے بطور تبرک امام کے دستِ مبارک کے اس مخطوطہ کو رکھ چھوڑا تھا۔ لوگوں کو دکھاتے اور لکھنے کی شانِ نزول کو بھی اس کے ساتھ بیان کرتے۔ (ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷)

امام احمدؒ کے واقعات اس سلسلے میں اتنے ہیں کہ سب کے درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں،

---

[1] جس گھر میں امام صاحب رہتے تھے ایک بوڑھی بھی وہاں رہتی تھی، وہی یہ قصہ بیان کرتی تھی کہ امام احمد بن حنبل کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے کہ پیچھے میں کسی نے کپڑے ان کے چرالئے، جب امام آئے تو حادثہ کی خبر ہوئی۔ بڑھیا کا بیان ہے کہ اس شخص نے کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا کہ ہیں یا نہیں، صرف ان مسودوں کو دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں، جو طاق پر بچ کر رہ گئے تھے۔

ان کے یمنی استاذ عبدالرزاق لوگوں کو یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ جب احمد بن حنبل میرے پاس (حدیث پڑھنے کے لئے) یہاں یمن آئے تو میں نے ان سے کہا کہ یمن کوئی کاروباری ملک نہیں ہے، پھر میں نے چند اشرفیاں پیش کیں لیکن لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، اسی زمانہ میں اسحاق بن راہویہ بھی عبدالرزاق ہی کے پاس امام احمد کے ساتھ حدیث سنا کرتے تھے۔ اسحاق نے ایک طویل قصہ کا ذکر کرتے ہوئے اسی میں بیان کیا ہے کہ ازار بند بن بن کر امام احمد یمن میں اپنی ضرورت ان ہی ازار بندوں کو بیچ کر پوری کیا کرتے تھے۔ دوسروں نے لاکھ کچھ قبول کر لینے پر اصرار کیا لیکن ہمیشہ انکار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب کام سے فارغ ہو کر یمن سے امام چلنے لگے تو نانبائی کے کچھ روپے حضرت پر رہ گئے، جوتا پاؤں میں تھا اسی کو روپے کی جگہ نانبائی کے حوالہ فرما دیا، خود پیدل روانہ ہوئے، اونٹوں پر بار لادنے والے اور اتارنے والے مزدوروں میں شریک ہو گئے، جو مزدوری ملتی تھی، وہی زادِ راہ کا کام دیتی تھی (ان سارے واقعات کا ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے، دیکھو ج ۲)

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا واقعات میں گو حضرت امام کی سیر چشمی، بلند نظری کی شہادتوں کے عناصر زیادہ شریک ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس قسم کی زندگی سے اپنے آپ کو ان بزرگوں نے راضی کر لیا تھا، ان کی طرف محنت و جفاکشی کے جو واقعات بھی منسوب کئے جائیں ان میں شک کرنے کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟ علم حدیث میں لوگ کہتے ہیں کہ شعبہ بن الحجاج امیر المومنین سمجھے جاتے تھے۔ ہم ان کی سوانح عمری میں پڑھتے ہیں کہ ستر پچھتر کی عمر گزارنے کے باوجود اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاشی فکر میں الجھانا پسند نہ کیا۔ ذہبی نے لکھا ہے:

ما اکل شعبة من کسبه قط (ج ا ص ۱۸۴) — اپنی کمائی سے شعبہ نے کبھی نہیں کھایا۔

ان کو یہ کرنا چاہئے تھا یا نہ کرنا چاہئے تھا[1]، یہ الگ سوال ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا آدمی حدیث

---

[1] آخر عمر میں شعبہ اپنے طریقۂ کار کی خود مذمت کیا کرتے تھے، شاگردوں سے کہتے کہ ہماری طرح نہ بن جانا کہ میں اپنے بھائیوں کے پسینے کا بوجھ بنا ہوا ہوں، لکھا ہے کہ حماد اور بشار نامی شعبہ کے دو بھائی تھے، صراف کا کام کرتے تھے وہی ان کے اور ان کے اہل و عیال کے مصارف کے متکفل تھے۔ شعبہ کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے کہ جو طلب حدیث میں مبتلا ہوا فقر و فاقہ میں مبتلا ہوا: اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ خود اس کے شکار ہوئے، اپنا حال بیان کرتے ہوئے کبھی شعبہ یہ بھی کہتے کہ اسی طلب حدیث کے قصہ میں اپنی والدہ کا طشت سات دینار میں مجھے بیچنا پڑا۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۸۴)

ہی میں کیا جس علم میں بھی چاہے امیر بن سکتا ہے. قلب کی اس فارغ البالی کا کوئی ٹھکانا ہے، ان ہی شعبہ کے متعلق ابو قطن کے حوالہ سے ذہبی نے نقل کیا ہے کہ

مارأیت شعبة قد رکع الاظننت انه نسي ولا سجد الا قلت نسي۔ (ج ۱ ص ۱۸۲)

میں نے شعبہ کو رکوع میں جب کبھی دیکھا تو یہی خیال گزرتا تھا کہ بھول گئے (یعنی رکوع ہی میں اس کا خیال دماغ سے ان کے شاید نکل گیا) اسی طرح جب کبھی سجدے میں دیکھا تو خیال کیا کہ بھول گئے

محدثین علم حدیث کی خدمت کو شب بیداری سے افضل سمجھتے تھے

بظاہر اس حال کا تعلق نفلی نمازوں سے معلوم ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ان ہی محدثین کے اس عام نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھ لیجئے جو ان میں سے کسی ایک کی طرف نہیں بلکہ متعدد بزرگوں کی طرف منسوب ہے، مثلاً حافظ الجزیرہ معافی بن عمران الموصلی، سفیان ثوری جنھیں "یاقوتۃ العلماء" کہا کرتے تھے. ان ہی معافی سے پوچھنے والے نے پوچھا کہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہنا، یا حدیث کے لکھنے، یاد کرنے میں رات گزارنا، ان دونوں مشغلوں میں آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ جواب میں معافی نے کہا کہ

حدیث تکتبه احب الی من قیام من اول اللیل الی اٰخرہ (جامع ص ۴۴)

حدیث کا لکھنا میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر ہے کہ رات بھر اول سے آخر تک تم نمازیں پڑھتے رہو۔

اور یاقوتۃ العلماء کا جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کوئی ذاتی مذاق نہ تھا، امام احمد بن حنبل بھی لوگوں سے یہی فرماتے کہ

"علمی اشتغال میں رات کے کسی حصہ کو بسر کرنا میرے نزدیک احیاء شب (یعنی نماز پڑھنے سے) زیادہ بہتر ہے"

سائل نے دریافت کیا کہ علم سے آپ کی مراد کیا ہے؟ فرمایا کہ اپنے دین کے معلومات کو بڑھانا. اس نے کہا کہ کیا اسی نماز، روزہ، حج، نکاح، طلاق وغیرہ کے متعلقہ معلومات کو آپ علم کہتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں یہی! زہری تو اسی بنیاد پر کہتے تھے کہ دین میں سمجھ پیدا کرنے کی کوشش اس سے زیادہ بہتر عبادت

اور کیا ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب خود نبوت کے صحبت یافتوں کا فتوی تھا، ابو ہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ

"تھوڑی دیر بیٹھ کر دین کے سمجھنے میں (یعنی تفقہ) میں بسر کرنا میرے نزدیک رات بھر (نمازوں میں) جاگنے سے بہتر ہے"

اس باب میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کا ایک ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے، بلکہ خود قرآن میں اسی اصول کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔ اسی لئے امام شافعی کا تو عام فتوی تھا کہ علم کا حاصل کرنا نفلی نمازوں سے بہتر ہے۔ مصر کے امام ابن وہب امام مالک کے ارشد تلامذہ میں ہیں، وہی کہا کرتے تھے کہ امام مالک کے سامنے میں پڑھ رہا تھا، اتنے میں ظہر یا عصر کا وقت آگیا، کتاب بند کرکے میں (نفل کی) نیت سے اٹھا، امام سمجھ گئے اور فرمانے لگے کہ

"تعجب ہے جس چیز میں تم مشغول تھے کیا اس سے بھی وہ کام زیادہ بہتر ہے جسکو اب کرنا چاہتے ہو"

پھر فرمایا کہ

"نیت" درست ہو تو وہ بہتر ہے، جس میں تم مشغول تھے۔"

حافظ ابن عبدالبر نے اس قسم کے بیسیوں اقوال صحابہؓ، تابعین اور ائمہ کے نقل کئے ہیں، میری غرض ان کے ذکر سے اس وقت یہ ہے کہ اب وہ غلط ہو یا صحیح، اس سے بحث نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ جن کے قلوب میں اس علم نے اپنی اتنی گہری جگہ بنالی تھی کہ دنیا تو خیر دنیا ہی ہے وہ فرائض کے سوا سارے دینی مشاغل پر بھی اس علم کی مشغولیت کو ترجیح دیتے تھے۔ جب نوافل میں ان کے استغراق اور یکسوئی کا یہ حال تھا کہ سجدہ میں گئے تو سجدہ ہی میں پڑے ہوئے ہیں، رکوع میں ہیں تو رکوع سے سر اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتے، حتی کہ دیکھنے والا بے چارہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا کہ بھول گئے۔ ان ہی لوگوں کے متعلق سوچئے کہ اس علم کی طلب و تلاش میں ان کی کوششوں کی کیا کیفیت ہوگی جو نفلی نمازوں کو اتنا وقت دے سکتا ہو، غور کرنا چاہئے کہ جو چیز ان کی نگاہوں میں ان نمازوں سے بھی بہتر تھی اس کے لئے جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے کیا اس میں کوئی دقیقہ کوشش کا انہوں نے اٹھا رکھا ہوگا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ دین ہی جس کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے اس کے نزدیک دینی معلومات کی ظاہر ہے کہ کیا وقعت ہوگی، لیکن جو دین کو ایک واقعہ یقین کر چکا ہو، اسی قسم کا واقعہ جیسے دین کے انکار کرنے والوں کی نگاہوں میں "دنیا" ایک واقعہ ہے، پھر اس دنیا یعنی زندگی کا وہ وقفہ جسے شکم مادر سے نکلنے اور شکم قبر میں جانے کے دوران گزارتا ہے، اسی زندگی میں نفع پہنچانے والے معلومات کی جستجو اور تلاش میں جب وہ سب کچھ کیا جاسکتا ہے جس کا تماشا آج ہم ان ممالک میں کر رہے ہیں، جہاں انسانی زندگی اسی وقفہ تک محدود سمجھی جاتی ہے تو آپ کو جدوجہد کے اس سلسلہ پر اور ان کے نتائج پر کیوں تعجب ہوتا ہے جو دینی معلومات کے حاصل کرنے والے بزرگوں کی طرف کتابوں میں منسوب کئے گئے ہیں، بزرگوں کی وہی جماعت جس میں اس یقین کے پیدا کرنے میں پیغمبروں نے کامیابی حاصل کی تھی کہ اسی دو شکمی وقفہ میں انسانی زندگی گھٹ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ آدمی جس زندگی کو چاہتا ہے کہ کبھی ختم نہ ہو، انہوں نے یقین دلایا ہے کہ واقعہ بھی یہی ہے۔ دین چونکہ اسی نہ ختم ہونے والی لامحدود زندگی کے متعلقہ معلومات کا نام ہے، اس لئے زندگی کو لامحدود یقین کرنیوالوں میں اس زندگی کے متعلقہ معلومات کے جاننے کی تڑپ اگر پیدا ہوئی تو آپ ہی بتلائیے کہ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، جس حد تک اس لامحدود زندگی کے یقین کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی، اسی نسبت سے ان معلومات کی تلاش و جستجو کے جذبہ میں شدت پیدا ہو رہی تھی، جن سے اس زندگی کے نفع و ضرر کا تعلق تھا، جن معلومات سے دو شکمی وقفہ والی زندگی کے مشکلات کے حل میں مدد ملتی ہو یا سہولتوں میں اضافہ ہوتا ہو، جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے لئے گھسنے والے سمندروں میں گھس رہے ہیں، پہاڑوں کو کھود رہے ہیں اور جو کچھ ان کے امکان میں ہے سب کچھ کر رہے ہیں تو لامحدود زندگی کو واقعہ یقین کرنے والوں کے متعلق جب سنایا جاتا ہے کہ الدین کے یقین و اعتماد کا جو اصلی سرچشمہ تھا اور جس کی زندگی کا ہر پہلو الدین کے لئے نئے انکشافات کی حیثیت رکھتا تھا، ان ہی انکشافات کی راہوں میں انہوں نے وہ سب کچھ لگا دیا جسے وہ لگا سکتے تھے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی توقع کے قائم کرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی۔

احتیاط کا حال

یہی امیر المومنین فی الحدیث شعبہ جن کے سجدوں اور رکوع کی کیفیت آپ سن چکے، ان ہی کے متعلق اگر یہ بھی سنایا جاتا کہ

كَانَ لَا يَرْضٰى اِلَّا اَنْ يَسْمَعَ الْحَدِيْثَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً -	جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کو شعبہ بیس مرتبہ نہیں سن لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

جس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یعنی ایک ہی استاذ کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو اسی استاذ سے بیس دفعہ جب تک نہیں سن لیتے تھے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اور محدثین یہ بھی کرتے تھے۔ ہشیم کے حالات میں خطیب نے لکھا ہے کہ ان کے شاگرد ابراہیم بن عبداللہ الہروی کہا کرتے تھے:

مَا مِنْ حَدِيْثِ هُشَيْمٍ اِلَّا وَسَمِعْتُهُ مِنْهُ مَا بَيْنَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً اِلٰى ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۱۱۹)	ہشیم سے جو حدیثیں میں روایت کرتا ہوں، ان سے حدیثوں کو کم وبیش بیس سے تیس مرتبہ میں نے سنا ہے۔

اسی طرح معن بن عیسیٰ کا بھی دعویٰ تھا کہ امام مالک سے جتنی حدیثیں روایت کرتے تھے ان کے متعلق کہتے تھے کہ

قَدْ سَمِعْتُهُ مِنْهُ نَحْوًا اَوْ اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً (حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۲۱)	میں نے امام مالک سے یہ حدیثیں تیس مرتبہ سنی ہیں یا اسی کے قریب قریب۔

اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی حدیث کو شعبہ جب تک کم از کم بیس استاذوں سے نہیں سن لیتے تھے ان کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ معلوم ہے یہ بھی محدثین کا عام مذاق تھا۔ یحییٰ بن معین کو تو اس پر اتنا اصرار تھا کہ لوگوں سے وہ کہا کرتے تھے:

لَوْلَمْ نَكْتُبِ الْحَدِيْثَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ وَجْهًا مَا عَقَلْنَاهُ۔ (ص ٦)	جب تک کسی حدیث کو تیس ذریعوں سے ہم لوگ نہیں لکھتے اس وقت تک اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آتا

اس زمانے کے حساب سے ٹھیک اس کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ایک ہی واقعہ ہوتا ہے، مختلف

نیوز ایجنسیاں اپنے اپنے الفاظ اور اپنی اپنی تعبیر میں اس واقعہ کی خبر اخباروں کو بھیجتی ہیں۔ جو لوگ سیاسی کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں یا تحقیقی اخبار نویسی کا کام کرتے ہیں یا صحیح واقعات کے علم کا جن لوگوں کو ذوق ہوتا ہے وہ بجنسہ ایک واقعہ کی خبر کو مختلف اخباروں میں پڑھتے ہیں اور نیوز ایجنسی کی تعبیروں کو ملانے کے بعد واقعہ کی اصل نوعیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ اخباروں کا مطالعہ ان ہی التزام کے ساتھ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے علم اور ان کے فیصلوں کی نوعیت عام اخبار بینوں سے بھلا کوئی نسبت رکھتی ہے[1]۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ حدیثوں کی تعداد بتاتے ہوئے عام کتابوں میں لاکھوں لاکھوں تک ان کے شمار کو پہنچا دیا گیا ہے۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ شاید باور کر لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن اقوال وافعال کو یا تقریرات کو منسوب کیا گیا ہے ان کی تعداد لاکھوں لاکھ تک پہنچتی ہے، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے[2]۔ میں بتا چکا ہوں الحاکم صاحبِ مستدرک کی یہ شہادت پیش

---

[1] مثلاً بہت سی باتیں کسی ایجنسی کی خبریں مجمل رہ جاتی ہیں، دوسری نیوز ایجنسی کی خبریں اسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے بعض دفعہ نامہ نگار میں سلیقہ اس کا نہیں ہوتا کہ گر کی بات اور عام باتوں میں تمیز کر سکے لیکن ہوشیار نامہ نگار بھیجی ہوئی خبروں میں اسی کا انتخاب کرتا ہے یا اسی پر زیادہ زور اپنے بیان میں خرچ کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ خبر کی نوعیت کا اظہار ایک ایجنسی کا نامہ نگار کرتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے۔ جن کی نظر سب پر ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس حد تک خبر قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے بلکہ مختلف اخباروں کے پڑھنے سے ان لوگوں کو اس کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے کہ بعض بالکل بے بنیاد جھوٹی خبریں اخباروں میں کسی خاص غرض سے جو شائع ہو جاتی ہیں، محتاط اخبار یا ایجنسیاں ان کے ذکر سے پرہیز کرتی ہیں لیکن بعض اخباروں یا ایجنسیوں کو اسی میں مزہ آتا ہے۔

[2] ابن جوزی سے بڑھ کر اس باب میں خود خیال کیجئے کس کا بیان قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب "صید الخاطر" فصل ۱۷۵ میں حدیثوں کے متعلق اس عددی مغالطہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اَنَّهٗ لَوْ جُمِعَ الصَّحِيْحُ وَالْمُحَالُ الْمَوْضُوْعُ وَكُلُّ مَنْقُوْلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَلَغَ خَمْسِيْنَ اَلْفًا یعنی صحیح حدیثوں کے ساتھ ان ساری بے بنیاد جھوٹی اور گھڑی ہوئی جعلی حدیثوں کو بھی جمع کر لیا جائے جو کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو وہ بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچ سکتی ہیں، انہوں نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے سارے اسلامی ممالک کا دو دفعہ دورہ ان ہی حدیثوں کے جمع کرنے کے لئے کیا لیکن ان کی مسند میں بھی چالیس ہزار حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں دس ہزار مکرر ہیں، بلکہ ابن عساکر سے تو ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد مسند احمد کی قوی وضعیف حدیثوں کی تعداد تیس ہزار تک بمشکل پہنچ سکتی ہے۔ (دیکھو الکتانی ج ۲ ص ۲۰۷) دراصل معنوی اور لفظی تکرار کے لحاظ سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد

لَا یَبْلُغُ عَدَدُھَا عَشَرَةَ اٰلَافِ حَدِیْثٍ (دم ل ص)   دس ہزار تک نہیں پہنچتی

اور قوی و ضعیف، صحیح و حسن، معیاری غیر معیاری حدیثوں کی تعداد مکررات کو الگ کر لینے کے بعد میرے خیال میں تیس بتیس ہزار سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر ایک ایک حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا دستور اور یہ کہ جتنے راویوں سے حدیث سنی جاتی تھی، ایک اصطلاح بنالی گئی تھی کہ حدیث کی تعداد بھی وہی قرار پاتی تھی یعنی دس راویوں سے اگر سنی گئی ہے تو وہی ایک حدیث دس حدیث بن جاتی تھی، الذہبی وغیرہ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ **ابراہیم بن سعید الجوہری** کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ ایک صاحب جن کا نام جعفر بن خاقان تھا، انہوں نے ابراہیم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث کے متعلق کچھ دریافت کیا، ابراہیم نے اپنی لونڈی (جاریہ) کو بلایا اور کہا کہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) شاید گننے میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے، معناً یا مآلاً جن دو حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے، ابن عساکر نے ان کو بھی مکررات میں غالباً شمار کر لیا ہے اور ابن جوزی نے ان ہی حدیثوں کو مکرر خیال کیا ہے جن کے الفاظ بھی ایک ہی ہیں، اور ابن جوزی کا شمار تو خیر تشدد پسندوں میں ہے لیکن ان کے مقابلہ میں جلال الدین سیوطی جیسے سہولت پسند بزرگ نے جمع الجوامع کے نام سے حدیثوں کے جمع کرنے کا جو آخری کام کیا ہے اور اسی کتاب کی فقہی ترتیب مشہور ہندی محدث علی متقی نے کنز العمال میں کی ہے، دیباچہ میں شیخ علی متقی نے لکھا ہے اس کتاب یعنی کنز العمال کے پڑھنے والوں کے سامنے نہ صرف جمع الجوامع ہی کی کل حدیثیں آ جائیں گی بلکہ ایک حصہ ان حدیثوں کا بھی ان کو ملے گا جو جمع الجوامع میں نہیں پائی جاتیں۔ اب دیکھئے کنز العمال کی حدیثوں کے گننے والوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب چالیس ہزار نو سو انسٹھ ۴۰،۹۵۹ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کنز العمال کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے ان کو اندازہ ہوا ہو گا کہ اس میں اب بھی کتنی حدیثیں مکرر ہیں، میرا تو خیال ہے کہ ان مکررات کو اگر حذف کر دیا جائے تو چالیس ہزار کی یہ تعداد گھٹ کر قریب قریب تیس ہزار تک پہنچ جائے تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ کنز العمال کا خلاصہ بحذف مکررات خود علی متقی نے کیا ہے جو مسند احمد کے حاشیہ پر چھپ بھی چکا ہے۔ شمار کرنے سے ثابت ہوا ہے کہ اس میں کل تیس ہزار اور دو حدیثیں درج ہوئی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ حدیث کے ان مجامیع یا دائرۃ المعارف میں رطب و یابس ہر طرح کی حدیثیں لے لی گئی ہیں، اسی لئے میرا خیال ہے کہ صحیح اعلیٰ معیاری حدیثوں کی تعداد اگر دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی تو ضعیف و حسن و صحاح سب کو ملانے کے بعد تیس بتیس ہزار سے آگے ان کی تعداد کا بڑھنا مشکل ہے۔ ۱۲۰

اَخْرِجِيْ لِيَ الْجُزْءَ الثَّالِثَ وَالْعِشْرِيْنَ مِنْ مُسْنَدِ اَبِيْ بَكْرٍ رض۔	حضرت ابوبکرؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی تیئسویں جلد نکال کر لا۔

جعفر نے ابراہیم کے ان الفاظ کو سن کر حیرت سے کہا کہ ابوبکر صدیقؓ سے تو پچاس حدیثوں کا صحیح ثابت ہونا بھی مشکل ہے، یہ آپ نے ان کی حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ کہاں سے جمع کر لیا جس کی اتنی جلدیں ہیں؟ یہ سن کر ابراہیم نے حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ

كُلُّ حَدِيْثٍ لَا يَكُوْنُ عِنْدِيْ مِنْ مِائَةِ وَجْهٍ فَاَنَا فِيْهِ يَتِيْمٌ۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۸۹)	ایک ایک حدیث جب تک سو سو طریقوں سے مجھے نہیں ملتی تو اس حدیث کے متعلق میں اپنے آپ کو یتیم خیال کرتا ہوں۔

مطلب ابراہیم کا وہی تھا کہ ایک ایک حدیث سو سو طریقوں سے جب تک مجھے نہیں ملتی اس وقت تک تو اپنے آپ کو اس حدیث کے متعلق لاوارث یتیم آدمی خیال کرتا ہوں اور یوں ایک حدیث کو بجائے ایک کے وہ سو حدیث بنا لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طریقے سے ابوبکر صدیقؓ کی حدیثوں سے مجلدات ابراہیم نے اگر بنا لئے تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ والی حدیث واقع میں ظاہر ہے کہ ایک ہی حدیث ہے لیکن راویوں کے تعداد کی بنیاد پر محدثین نے بجائے ایک کے اس کی تعداد پانسو تک پہنچا دی ہے، میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ "محدثین" کا یہ خاص کارنامہ ہے۔ حدیثوں کی صحت و سقم کے پتہ چلانے کا یہ بہترین طریقہ تھا جسے انہوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس زمانے میں پروپاگنڈے کے لئے یا صرف اس لئے کہ خبر میں سنسنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے بے بنیاد جھوٹی خبروں کے پھیلانے کا جو عام رواج ہے، ان خبروں کے متعلق بھی صحیح رائے وہی قائم کر سکتے ہیں جو مختلف نیوز ایجنسیوں کی خبروں اور مختلف اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعوں سے باخبر رہتے ہیں، وہی جانتے ہیں اور ان ہی کو یہ جاننے کا موقعہ ہے کہ کن کن ایجنسیوں کی روش محتاط ہے، ان میں کس کس کی کیا کیا خصوصیت ہے، ان میں بھروسہ اور اعتماد کے قابل خبریں کون مہیا

کرتا ہے، کچھ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ اس زمانے کے محدثین کا حال تھا۔ سفیان ثوری کا ایک قول حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ حدیثوں کے سننے کی غرض ایک ہی نہیں ہوتی، کہا کرتے تھے کہ

"ہم بعضوں سے اس لئے حدیث سنتے ہیں کہ اس کو اپنے دین میں شریک کریں اور کبھی کسی حدیث کی صحت اور عدم صحت کے متعلق فیصلہ کو ملتوی کرنے کے لئے بھی ہم بعضوں سے اس حدیث کو سنتے ہیں، بعضوں کی بیان کی ہوئی حدیث کو ہم جانتے ہیں کہ مستحق توجہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بیان کرنیوالے کی روش اور مذہب کا پتہ چلانے کیلئے ہم اس سے حدیث سنتے ہیں۔"

(معرفۃ علوم الحدیث، حاکم ص ۱۳۵)

حاکم نے احمد بن حنبل کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہم جس زمانے میں صنعا (یمن) میں حدیث پڑھنے کیلئے مقیم تھے اور میرے ساتھ علاوہ دوسرے رفقاء کے یحییٰ بن معین بھی تھے، ایک دن میں نے یحییٰ کو دیکھا کہ گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں اور کوئی آدمی جب سامنے آجاتا ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ کے نام جعلی حدیثوں کا ایک مجموعہ ابان کی روایت سے جو پایا جاتا ہے اسی کو یحییٰ نقل کر رہے ہیں، میں نے کہا کہ تم ان غلط اور جھوٹی روایتوں کو نقل کر رہے ہو۔ اس وقت یحییٰ بن معین نے کہا کہ

بھائی! اسی لئے تو اس کو لکھ رہا ہوں کہ ان ساری روایتوں کو لکھنے کے بعد زبانی یاد کرلوں، میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ساری روایتیں جعلی ہیں، غرض میری یہ ہے کہ ابان کی جگہ کسی معتبر راوی کا نام داخل کرکے غلط فہمی میں لوگوں کو اگر کوئی مبتلا کرنا چاہے گا تو میں اس غلط فہمی کا ازالہ اصل واقعہ کو ظاہر کرکے کرسکوں گا یعنی بتا سکوں گا کہ جس جگہ پر ثقہ راوی کا نام رکھا گیا ہے یہ غلط ہے درحقیقت ان روایتوں کا بنانے والا ابان ہے۔" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰)

"یحییٰ بن معین نے اسی غرض سے موضوع حدیثوں کا بھی ایک طومار نقل کیا تھا، کہا کرتے تھے کہ دھنغ بافوں سے میں نے بڑا ذخیرہ روایتوں کا لکھا جس سے بعد کو میں نے اپنے تنور کو گرم کیا

اور نہایت عمدہ پکی ہوئی روٹیاں اس سے تیار ہوئیں۔" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح واقعات سے واقفیت کے لئے جیسے اس زمانے میں ہر قسم کی نیوز ایجنسیوں اور ہر طرح کے اخباروں کا مطالعہ ناگزیر ہے، محدثین بھی یہی سمجھتے تھے کہ سچی روایتوں کو جھوٹی روایتوں سے جدا کرنے کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے راویوں سے حدیثوں کو سننے کی کوشش کی جائے۔ حافظ ابوعمرو بن عبدالبر نے ایوب سختیانی کے حوالے سے یہ تجربہ کی بات نقل کی ہے کہا کرتے تھے

"اپنے استاذ کی غلطیوں سے تم اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسروں کے پاس بھی جا کر نہ بیٹھو۔" (ص ۹۹ جامع)

بہرحال حدیثوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ بھی اور ایک ایک محدث کے سینکڑوں اساتذہ کا نام کتابوں میں جو لیا جاتا ہے، اس کی وجہ بھی محدثین کا یہی مذاق تھا یعنی جب تک سو سو طریقوں سے حدیث ان تک نہ پہنچی ہو، اس وقت تک اس حدیث میں اپنے آپ کو یتیم قرار دیتے ان کے اساتذہ کی کثرت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ شعبہ جو اپنی تسلی کے لئے ہر حدیث کا بیس دفعہ سننا ضروری قرار دیتے تھے، ان کے کل اساتذہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی صحبت یافتہ بزرگوں یعنی تابعین میں ان کے استاذوں کی تعداد جیسا کہ ذہبی نے لکھا ہے کہ

سَمِعَ مِنْ اَرْبَعِ مِائَةٍ مِّنَ التَّابِعِيْنَ۔ تابعین میں سے جن جن استاذوں سے شعبہ نے حدیث سنی تھی، ان کی تعداد چار سو ہے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۸۲)

محدثین کے زہد و تقویٰ کی چند مثالیں

مقصود اس طول طویل گفتگو سے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے تن من دھن سب کو دین کیلئے مختص کر دیا تھا، یہی شعبہ نماز میں جن کے سجدوں اور رکوع کی وہ کیفیت تھی، ذہبی ہی نے لکھا ہے کہ باوجود اس جفاکشی کے صائم الدہر رہتے تھے، یعنی ہمیشہ روزے رکھتے تھے، دیکھ کر لوگوں کو رحم آتا جلد بدن کی خشک نظر آتی تھی۔ بھلا سوچئے تو جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ پوچھنے والے نے پوچھا، اس پیرانہ سالی میں آپ کے مشاغل کی نوعیت کیا رہ گئی ہے تو جواب میں بولے کہ بھائی صرف ایک رکعت

میں سورۂ بقرہ پڑھ لیتا ہوں اور مہینے میں اب تین روزوں یعنی ایام بیض کے روزوں سے زیادہ رکھا نہیں جاتا۔ ابو اسحاق السبیعی کے حال میں ذہبی نے اس کا تذکرہ کیا ہے جن کے اساتذہ میں اڑتیس[۳۸] تو صرف صحابی ہیں (ج ا ص ۱۰۸) آخر اسی عہد کے محدثین میں جب ایسے لوگ بھی تھے، مثلاً ثابت البنانی کے متعلق لکھا ہے کہ

"دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے اندر معمول تھا کہ قرآن ختم کر لیتے تھے اور ہمیشہ صائم الدہر رہتے (ج ا ص ۱۱۸)

سلیمان تیمی بھی صائم الدہر تھے، عموماً صبح کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھتے تھے، نفل کی نمازوں میں ان کا بھی حال یہی تھا کہ ستر دفعہ سے کم سجدے میں تسبیح نہ پڑھتے تھے۔ (تذکرہ ج ا ص ۱۴۲) اس عہد کے بزرگوں کے عبادات و ریاضات کی تفصیل کے لئے حلیۃ الاولیا، اور صفوۃ الصفوہ وغیرہ پڑھنی چاہئے۔ نسبتاً ان میں جن لوگوں کو عافیت پسند اور آسائش و آرام، فراغت و رفاہیت کی زندگی بسر کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ بڑے خوش خوراک خوش پوشاک تھے لیکن ان کا حال یہ تھا، مثلاً امام نسائی کے متعلق ذہبی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ بڑے وجیہ و شکیل آدمی تھے، برود نوبیہ (ایک قسم کی قیمتی چادر تھی) اور سبز دوشالے کو پسند کرتے تھے، لکھا ہے کہ

کھانے میں نسائی زیادہ تر بڑے قد والے مرغ کو پسند کرتے تھے، جو خاص کر ان کے لئے خریدے جاتے تھے اور ان کو خصی کر کے خوب فربہ کر لیا جاتا تھا۔" (ص ۲۴۱)

لیکن باوجود ان تمام باتوں کے محمد بن مظفر بیان کرتے تھے کہ

میں نے مصر (جہاں امام نسائی نے قیام اختیار کر لیا تھا) وہاں کے سارے علما اور شائخ کو پایا کہ وہ امام نسائی کی عبادت و ریاضت جس کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا، تعریف کرتے تھے۔" (ص ۲۴۲)

ان کے دینی تصلب کے لئے یہی کیا کم ہے کہ محض حق گوئی کی وجہ سے گویا ان کو شہید ہونا پڑا[۱]۔ کہتے

---

[۱] یعنی لکھا ہے کہ مصر سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے امام دمشق میں ٹھہرے، عام طور پر خوارج کا اس زمانہ میں شام کے علاقوں میں زور تھا، جامع مسجد میں کسی نے پوچھ لیا کہ آپ بڑے محدث ہیں، امیر معاویہؓ کی تعریف میں بھی تو کچھ حدیثیں بیان کیجئے، باوجودیکہ شام والوں کے عقائد سے امام نسائی واقف تھے، اس باب میں ان کا جو علم تھا اس کو چھپانا استبقاء اور تدین کے خلاف معلوم ہوا، بھری مجلس میں کہہ دیا کہ امیر معاویہؓ کے فضائل کیا پوچھتے ہو؟ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہیں کہ خواجہ حسن بصری بھی لطیف غذاؤں کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ ابن سعد نے حمید کا قول نقل کیا ہے، کہتے تھے کہ

مَاشَمِمْتُ مَرِقَةً قَطُّ اَطْيَبَ مِنْ مَرِقَةِ الْحَسَنِ (ابن سعد ج ۷، ص ۱۲۱)

حسن بصری کے شوربے سے زیادہ خوشگوار خوشبو میں نے کسی دوسرے آدمی کے شوربے میں نہیں سونگھی۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ گوشت کا روزانہ آپ کے دسترخوان پر رہنا ضروری تھا، لیکن زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت مجاہدہ میں جو ان کا حال تھا ان سے کون ناواقف ہے، ابن جوزی نے بیس جزوں میں ان کے حالات لکھے ہیں، اسی سے اندازہ کیجئے۔ یوسف بن اسباط جیسے آدمی کا بیان ہے کہ

"تیس سال سے یہ شخص ہنسا نہیں ہے اور چالیس سال اس حال میں گزارا کہ اس عرصے میں کسی سے مذاق نہ کر سکے۔" (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

روتے رہتے تھے، لوگ پوچھتے تو کہتے کہ معاملہ ایسے سے آپڑا ہے جسے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے، کون جانے کہ کل میں آگ میں نہ جھونکا جاؤں گا (صفوہ ج ۳ ص ۱۵۶)

حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے خوف کو دیکھ کر یزید بن حوشب کہا کرتے تھے کہ

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے لئے حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔"

یا امام مالک ہی ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے میں ان کا نقطہ نظر عام طور پر مشہور ہے، ہمیشہ قیمتی لباس زیب تن فرماتے، عطر اور خوشبو میں ڈوبے رہتے، ان کے دربار کے رعب اور وقار کو دیکھ کر لوگ کہا کرتے تھے کَاَنَّہٗ بَابُ اَمِيْرٍ (کسی امیر آدمی کی ڈیوڑھی ہے)۔ آپ کا بھی معمول تھا کہ گوشت کے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ اور اپنے اس ذوق پر اتنا اصرار تھا کہ کسی دن اگر گوشت کیلئے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) معاملہ ان کا برابر سرابر بھی ہو جائے تو کیا تمہارے خوش ہونے کیلئے یہی کافی نہیں ہے نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا کہ خوارج جن سے مسجد بھری پڑی تھی، ان پر ٹوٹ پڑے اور بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ لکھا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ شرمگاہ اور اندرونی بیضوں کو لاتوں سے لوگوں نے اتنا کچلا کہ اس کی تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے۔ دمشق سے کسی طرح مکہ تو ان کو پہنچا دیا گیا لیکن مکہ پہنچ کر وفات ہو گئی۔ (ذہبی ج ۲ ص ۲۴۳)

پیسے نہ ہوتے اور اس کے لئے گھر کی کوئی چیز بیچنی پڑتی تو لکھا ہے کہ یَفْعَلُ وہ چیز بیچ کر گوشت خریدتے)۔ (الدیباج المذہب ص ۱۹) ہر جمعہ کو دستور تھا:

كَانَ يَأْمُرُ خَبَّازَهُ سَلَمَةَ اَنْ يَعْمَلَ لَهُ وَلِعِيَالِهِ طَعَامًا كَثِيْرًا۔ (ص ۱۹)

سلمہ نامی باورچی جو آپ کا تھا اس کو حکم دے رکھا تھا کہ امام اور امام کے گھر والوں کے لئے بہت زیادہ کھانا تیار کرے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان کے علم و عمل، تقویٰ و دیانت کے جو گہرے نقوش امت کے قلوب پر قائم ہیں کیا وہ قیامت تک مٹ سکتے ہیں۔ اللہ اللہ بارگاہِ رسالت پناہی ؐ کے ساتھ جس کی نیازمندیوں اور ادب شناسیوں کا یہ حال ہو، عبداللہ بن مبارک کی یہ چشم دید شہادت ہے، فرماتے ہیں کہ

"امام مالک ہم لوگوں کو حدیث پڑھا رہے تھے، بچھو (جو ان کے کپڑوں میں کسی طرح گھس گیا تھا) نے سولہ دفعہ ڈنک مارے، امام مالک کا چہرہ ہر نیش پر متغیر ہو کر زرد پڑ جاتا تھا لیکن حدیث جس طرح بیان کر رہے تھے بیان کرتے رہے، درمیان میں اس کے سلسلہ کو نہ توڑا۔ جب درس ختم ہو گیا اور لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تب میں نے عرض کیا آج آپ کا یہ کیا حال ہو رہا تھا تب وجہ بیان کی اور فرمایا کہ اِنَّمَا صَبَرْتُ اِجْلَالًا لِحَدِيْثِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے احترام کی وجہ سے میں صبر کئے بیٹھا رہا"۔ (دیباج ص ۲۲)

دوسری کتابوں میں ہے کہ درس سے فارغ ہونے کے بعد اندر تشریف لے گئے، کپڑے اتارے تب بچھو نکالا گیا۔ باہر آ کر ابن مبارک سے چہرے کے تغیر کی وجہ بیان کی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ اس طبقہ کے متعلق کیا جاتا ہے جو حدیثوں کی حفاظت و اشاعت کا صحابہ کے بعد ذمہ دار بن لیا تھا، کیا یہ صرف گزر جانے کی بات ہے؟ پیغمبر اور پیغمبر کی حدیثوں کا جس کے دل میں اتنا احترام ہو کہ بچھو ڈنک پر ڈنک مارتا چلا جا رہا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنا رہا ہوں، سنانے والا صرف اس خیال سے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔

حفاظِ حدیث کے اس گروہ میں جنہیں وسعت عطا کی گئی تھی خود امام بخاری بھی ہیں۔ بخاری کے

ان کی کافی جائداد تھی اور متعدد پن چکیاں ان کی چلتی تھیں، وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار بھی کرتے تھے جس میں ایک ایک دفعہ میں دس دس ہزار کا نفع ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ صرف رمضان میں ان کے مجاہدے کا یہ حال تھا کہ علاوہ تراویح کے پچھلی رات کو نصف یا ایک تہائی قرآن تہجد میں ختم کرتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے دن قرآن ختم ہو جاتا تھا، اور یہ اس تلاوت کے سوا تھا جو دن کو روزہ کی حالت میں کرتے تھے۔ دستور تھا کہ دن کو قرآن کو شروع کرتے اور افطار کے وقت تک ختم ہو جاتا تھا۔

امام بخاری کے ساتھ بھی کہتے ہیں امام مالک ہی کے قریب قریب حادثہ پیش آیا، امام مالک تو حدیث پڑھا رہے تھے اس وقت بچھو نے کاٹا تھا۔ امام بخاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں سے کسی نے باغ میں حضرت کی دعوت کی تھی اتنے میں ظہر کا وقت آگیا، فرض سے فارغ ہو کر نفل میں مشغول ہوئے کہ عین نماز میں بھڑنے کاٹنا شروع کیا لیکن نماز نہ توڑی۔ جب سلام پھیرا تو لوگوں سے کہا کہ دیکھو میرے کرتے میں کوئی چیز تو نہیں ہے، دیکھا گیا تو بھڑ برآمد ہوئی۔ کئی جگہ اس کاٹنے کی وجہ سے ورم ہو گیا تھا۔ پوچھا گیا کہ نماز آپ نے توڑی کیوں نہیں؟ فرمایا کہ

كُنْتُ فِي سُوْرَةٍ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُتِمَّهَا — میں ایک سورہ کی تلاوت میں مشغول تھا، جی یہی چاہا کہ اس کو ختم کر لوں۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳)

اور میں ان قصوں کو کہاں تک بیان کروں، ان کی کوئی حد و انتہا بھی ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ جن بزرگوں کے متعلق سمجھا گیا ہے کہ وہ کچھ غیر معمولی طور پر خوش خوراک خوش پوشاک تھے، ان کی غرض بھی یہی تھی کہ اس ذریعہ سے کام زیادہ قوت اور زیادہ بشاشت کے ساتھ انجام پا سکتا ہے خیال تو کیجئے کہ راتیں جن لوگوں کی اس طرح گزرتی تھیں جیسا کہ امام بخاری ہی کے متعلق ان کے اوراق (مسودہ) نویس محمد بن ابی حاتم کا بیان ہے کہ

"سفر میں امام بخاری کے ساتھ میرا قیام اسی کمرے میں عموماً ہوتا تھا جس میں امام آرام فرماتے تھے، دیکھا کرتا تھا کہ رات کو جب ہم لوگ سو رہتے تو امام بخاری بار بار اٹھ کر چقماق سے چراغ جلاتے اور لکھی ہوئی حدیثوں پر کچھ علامت بناتے پھر سو رہتے۔ ایک ایک رات میں پندرہ سے

بیس دفعہ تک میں نے دیکھا ہے کہ اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں، پھر اٹھتے ہیں اور لیٹتے ہیں۔ میں عرض کرتا کہ جس وقت آپ اٹھتے ہیں مجھے اٹھا لیا کیجئے تو فرماتے کہ میاں تم جوان آدمی ہو، تمہاری نیند کو میں خراب کرنا نہیں چاہتا۔" (ص ۱۴)

اس قسم کی محنت اور جفاکشی کے لئے خود ہی سوچنا چاہئے کہ کتنی غیر معمولی توانائی کی ضرورت ہے، ایک دلچسپ لیکن غیر معمولی نتائج کا حامل اسی سلسلے کے بزرگوں میں **وکیع بن الجراح** کا وہ وقت نامہ ہے جسے خطیب نے وکیع کے صاحبزادے سفیان بن وکیع کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ یہ وکیع صرف حدیث ہی کے نہیں بلکہ فقہ کے بھی امام ہیں، حنفیوں کو اس پر فخر ہے کہ وکیع زیادہ تر امام ابو حنیفہ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ سفیان ثوری کے تلمیذ خاص سمجھے جاتے ہیں عبداللہ بن مبارک، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی وغیرہم اکابر کے وکیع استاذ ہیں، امیر گھرانے کے آدمی تھے، صرف والدہ سے لکھا ہے کہ دس لاکھ درم وراثت میں ان کو ملے تھے۔ بہرحال چوبیس گھنٹے کا نظام اوقات آخر زمانے میں ان کا کیا تھا وہ سنئے، ان کے صاحبزادے کہتے تھے:

میرے والد صائم الدہر تھے، قاعدہ ان کا یہ تھا کہ صبح سویرے (نمازِ صبح سے فارغ ہونے کے بعد) درس حدیث کے حلقہ میں تشریف لاتے، حدیث کے طلبہ کو پڑھاتے رہتے تا اینکہ دن کافی چڑھ جاتا، حلقہ سے اٹھ کر گھر تشریف لاتے اور سو جاتے، ظہر کے وقت تک سوتے اس کے بعد ظہر کی نماز کے لئے اٹھتے، نماز سے فارغ ہو کر اس سڑک کی طرف چلے جاتے جدھر سے پانی بھرنے والے بہشتی پکھالیں بھر بھر کر شہر کی طرف لاتے تھے اور ہر ایک سے دریافت کرتے کہ قرآن اس کو کتنا یاد ہے، جسے یاد نہ ہوتا اس کو قرآن کی اتنی سورتیں یاد کراتے جو نماز پڑھنے کے لئے کافی ہوں، یہ کام عصر کے وقت تک کرتے، عصر کی نماز اپنی مسجد میں ادا فرماتے اور نماز کے بعد وہیں بیٹھ کر قرآن کا درس دیتے، کچھ وقت بچتا اسے اللہ کی یاد میں گزارتے، مغرب کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لاتے تب افطار کا کھانا آپ کے آگے رکھا جاتا، قریب دس رطل (گویا پانچ سیر) سے کم مقدار مجموعی طور پر کھانے کی نہ ہوتی، کھانے کے بعد آپ کے سامنے نبیذ کا قرابہ

پیش ہوتا۔ دس رطل کے قریب نبیذ[1] جس میں ہوتی، کھانے کے بعد اس قرابے سے جتنا ان کا جی چاہتا پیتے رہتے اور جو بچ جاتا اس کو سامنے رکھ لیتے۔

اس کے بعد کیا کرتے تھے، اسی کو میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ سفیان بن وکیع کہتے ہیں کہ

وَيَقُومُ فَيُصَلِّي وِرْدَهُ مِنَ اللَّيْلِ وَكُلَّمَا صَلَّى رَكْعَتَيْنِ أَوْ أَكْثَرَ مِنْ شَفْعٍ أَوْ وِتْرٍ شَرِبَ مِنْهَا حَتَّى يَنْفَدَهَا ثُمَّ يَنَامُ۔

(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷)

پھر کھڑے ہو جاتے اور رات میں نمازوں کا ان کا جو ورد تھا اسے پورا کرتے اور دو رکعتوں یا ان سے زیادہ رکعتوں کے بعد خواہ طاق ہوتیں یا جفت (سلام پھیر کر) اسی قرابہ سے پیتے رہتے تاآں کہ ختم ہو جاتا پھر سو رہتے۔

---

[1] نبیذ کیا چیز ہے؟ جو نہیں جانتے ہیں یا نہیں جاننا چاہتے ہیں انہوں نے طرح طرح کی باتیں اس کے متعلق مشہور کر رکھی ہیں حالانکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اطبا جس دوا کو خیسانده کہتے ہیں یعنی رات کو پانی میں عناب، گاؤزباں، سپستان وغیرہ اسی قسم کی نباتی دوائیں ڈال دی جاتی ہیں اور صبح کو بقول ان ہی اطبا "مالیده صاف نموده بنوشند"۔ نبیذ بھی یہی چیز تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے نباتاتی دواؤں عناب، سپستان وغیرہ کے کھجور یا کشمش، منقی کو پانی میں رات کو ڈال دیتے تھے جسے "مالیده صاف نموده" صبح کو پیتے تھے اور صبح کو ڈالی ہوئی نبیذ رات کو استعمال کرتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دوائی خیسانده کے استعمال کا موقع کسے نہ ملا ہوگا، پھر کیا اس میں نشہ یا سکر پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ نباتاتی اشیاء ہونے کی وجہ سے اس میں بھی الکحل پیدا ہو سکتا ہے، جیسے کھجور، کشمش، منقی کے خیسانده کو دھوپ میں اگر رکھ دیجئے تو یقیناً اس عمل کے بعد اس میں جوش پیدا ہونے کف پھینک دینے کے بعد نشہ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن نبیذ اس کے بعد تو شراب بن جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نبیذ کے نام سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے بعض لوگوں نے شراب بنام نبیذ استعمال کیا ہو۔ لیکن ائمہ کوفہ نے نبیذ کی حلت کا جو فتوی دیا ہے میرے خیال میں اس کی حرمت پر اصرار کرنا ایسا ہی ہے کہ کسی حلال چیز کو خواہ مخواہ حرام ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ دوائی خیساندے کو بعض دفعہ آگ پر جوش دے کر بھی استعمال کرتے ہیں، اس میں بھی نشہ پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح کھجور یا کشمش کے خیسانده کو آگ پر اگر جوش دے دیا جائے تو گاڑھا ضرور ہو جائے گا لیکن نشہ اس میں پیدا ہو گا قطعاً یہ تجربہ کے خلاف ہے، اگر اس میں نشہ کا پیدا ہونا ضرور ہے تو چاہیے کہ سارے دوائی خیساندے میں نشہ پیدا ہو جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کو لوگوں نے اس معاملہ میں بہت بدنام کیا ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا وکیع امام ہی کے مسلک کی اتباع فقہ میں کرتے تھے اس لئے وہ خود بھی پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پینے کا حکم دیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے وکیع سے کہا کہ حضور میں نے نبیذ پی تو رات کو خواب دیکھا، کہنے والا کہتا ہے کہ تو نے شراب پی۔ وکیع نے سن کر فرمایا کہ شیطان ہو گا جس نے تجھ سے یہ کہا۔ کہتے تھے کہ فرات کے پانی اور نبیذ میں میرے نزدیک قطعاً فرق نہیں ہے۔ ۱۲۰

(خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۱)

ظاہر ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے جو ضعف پیدا ہو جاتا تھا اسی کی تلافی رات کو نبیذ سے فرماتے تھے، کیونکہ نبیذ کو نشہ آور عرق قرار دینا تو تجربہ سے خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہو کر ایک دعویٰ کر بیٹھنا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ کھجور اور انگور سے جو عرق نبیذ کی شکل میں حاصل کیا جاتا تھا اس سے کافی قوت پیدا ہوتی تھی اسی لئے تو وکیع نبیذ کے قرابے کو سامنے رکھ کر رات کی نماز پڑھا کرتے تھے، جہاں کچھ سستی محسوس ہوتی ایک پیالہ چڑھا لیتے تھے، جب وہ ختم ہو جاتا تو سو رہتے تھے۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ وکیع ہی کے متعلق الذہبی نے جس واقعہ کا ذکر بطور ایک ظریفانہ لطیفہ کے کیا ہے مجھے تو ظرافت سے زیادہ اس میں حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے، لکھا ہے کہ وکیع ذرا لحیم شحیم بھاری بدن کے آدمی تھے، جب مکہ پہنچے اور سرخیل صوفیہ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی تو ان کی فربہی کو دیکھ کر فضیل نے کہا کہ میں نے تو سنا ہے کہ تم راہب العراق ہو پھر یہ فربہی کیسی؟ جواب میں وکیع نے فرمایا:

هٰذَا مِنْ فَرَحِيْ بِالْاِسْلَامِ۔ اسلام کی وجہ سے نشاط کی جس کیفیت میں رہتا ہوں، یہ اس کا نتیجہ ہے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۸۳)

واللہ اعلم کہ ان کا واقعی مطلب کیا تھا لیکن میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آدمی اپنے جسم کی بھی اگر نگرانی سے غفلت نہ اختیار کرے اور محنت و مشقت کا جو بار اس پر ڈالا جائے اس کی تلافی عمدہ اور لطیف غذاؤں سے کرتا رہے تو جن ذہنی بےچینیوں اور دماغی الجھنوں سے اسلام آدمی کو نجات عطا کر کے روحانی سکون بخشتا ہے ان دونوں باتوں کا مجموعی اثر وہی ہونا چاہئے جس کا وکیع کے وجود میں مشاہدہ کیا گیا تھا۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں نے جیسا کہ عرض کیا، وکیع کے وقت نامے سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے بزرگوں کی ساری زندگی مقررہ اوقات کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یہ ان کے ضبطِ اوقات ہی کا نتیجہ تھا کہ ان علمی مشاغل اور مجاہدات

کے ساتھ جو بجائے خود حیرت انگیز ہیں وہ علم کا کام از کیسا کام؟ انجام دے سکتے تھے۔ بعض لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنی نمازیں پڑھتے تھے اور اتنی مختصر مدت میں قرآن ختم کرتے تھے، آخر ان کو ہزار ہا ہزار حدیثوں کے یاد کرنے کا موقع کیسے مل جاتا تھا؛ لیکن سمجھا نہیں گیا، پہلی بات تو یہی ہے کہ اپنے اوقات عزیز کو لایعنی مشاغل میں جو صرف کرنے کے عادی ہیں وہ ان لوگوں کے اوقات کی برکتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جو اپنی ایک ایک سانس کی قیمت حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ آخر عام لوگوں کا کیا حال ہے، تھوڑا وقت معاشی کاروبار میں وہ ضرور لگاتے ہیں لیکن اس کے بعد کھیل تماشوں، سینما بینی، تاش بازی اور اسی قسم کی مختلف بازیوں میں جتنا وقت بے کار وہ خرچ کر دیتے ہیں اگر اسی میں وہ کام کرنے کا تجربہ کریں تو خود ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ جو کچھ ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔

ماسوا اس کے محدثین کی زندگی کے دو مستقل دور تھے، ایک زمانہ ان کا طلب حدیث کا ہوتا تھا، گزر چکا کہ اس زمانہ میں عہد صحابہ اور اس کے بعد بھی سمجھا جاتا تھا کہ نفلی عبادات پر علمی اشتغال کو ترجیح دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں متعدد شہادتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں، اسی کا نتیجہ تھا کہ جن سے نفلی عبادات کا ترک بالکلیہ ممکن نہ ہو سکتا تھا وہ اپنے اوقات خصوصاً اپنی راتوں کو چند حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ عمرو بن دینار جو سفیان و شعبہ وغیرہ کے استاذ اور ابن عباسؓ و ابن عمرؓ کے شاگرد ہیں، ان کے حال میں لکھا ہے کہ

> رات کو انھوں نے چند حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک ثلث تو نیند کے لئے تھا، دوسرے ثلث میں وہ حدیثیں یاد کرتے تھے اور تیسرے ثلث میں نمازیں پڑھتے تھے۔" (جامع ص ۱۰۷)

اور طلب حدیث کا دور جب گزر جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ حدیث کے ان حافظوں کو اب حدیث کے یاد کرنے کے لئے وقت دینے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ رات ان کی فارغ ہو جاتی تھی، البتہ دن کو شاگردوں کے سامنے اپنی یاد کی ہوئی حدیثوں کو دہراتے تھے اور اسی سے ان کی یاد تازہ رہتی تھی۔ بڑے بڑے حفاظ کا تو یہ حال تھا کہ ان کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر قوی تھا، اسی لئے اس قسم کے حضرات درس

حدیث کے وقت اپنے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں رکھتے۔ کتابوں میں پڑھئے اس قسم کے فقرے مثلاً

لَمْ یُرَ فِیْ یَدِ سُفْیَانَ بْنِ عُیَیْنَةَ وَالثَّوْرِیِّ وَشُعْبَةَ وَوَکِیْعٍ کِتَابٌ قَطُّ

سفیان بن عیاینہ اور سفیان ثوری اور شعبہ و وکیع کے ہاتھوں میں کتاب کبھی نہیں دیکھی گئی۔

اور

مَا رُؤِیَ لِوَکِیْعٍ کِتَابٌ قَطُّ وَلَا لِهُشَیْمٍ وَلَا لِحَمَّادٍ وَلَا لِمَعْمَرٍ۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۵)

نہ وکیع ہی کے ہاتھ میں کبھی کتاب دیکھی گئی اور نہ ہشیم کے ہاتھ میں نہ حماد کے ہاتھ میں اور نہ معمر کے ہاتھ میں۔

یہ تو غیر معمولی حافظہ رکھنے والے بزرگوں کی عام عادت تھی، باقی جن لوگوں کی قوت یادداشت ایسی نہ تھی پڑھانے کے وقت اپنے ہاتھوں میں وہ کتاب رکھتے تھے اور جن بیچاروں کو درس کا موقعہ میسر نہ آتا تو گزر چکا کہ مکتب خانوں کے بچوں کے سامنے یا عام غرباء کے مجمع میں جاکر اپنی حدیثوں کو دہراتے تھے۔ بہرحال وکیع کے نظام الاوقات کا سب سے زیادہ عبرت انگیز جز، وہ ہے کہ سقّوں کی گزرگاہ میں پہنچ کر ان کو قرآنی سورتیں یاد کراتے تھے۔ آج کسی مولوی کو کسی قصبہ یا شہر میں معمولی سا امتیاز بھی حاصل ہوجاتا ہے تو وہ بیچارہ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستباز خادموں کو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وکیع ہیں وہی وکیع، امام فن رجال یحیی بن معین جن کے متعلق کہتے تھے کہ میری آنکھوں نے ان سے بڑا آدمی نہیں دیکھا۔ یہی دعوٰی امام احمد بن حنبل کا بھی تھا کہ علم میں وکیع جیسا آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔ امام احمد کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے:

مَا رَأَتْ عَیْنِیْ مِثْلَهٗ قَطُّ یَحْفَظُ الْحَدِیْثَ جَیِّدًا وَیُذَاکِرُ بِالْفِقْهِ فَیُحْسِنُ مَعَ وَرَعٍ وَاجْتِهَادٍ وَلَا یَتَکَلَّمُ فِی اَحَدٍ۔

(خطیب ص ۴۷۴)

وکیع جیسے آدمی کو میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا، حدیثیں بھی ان کو خوب یاد تھیں اور فقہی مسائل پر خوبی کے ساتھ بحث کرتے تھے، ان علمی فضائل کے ساتھ ان میں پارسائی اور عبادت میں جدوجہد کی خصوصیت بھی پائی جاتی تھی، وہ کسی پر اعتراض اور نکتہ چینی بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن جو اپنے وقت کا سب سے بڑا امام فقہ میں بھی تھا اور حدیث میں بھی وہ حبشیوں کو قرآن کی ابتدائی سورتوں کے سکھانے کو بھی اپنی زندگی کا ایک فرض قرار دیئے ہوئے تھا، ایسے ہی آدمی کے گھر میں یہ ہو سکتا تھا جیسا کہ ان کے صاحبزادے ابراہیم کا بیان ہے:

"میرے والد تہجد کی نماز کے لئے جس وقت اٹھتے تھے تو ان کے سارا گھر اس نماز کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ حتیٰ کہ گھر میں حبشن چھوکری تک تہجد پڑھتی تھی"۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۷۱)

بہرحال ان چیزوں کو کہاں تک لکھوں، غرض یہ تھی کہ صحاح ستہ کے مصنفین سے پہلے اور عہد صحابہؓ کے بعد حدیث کی حفاظت و اشاعت کا کام ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ میں جن لوگوں کے سپرد رہا خود ان کا اور جس ماحول میں وہ تھے صحیح واقعات کی روشنی میں اس ماحول کا ایک سرسری اجمالی خاکہ بقدر ضرورت لوگوں کے سامنے آجائے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اس وقت تک پیش کیا جا چکا ہے انشاء اللہ اس مقصد کے لئے وہ کافی ہے، اب اسی کے ساتھ اور بھی چند چیزوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے، اگرچہ ضمناً ان کی طرف بھی اشارہ کرتا چلا آیا ہوں۔

حدیث کے سلسلہ میں تین ضروری مقدمات

(۱) یاد رکھنا چاہئے کہ واقعات کا یاد رکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ اقوال و ملفوظات کا۔ واقعات کی حالت تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی آدمی ہوگا جس کے حافظہ میں ہزارہا واقعات کی یاد تازہ نہ ہو، کم از کم وہی واقعات جو اس شخص کے ساتھ گزرے ہوں، ہوش سنبھالنے کے بعد صبح و شام لوگوں کے سامنے واقعات گزرتے رہتے ہیں اور وہ یاد رہتے ہیں، ان کے یاد کرنے کے لئے حافظہ پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس فطری عام قاعدے کے ساتھ اس کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے جیسا کہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ حدیث صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات طیبہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ آپؐ کو کرتے ہوئے جو کچھ دیکھا گیا یا آپؐ کے سامنے دوسروں نے جو کچھ کیا

اور آپ نے اس سے منع نہیں کیا، اصطلاحاً جس کا نام محدثین نے تقریر رکھا ہے، حدیث کا لفظ ان واقعات کو بھی حاوی ہے، اسی لئے جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنی حدیثیں یاد تھیں تو اس کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ملفوظات اتنی تعداد میں ان کو یاد تھے بلکہ ملفوظات کے ساتھ بڑا حصہ ان حدیثوں میں افعال و تقریرات کا بھی ہوتا ہے۔

(۲) خود صحابہ میں بھی بجز معدودے چند حضرات کے جنہیں مکثرین کہتے ہیں، زیادہ تر اسی قسم کے حضرات ہیں جن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد کا سو سے متجاوز ہونا بھی مشکل ہے اسی سے اندازہ کیجئے کہ سو یا سو سے کچھ اوپر حدیثوں کے روایت کرنے والے حضرات صحابہ میں بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہیں، ورنہ ان کی عمومیت "اصحاب العشرات" (یعنی سو سے کم، نوّے ۹۰، اسّی ۸۰، ستر، ساٹھ، پچاس دس تک) میں شمار ہوتے ہیں، تاہم صحابۂ کرام کے عہد تک حدیثوں میں سند کا سوال چونکہ پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ بات فقط متن تک محدود تھی، نیز جن چیزوں کو وہ بیان کرتے تھے ان کے وہ خود ذاتی تجربہ کار اور دیکھنے والے تھے، اس لئے چند صحابی مثلاً ابو ہریرہ، عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، ابن عمر وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیثوں کی تعداد کافی ہے۔ لیکن صحابہ کے بعد چونکہ سند کا یاد رکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا اور جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے کڑی پر کڑی کا اضافہ سند میں ہوتا چلا جا رہا تھا، حافظہ پر بھی اس کی وجہ سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صحابہ کے بعد والوں میں زمانے تک ہمیں اسی قسم کے حضرات ملتے ہیں جن کی حدیثوں کی تعداد محدود تھی، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن شہاب زہری جیسے آدمی کی روایتوں کی مجموعی تعداد کو بتاتے ہوئے الذہبی نے لکھا ہے کہ

قَالَ اَبُوْدَاؤدَ حَدِيْثُهٗ اَلْفَانِ وَمِائَتَانِ اَلنِّصْفُ مِنْهَا مُسْنَدٌ۔ (تذکرہ ص ۱۰۳)	ابوداؤد کا بیان ہے کہ زہری کی روایتوں کی تعداد دو ہزار دو سو ۲۲۰۰ ہے جس میں مسند (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل سند کے ساتھ جو روایتیں منسوب ہیں) ان کی تعداد کل نصف ہے۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ان کی مسند حدیثوں کی تعداد ایک ہزار ایک سو سے زیادہ نہ تھی

اور یہ حال جب زہری کی روایتوں کا ہے تو دوسروں کی روایتوں کو اسی پر قیاس کیجئے، زہری سے پہلے قاسم بن محمد جلیل القدر تابعی ہیں، لیکن ذہبی ہی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ

قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ كَانَ الْقَاسِمُ أَعْلَمَ أَهْلِ زَمَانِهِ وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْمَدِينِيِّ لَهُ مِائَتَا حَدِيثٍ (تذکرہ ج ۱ ص ۹۱)

ابن عیینہ کہتے تھے کہ قاسم اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے، اور ابن مدینی کا بیان ہے کہ قاسم کی روایتوں کی تعداد کل دو سو ہے۔

اسی طرح بصرہ کے امام حدیث ثابت البنانی کی حدیثوں کی تعداد، ذہبی نے لکھا ہے کہ دو سو پچاس تھی (ج ۱ ص ۱۱۶) سلیمان تیمی کی روایتوں کی تعداد کل دو سو بتائی گئی ہے (ذہبی ج ۱ ص ۱۴۲) عمرو بن مرہ بھی کل دو سو ہی حدیثوں کے راوی تھے (ج ۱ ص ۱۱۵)، یحییٰ بن سعید الانصاری کے پاس بھی صرف تین سو حدیثوں کا ذخیرہ تھا (ذہبی ج ۱ ص ۱۳۰) ایوب سختیانی کل آٹھ سو روایتوں کے راوی تھے (ج ۱ ص ۱۲۳)

میں نے تذکرۃ الحفاظ سے یہ چند مثالیں چن لی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے بعد شروع میں لوگوں کے پاس حدیثوں کی محدود تعداد تھی لیکن جوں جوں زمانہ آگے کی طرف بڑھتا گیا اس منتشر اور بکھرے ہوئے سرمایہ کو لوگوں نے سمیٹنا اور جمع کرنا شروع کیا۔ اور بعض لوگوں نے خاص قسم کی حدیثوں کو جمع کیا۔ مثلاً احکام یعنی فقہی مسائل جن حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے متعلق امام شافعی کا بیان ہے کہ

وَجَدْتُ أَحَادِيثَ الْأَحْكَامِ كُلَّهَا عِنْدَ مَالِكٍ سِوَى ثَلَاثِينَ حَدِيثًا وَوَجَدْتُهَا كُلَّهَا عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ سِوَى سِتَّةِ أَحَادِيثَ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۲)

احکام (جن سے اسلامی قوانین پیدا ہوتے ہیں، ان کی متعلق حدیثوں کا سارا ذخیرہ میں نے امام مالک کے پاس پایا بجز تیس حدیثوں کے، پھر ایسا ذخیرہ جس میں یہ تیس حدیثیں بھی شریک تھیں میں نے ابن عیینہ کے پاس پایا بجز چھ حدیثوں کے (کہ وہ ابن عیینہ کے پاس بھی نہ تھیں)۔

اسی طرح بعض حضرات نے کسی خاص علاقے کے راویوں کی حدیثیں جمع کیں، ذہبی نے علی بن مدینی کے حوالے سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

دَارَ عِلْمُ الثِّقَاتِ عَلَى الزُّهْرِيِّ وَعَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ بِالْحِجَازِ وَقَتَادَةَ وَيَحْيَى بْنِ اَبِيْ كَثِيْرٍ بِالْبَصْرَةِ وَاَبِيْ اِسْحَاقَ وَالْاَعْمَشِ بِالْكُوْفَةِ يَعْنِيْ اَنَّ غَالِبَ الْحَدِيْثِ الصِّحَاحِ لَا تَخْرُجُ عَنْ هٰؤُلَاءِ السِّتَّةِ۔ (ج ۱ ص ۱۰۵)

معتبر راویوں کا علم ان چند بزرگوں پر گردش کرتا ہے یعنی حجاز کا علم زہری، عمرو بن دینار پر اور بصرہ کا علم قتادہ و یحییٰ بن کثیر پر، کوفہ کا ابو اسحاق و اعمش پر گردش کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح حدیثیں عموماً ان بزرگوں کے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں۔

اسی طرح ابوداؤد الطیالسی کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کہ

وَجَدْنَا الْحَدِيْثَ عِنْدَ اَرْبَعَةٍ الزُّهْرِيِّ وَقَتَادَةَ وَاَبِيْ اِسْحَاقَ وَالْاَعْمَشِ۔

میں نے حدیث کا ذخیرہ چار آدمیوں کے پاس پایا یعنی زہری، قتادہ اور ابو اسحاق و اعمش۔

ذہبی نے طیالسی کا یہ تخمینہ نقل کیا ہے کہ

وَلَمْ يَكُنْ عِنْدَ وَاحِدٍ مِّنْ هٰؤُلَاءِ اِلَّا اَلْفَيْنِ اَلْفَيْنِ۔ (ص ۱۰۸)

اور ان میں سے ہر ایک کے پاس دو دو ہزار سے زیادہ حدیثوں کا سرمایہ نہ تھا۔

مگر جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا گیا لوگوں میں ایک ہی حدیث کو مختلف راویوں سے سننے کا شوق بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانے میں واقعات کی تہ تک پہنچنے کیلئے کسی ایک اخبار میں کسی نیوز ایجنسی کی دی ہوئی خبر کا پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا، کچھ اس قسم کا حال حدیث کے باب میں ان لوگوں کا ہو گیا تھا، اس مذاق میں لوگوں کی اولوالعزمیاں ترقی کر کے اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ بعض لوگ سو سو طریقوں سے جب تک کسی روایت کو سن نہیں لیتے، اپنے آپ کو اس روایت میں یتیم خیال کرتے تھے اور قاعدہ یہ بن گیا تھا کہ مختلف طریقوں سے جو حدیثیں سنی جاتی تھیں محض سند میں کسی ایک راوی کے بڑھ جانے یا متن میں کسی لفظ کے اضافے کے ساتھ ہی بجائے ایک حدیث کے وہی ایک حدیث دو حدیثیں بن جاتی تھیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس طریقہ سے حدیثوں کی تعداد بڑھتے ہوئے لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ نیز حدیث کے لفظ کے نیچے صحابہ اور تابعین کے اقوال و فتاویٰ کو بھی آخر میں لوگ درج کرنے لگے۔ حدیثوں کے عددی اضافہ میں کچھ اس کو بھی دخل ہے

ورنہ عرض کر چکا ہوں کہ اعلیٰ درجہ کی معیاری حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی اور صحیح حدیثوں کے ساتھ ضعیف و حسن وغیرہ کو ملا لیا جائے تو بمشکل تیس تیس ہزار وہ ثابت ہوتی ہیں۔ بلکہ ابن جوزی کا قول نقل کر چکا ہوں کہ جعلی اور موضوع حدیثوں کو ملا لینے کے بعد حدیثوں کے سارے سرمایہ کو پچاس ہزار تک پہنچانا مشکل ہے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی بھولنا نہ چاہئے کہ جن لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ لاکھ یا لاکھ سے اوپر ان کو حدیثیں یاد تھیں۔ مثلاً امام بخاری، امام مسلم یا ابوزرعہ، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین وغیرہ، سو ظاہر ہے کہ ان میں یا تو خود صحاح ستہ کی کتابوں کے مصنف ہیں یا ان کے معاصرین ہیں، جیسے ابوزرعہ، امام بخاری کے معاصر ہیں، یا صحاح کے مصنفین کے بعد کے لوگ ہیں جیسے احمد بن حنبل یحییٰ بن معین وغیرہ، اور اس وقت میری گفتگو کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مصنفین صحاح سے پہلے اور صحابہ کے بعد درمیانی عہد میں حدیث کی خدمت کرنے والے تھے۔ کم از کم اس عہد میں میں نہیں جانتا کہ کسی کے متعلق لاکھ دو لاکھ حدیثوں کا دعویٰ کیا گیا ہو۔

(۳) حدیثوں کے ان حفاظ کے متعلق عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں ہر ایک کی حالت یہ تھی کہ سن لینے کے بعد اس کو حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں، بہ تفصیل بتا چکا ہوں کہ یہ واقعہ کی قطعاً غلط تصویر ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بعضوں کا حافظہ یقیناً غیر معمولی تھا، اور حافظہ ہی کیا سارے انسانی کمالات کے متعلق آپ کو غیر معمولی مثالیں ہر زمانے میں تلاش سے مل سکتی ہیں ان کی بلندی کی بھی اور پستی کی بھی، یہی حال حافظہ کی قوت کا بھی ہے، رومیوں کی تاریخ میں مشہور رواقی حکیم سینکا کے باپ مارکس ریناس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"دو ہزار الفاظ سننے کے بعد بالترتیب ان کا اعادہ بلا تکان کر دیا کرتا تھا۔" (ترجمہ سکرس آف گارڈ)

یہ قوتِ یادداشت کا ایک نقطہ تھا، اسی کے مقابلہ میں رومیوں کی اسی تاریخ میں ہم رومی بادشاہ کلاڈیوس کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ

اس کے حافظہ کی حالت یہ تھی کہ ان اشخاص کو شطرنج کھیلنے کیلئے مدعو کرتا جو اس روز سے قبل اس

کے حکم سے ملکِ عدم کو روانہ ہو چکے تھے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے مصاحبوں سے اپنی ملکہ کی عدم موجودگی کی وجہ پوچھی حالانکہ کئی دن پہلے بدنصیب ملکہ اسی بادشاہ کے قہر کا لقمہ بن چکی تھی (یعنی قتل کرائی جا چکی تھی)۔ (کتاب مذکور ص ۹۷)

گویا اس رومی بادشاہ کے حافظہ کی حالت قریب قریب وہی تھی جو عربی کے افسانوی قصوں میں ھنبقاء نامی شخص کے متعلق لوگ ذکر کرتے ہیں کہ گلے میں ٹوٹے جوتوں کا ہار اس لئے ڈالے رہتا تھا کہ اپنے آپ کو پہچان سکے اور یاد رکھ سکے۔ کہتے ہیں کہ اس ہار کے بغیر اپنے آپ کو بھی وہ بھول جاتا تھا۔

بہر حال بعض محدثین کی غیر معمولی قوتِ یادداشت اب خواہ اس عام قانون کا نتیجہ ہو اور اسلام کو ان سے کام لینے کا موقعہ مل گیا، یا یہ سمجھا جائے کہ آخری نبوت کے متعلقہ معلومات کی حفاظت کے لئے قدرت نے جہاں دوسری چیزیں پیدا کی تھیں ان ہی میں غیر معمولی حافظہ رکھنے والے حضرات بھی پیدا کئے گئے تھے۔ کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کی تعداد محدثین میں بھی بہت تھوڑی تھی، ورنہ عام حال ان کے حافظوں کا بھی وہی تھا جس کا ذکر ایک محدث نے وکیع کی قوتِ یادداشت کو سن کر کیا تھا، یعنی کہا کہ

اِنَّ حِفْظَ وَکِیْعٍ کَانَ طَبْعِیًّا وَحِفْظُنَا تَکَلُّفٌ — وکیع کا حافظہ ان کی ایک طبعی خصوصیت تھی اور ہم لوگ جو یاد کرتے ہیں سو تکلف کی یاد ہے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۷۷)

اوسط درجہ کی قوتِ یادداشت رکھنے والے لوگ کسی چیز کو جس تدبیر سے یاد کرتے ہیں تکلف والے حفظ سے یہی مراد ہے، اسی تکلف والے حفظ سے کام لیکر اس وقت تک لاکھوں لاکھ کی تعداد میں قرآن کے حافظ لوگ بن رہے ہیں یعنی ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ رفتہ رفتہ تدریجی طور پر تھوڑا تھوڑا کر کے یاد کرتے ہیں اور آپ سن چکے کہ کسی ایک آدمی کا نہیں بلکہ اس زمانہ کے عام محدثین کا یہی دستور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں چند حدیثیں جن کا اوسط پانچ سے دس تک کی حدیثوں کا تھا اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے مقصد اس کا وہی تھا کہ عام لوگوں کے لئے حدیثوں کے یاد کرنے کی تدبیر تکلف والی شکل بھی ہو سکتی تھی۔

عہدِ صحابہ اور مصنفینِ صحاح کے درمیانی دور میں حفاظتِ حدیث کی شکلیں

حفظ اور کتابت

اب ان سارے معلومات اور مقدمات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ مصنفین صحاح اور عہد صحابہؓ کے اس درمیانی وقفہ میں مان بھی لیا جائے کہ حدیثوں کی حفاظت کی ایک ہی شکل یعنی کتابت نہیں صرف حفظ ہی تھی تو جوان کا ماحول تھا اور جس قسم کے ظاہری باطنی خصوصیات میں از سرتابقدم وہ ڈوبے ہوئے تھے ان کے لحاظ سے حدیثوں کو زبانی یاد کر لینا یہ کام ان کے لئے کچھ بھی دشوار تھا؟ ایک ایسے بدترین ناموافق حالات جن میں پچھلی صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمان گزر رہے ہیں، ان کی زندگی کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو چکا ہے، قلوب پر دین کی گرفت روز بروز ڈھیلی پڑتی چلی جا رہی ہے لیکن بایں ہمہ حفظ بے تکلف کے عام قانون کے تحت ہمارے اور آپ کے سامنے دس بیس ورق ہی نہیں بلکہ اول سے آخر تک الحمد سے والناس تک کے حافظِ قرآن ہزار ہا ہزار کی تعداد میں جب پیدا ہو رہے ہیں تو جس زمانہ کا نقشہ صفحات بالا میں آپ کے آگے رکھا گیا ہے، حدیثوں کے حفظ کا مسئلہ کیا کوئی بڑی بات تھی؟ جس کی دشواریوں کو محسوس کر کے یا کرا کے آج حدیثوں کے متعلق بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں، خصوصاً جب اسی کے ساتھ ان نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ ان محفوظ حدیثوں میں ملفوظات نبویہ کے ساتھ ایک بڑا حصہ واقعات (یعنی افعال اور تقریرات) کا بھی شریک تھا۔ اور میرا تخمینہ یہ ہے کہ حدیث کے ان تینوں اجزاء میں دو تہائی حصہ ان ہی واقعات کا ہے بلکہ صحیح جستجو سے اگر کام لیا جائے تو شاید اس تخمینہ سے زیادہ بھی ہو، عرض کر چکا ہوں کہ واقعات کا یاد رکھنا آدمی کی قوت یادداشت کے لئے اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ملفوظات اور اقوال کے یاد کرنے میں۔

پر بار پڑتا ہے، پھر اسی کے ساتھ جب اس کو بھی سوچا جائے کہ سو ڈیڑھ سو سال کے اس درمیانی وقفہ کے ابتدائی ایام میں عموماً حدیث کا سرمایہ بکھری ہوئی شکل میں تھا۔ اجتماع اور تمرکز کی کیفیت اس میں بعد کو پیدا ہوئی، ظاہر ہے کہ اجتماع و تمرکز کی اس کیفیت سے پہلے ہر ایک پر حدیثوں کی محدود تعداد کے حفظ کی چونکہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی اس لئے سمجھنا چاہئے کہ خاص وقت تک اس سہولت سے بھی لوگ مستفید ہوتے رہے لیکن جیسے جیسے یہ سرمایہ مخصوص دماغوں میں سمٹنے لگا تو اس کو بھولنا نہ چاہئے کہ حدیثوں کے سیکھنے سکھانے پڑھنے پڑھانے کے نظام کا استحکام اور اس کی استواری بھی بڑھتی چلی گئی اور گو عددی لحاظ سے آخر زمانہ میں حدیثوں کی تعداد میں بظاہر مہیب اضافہ نظر آتا ہے لیکن پہلی بات تو اس سلسلہ کی وہی ہے کہ غیر معمولی اضافہ وقفہ کی اس درمیانی مدت کے بعد پہلے ہے نیز حدیثوں کے عددی اضافہ کا راز جب معلوم ہو چکا کہ وہ خود حدیثوں کا اضافہ نہ تھا بلکہ زیادہ تر سند یا متن میں لفظ دو لفظ کے اضافہ سے حدیثوں کے عدد میں اضافہ ہو جاتا تھا تو پھر اس کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ ایک یمنی عالم نے اپنی کتاب "اَلْعِلْمُ الشَّامِخ" نامی میں جلال الدین سیوطی کے اس دعوے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ مجھے دو لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں، بڑے مزے سے لکھا ہے کہ لوگوں کو سیوطی کے اس دعوی سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ واقعی ان حضرات کو دو لاکھ حدیثیں یاد تھیں بلکہ ان کا یہ دعوی محدثین کی اسی اصطلاح پر مبنی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے:

قَدْ يَكُوْنُ الْوَاحِدُ فِيْ كِتَابِ السُّيُوْطِي اَرْبَعَةً اَوْ عَشَرَةً اَوْ سِتِّيْنَ حَدِيْثًا بِاعْتِبَارِهِمْ (العلم الشامخ ص۲۹۶)	کہ ایک حدیث مذکورۂ بالا حساب سے سیوطی کی کتاب میں چار یا دس یا ساٹھ تک کی تعداد تک پہنچ جاتی ہے۔

گویا سمجھنا چاہئے کہ حافظہ پر تو کل ساٹھ الفاظ کے یاد کرنے کا بار پڑا لیکن کہنے کے لئے ہو گیا کہ میں نے ساٹھ حدیثیں یاد کر لیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مثلاً ایک ہی حدیث ہے، حضرت ابو ہریرہؓ بھی اس کے راوی ہیں اور عائشہ صدیقہؓ بھی، ابن عمرؓ بھی، آپ کے نزدیک تو وہ ایک ہی حدیث ہے لیکن محدث بیان کرے گا کہ مجھے تین حدیثیں یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نام ابو ہریرہؓ کے ساتھ عائشہؓ اور ابن عمرؓ ان دو ناموں کے یاد کر لینے سے ایک حدیث تین حدیث بن گئی۔ عوام جو فن اور اس کی اصطلاحات

سے ناواقف ہیں ان کو حیرت ہوتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خود ان ناموں کے یاد رکھنے میں حافظہ کو دوسری بہت سی چیزوں سے مدد ملتی ہے۔ فن کار ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں فلاں فلاں صحابی سے حدیثیں زیادہ مروی ہیں، اسی طرح علم حدیث اور اسماء الرجال سے جو اشتغال رکھتے ہیں وہ صحابیوں کے متعلق بھی جانتے ہیں کہ تابعین میں فلاں فلاں صحابی سے زیادہ خصوصیت تھی، اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے اساتذہ اور تلامذہ کے خصوصی تعلقات کا عام علم فن کے جاننے والوں کو پہلے ہی سے ہوتا ہے، پس اسماء تو یونہی یاد رہتے ہیں، حافظہ کو ہر حدیث کے متعلق اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ ان ناموں میں سے کس نام کا کس حدیث کی سند سے تعلق ہے، پس اس کو مستحضر رکھنا چاہئے سچ پوچھئے تو اس کی وجہ سے ناموں کے یاد کرنے میں بھی حافظہ کا کام آدھا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح متونِ حدیث کا حال ہے کہ اصل حدیث تو ایک ہی ہے، دوسرے طرق میں لفظ دو لفظ کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی اضافہ کی وجہ سے حدیث کے نمبروں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی حافظہ پر جو کچھ بار پڑتا ہے وہ لفظ دو لفظ ہی کے یاد کرنے کا پڑتا ہے۔ بہر حال اکثر ابواب کی حدیثوں کا یہی حال ہے کہ سند یا متن میں لفظ دو لفظ کو بدلتے چلے جائیے، حدیثوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی مسئلہ کے متعلق ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ابن راہویہ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑے پتے کی بات لکھی ہے، بیان یہ کیا ہے کہ مشہور امام فن علل ابو حاتم رازی کی مجلس میں ابن راہویہ اور ان کی غیر معمولی قوتِ یادداشت کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب جن کا نام احمد بن سلمہ تھا، انہوں نے ابو حاتم سے کہا کہ ابن راہویہ صرف عام ابواب ہی کی حدیثیں نہیں بلکہ تفسیری روایتیں بھی شاگردوں کو زبانی بغیر کتاب سامنے رکھنے کے لکھوایا کرتے ہیں۔ ابو حاتم جو فن کے گُر سے واقف تھے، احمد سے یہ سن کر سنبھل گئے اور تعجب کے ساتھ کہنے لگے کہ

هٰذَا اَعْجَبُ لِاَنَّ ضَبْطَ الْاَحَادِيْثِ الْمُسْنَدَةِ اَسْهَلُ وَاَهْوَنُ مِنْ ضَبْطِ	(تفسیری روایات کا زبانی لکھوانا، بلاشبہ بہت زیادہ عجیب ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی

اَسَانِیْدِ التَّفَاسِیْرِ وَاَلْفَاظِھَا۔ (ج ۲ ص ۱۲۳۴) حدیثوں کا یاد رکھنا تفسیری روایتوں کی سندوں اور ان کے الفاظ کے یاد کرنے کے حساب سے بہت زیادہ آسان اور سہل ہے۔

سمجھا آپ نے ابو حاتم کیا کہہ رہے ہیں، قصہ یہ ہے کہ تفسیری روایات کے ذخیرے میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کا سرمایہ بہت کم پایا جاتا ہے بلکہ زیادہ تر وہ صحابہ اور صحابہ سے بھی زیادہ بہت زیادہ ان لوگوں کے اقوال اس ذخیرے میں شامل ہیں جو صحابہ کے بعد تھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے زیادہ روایت کرنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے۔ زیادہ تر روایتیں عموماً مکثرین صحابہ (ابو ہریرہؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ ابن عمرؓ وغیرہم) حضرات سے مروی ہیں۔ اکثر حدیثوں کے لئے صحابہ کے طبقہ میں ان چند ناموں کا یاد کر لینا کافی ہے۔ پھر ان بزرگوں کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ یعنی حدیث کی سندوں کی آخری کڑیوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اپنے اپنے استاذوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے لحاظ سے مشہور ہیں حدیث کا ابتدائی طالب العلم ان محدود شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ہزارہا ہزار حدیثوں کی سندوں کے لئے چند محدود اسماء جن کی تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ ہوگی، ان کو یاد رکھنا ان ساری سندوں کے رجال کا یاد رکھنا ہے اور متون میں بھی اختلاف زیادہ تر لفظ دو لفظ ہی کے حساب سے ہوتا ہے مگر تفسیری روایات کی سندیں بھی لامحدود اور ان کے متون کے الفاظ بھی زیادہ تر ایک دوسرے سے کم ملتے جلتے ہیں، اسی لئے تفسیری روایتوں کے یاد رکھنے اور زبانی بیان کرنے پر ابو حاتم کو تعجب ہوا اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حدیثوں کی عددی کثرت کو دیکھ کر بھڑکنے اور بدکنے کی ضرورت نہیں، ان کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ان مہیب اور مدہش اعداد و شمار کو سن کر بظاہر فن کے نہ جاننے والے باور کئے بیٹھے ہیں، آدمی کی قوت یادداشت اس قسم کے مؤثرات سے شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر امداد حاصل کرتی رہتی ہے۔

بات بہت طویل ہو گئی، حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو سال وقفہ کی جو درمیانی مدت ہے اس میں اگر حدیثوں کے قلمبند کرنے کا جیسا کہ عام طور پر پھیلا دیا گیا ہے رواج نہ بھی ہوا ہو

اور یاد کرنے والوں کی یاد ہی پر اس زمانے میں حدیثوں کے محفوظ رکھنے کا دارومدار رہا ہو تو واقعات اور حالات سے جو واقف ہیں، ان کے نزدیک ہلکی سے ہلکی بے اعتمادی کی وجہ محض یہ واقعہ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ سچی اور ٹھوس بات یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ، معلومات کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ جیسے لکھ کر معلومات کو محفوظ کیا جاتا ہے اسی طرح یاد کر کے بھی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس کی زندہ مثال آپ کے سامنے قرآن ہی موجود ہے۔ مکتوبہ قرآن میں قرآن کی کسی آیت یا سورت کو پڑھیے یا کسی حافظ سے اسی آیت یا سورت کو سنئے، کیا دونوں کے اعتماد میں کسی قسم کا فرق آپ پا سکتے ہیں؟

پس مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان میں کون معلومات کے محفوظ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور کون نہیں بن سکتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کتابت ہو یا حفظ و یادداشت دونوں میں سے جس کسی سے بھی کام لیا جائے، کام لینے والے پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کی جیسا کہ چاہیے اگر تکمیل کی گئی ہے اور حزم و احتیاط کے لحاظ سے جن باتوں کی نگرانی کی ضرورت ہے ان سے لاپرواہی نہیں اختیار کی گئی ہے تو ان میں جس ذریعہ سے بھی کام لیا جائے گا قدرتاً انسانی فطرت اس ذریعہ سے محفوظ کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر اعتماد کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے خواہ یہ کتابت کا ذریعہ ہو یا یاد کرنے کا طریقہ، لیکن ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں اگر غفلت اور لاپرواہی برتی گئی ہو تو خود بخود اعتماد کی ضمانت مشتبہ ہو جاتی ہے، خواہ لکھنے سے کام لیا گیا ہو یا یاد کرنے سے، جو واقعہ ہے وہ یہی اور صرف یہی ہے۔ نہ سوچنے والوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار جو کئی سو سال بعد قلمبند ہوئیں۔ اس عامیانہ غوغا میں اور جو غلطیاں ہیں ان کو تو جانے دیجیے، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انہوں نے یہ کیسے باور کر لیا ہے کہ قید کتابت میں آجانے کے بعد اشتباہات و شکوک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟ کیسی عجیب بات ہے، ایک طرف اس کا ہنگامہ مچایا جاتا ہے کہ عالم معنی پر مظالم کے جو پہاڑ کاتبوں کے ہاتھوں سے ٹوٹے ہیں، عالم صورت پر یہ ظلم چنگیز خاں کے ہاتھوں بھی نہ ہوا تھا۔ عصر حاضر میں طباعت اور ٹائپ کی بھی بو قلموں

اقسام کے باوجود معمولی سی بے احتیاطیاں عبارتوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں، منفی کی جگہ مثبت اور مثبت کی جگہ منفی بن جانا معمولی بات ہے، روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے۔ ہندوستان کا مشہور مطبع نولکشور تقریباً ایک صدی سے اس کی شہادتیں فراہم کر رہا ہے اور فرض کیجئے کہ بے چارہ کاتب کتابت کی ذمہ داریوں کو نباہ بھی لے گیا ہو لیکن اس کے بعد بھی پڑھنے والوں کی نگاہیں ٹھوکروں سے کیا بالکلیہ محفوظ ہو جاتی ہیں، بیسیوں لطائف اس سلسلہ کے عوام میں مشہور ہیں۔ اور ان لطائف کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا کہ آیا تراشیدہ اور خود آفریدہ ہیں یا واقعی پڑھنے والوں نے یوں ہی پڑھا تھا جو مشہور ہو گیا ہے، لیکن خود تدوین حدیث کی تاریخ ہی میں جن لطائف کا ذکر مسلسل سند کے ساتھ محدثین نے کیا ہے وہی کیا کم تعجب انگیز ہیں۔ اصل فہرست تو ان لطائف کی بہت طویل ہے بطور دلچسپی اور عبرت کے لئے چند نمونے نقل کئے جاتے ہیں۔ حاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نقل کیا ہے کہ علی نامی کسی صاحب کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ "عَلِيٌّ رَجُلٌ غَبِيٌّ" (یعنی علی کم عقل آدمی تھے)، پڑھنے والے صاحب نے پڑھا کہ "عَلِيٌّ رَجُلٌ عِنِّينٌ" (یعنی علی نامرد آدمی تھے)۔ حاکم نے حافظ ابو زرعہ کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص جس نے استادوں سے حدیث پڑھی نہ تھی، کتاب کھول کر حدیث پڑھانے بیٹھ گیا، مشہور حدیث آئی یعنی حضرت انس کے بھائی جن کا نام ابو عمیر تھا، بچے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور طیبت (خوش مزاجی) کے فرمایا تھا یَا اَبَا عُمَيْرُ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ (ابو عمیر نغیر نے کیا کیا) نغیر[1] ایک چڑیا کا نام ہے جسے ابو عمیر ہاتھ میں لئے پھرتے تھے، غالباً اڑ گئی یا مر گئی تھی، حضور نے ان کے ہاتھ میں چڑیا کو نہ دیکھا تو یہ فرمایا۔ حدیث پڑھانے والے صاحب ان تفصیلات سے ناواقف تھے اور "نغیر" کا لفظ بھی کچھ غیر مشہور رہے اس لئے آپ نے بجائے

---

[1] کہتے ہیں کہ بلبل کو نغیر کہتے تھے، یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے مسائل اور احکام کے پیدا کرنے میں علماء اسلام نے جو کوششیں کیں ان کی ایک مثال یہ روایت بھی ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ ایک بچے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے تھے۔ الکتانی نے لکھا ہے کہ ابو العباس بن القاص نے صرف اس حدیث سے سو مسئلے پیدا کئے تھے۔ اسی طرح ابن صباغ نامی ایک مراکشی عالم کے متعلق لکھا ہے کہ چار سو فوائد اس حدیث سے انہوں نے پیدا کئے۔ دیکھئے الکتانی ج ۱ ص ۱۵۰ اور نفح الطیب ج ۴ ترجمہ ابن صباغ ۱۲۔

نغیر کے یہ قرار دیا کہ یہ لفظ "بعیر" کا ہے، اور شاگردوں کو مطلب یہ سمجھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو عمیر سے پوچھ رہے تھے کہ اونٹ کیا ہوا؟ ان ہی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ دوسری حدیث جس میں ہے کہ لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيهَا جَرَسٌ جس کا مطلب یہ تھا کہ اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں ڈال دینے کی جو عادت عرب میں تھی اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے وہ قافلہ محروم رہ جاتا ہے جس کے جانوروں کے گلے میں گھنٹی (جرس) ہو۔ محدث صاحب نے "جرس" کو "خرس" پڑھا اور فرمایا کہ ریچھ کو جو لوگ قافلہ کے ساتھ رکھتے ہیں ان کو مطلع کیا گیا ہے کہ ملائکہ کی پسندیدگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یا جس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "البُزاق" یعنی تھوک کو مسجد کی دیوار پر دیکھا، محدث صاحب نے فرمایا کہ "البُراق" کو دیکھا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ لطیفہ الحاکم نے اس سلسلہ میں مشہور محدث ابن خزیمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ اثر جو کتابوں میں منقول ہے کہ تَوَضَّأَ فِي جَرِّ نَصْرَانِيَّةٍ (یعنی حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی عورت کے گھڑے کے پانی سے وضو کیا) پڑھنے والے صاحب نے جر کے لفظ کو حر پڑھا، اب کیا بتاؤں کہ انہوں نے کیا پڑھا، لغت میں دیکھیے کہ حُر کے کیا معنی ہیں[1]؟ دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ یہ ہے حال اس کتابت کا جس کے متعلق لوگوں نے غلط توقعات قائم کر لئے ہیں۔

لطف تو اس وقت آتا ہے جب پڑھنے والے اپنی غلط بینی یا غلط فہمی کی تصحیح و توجیہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب جن کا نام محمد بن علی المذکر تھا، غالباً وعظ گوئی کا پیشہ کرتے تھے ایک حدیث پڑھی:

"قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَرْعُنَا تَزْدَادُ حِنًّا"

لوگ حیران ہوئے کہ مطلب کیا ہوا؟ الحاکم نے لکھا ہے کہ تب محدث صاحب نے "قص قصۃ طویلۃ" یعنی ایک طویل قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ کسی علاقے کے لوگ تھے اپنی زرعی پیداواروں کا عشر اور

---

[1] عورت کی شرمگاہ ۱۲

صدقہ ادا نہیں کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرتے ہوئے پہنچے کہ ہم لوگوں نے کھیتی کی لیکن سب کی سب "حنا" یعنی "مہندی" کا درخت بن گئی، اسی قول کو رسول اللہ نے گویا نقل کیا ہے۔ سیوطی نے تدریب ص۱۹۶ میں لکھا ہے کہ یہ دراصل مشہور حدیث

زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا ناغہ کر کر کے ملاقات کیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے۔

کی خرابی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی غلطیاں ان ہی لوگوں سے صادر ہوئی ہیں یا آئندہ صادر ہو سکتی ہیں جن کے متعلق حضرت عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے کہ

لَمْ يَكُنِ الْحَدِيْثُ بِشَغْلِهِمْ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۱۴۹) حدیث کا فن ان کا پیشہ نہ تھا۔

لیکن بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو فن کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے مثلاً مصر کے قاضی ابن لہیعہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مشہور حدیث اِحْتَجَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹائی وغیرہ سے مسجد میں ایک جگہ گھیر لی تھی ابن لہیعہ نے بجائے اِحْتَجَرَ کے اس کو اِحْتَجَمَ پڑھا۔ یعنی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا۔ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ

اَخَذَهٗ مِنْ كِتَابٍ بِغَيْرِ سِمَاعٍ۔ ابن لہیعہ نے استاذ سے سنے بغیر اس حدیث کو کتاب میں دیکھ کر، روایت کرنا شروع کیا تھا۔ (مقدمہ ص ۱۱۴)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حدیث مکتوبہ شکل میں ابن لہیعہ کے سامنے پیش ہوئی لیکن زبانی استاذ سے حدیث کے الفاظ ابن لہیعہ نے چونکہ نہیں سنے تھے اس لئے کتابت ان کو غلطی سے نہ بچا سکی، اور اس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں محدثین نے جمع کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی قسم کی غلطیوں کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں امام مسلم کی کتاب التمییز، اور دارقطنی و ابواحمد عسکری کی کتابوں کا لوگوں نے خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ ایک پر لطف قصہ اسی سلسلہ کا یہ بھی ہے کہ ایک محدث صاحب نے عام مجمع میں حدیث بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَلَّذِیْنَ یُشَقِّقُوْنَ الحَطَبَ۔ دراصل الحطب جس کے معنی لکڑی ہیں اس کی جگہ حدیث میں "الخُطَب" کالفظ تھا، درحقیقت تقریر اور وعظ میں لفاظی سے کام لینے والوں کو خدا کی نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود ٹھیرایا تھا لیکن محدث صاحب نے گویا یہ پڑھا کہ لکڑی چیرنے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ لکھا ہے کہ وعظ سننے والوں میں ملاحوں کا بھی ایک گروہ تھا ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے اور بولے کہ

فَکَیْفَ نَعْمَلُ وَالْحَاجَۃُ مَاسَّۃٌ۔ آخر ہم لوگ کیا کریں؟ ضرورت تو لکڑی چیرنے کی بہرحال ہوتی ہے۔ (تدریب ص ۱۱۵)

یعنی بے چاروں کا روزگار ہی کشتی چلانے پر موقوف تھا اور کشتی ظاہر ہے کہ لکڑی چیرے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔ لوگوں نے یہ نہیں لکھا کہ پھر محدث بیچارے نے اس کا کیا جواب دیا۔ تعجب ہے کہ ابن صلاح نے اس قصہ کو ابن شاہین جیسے آدمی کی طرف منسوب کیا ہے، اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ وہ بیچارے کیا، اسی قسم کی غلطیوں کا تجربہ اکثروں کو کرنا پڑتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا قول سیوطی نے نقل کیا ہے کہ

وَمَنْ یَّعْرِیْ عَنِ الْخَطَاءِ وَالتَّصْحِیْفِ (تدریب ۱۹۶) عام غلطی یا غلط خوانی سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔

اسی لئے میری غرض ان تصحیفی غلطیوں کے ذکر سے خود ان غلطیوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان حضرات سے میرا خطاب ہے جنھوں نے اس زمانے میں حفظ اور یادداشت کی تحقیر کرتے ہوئے "کتابت" کا اتنا ہنگامہ مچا رکھا ہے کہ میں نے جیسا کہ عرض کیا ان کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب ہو جانے کے بعد پھر شکوک و شبہات کی گویا گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں اور صحیح بات وہی ہے کہ چیزوں کے محفوظ کرنے کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، کام لیتے ہوئے جن احتیاطوں کی ضرورت ہے اگر ان کی پابندی کی جائے گی تو دونوں ہی ذرائع قابلِ اعتماد ہیں اور ان احتیاطوں سے جب لاپروائی برتی جائے گی تو شک و شبہ کی گنجائش دونوں میں پیدا ہو سکتی ہے، محدثین اس کو خوب سمجھتے تھے کہ محض کسی چیز کا قیدِ کتابت میں آجانا اس کو قابلِ

اعتماد بنا دینے کے لئے قطعاً کافی نہیں ہے۔ لکھنے کے بعد اسی لئے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو شدید تاکید کیا کرتے تھے کہ اصل صحیح نسخے سے اس کو ملا لیا کریں، اس سلسلہ میں ان کے شدید تاکیدی الفاظ کتابوں میں منقول ہیں، پچھلے زمانے ہی میں نہیں بلکہ لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی بہن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے صاحبزادے عروۃ بن الزبیرؓ نے اپنے لڑکے ہشام بن عروہؒ سے پوچھا کہ جو حدیثیں میں نے بیان کیں تم نے ان کو لکھ لیا؟ ہشام کہتے کہ جی ہاں لکھ لیا۔ عروہ نے کہا اس کا اصل سے مقابلہ بھی کر لیا؟ ہشام نے کہا جی نہیں۔ یہ سن کر عروہ نے کہا کہ

لَمْ تَكْتُبْ (الکفایہ ص ۲۳۷) تم نے پھر گویا لکھا ہی نہیں۔

قریب قریب اسی کے دوسرے محدثین سے الفاظ اس باب میں منقول ہیں۔ اور یحییٰ بن ابی کثیر تو عموماً اپنے تلامذہ سے فرماتے کہ

مَنْ كَتَبَ وَلَمْ يُعَارِضْ كَمَنْ دَخَلَ الْخَلَاءَ وَلَمْ يَسْتَنْجِ (الکفایہ ص ۲۳۷)

جس نے لکھا لیکن اصل سے اس کا مقابلہ نہ کیا تو اس کی حالت اس شخص کے مانند ہے جو بیت الخلاء گیا اور استنجا کئے بغیر نکل آیا۔

محض کتابت کو حفاظتِ کاملہ کا ذریعہ سمجھنا نادانی ہے

اور ایک مقابلہ ہی کیا کتابتِ حدیث کی ذمہ داریوں کی وہ فہرست جو ہمارے محدثین نے بنائی ہے کافی طویل ہے۔ انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس کی تفصیل کی جائے گی، اس وقت میرا خطاب صرف ان مسکینوں کی طرف ہے جنہوں نے کتابت کے متعلق کچھ یہ باور کر لیا ہے کہ کسی چیز کا مکتوب ہو جانا گویا معصوم ہو جانا ہے، نہ لکھنے والوں سے غلط نویسی اور بھول چوک ہو سکتی ہے اور نہ پڑھنے والے کبھی غلط پڑھ سکتے ہیں یا غلط سمجھ سکتے ہیں، اسی کے مقابلہ میں یاد کی ہوئی چیز کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اپنی اصلی حالت میں اس کا یاد رہ جانا گویا ناممکن ہے، پھر ان ہی مفروضات پر تیسرے فرض کی بنیاد کھڑی کی گئی کہ ابتدائی عہد میں حدیثوں کے چونکہ صرف زبانی یاد کرنے کا رواج تھا اور ان کے قلم بند کرنے کا خیال بعد کو کئی صدی کے گزرنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس لئے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ حدیثوں کا موجودہ

ذخیرہ جو کتابوں میں ہے قطعاً کسی حیثیت سے قابلِ اعتماد نہیں ہے، اسی کا نام بنار الفاسد علی الفاسد ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان میں ہر مقدمہ فاسد اور محض ایک خود تراشیدہ فرض ہے، جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ ابتدائی صدیوں میں حدیثوں کے قلمبند نہ ہونے کا افسانہ صرف افسانہ ہے اور ابھی تو اس سلسلہ میں صرف عہد صحابہ کی چیزیں پیش کی گئی ہیں، بعد کے قصے تو انشاء اللہ آپ آئندہ سنیں گے، اسی طرح کتابت کی اتنی غیر معمولی اہمیت اور حفظ و یادداشت کی حد سے گزری ہوئی تحقیر و توہین جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، واقعات سے ان کا کچھ بھی تعلق ہے؟ نہ صرف گزشتہ تجربے بلکہ روزمرہ کے مشاہدات سے جو بات صحیح ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ دونوں ذریعے معلومات کے محفوظ کرنے کے طبعی طریقے ہیں، ان میں سے جس ذریعہ کو ذمہ داریوں کی تکمیل کرتے ہوئے لوگ اختیار کریں گے اور جس حد تک اختیار کریں گے اسی حد تک اعتماد کے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوں گے اور جتنی زیادہ لاپروائیوں سے کام لیا جائے گا اعتماد اور بھروسہ بھی اسی نسبت سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

تفصیل تو آگے آئے گی، سردست بطور دعوی کے اتنا تو پھر بھی اسی وقت کہہ دینا چاہتا ہوں اور شاید پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار و رفتار، سیرت و کردار عادات و اطوار تین مختلف راہوں سے منتقل ہوتے ہوئے پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچے ہیں۔ یعنی تعامل، روایت و کتابت۔ تعامل اور توارث کی راہ سے منتقل ہونے والی چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا، کہہ چکا ہوں کہ جس راہ سے قرآن کی منتقلی اگلوں سے پچھلوں میں ہوتی چلی آرہی ہے، اسی راہ سے جو چیزیں منتقل ہوئی ہیں ان میں شک و شبہ کی بھلا گنجائش ہی کیا ہے؟ البتہ صرف روایت اور کتابت کی راہوں سے جو چیزیں منتقل ہوئی ہیں قطعیت میں ان کی یہ کیفیت تو نہیں ہے جو توارث اور تواتر کی راہ سے منتقل ہونے والی چیزوں میں قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے لیکن آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس نوعیت کی چیزیں بھی، یہ عجیب بات ہے کہ ابتداء عہد اسلام سے اس وقت تک جب کتابیں مدون ہو کر متواتر ہو گئیں، عموماً کتابت و روایت کی دونوں راہوں سے ساتھ ساتھ وہ منتقل

ہوتی چلی آرہی ہیں، اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ روایت کی کوتاہیوں کی تلافی کتابت سے اور کتابت کی کوتاہیوں کی تلافی روایت سے ہوتی چلی گئی۔ محدثین جانتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک طریقہ پر قناعت کر لینے کے بعد باہمی کوتاہیوں کی تلافی ایک دوسرے سے جو ہو رہی ہے یہ فائدہ جاتا رہے گا، بلکہ بجنسہ الفاظ کے نہ سننے کی وجہ سے دیکھا جا رہا تھا کہ جو لوگ صرف لکھی ہوئی حدیثوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں اس قسم کی فاحش غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کے نمونوں کا ابھی آپ ذکر سن چکے۔ نہ صرف عوام بلکہ فن سے تعلق رکھنے والوں کو بھی پایا گیا کہ ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اور کیسی غلطیاں؟ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن لکھتے ہوئے ایک کاتب صاحب آیت خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا پر جب پہنچے تو ٹھٹھک کر فرماتے ہیں، ہیں یہ کیا؟ میں نے ہمیشہ لوگوں کو دیکھا کہ خرِ عیسٰی کا ذکر کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ میرے پیش رو کاتب نے غلطی سے بجائے "عیسٰی" کے "موسٰی" لکھ دیا، آپ نے قرآن میں بھی اصلاح دی اور اصلاح کے بعد لوگوں سے اس کی داد بھی چاہی کہ وقت پر عیسٰی کا مجھے خیال آگیا ورنہ ردّ میں ممکن تھا کہ میرا قلم بھی "موسٰی" ہی لکھتے ہوئے آگے نکل جاتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ واقع میں یہ واقعہ پیش بھی آیا ہے، لیکن خطیب نے اپنی متصل سند کے ساتھ حدیث کے متعلق یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ میں پہلے تو تعلقات اچھے تھے لیکن بعد کو دونوں کے درمیان کچھ سوء مزاجی پیدا ہو گئی، پھر عید کی نماز میں اذان اور اقامت کے مسئلہ کا ذکر ہے۔ یہاں جس چیز کا ذکر مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے تعلقات پہلے اچھے تھے، اسی مفہوم کو عطاء واقعہ کے راوی نے عربی کے ان الفاظ میں ادا کیا تھا۔ کَانَ الَّذِی بَیْنَھُمَا حَسَنًا (دونوں کے تعلقات اچھے تھے)۔

مگر جیسے "خر" کے لفظ کو دیکھ کر قرآن کے کاتب صاحب کا ذہن بجائے حضرت موسٰی کے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اسی طرح عطا۔ کے مذکورہ بالا الفاظ میں "حسن" کا جو لفظ تھا یہ سمجھ کر کہ ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کا جب تذکرہ ہو رہا ہے، سننے والے کا ذہن امام حسن علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گیا اور اہل بیت کے ساتھ نیازمندی کے تعلقات کو ظاہر کرنے

کے لئے جوشِ عقیدت میں "حسنًا" کے لفظ کے بعد "علیہ السلام" کا اضافہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس غلطی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ یہی تو ہوئی کہ لفظ صرف مکتوبہ شکل میں سامنے آیا ورنہ روایت کی راہ سے بھی یہی لفظ ان کے کان میں اگر پڑتا تو اولاً بجائے "حسن" کے ان کا کان اس لفظ کو "حسن" کی شکل میں سنتا، پھر بھی کچھ کھٹکا دل میں رہ جاتا تو پوچھ سکتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ استاذ سامنے ہوتا تو بتلا دیتا۔ لیکن صرف کتابت پر بھروسہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بیچارے امام حسن علیہ السلام کو ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کے درمیان کھینچ کر وہ لے آئے۔

جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تفصیل سے یہ بتایا جائے گا کہ صحیح راہ روایتوں کی حفاظت کی یہی ہے کہ کتابت اور روایت دونوں طریقوں کو مسلسل جاری رکھا جائے تاکہ ایک کے نقص کی تکمیل دوسرے سے ہوتی رہے، اور محدثین نے یہی کیا بھی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تو لوگ کتابت ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں اور روایت کی کوئی اہمیت دلوں میں باقی نہیں رہی ہے، لیکن یہ ان کا حال تھا جن بیچاروں کو اس قسم کی چیزوں کے تجربہ کرنے کا ذاتی طور پر موقعہ نہیں ملا ہے، ورنہ محدثین اپنے طویل تجربوں کی بنیاد پر اس زمانے میں اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ کسی چیز کے متعلق ان دونوں ذرائع میں سے کسی ایک ہی کے ذریعہ کے اختیار کرنے کا موقعہ آجائے تو وہ سمجھتے تھے کہ ہر لحاظ سے روایت کے طریقہ میں صحت کی توقع بہ نسبت کتابت کے زیادہ ہے۔

نقدِ رجال کے امام جلیل علی بن مدینی اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ

حَافِظٌ مُتْقِنٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَصْلٍ غَیْرِ مُتْقِنٍ (کفایہ ص ۲۴۱)

حدیثوں کو زبانی یاد رکھنے والے جنہوں نے اتقان اور بیدار دماغی کے ساتھ یاد کیا ہو میرے نزدیک حدیث کے ایسے نسخے سے بہتر ہیں جن کے لکھنے میں زیادہ توجہ نہ کی گئی۔

حافظ کے ساتھ "متقن" کا لفظ ابن مدینی نے جو بڑھایا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کسی چیز کے یاد کرنے میں جن احتیاطوں کی ضرورت ہے ان کی ذمہ داریوں کا محسوس کرنے والا ہو اور یاد کرتے ہوئے ان کا پورا پورا خیال رکھتا ہو، وہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایسا حافظ اور زبانی یاد رکھنے والا

میرے نزدیک اس کتاب اور نسخہ سے بہتر ہے جس کے لکھنے میں اتقان کا خیال نہ کیا گیا ہو یعنی لکھنے والے نے لاپروائیوں سے کام لیا ہو۔

خیال تو کیجئے یہ تو خیر حدیث کا معاملہ ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ روایت کس حد تک صحیح ہے کسی معمولی آدمی کا بیان ہوتا تو کم از کم میرے لئے اس کا باور کرنا آسان نہ تھا بہر حال دار قطنی کی "کتاب التصحیف" سے سیوطی نے تدریب میں نقل کیا ہے کہ ایک مشہور عالم تفسیر پڑھا رہے تھے جب سورۂ یوسف کی آیت جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ پر پہنچے جس کے معنیٰ ہیں کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سفری سامان میں شاہی پیمانے کو رکھوا دیا۔ لیکن مفسر صاحب نے اسی آیت کو تلاوت کرتے ہوئے پڑھا کہ جَعَلَ السَّفِينَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ یعنی بجائے شاہی پیمانے کے یہ مطلب ہوا کہ حضرت یوسف نے "کشتی" اپنے بھائی کے ساز و سامان میں رکھوا دی۔ سننے والوں نے جنہیں قرآن زبانی یاد تھا اور نہ بھی یاد ہوتا تو ایسی فاحش غلطی پر کون صبر کر سکتا تھا بہر حال جب پوچھا کہ لفظ السَّفِينَةَ نہیں بلکہ السِّقَايَةَ ہے تو ملاحظہ فرمائیے اس دیدہ دلیری کو، اللہ علم کے فتنے سے آدمی کو محفوظ رکھے کہ بجائے غلطی کو مان لینے کے فرماتے ہیں:

"کہ یہ عاصم کی قراءت ہوگی اور میرے بھائی قرآن کو ان کی قراءت پر نہیں پڑھتے ہیں" [1]

بظاہر اپنی غلطی کا ان کو احساس ہوا لیکن پڑھنے والوں کے سامنے رسوائی نہ ہو ایک بات بنا دی گئی۔ اسی کتاب کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سورۂ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ، جس کا نام سورۂ فیل ہے، ان ہی صاحب نے پڑھاتے ہوئے الم تر کے شروع میں جو الم ہے، اس کو سورۂ بقرہ کے ابتدائی حروف کی طرح الف لام میم ترکیف فعل ربک پڑھ دیا تھا۔ [2]

آپ دیکھ رہے ہیں، خدانخواستہ اگر قرآن کے معاملہ میں صرف کتابت ہی پر بھروسہ کر لیا جاتا اور کتابت کے ساتھ ساتھ زبانی یاد کرنے کا دستور مسلمانوں میں شروع سے مروج نہ رہتا تو جس تر و تازہ حال میں اس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہے کیا پڑھا جا سکتا تھا، علی الخصوص اسلام کے ابتدائی

---

[1] و [2] تدریب الراوی ص ۱۹۷۔

دنوں میں جب عربی حروف خصوصاً جن کی شکلیں باہم ملتی جلتی تھیں مثلاً ج ح خ د ذ ص ض ع غ میں نقاط کے ذریعہ امتیاز کا طریقہ بھی جاری نہ ہوا تھا، گو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حلقۂ خاص کے آدمی ابوالاسود دیلی[۱] نے عہدِ صحابہ میں، ہی نقاط کے ذریعہ ان مشتبہ حروف کی شناخت کا طریقہ ایجاد کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا۔ لیکن جب تک نقاط کا یہ طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا ان مشتبہ حروف میں تمیز کے لئے لوگوں کو کتنی دشواریاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی کوئی طریقہ ان حروف میں تمیز کا پایا جاتا تھا جسے رقش کہتے تھے ابن عساکر اور مرزبانی کے حوالہ سے حضرت معاویہؓ کی روایت کتابوں میں جو نقل کی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجئے (تدریب ص ۱۵۲) لیکن پھر بھی کوئی کلی اطمینان بخش طریقہ ان حروف کی شناخت صحیح کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں نہ تھا بلکہ لوگ اپنی ذاتی تجویزوں سے کام لیا کرتے تھے۔ الذہبی نے عبداللہ بن ادریس کے تذکرے میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی سند میں ابوالحوراء نام جب آیا تو اندیشہ اس کا ہوا کہ کہیں ابوالجوزاء نہ پڑھا جائے، اس لئے اپنے ذہنی اشارے کے لئے میں نے اس کے نیچے "حور عین" کا لفظ لکھ دیا[۲]، جس سے معلوم ہوا کہ علاوہ نقاط کے بعض دوسرے

---

[۱] دیلی کی وفات ۶۹ سنہ ہجری میں ہوئی ہے، اس لئے یہ کام ۶۹ سنہ سے بہت پہلے پورا ہو چکا تھا بعض لوگ حجاج کے سر اس کا سہرا باندھتے ہیں لیکن میرے نزدیک بنی امیہ کے سیاسی مکائد کا ایک جزء یہ بھی ہے۔ ان ہی سیاسی اغراض کے تحت قرآن کا جامع حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشہور کر دیا تھا حالانکہ واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہے۔ حضرت عثمانؓ کا کام قرآن کے متعلق صرف اس قدر ہے کہ لکھنے کی حد تک آپ نے سارے مسلمانوں کو قریشی لہجے کے مطابق شکل پر جمع کر دیا تھا ورنہ پڑھنے میں پھر بھی آزادی تھی اور وہ کسی کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو "جامع الناس علی القرآن فی الکتابۃ" کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال میری تحقیق یہی ہے کہ نقط اندازی کے جس مسئلہ کو حجاج کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، روایت کی تنقیح و تحقیق سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ درحقیقت اس کے موجد یہی ابوالاسود دیلی تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص آدمی تھے۔ نحو کے ابتدائی کلیات ابوالاسود ہی نے حضرت علیؓ سے سیکھے تھے۔ ان امور کی تفصیل تدوین قرآن کی تاریخ میں ملے گی جسے لکھ چکا ہوں لیکن طبع نہیں ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو حجاج ہی کو اگر قرآنی حروف کے نقاط کا بانی مانا جائے تو جب بھی یہ کام عہد صحابہ ہی میں سمجھنا چاہئے کہ انجام پایا۔ حجاج کے زمانے میں بکثرت صحابہ موجود تھے۔

[۲] یہ عجیب بات ہے کہ ذہبی نے ابن ادریس کے اس قول کو نقل کر کے لکھ دیا ہے کہ قلتُ لم یکن (باقی بر صفحہ آئندہ)

طریقے بھی ان حروف میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے لوگ اختیار کرتے تھے۔

بہر حال کچھ بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ نقاط کا طریقہ جب تک ایجاد نہ ہوا تھا اس وقت تک مکتوبہ چیزوں کا صحیح پڑھنا اور بھی دشوار تھا لیہ تو حفظ اور یادداشت کے طریقے سے قرآن کے محفوظ کرنے کی کرامت ہے کہ بحمد اللہ اس کے کسی لفظ کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہوا، قرارت کے اختلافات عموماً لہجوں کے اختلافات ہیں یا اس کے وجوہ دوسرے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے، ورنہ جیسا کہ اس زمانہ میں سمجھ لیا گیا ہے اگر بالکلیہ بھروسہ صرف کتابت کے طریقہ پر کر لیا جاتا تو حدیث تو حدیث میں سمجھتا ہوں کہ قرآن تک کے لئے وہ کتنا بڑا فتنہ بن سکتا تھا[1]۔ تدوینِ حدیث کی تاریخوں میں لوگ اس قسم کے لطائف کا ذکر جو کرتے ہیں کہ فلاں صاحب نے سفیان ثوری کو شقیان ثوری پڑھا یا خالد الحذار، کو جلد الجدا، اور الحسن کے لفظ کو الجسر پڑھ دیا تھا حتی کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ ایک صاحب میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے انھوں نے حدیث کی سند کے راوی رقیہ بن مصقلا کو رقبہ بن مشقلہ پڑھ دیا تو ہم لوگوں میں آئندہ وہ رقبہ ہی کے نام سے پکارے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) ظهر الشكل بعد (ج ۱ ص ۱۹۱) یعنی اس وقت نقطوں کا طریقہ ہنوز ایجاد نہ ہوا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں ذہبی کی یہ بات نہ آئی قطع نظر اس سے کہ عہد نبوت ہی میں بعض امتیازی طریقوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ لفظ تو وہاں بھی نقاط ہی کا استعمال کیا گیا ہے، دیکھئے رقش والی روایت حضرت معاویہؓ کی۔ تاہم اتنا تو بہر حال مسلم ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول ہی میں خواہ دؤلی کو سمجھئے یا حجاج ہی کے اشارے سے سمجھئے نقطوں کا رواج عمومی طور پر پھیل چکا تھا، پھر ابن ادریس جو دوسری صدی کے عالم ہیں ۱۹۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے، ان کے متعلق یہ لکھنا کہ اس وقت تک نقطوں کا رواج نہ ہوا تھا اور شکل سے اگر حرکات زیر و زبر مراد ہے تو اس کی یہاں ضرورت نہ تھی، میرا خیال ہے کہ نقاط کی ترویج کے باوجود بھی اشتباہ کا اندیشہ رہ جاتا تھا۔ یہ محدثین کی احتیاط کی انتہا تھی کہ نام تک کی صحت کے لئے اتنی نزاکتوں سے کام لیتے تھے۔ ۱۲

[1] خدا جانے جلال الدین سیوطی نے یہ بات کہاں سے نقل کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں والیٔ مصر کے نام جس خط کی وجہ سے فتنہ کا آغاز اسلام میں ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصلی خط میں لکھا ہوا تھا کہ جب حامل خط ہٰذا تمہارے پاس پہنچے تو اس کی بات کو قبول کیجیو۔ اسی قبول کیجیو کے مفہوم کو عربی میں "فاقبلوہ" کے الفاظ سے ادا کیا گیا تھا۔ لیکن فتنہ پردازوں نے اس کو "فاقتلوہ" بنلوایا۔ یعنی قتل کر دیجیو۔ اسی کے بعد اسلام میں وہ فتنہ اٹھا جو پھر نہ دبا۔ (دیکھو تدریب ص ۱۵۱) اگر یہ واقعہ ہے تو فتنۂ عثمانی کی تاریخ کی بنیاد ہی بدل جاتی ہے۔ ۱۲

جانے لگے اور یہی نام ان کا مشہور ہوگیا (دیکھو معرفۃ علوم الحدیث الحاکم ص ۱۵۲) لیکن یہ غلطیاں تو حدیث میں اور حدیث میں بھی سند کے راویوں کے نام میں لوگوں میں لگی تھیں۔ حکیم الامت مرشد تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے وعظ میں ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے کسی صاحب نے بغیر استاذ کے خود قرآن کی تلاوت کرنی چاہی، قرآن کھولا، پہلی سورت جس پر نظر پڑی اس کی ابتدا الٓر سے ہوئی تھی، عربی خط میں یہ کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ صاحب نے اس کو "آلو" پڑھا، غالباً اس پر مسرور ہوئے ہوں گے کہ ہماری دینی کتاب نباتاتی حقائق سے لبریز ہے کھولنے کے ساتھ ہی کھانے کی ایک چیز سامنے آگئی۔ آگے خیال کرلیا ہوگا کہ اسی آلو کے بونے کاشت کرنے پکانے کے طریقوں پر بحث کی گئی ہوگی، افسوس ہوا ہوگا کہ ملاؤں نے اس بہترین کتاب کو صرف خشک دین اور جنت و دوزخ کے تذکروں کی یادداشت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

گو بات بہت بڑھ رہی ہے لیکن کیا کیا جائے میں نے تو جو کچھ لکھا ہے ان مقالات اور مباحث کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو کتابت کو ہر مرض کی دوا یقین کرتے ہوئے اس پروا ویلا مچا رہے ہیں کہ حدیثوں کو بجائے کتابت کے اتنے دنوں تک حفاظ حدیث کے حافظوں کے سپرد کیوں کر دیا گیا؟ خود ہی سمجھے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کاش حدیثوں کے زبانی یاد کرنے کا یہ طریقہ ابتداء اسلام میں اگر جاری نہ ہوتا اور صرف کتابت پر بھروسہ کرلیا جاتا تو بدگمانیوں کے جو بھبھارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق ان کے دماغوں میں اٹھ اٹھ کر خفقان پیدا کرتے رہتے ہیں ان کی تولید اور پیدائش کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی، اسی مفروضہ خود آفریدہ واقعہ کو بزرگوں پر لعن وطعن کا ذریعہ بھی بنالیا گیا ہے اور اسی کو پیش کر کر کے "اسوۂ حسنہ نبویہ" جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے شمع راہ کا کام دے رہا تھا، اس شمع ہی کو بجھا دینے کی کوششوں میں ایڑی چوٹی کا زور خرچ کیا جارہا ہے۔ صرف قرآن، قرآن کے سوا کچھ نہیں، اسی کا جھنڈا بلند کر دیا گیا ہے، کتابوں کے طومار کے سوا مختلف بھیسوں میں ماہوار رسالے نکالے جارہے ہیں،

اور قرآن بھی وہ جس کے پڑھنے والوں کو "الکّو" کی جگہ اس میں "آلو" لکھا ہوا نظر آتا ہو آپ ان بافیدہ طامات کے کوہ پیکر گٹھوں کو دیکھئے تب معلوم ہو گا کہ میں نے تو ابھی کوئی پوٹلی بھی تیار نہیں کی ہے۔

خیر اب اس قصے کو ختم کیجئے، انصاف سے کام لینے والوں کے متعلق مجھے توقع ہے کہ اس سلسلہ میں واقعات کی جو روشنی مہیا کی گئی ہے، اس روشنی میں وہ اس نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے کہ یاد کر کے کسی چیز کو محفوظ کرنا یا لکھ کر اس کو محفوظ کر دینا دونوں میں چنداں فرق نہیں ہے سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہے کہ حفاظت کے ان دونوں ذرائع سے کام لیا جائے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا کہ قرآن ہی کی حد تک نہیں بلکہ حدیثوں کے متعلق بھی شروع ہی سے اسی طریقہ کو سارے اسلاف نے اختیار کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ لوگوں کو اس کا بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حفاظت کے ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک ہی طریقہ کو کسی وجہ سے اگر اختیار کیا جائے یا دونوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے کام لیا جائے تو ایسی صورت میں حفظ اور یاد کرنے کے تسلسل کو جاری کرنا، یعنی ہر پہلی نسل خود یاد کر کے آئندہ نسلوں کو یاد کراتی چلی جائے تو مختلف وجوہ سے کتابت اور قلم بندی کے لحاظ سے حفظ اور یاد کرنے کا یہ طریقہ زیادہ اسلم و احکم ہے چیزیں اپنی شکل و صورت، خط و خال کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس اعتماد کی جتنی ضمانت اس طریقہ میں ہے، صرف کتابت میں اس اعتمادی اطمینان کو آدمی کی فطرت مشکل ہی سے پا سکتی ہے میری مذکورہ بالا گفتگو کا آخری خلاصہ یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ "وید" کے متعلق البیرونی کی اس تاریخی شہادت کو پیش کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں جس وقت البیرونی آیا ہے، اس سے کچھ ہی دن پہلے کشمیر کے ایک پنڈت نے وید کے اشلوکوں کو قلم بند کیا تھا ورنہ اس سے پہلے خواہ جتنا زمانہ بھی گزرا ہو، اس کتاب کی حفاظت کا سارا دار و مدار یاد کرنے والے پنڈتوں اور برہمنوں کی یاد پر تھا میں نے عرض کیا تھا کہ وید پر اور جن پہلوؤں سے بھی نکتہ چینی کی جائے لیکن صرف اتنی بات کہ اتنے زمانے تک جو کتاب قیدِ کتابت میں نہ آسکی اس کے ماننے والوں کے اعتماد کو مضمحل

کرنے کے لئے قطعًا ناکافی ہے، آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ جیسے قرآن کو زبانی یاد کرنے کا دستور تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال سے مسلمانوں میں مروج ہے، اسی طرح وید کو جن لوگوں نے خدا کی کتاب مانا تھا، ان میں بھی یہی دستور جاری تھا، کہہ چکا ہوں کہ واقعات سے یہی ثابت بھی ہوتا ہے کہ وید کے ماننے والوں نے اپنے دھرم اور دین کی بنیادی کتاب کی حفاظت وبقا کے تسلسل کو زبانی یاد کرنے ہی کے طریقے سے کم از کم ہزار پندرہ سو سال تک باقی رکھا اور کبھی ان کے قلب میں اس کا شبہ نہ ہوا کہ اتنی طویل مدت تک جو چیز مکتوبہ شکل میں نہیں رہی ہے اس کو دین کے جوہری حقائق اور اساسی عناصر کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا یہی ایک واقعہ ان ساری نامسعود ونامبارک کوششوں کو غیر فطری ٹھیرانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ حدیثوں کے متعلق یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ صدی ڈیڑھ صدی تک وہ قلمبند نہ ہوسکیں بلکہ بجائے اس کے یاد کر کرکے یاد کرنے والوں نے اس کو محفوظ رکھا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک ان کو منتقل کیا۔ آخر فطرت کا اگر تقاضہ یہی ہوتا کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے تو صدی ڈیڑھ صدی نہیں بلکہ کم از کم تیرہ چودہ صدیوں تک کتابی قالب سے آزاد رہنے والی کتاب "وید" کروڑہا کروڑ انسانوں کے اس اعتماد کے حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوسکتی تھی جو مذہب کے آخری بنیادی اور اساسی کتاب پر اس کے ماننے والوں کو ہوسکتی ہے۔

خبر احاد کا درجہ

حدیث پر بلاشبہ مسلمان اعتماد کرتے چلے آئے ہیں اور جب تک مسلمان مسلمان ہیں انشاءاللہ یہ اعتماد ان میں باقی رہے گا لیکن کون نہیں جانتا کہ تواتر و توارث کی جس راہ سے منتقل ہوتا ہوا قرآن پہنچا ہے، اسی راہ سے منتقل ہونے والی وہ ساری چیزیں جو مسلمانوں کو اپنے پیغمبر سے ملی ہیں، اعتماد راسخ کا جو مقام ان چیزوں کو مسلمانوں میں حاصل ہے بھلا اعتماد کی اس لازوال غیر متزلزل کیفیت سے ان چیزوں کے اعتماد کو کیا نسبت جن کے علم کا ذریعہ وہ حدیثیں ہیں جنہیں اصطلاحًا خبر احاد کہتے ہیں یعنی صحاح وغیرہ کتابوں کی عام حدیثوں کی جو نوعیت ہے اور اس وقت میری

بحث کا تعلق دراصل حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے، آپ اصولِ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ کو قریب قریب یہی مضمون مختلف الفاظ میں ملے گا، مثلاً صاحبِ کشف بزدوی نے لکھا ہے کہ

مَنْ سَوَّاهُ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ فَقَدْ أَخْطَأَ فِيْ رَفْعِهِ عَنْ مَنْزِلَتِهِ وَ وَضْعِ الْأَعْلَىٰ عَنْ مَنْزِلَتِهِ۔

(کشف ج ۲ ص ۲۴)

قرآن اور سنتِ متواتر (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو باتیں تواتر کی راہ سے منسوب ہیں) ان دونوں کے برابر (جو ان حدیثوں کو سمجھتا ہے جنہیں خبر احاد کہتے ہیں،) اس نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا یعنی خبر احاد والی حدیثوں کا جو واقعی مقام اور مرتبہ ہے اس مرتبہ سے ان کو اس نے بلند کر دیا، یہ پہلی غلطی ہوئی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ (کتاب و سنتِ متواترہ) کو ان کے مقام سے اس نے گرا دیا۔

بلکہ ایسی حدیثیں بھی جو اپنے بیان کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے تواتر کے درجہ تک تو نہ پہنچی ہوں لیکن پھر بھی اگلی نسلوں تک انھیں عام شہرت حاصل رہی ہے، اصطلاحاً جس کا نام حنفیوں نے خبر مشہور رکھا ہے، ان تک کے متعلق شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ

إِنْ جَاحِدَهُ لَا يُكَفَّرُ بِالْإِتِّفَاقِ۔

(کشف ج ۲ ص ۳۶۸)

اس قسم کی مشہور حدیثوں کے منکر کو کافر نہیں ٹھیرایا جا سکتا، یعنی اس پر کفر کا فتویٰ اور یہ کہ دائرہ اسلام سے وہ خارج ہو گیا یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا

اور جب ان کا حال یہ ہے تو درجہ میں ان سے جو حدیثیں فروتر ہیں یعنی احاد خبریں، ظاہر ہے کہ ان کے ماننے نہ ماننے پر مسلمان ہونے نہ ہونے کا دارو مدار کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے جو راہ نمایاں میسر آتی ہیں، خواہ بجائے خود وہ کتنی بھی قیمتی ہوں لیکن بایں ہمہ یہ مسلمہ ہے کہ

لَا يُعَاقَبُ بِتَرْكِهَا لِأَنَّهَا لَيْسَتْ بِفَرِيْضَةٍ وَلَا وَاجِبَةٍ۔

(کشف ج ۲ ص ۳۱۰)

ان کے چھوڑنے پر چھوڑنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ (جو احکام احاد خبروں سے پیدا ہوتے ہیں) وہ نہ فرض ہوتے ہیں اور نہ واجب۔

اور یہ حکم تو ان کا ہے جو ان حدیثوں کو مانتے ہیں لیکن ان پر عمل کی توفیق سے محروم ہیں باقی مسلمانوں میں ایک گروہ مثلاً معتزلہ وغیرہ جو یہ کہتے تھے کہ ایسی حدیثوں کا کیا اعتبار جن کی خبر معدودے چند آدمیوں نے دی ہو یعنی سرے سے خبر احاد کی افادیت کے جو منکر ہیں ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ صاحب کشف نے نقل کیا ہے کہ

فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ (ج ۲ ص ۲۲) سیدھی راہ سے وہ بھٹک گیا۔

درحقیقت ان پر وہی بات صادق آتی ہے جسے فخر الاسلام بزدوی نے اپنے بلیغ فقرے میں ادا کیا ہے کہ

هٰذَا رَجُلٌ سَفِيْهٌ لَمْ يَعْرِفْ نَفْسَهٗ وَلَا دِيْنَهٗ وَلَا دُنْيَاهُ وَلَا اُمَّهٗ وَلَا اَبَاهُ۔ (ص ۳۶۲)

یہ دراصل ایک بے وقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی یہ نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو نہ دنیا کو، نہ اپنی ماں کو نہ اپنے باپ کو۔[1]

بہر حال کچھ بھی ہو، میں کہنا چاہتا ہوں کہ محض زبانی یادداشت کی شکل میں رہنے کی وجہ

---

[1] یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ فخر الاسلام غصہ میں کچھ دشنام طرازی پر اتر آئے بلکہ واقعہ کے اظہار کی شکل ہی اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ واقعیت پسندی میں بعضوں کا یہی مذاق حد جنون تک پہنچ جاتا ہے اور اسی لئے ان چیزوں کے سوا جنہیں ان کی آنکھوں نے دیکھا ہو، کانوں نے سنا ہو، الغرض اپنے حواس کے معلومات کے سوا دوسروں کی دی ہوئی خبر، صرف اس لئے کہ وہ خبر ہے اور ہر خبر میں سچ ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹ ہونے کی بھی چونکہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے خبر سے کہتے ہیں کہ کسی واقعہ کا علم ہو ہی نہیں سکتا، خواہ خبر دینے والا کوئی ہو، کسی قسم کی خبر دے رہا ہو، کسی حال میں دے رہا ہو، اور اپنے اسی دسوسے کو یہ لوگ ایک قسم کا فلسفہ قرار دے کر ان حدیثوں کا بھی انکار کرتے ہیں جن میں ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل وغیرہ کی خبر دی جاتی ہے فخر الاسلام کا خطاب اسی قسم کے دسواسیوں سے ہے کہ دنیا کے معاملات کا تو ظاہر ہے کہ زیادہ تر خبروں ہی پر دار و مدار ہے آج اگر اس اصول کو مان لیا جائے کہ خبروں سے واقعات کا علم نہیں حاصل ہو سکتا تو کیا کوئی بے چارا تاجر تجارت کر سکتا ہے، خبر ہی سے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیزیں فلاں جگہ ملتی ہیں، خبر ہی سے اس کو واقفیت ہوتی ہے کہ مال اس کا روانہ ہو گیا ہے یا اسٹیشن پہنچ گیا ہے اور ایک یہی کیا زندگی کے سارے شعبوں کا یہی حال ہے اگر آدمی اس قدر شکی ہو جائے تو چپراسی کو اس کا افسر یہ حکم دے کر بھیجے کہ فلاں صاحب کو بلا لاؤ، چپراسی خبر دے کہ صاحب آپ کو بلاتے ہیں، اس خبر کو سن کر کہنے والا کہنے لگے کہ تو خبر دے رہا ہے خبر جھوٹی بھی ہوتی ہے اور سچی بھی، اس سلئے مجھے تیری خبر سے کسی قسم کا علم حاصل نہ ہوا، یہ فرماتے ہوئے اگر افسر کے چپراسیوں کو جو واپس کرتا رہیگا (باقی بر صفحہ آئندہ)

سے جب دنیا کی کوئی منطق اعتماد کی اس چٹان کو ہلانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی جو مذہب کے بنیادی حقائق اور اساسی عناصر پر انسانی فطرت عموماً رکھتی ہے تو بتایا جائے کہ حدیثوں کا عام ذخیرہ جس سے پیدا ہونے والے نتائج کی حیثیت مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعمیر میں صرف ثانوی عناصر و اجزاء کی ہے، اس حد سے زیادہ محتاط طرز عمل پر لب کشائی اور انگشت نمائی کی جرأت محض اس غلط مفروضہ کی بنیاد پر کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ سو سوا سو سال یعنی وقفہ کی مذکورہ بالا مدت جو عہد صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیان گزری، اسی میں قلمبند کر کے حدیثوں کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا گیا تھا، بلکہ حفظ اور یادداشت کے ذریعہ سے سینوں سے سینوں تک اس عرصے میں یہ حدیثیں منتقل ہوتی رہی ہیں، ان حدیثوں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلومات کا جو سرمایہ اس وقت دنیا میں پایا جارہا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیثوں سے روٹھنے والے ان معلومات کے قبول کرنے سے جو گریز کی راہ اختیار کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور وقتاً فوقتاً طرح طرح کی بدگمانیاں اور تشکیکی شرارے معلومات کے اس مقدس سرمایہ کے متعلق بے اعتمادی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) آپ ہی خیال کیجئے کہ پاگل خانے کی چار دیواری میں داخل ہونے سے کب تک بچارہ سکتا ہے دنیا کو جانے دیجئے آپ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں، گھڑے میں پانی ہے، پوچھتے ہیں کہ پانی پاک ہے؟ مؤذن خبر دیتا ہے کہ جی ہاں پاک ہے۔ آپ خبر قرار دے کر اس کی خبر کو مسترد کر دیتے ہیں۔ آگے جانماز ہے، کیا پاک ہے؟ پھر وہی خبر آپ کو ملتی ہے کہ پاک ہے۔ امام آگے ہوتا ہے کہتا ہے کہ میں باوضو ہوں، میرے کپڑے پاک ہیں، لیکن آپ ہر خبر کو خبر ٹھیرا کر اس سے علم پانے سے انکار کریں گے تو کیا ایک وقت کی بھی نماز آپ پڑھ سکتے ہیں؟ فخر الاسلام نے آگے جو بات کہی ہے وہ یہی واقعہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کو باپ ماں کو ماں ظاہر ہے کہ خبر دینے والوں کی خبروں ہی کی بنا پر تو یقین کرتا ہے لیکن جن کے ہاں خبر سے علم پیدا ہی نہیں ہوتا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اپنے باپ اور ماں کو پہچاننے کے حق سے وہ محروم نہیں ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خبریں کبھی جھوٹی بھی ہوتی ہیں لیکن جھوٹی اور سچی خبروں میں تمیز کا ایک قانون ہے۔ عوام ممکن ہے کہ اس قانون کی تفصیلات سے اس لئے واقف نہ ہوں کہ وہ زیادہ سوچ بچار سے کام نہیں لیتے، لیکن ہر ایک کی فطرت اس قانون کو پہچانتی ہے اور اسی کی راہ نمائی میں دین و دنیا کا کام چل رہا ہے۔ محدثین نے غور و خوض کے بعد اسی قانون کے تمام اجزاء اور عناصر کی تحلیل کی ہے۔ آئندہ اپنے موقعہ پر انشاء اللہ ان تفصیلات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ ۱۲

پیدا کرنے کے لئے فضا میں جو اڑاتے رہتے ہیں، آخر وہ چاہتے کیا ہیں ؟ کیا واقعی ان کی عقل اس کی اجازت دیتی ہے کہ بلا وجہ ان سب کو غلط بیانی کا مجرم قرار دیا جائے جن سے حدیثوں کا یہ ذخیرہ مروی ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ کسی خبر دینے والے کو محض اس لئے کہ وہ ایک واقعہ کی خبر دے رہا ہے بلا وجہ جھوٹا یقین کر لینا نہ صرف عقلی افلاس بلکہ اخلاقی دیوالیہ کی بھی دلیل ہے، جس کے متعلق جھوٹ یا غلط بیانی کا آپ کو تجربہ نہیں ہوا ہے خواہ وہ بے چارہ کسی درجہ کا بھی انسان ہو، یہ سمجھ لینا کہ وہ جھوٹا ہے اور دروغ باف ہے کسی حیثیت سے بھی شریفانہ فعل قرار پاسکتا ہے ؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے آپ ہی کے ساتھ کوئی اس طرز عمل کو اگر اختیار کرے اور آپ کے حالات سے ناواقف ہونے کے باوجود فقط اس لئے کہ آپ نے کسی واقعہ کی اطلاع دی ہو، سننے کے ساتھ سننے والا قہقہہ لگا دے تو خود سوچئے کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا دل کیا فیصلہ کرے گا ؟ پھر بتایا جائے کہ ایسی صورت میں اس ہنسی کو عقل و دانائی کی ہنسی کیسے قرار دی جائے جو آج پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے منہ پھلانے والوں کے ہونٹوں پر ناچ رہی ہے۔ سمجھنے والے خواہ کچھ بھی سمجھیں لیکن مجھے تو ان استخفافی مسکراہٹوں اور استہزائی غل غپاڑوں کے نیچے سبک مغزی، تنگ نظری کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں نظر آرہی ہے، سنجیدگی اس قسم کی چھچھوری حرکتوں کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ تمسخر کرنے والوں کے اس گروہ نے آخر کبھی اس کو سوچا بھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور ان کے ان سارے مظاہروں کی بنیاد ان کے کس اخلاقی، ذریعہ پر قائم ہے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کو منانے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ان بزرگوں کے احترام و عظمت سے اپنے قلوب کو بلا وجہ خالی کرے، جن کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ گزشتہ اوراق میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا مطالبہ تو شاید یہ ہے کہ جن کے متعلق سچائی اور راستبازی کے سوا اور کسی چیز کا تجربہ نہیں ہوا ہے، اچانک ان میں سے کسی ایک کو نہیں بلکہ سب کو، ہر ایک کو بلا وجہ یہ مان لیا جائے کہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے اور جھوٹ بولتے تھے اور ایسی چیزیں ہم تک ان بزرگوں نے پہنچائی ہیں جن کا

واقعہ سے کوئی تعلق نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی ہے خود سوچئے کہ ان حدیثوں کو مسترد کر دینے کا مطلب کیا ہوا؟ ایمانیوں کا وہی گروہ جن کی ایمانی قوتوں اور ان قوتوں کے آثار و نتائج کا تذکرہ ابھی ہم سے سن چکے ہیں، پیغمبر اور پیغمبر کے دین کے ان ہی وفا شعاروں کے متعلق وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ماننے کے باوجود اپنے اسی پیغمبر اور رسول کی طرف ان لوگوں نے جھوٹی باتیں قصداً منسوب کیں۔ اس کو بھی جانے دیجئے کہ پیغمبر کی طرف کسی جھوٹ کو منسوب کرنا خود اپنے اندر کن ہولناک نتائج کو پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ ایک کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا درحقیقت یوں سمجھنا چاہئے کہ منسوب کرنے والا اس کا انتساب اس خدا کی طرف کر رہا ہے جس کی مرضی کی نمائندگی کرنے کے لئے پیغمبر اٹھایا اور بھیجا جاتا ہے۔ پھر کیا جن بزرگوں کی راہ سے ہم تک حدیثیں پہنچی ہیں، ان کو ہم اتنا بڑا مجرم ٹھہرالیں، جس سے بڑا مجرم قرآن کا فیصلہ ہے کہ کوئی دوسرا نہیں ہے، ایک سے زائد جگہوں پر فرمایا گیا ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہے جو خدا پر افترا کرتا ہے اور خدا کی طرف جھوٹ بات منسوب کرتا ہے۔ اف جن کی زندگی از سرتاپا مجرمانہ ہے، کیا خدا کی شان ہے وہی اللہ کے دوستوں، رسول کے جانبازوں کو مجرمین کی اس جماعت میں شریک کرنے کی جسارت کر رہے ہیں جن سے بڑا مجرم قرآن کی رُو سے کوئی نہیں ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان بزرگوں کو مجرم ٹھہرانے کی اس مہم میں چاہتے ہیں کہ سارے مسلمانوں کو گھسیٹ لیں۔ بلاخوف تردید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انکار حدیث کے فتنہ پردازوں کا آخری انجام یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے۔

حدیث اور رواۃ حدیث کے مقابلہ میں عصری ہنگامہ آرائیوں کا اگر یہ مطلب نہیں ہے بلکہ کہنے والے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دین کے "بینات"[1] کی حفاظت و اشاعت کی جو سرگرمیاں میسر آئی

---

[1] بینات کی یہ اصطلاح قرآن سے ماخوذ ہے۔ دین کے ان عناصر و اجزاء کی یہ تعبیر ہے جن کا تعلق دین سے آدمی کے عقلی احساسات کے آگے اتنا واضح و بیّن اور کھلا ہوا ہو کہ سوچنے والے دین کو ان کے بغیر اور ان کے بغیر دین کو سوچ نہیں سکتے۔ توارث و تعامل کی پشت پناہی نسلاً بعد نسل مسلمانوں میں جو چیزیں آغاز اسلام سے منتقل ہوتی ہوئی ان متواترات کی شکل اختیار کر چکی ہیں جن کے انکار کی گنجائش آدمی کی فطرت میں نہیں رکھی (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہیں چونکہ صحاح کی عام حدیثوں (یعنی اصطلاحاً جنہیں خبر احاد کہتے ہیں) ان کے ساتھ شروع ہی سے یہ سلوک اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج و احکام کو چاہا جاتا ہے کہ اعتماد و وثوق قطعیت کا وہ مقام حاصل نہ ہو جو دین کے بینات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج و احکام کی خصوصیت ہے، اگر واقعی کہنے والے یہی کہنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا منکر کون تھا۔ مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ ماننے والوں نے آج ہی کیا ہمیشہ سے یہی مانا ہے، اہمیت میں شرعی قوانین کے ان دونوں سرچشموں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اس کا قائل ہی کون تھا جس کی تردید کی خواہ مخواہ زحمت اٹھائی جا رہی ہے، مانی ہوئی بات کو منوانے کے لئے بھلا ان بے ہنگام شورشوں کی کیا ضرورت تھی یہی نہیں بلکہ ان حدیثوں میں بھی کون قائل ہے کہ سب کا درجہ اعتماد میں برابر ہے، جن حدیثوں کی سند میں یعنی بیان کرنے والوں کے سلسلہ میں یا متن میں جہاں جہاں کوتاہیاں پائی گئی ہیں، ان کوتاہیوں سے کس زمانے میں چشم پوشی کی گئی ہے۔ بندگانِ خدا! آپ نے کیا نہیں سنا ہے کہ حدیثوں کے اسی ذخیرے میں صحیح حدیثوں کے ساتھ حسَن اور ضعیف حدیثوں کی نشان دہی خود محدثین نے کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کے علمی مجاہدات اور جان پر کھیل کر جو معلومات انہوں نے فراہم کئے ہیں، ان ہی مجاہدات اور معلومات کی روشنی میں ہم نے ان روایتوں کو پہچانا ہے اور پہچان سکتے ہیں جن کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب درست نہیں ہے۔ الغرض اس سلسلے میں کرنے کا کونسا کام تھا جو اٹھا رکھا گیا ہے۔ آپ اگر ان سے ناواقف ہیں تو آئیے اور مجھ سے اس داستان کی تفصیل سنئے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) گئی ہے، ان کے انکار کی جرأت اسی قسم کی جرأت ہے کہ کوئی یہ کہنے لگے کہ دنیا اسی وقت سے پائی جاتی ہے جب سے ہم اسے دیکھ رہے ہیں، باقی کہنے والے جو یہ کہتے ہیں اور خبر دیتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی دنیا موجود تھی آفتاب و ماہتاب پائے جاتے تھے، یہ صرف خبر دینے والوں کی ایک تراشی ہوئی خبر ہے ظاہر ہے کیا ایسے آدمی کو یہی سمجھا جائے گا کہ انسانی فطرت اور اس کے قدرتی اقتضاؤں سے وہ محروم ہو چکا ہے، بالفاظ دیگر پاگل دیوانہ ہے، بہرحال دین اسلامی کے بینات مثلاً قرآن ہی کو لیجئے۔ کیا قرآن کو الگ کر کے کوئی اسلام کو سوچ سکتا ہے اور یہی حال اسلام کی ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی اگلوں سے پچھلوں میں آ رہی ہیں جس راہ سے قرآن منتقل ہوتا ہوا آ رہا ہے۔ بینات اور غیر بینات کے مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب تدوین فقہ۔ ۱۲

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ اور ملتِ منصورہ کی فکر میں گھلنے والوں پر اس کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گا کہ ان خود ساختہ افکار اور خود آفریدہ اوہام و شکوک میں ان کا گھلنا بھی بے معنی ہے اور دوسروں کو بھی گھلانے کی کوشش جو ان کی طرف سے مسلسل جاری ہے لاحاصل کوشش ہے بلکہ اگر کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مجرمانہ کوشش ہے۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

ان لوگوں کے لئے جو نہیں جانتے ہیں یا جانتے ہیں مگر سوچنے کا موقع ان کو نہیں ملا ہے، سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں مستحق توجہ یہ ہے کہ دین کے "بینات" کو نگرانی و حفاظت، تبلیغ و اشاعت میں جو سرگرمیاں میسر آئی ہیں ان سرگرمیوں سے حدیثوں کا وہ ذخیرہ کیوں مستفید نہ ہو سکا جن سے پیدا ہونے والے نتائج و احکام کو تعامل و توارث کی قوت حاصل نہیں ہے، یعنی وہ حدیثیں جنہیں خبر آحاد کہتے ہیں، ان کے ساتھ یہ صورت حال کیوں پیش آئی؟ آیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے یا قصداً و ارادۃً ان کو اس حال میں رکھا گیا ہے؟ اس حادثے کو اتفاقی واقعہ قرار دینے میں علاوہ دوسرے اسباب و وجوہ کے جو ابھی بیان کئے جائیں گے۔ اگر سوچا جائے تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی آخر اتفاق کا کیا مطلب ہوگا؟ یہی تو کہ ان کی نگرانی و حفاظت کی ذمہ داری جن لوگوں پر عائد ہوتی تھی، ان لوگوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں اور بجائے اس کے بے اعتنائی اور بے توجہی سے کام لیا، ظاہر ہے کہ یہ کام تو ان ہی لوگوں کا تھا جو دین اسلامی کے سب سے پہلے محافظ اور مبلغ ٹھہرائے گئے تھے۔ پھر کیا العیاذ باللہ صحابۂ کرام بلکہ خاکم بدہن خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان سرد مہریوں اور بے اعتنائیوں کو منسوب کر دیا جائے؟

ابتدائی تاسیس و آغاز کی تاریخ اسلام کی بھی اگر وہی ہوتی جو تاریخ دنیا کے ان اکثر مذاہب و ادیان کی ہے جن سے ہم واقف ہیں تو شاید اس تصور کی ایک حد تک گنجائش بھی پیدا ہو سکتی تھی، یعنی کہا جا سکتا تھا کہ یہ مجبوری کا نتیجہ تھا، لیکن کون نہیں جانتا کہ ظہور کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان سیاسی طاقت اسلام کی پشت پناہی کے لئے اس کی تاسیس و آغاز کے ابتدائی دنوں

ہی میں مہیا ہو گئی اور کیسی سیاسی طاقت ؟ کل دس پندرہ سے بیس سال کے اندر بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ ارض کی سب سے بڑی قاہرہ حکومت وسلطنت اسلام کی حفاظت وبقا، تبلیغ واشاعت کو اپنا واحد نصب العین قرار دیتے ہوئے قائم ہو چکی تھی۔ آخر اسی دین اسلام کے بینات کے متعلق بقول ابن حزم دنیا کی سب سے بڑی طاقتور حکومت جب اس تماشے کو پیش کر چکی تھی کہ

وُلِّیَ عُمَرُ فَفُتِحَتْ بِلَادُ الفرسِ طُوْلاً وَ عَرضًا وَفُتِحَتِ الشَّامُ كُلُّهَا وَالْجَزِيْرَةُ وَ مِصْرَ وَلَمْ يَبْقَ بَلَدٌ إِلَّا وَبُنِيَتْ فِيهِ الْمَسَاجِدُ وَنُسِخَتْ فِيهِ الْمَصَاحِفُ وَقَرَأَ أَئِمَّةُ الْقُرآنِ وَعُلِّمَهُ الصِّبْيَانُ فِي الْمَكَاتِبِ شَرْقًا وَغَرْبًا وَبَقِيَ كَذٰلِكَ عَشَرَةَ اَعْوَامٍ وَاَشْهُرٍ ۔ (ج ۲ ص ۶۷)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد خلافت کی باگ ہوئی ان کے زمانے میں ایران کا سارا علاقہ فتح ہوا، اسی طرح شام والجزیرہ (دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ) مصر یہ سارے علاقے فتح ہوئے اور ان تمام ممالک میں ایسا کوئی ملک باقی نہ رہا جس میں مسجد نہ تعمیر ہوئی ہو، ہر ملک میں قرآن کے نسخے لکھے گئے، قرآن کے پڑھنے والوں نے انہیں پڑھا اور مکتب خانوں کے بچوں کو پڑھایا گیا،[1] مشرق و مغرب ہر جگہ یہی کیا گیا۔ حضرت عمرؓ دس سال اور کچھ مہینے زندہ رہے اور اسی زمانے میں یہی حال ان سارے مقبوضہ علاقوں کا تھا۔

اسی دس سال کچھ مہینے کے اندر یہ ہو گیا جیسا کہ ابن حزم ہی نے لکھا ہے کہ

وَاِنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَ الْمُسْلِمِيْنَ اِذْ مَاتَ عُمَرُ مِائَةُ اَلْفِ مُصْحَفٍ مِنْ مِصْرَ اِلَى الْعِرَاقِ اِلَى الشَّامِ اِلَى الْيَمَنِ فَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ فَلَمْ يَكُنْ اَقَلَّ (۰۰)

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے شام تک، شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

---

[1] لڑکے تو لڑکے اسی سے اندازہ کیجیے کہ خراسان جیسے دور دراز مقام میں لکھا ہے کہ ابن عباس کے شاگرد ضحاک بن مزاحم کے مکتب خانوں میں ہزار ہا لڑکوں کے ساتھ ساٹھ سو لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ (ص ۴۰۰ مفتاح السعادۃ ج ۱) اور یہ حال اسلام کے ابتدائی عہد کا ہے۔

قرنِ اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت واشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امرِ اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت ہے

سوال یہی ہے کہ جس حکومت کی طاقت سے یہ کام قرآنی نسخوں کے پھیلانے میں لیا گیا تھا، ہی حکومت اگر چاہتی تو پچیس تیس ہزار حدیثوں کے اس مجموعہ کی حفاظت واشاعت کا انتظام سی پیمانے پر کیا وہ نہیں کر سکتی تھی، جس پیمانے پر قرآن کی حفاظت واشاعت کا فرض انجام دیا گیا س کے قلمرو کے ایک ایک قطعہ اور خطہ کی آمدنی سے لوگ فرعون اور نمرود کی شان وشوکت کو دہیا ر سکتے تھے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس حکومت کے قبضے میں یہ سارے علاقے ہوں وہ کیا کچھ نہیں ر سکتی تھی، میں یہ مبالغہ نہیں کروں گا اگر کہوں کہ جس قاہرہ حکومت کی نصرت وتائید اسلامی دین کو اپنی تاریخ کے ابتدائی دنوں میں میسر آگئی تھی، سونے کے پتروں پر جواہرات کے حروف یں بھی ان حدیثوں کو وہی حکومت اگر لکھوانا چاہتی تو یقیناً لکھوا سکتی تھی۔ اسی الجزیرہ (عراق وعرب) کے حکمرانوں نے فرات ودجلہ کے کنارے سونے کی کتنی گائیں ڈھلوا ڈھلوا کر گڑوا دیں تھیں، یا مصر کے بادشاہوں نے جو کچھ کیا یا جو کچھ وہ کر سکتے تھے، اس کا اندازہ ان کی قبروں سے برآمد ہونے والی چیزوں سے ہو سکتا ہے، آخر مصر ہی کی تو آمدنی تھی جس سے اسکندریہ میں جیسا کہ کہا جاتا ہے چھ لاکھ کتابوں کا کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، پھر اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسی آمدنی کی وارث حکومت کو پچیس تیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کے لکھوانے سے بھی معذور ومجبور قرار دیا جائے اور یہ حال تو خیر عہدِ صحابہ کا ہے۔ خود نبوت کا جو دور تھا، مانا کہ اس وقت کی حکومت کے طول وعرض میں اتنا اضافہ نہ ہوا تھا لیکن جو حکومت اس وقت بھی قائم ہو چکی تھی جہاں ابن حزم، ہی

کے الفاظ میں اس نے یہ کر کے دکھایا تھا:

الإسلام قد انتشر وظهر في جميع جزيرة العرب من منقطع البحر المعروف ببحر القلزم مارًّا إلى سواحل اليمن كلها إلى بحر فارس مارًّا إلى منقطعه مارًّا إلى الفرات ثم على ضفة الفرات إلى منقطع الشام إلى بحر القلزم وفي هذه الجزيرة من المدن والقرى ما لا يعرف عدده إلا الله عز وجل كاليمن والبحرين وعمان ونجد وجبل طي وبلاد مضر وربيعة وقضاعة والطائف ومكة وكلهم قد أسلموا وبنوا المساجد ليس منها مدينة ولا قرية ولا حلة الأعراب إلا وقد قرئ فيها القرآن في الصلوات وعلّمه الصبيان والرجال والنساء.

(ج ٢ ص ٦٦)

اسلام (نبوت کے آخری زمانے میں) پھیل گیا اور سارا جزیرۂ عرب یعنی بحرِ قلزم سے جو خطِ یمن کے ساحل سے گزر کر خلیج فارس کے آخری حدود تک پہنچا ہے اور وہاں سے دریائے فرات پر آکر ختم ہوتا ہے، پھر فرات سے گزرتے ہوئے شام کے آخری حدود پر پہنچ کر بحرِ قلزم سے خط جو مل جاتا ہے اس سارے علاقے میں اسلام غالب آگیا. ظاہر ہے کہ عرب کے اس جزیرے میں شہر بھی تھے اور دوسری آبادیاں بھی تھیں، ایسی آبادیاں جن کی صحیح تعداد اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا مثلاً یمن، البحرین، عمان، نجد، جبل طے، مضر اور ربیعہ وقضاعہ کے علاقے، اسی طرح طائف کا شہر، مکہ کا شہر (عہدِ نبوت کے آخری عہد میں) ان علاقوں کے باشندے اسلام قبول کر چکے تھے اور مسجد تعمیر کر لیں تھیں، پھر ان میں کوئی شہر کوئی آبادی یا بدویوں کی فرودگاہ ایسی نہ رہی تھی جن میں نمازوں کے اندر قرآن نہ پڑھا جاتا تھا اور مکتب خانوں میں بچوں کو اسی طرح مردوں اور عورتوں کو قرآن نہ پڑھا دیا گیا تھا.

کیا عہدِ نبوت کی اسی حکومت کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا تھا کہ قرآن اور قرآن کے ساتھ دین اسلام کے دوسرے بنیادی عناصر کی اشاعت عام میں اپنی جس طاقت کا مظاہرہ اس شکل میں جیسے اس نے کیا تھا کہ بقول ابنِ حزم:

"پانچ وقتوں کی نمازوں میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ مومن، ہو یا کافر کسی کے لئے اس شبہ کی گنجائش ان میں نہ چھوڑی گئی، ان میں ہر ایک جانتا ہے کہ ان نمازوں کو مقررہ اوقات پر پیغمبر اپنے

صحابیوں کے ساتھ پڑھتے رہتے اور جو بھی جہاں کہیں آپ کے دین میں داخل ہوئے وہ
بھی ان نمازوں کو پڑھتے رہتے اور آج تک پڑھ رہے ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے اس
یقین کو ہر ایک اپنے دل میں پاتا ہے کہ سندھ والے بھی ان نمازوں کو اسی طرح پڑھتے ہیں
جس طرح اندلس والے ان کو ادا کرتے ہیں، آرمینیہ کے باشندے ان ہی نمازوں کو پڑھتے ہیں
جو یمن والے پڑھتے ہیں یہی حال رمضان کے روزوں کا ہے کہ نہ کسی مومن کے لئے شک کی گنجائش
باقی رہی اور نہ کافر کے لئے کہ رمضان میں آنحضرتؐ نے روزے رکھے اور جہاں کہیں جو لوگ بھی
آپ کے دین میں داخل ہوئے وہ بھی ہر سال ان روزوں کو رکھتے ہیں، اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ
رمضان کے روزوں کا یہ سلسلہ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، یہی حال حج کا ہے کہ مومن
ہو یا کافر سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی حج کیا اور اس کے مناسک
کو ادا فرمایا اور ہر علاقہ کے مسلمان ہر سال ایک ہی مہینے میں اس کو ادا کرتے ہیں، الغرض یہ اور
اسی قسم کی وہ ساری چیزیں جن کا قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے ان سب کا یہی حال ہے مثلاً
زکوٰۃ کی فرضیت، مردار اور سور کی حرمت وغیرہ۔" (الملل والنحل ابن حزم ج ۲ ص ۶۸)

جس طاقت سے کام لے کر ان دینی عناصر کو قطعیت کا یہ رنگ بخشا گیا تھا، کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ
قطعیت کے اسی رنگ کو، اسی طاقت اور قوت کو اگر خبر احاد والے احکام ومسائل میں بھی بھرنے
کا ارادہ کیا جاتا تھا تو اس مقصد کی تکمیل سے اسی حکومت کو کون روک سکتا تھا، حکومت تو
بہر حال حکومت ہی ہوتی ہے، ان ہی حدیثوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی انفرادی شخصیتوں نے
پچھلے زمانے میں جب چاہا تو واقعۃً ان کو آب زر اور سونے کے پانی سے لکھوایا۔ مفتاح السعادۃ
میں ابو محمد مزنی ایک عالم کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

اَمَرَ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَبِصَحِیْحِ الْبُخَارِیِّ فَکَتَبُوْا لَہٗ بِمَاءِ الذَّھَبِ مِنَ الْاَوَّلِ اِلَی الْاٰخِرِ (ج ۲ ص ۷)	کتاب اللہ یعنی قرآن مجید اور صحیح بخاری کے متعلق انہوں نے حکم دیا تو لوگوں نے آب زر سے دونوں کتابوں کو اول سے آخر تک لکھ دیا۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اتفاقاً کتابوں میں اس قسم کے واقعہ کا ذکر آ گیا ورنہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہوگا اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ طلائی حروف کے قرآن کے نسخے آج بھی جس کا جی چاہے اوسط درجے کے جس اسلامی کتب خانے میں چاہے دیکھ سکتا ہے[1]۔ قرآن کے لکھوانے میں جو جذبہ کارفرما رہا ہے حدیثوں کے متعلق کیوں سمجھا جائے کہ وہی جذبہ اثر انداز نہ ہوا ہوگا۔ خیال تو کیجئے تیسری صدی ہجری کا زمانہ ہے، ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" لکھی تھی جس میں "مالیات" کے متعلق عہد نبوت وعہد صحابہ کے آثار جمع کئے گئے ہیں، گویا براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل مسند حدیثوں ہی پر یہ کتاب مشتمل بھی نہیں ہے بلکہ حدیثوں کے ساتھ ساتھ صحابہ تابعین کے آثار اور فتوے سب ہی طرح کی چیزیں اس میں پائی جاتی ہیں، لیکن بایں ہمہ اندازہ کیجئے مسلمانوں کے جذبات کا، ابن عساکر کا بیان ہے کہ احمد بن مہدی بن رستم اصفہانی محدث المتوفی ۲۷۲ھ خود کہتے تھے کہ میں نے ابو عبید سے عرض کیا:

يَا اَبَا عُبَيْدٍ رَحِمَكَ اللّٰهُ اُرِيْدُ اَنْ اَكْتُبَ كِتَابَ الْاَمْوَالِ بِمَاءِ الذَّهَبِ (ج ۲ ص ۱۰۱)	ابو عبید! اللہ اپنی رحمت آپ پر نازل کرے (کہ ایسی کتاب آپ نے لکھی)، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب الاموال کو آب زر سے لکھواؤں۔

لیکن خود ابو عبید نے ابن رستم کو اس سے منع کیا اور کہا کہ حبر (مائل بسرخی سیاہی) سے لکھوانا بہتر ہوگا کیونکہ دیر تک اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ ابن رستم نے صرف ارادہ ہی کیا تھا میں سمجھتا ہوں کہ ابو عبید اگر نہ روک دیتے تو ضرور اپنے ارادے کو وہ پورا کر کے رہتے، آخر جس شخص کے متعلق ابن عساکر ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ ان کے پاس حدیث کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا آخر میں بیان کیا ہے کہ

[1] صوبہ بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں خضر چک میں مولویوں کے گھرانے میں ایک کتب خانے کے دیکھنے کا موقعہ مجھے ملا تھا منجملہ دوسرے نوادر کے میں نے حدیث کی دعاؤں کی کتاب "حصن حصین" کا ایک نسخہ وہاں دیکھا تھا جس کی زمین نیلم کے پانی سے اودے رنگ سے تیار کی گئی تھی اور حروف اول سے آخر تک طلائی تھے۔ عنوانات اور فصول حل کردہ موتی کے پانی سے لکھے گئے تھے۔ غالباً ابھی وہ نسخہ خضر چک میں موجود ہوگا۔ ۱۲

أَنْفَقَ عَلَيْهَا نَحْوًا مِنْ ثَلٰثِمِائَةِ أَلْفِ دِرْهَمٍ — جس پر تقریباً تین لاکھ درم انہوں نے صرف کئے تھے۔

تین لاکھ درم جس نے حدیثوں کی کتابت پر خرچ کر دیا ہو، کیوں تعجب کیجئے اگر ابو عبید کی کتاب الاموال کو وہی آب زر سے جیسا کہ ارادہ کیا تھا لکھوا دیتے۔ مسلمانوں کے مذاق کا اس باب میں کون اندازہ کر سکتا ہے، حکومتیں اور سلطنتیں جو کچھ کر سکتی ہیں ان کو تو جانے دیجئے، تیسری صدی کے محدث حافظ یعقوب بن شیبہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں اپنی مسند وہ تیار کر رہے تھے:

كَانَ عِنْدَ مَنْزِلِ يَعْقُوبَ أَرْبَعُوْنَ لِحَافًا	یعقوب کے گھر میں چالیس لحاف رکھے رہتے تھے تاکہ
أَعَدَّهَا لِمَنْ يَبِيْتُ عِنْدَهُ مِنَ	حدیثوں کے نقل کرنے کے لئے ان کے یہاں رات کو
الْوَرَّاقِيْنَ الَّذِيْنَ يُبَيِّضُوْنَ الْمُسْنَدَ	کاتبوں کی جو جماعت سوتی تھی اس کے اوڑھنے میں
(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۴۱)	کام آئیں۔

میں تو حیران ہوں کہ پڑھنے والے عام متداول کتابوں میں اس قسم کے واقعات بھی پڑھتے ہیں مثلاً قرات اور عربیت کے امام ابو عمرو بن العلا، جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچاس اور پچپن سال یا چند سال اسی کے آگے پیچھے مکہ میں پیدا ہوئے۔ آخر میں بصرے کو اپنا وطن بنا لیا تھا، بعض صحابہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی استفادہ کا موقعہ ان کو ملا تھا، بہرحال کہنا یہ ہے کہ ان ہی کے حالات میں ابن خلکان، الیافعی وغیرہ سبھوں نے لکھا ہے کہ

كَانَتْ كُتُبُهُ الَّتِيْ كَتَبَ عَنِ الْعَرَبِ	ابو عمرو بن العلا نے فصحاء عرب کی جن چیزوں کو لکھ کر
الْفُصَحَاءِ قَدْ مَلَأَتْ بَيْتًا لَهُ إِلَى السَّقْفِ	جمع کیا تھا، ان کی کتابوں سے چھت تک کمرہ بھرا
(الیافعی ج ۱ ص ۳۲۵)	ہوا تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ ابو عمرو مانا کہ کوئی بڑے رئیس آدمی نہ تھے، تاہم بعض علوم خصوصاً قرآن کے پڑھانے میں اور ادب عرب کے امام مانے جاتے تھے، عربی ادب میں ان کی واقفیت کا کیا حال

تھا، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے جو اصمعی، ان کے شاگرد رشید کی اس ذاتی شہادت سے ثابت ہے یعنی اصمعی کا بیان ہے کہ

"میں دس سال تک ابو عمرو بن العلار کے حلقہ میں بیٹھا ہوں لیکن کسی لغوی مسئلہ میں شعر کے پیش کرنے کی جب ضرورت ہوئی تو اس شخص نے کبھی اسلامی شاعر (یعنی عہدِ اسلام) کے کلام کو پیش نہیں کیا۔"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قبل اسلام کے جاہلی شعراء کا کلام ہی ابو عمرو کو اتنا محفوظ تھا کہ اسلامی شعراء کے کلام میں اس مسئلہ کے متعلق شہادت ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ کچھ بھی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ ابو عمرو کا مکان کوئی معمولی غریبوں کا جھونپڑا نہ ہوگا، بصرہ اور کوفہ میں مسلمانوں کی تعمیری ترقیوں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس حیثیت کے آدمی ابو عمرو[1] تھے، ان کے کتب خانے کا یہ کمرہ کافی طول و عرض بھی رکھتا ہوگا اور بلندی بھی اس کی اسی نسبت سے ہوگی۔ یہ کمرہ نیچے سے اوپر چھت تک کتابوں سے پٹا ہوا تھا، خیال کرنا چاہئے کہ ان کتابوں کی اور جتنے اوراق پر وہ مشتمل ہوں گی ان کی کیا تعداد ہوگی۔ اندازہ میں انتہائی مسامحت سے کیوں کام نہ لیا جائے پھر بھی وہ دس بیس کتابیں اور سو دو سو ورق تو کبھی نہیں ہو سکتے، بہرحال اتنا تو یقینی ہے کہ جتنے صفحات میں پچیس تیس ہزار حدیثوں کے متونِ سند کے ایک دو راوی کے ناموں کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں ان سے تو یقیناً ان کی مقدار زیادہ ہی ہوگی۔

میں پوچھتا ہوں کہ پہلی صدی ہجری میں بصرے کا ایک خوش باش شہری تو مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ مہیا کر سکتا ہو لیکن جس حکومت کا وہ ادنیٰ رعیت ہو، اس کو اتنا مجبور و معذور، بے دست و پا فرض کر لینا کس حد تک درست ہو سکتا ہے کہ جاہلی شعراء کے اشعار نہیں بلکہ جس پیغمبر کے صدقہ میں یہ حکومت قائم ہوئی تھی اس کے ملفوظات، گفتار و رفتار، سیرت و کردار کے متعلق معلومات کے قلمبند کرنے کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔

---

[1] ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ابو عمرو کو پھولوں کا خاص شوق تھا، روزانہ گجرا خریدا جاتا تھا اور باسی پھولوں کو خشک کر کے منہ دھونے کی چیزوں میں کوٹ کر ملا دیا جاتا تھا گویا خوشبودار صابن بنا لیا جاتا تھا۔ ۱۲

اب میں کیا عرض کروں، ابوعمرو بن العلار کی چھت سے لگی ہوئی ان کتابوں کی صحیح مقدار پر کمرے کی صحیح مقدار کے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہنے والے جو کچھ کہہ بھی سکتے ہیں لیکن اسلام کی ان ہی ابتدائی صدیوں میں اسی حکومت کے ایک عام باشندے ابن عقدہ کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ

تَحَوَّلَ مَرَّةً وَكَانَتْ كُتُبُهُ سِتُّ مِائَةِ جَمَلٍ (الیافعی ج ۱ ص ۳۱۱)

جہاں پہلے رہتے تھے وہاں سے جب ایک دفعہ منتقل ہوئے تو چھ سو اونٹوں پر ان کی کتابیں لدی ہوئی تھیں۔

تیسری صدی کے ایک محدث ابن عقدہ جن کی وفات چوتھی صدی میں ہوئی ہے، یہ ان کے کتابی سرمایہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر اونٹ نو من بوجھ لاد لیتا ہے، حساب کر لیجئے کہ ابن عقدہ کی ان کتابوں کا مجموعی وزن کتنا ہوا۔ گو مورخین نے تصریح تو نہیں کی ہے لیکن غالب قرینہ یہ ہے کہ اس کتابی سرمایہ میں زیادہ تر وہی چیزیں تھیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان، آپ کے اصحاب سے تعلق تھا، کیونکہ ابن عقدہ ان ہی چیزوں کے اپنے وقت میں بے نظیر عالم اور حافظ سمجھے جاتے تھے اور اس کو بھی جانے دیجئے، زمانہ چونکہ آگے بڑھ گیا ہے اس لئے گفتگو کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے لیکن ابو قلابہ کا نام حدیثوں کی سندمیں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ ان کی وفات ہی ہوئی ہے ۱۰۴ھ میں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ پہلی صدی ہجری کے علمار میں ہیں، سنئے ان کی کتابوں کی مقدار، الذہبی نے نقل کیا ہے:-

مَاتَ اَبُوْ قِلَابَةَ بِالشَّامِ فَاَوْصٰى بِكُتُبِهٖ لِاَيُّوْبَ السَّخْتِيَانِيْ فَجِيْءَ فِيْ عِدْلِ رَاحِلَةٍ (تذکرہ ج ۱ ص ۸۸)

ابو قلابہ کا جب انتقال ہوا تو وفات سے پہلے اپنی کتابوں کے متعلق انہوں نے وصیت کی تھی کہ ایوب سختیانی (ان کے شاگرد تھے) ان ہی کے سپرد کر دی جائیں۔ جب ایوب کے پاس آئیں تو ایک اونٹ کا نصف بار تھیں۔

ساڑھے چار من تو ان کتابوں کا وزن ہونا چاہئے، آئندہ بھی کسی موقعہ پر ابو قلابہ کی کتابوں کا ذکر آئے گا۔ جہاں بتایا جائے گا کہ زیادہ تر ان کی یہ کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر مشتمل تھیں۔

اور قصہ کچھ اسی پر کیا ختم ہو جاتا ہے؟ ابو قلابہ تو بہر حال تابعی ہیں، لیکن ابن عباسؓ تو تابعی نہیں ہیں، ان کے مشہور مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کُریب بن ابی مسلم کا یہ بیان طبقات ابن سعد میں پڑھئے، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں:

وَضَعَ عِندَنَا كُرَيبُ بنُ اَبِي مُسلِمٍ مَولٰى عَبدِ اللهِ بنِ عَبَّاسٍ حِملَ بَعِيرٍ مِّن كُتُبِ ابنِ عَبَّاسٍ (ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶)

ہمارے پاس عبداللہ بن عباس کے مولیٰ کُریب نے ابن عباسؓ کی کتابیں رکھوائی تھیں جو ایک بار شتر تھیں۔

ابن عباس کی ان کتابوں کا انشاء اللہ آگے بھی ذکر آئے گا، اس وقت تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس حکومت کی رعایا کے افراد ایک ایک بار شتر لکھوا سکتے تھے خود اس حکومت کے امکانات کا اس باب میں لوگوں کو اندازہ کرنا چاہئے۔ عہدِ نبوتؐ اور عہدِ صحابہؓ کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت سے چونکہ یہ زمانہ بہت زیادہ قریب تھا، اس لئے نوشت و خواند کے ساز و سامان کا اس وقت بہ سہولت میسر آنا آسان نہ تھا، ہم اس کے متعلق پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت کے لفظ کا عوام جو یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ نوشت و خواند سے عرب کے باشندے اسلام سے پہلے قطعاً نا آشنا تھے، یہ صحیح نہیں ہے جاہلیت قرآن کی ایک اصطلاح ہے، ایک سے زائد مقامات پر قرآن نے اپنی اس اصطلاحِ خاص کا تذکرہ کیا ہے، قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص قسم کے خیالات و عقائد، عادات و اطوار کی تعبیرِ جاہلیت کے لفظ سے کی گئی ہے ورنہ جہاں تک عرب جاہلیت کے حالات سے پتہ چلتا ہے نوشت و خواند میں اس ملک کے باشندوں کی اسلام سے پہلے اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب وہی حالت معلوم ہوتی ہے جو اس زمانے کے عام متمدن ممالک (ایران روم مصر وغیرہ) کی تھی[1] بعضوں میں غلط فہمیاں تدوینِ قرآن کی ان روایتوں سے پیدا ہوئیں جن میں بیان کیا گیا ہے

[1] یعنی لازمی تعلیم اس زمانے میں جہاں تک تاریخی روایات کا اقتضا ہے کہیں نہیں تھی، البتہ چین شاید اس حکم سے مستثنیٰ ہو، دوسری تیسری صدی ہجری کے ان سیاحوں نے جو چین پہنچے ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے لازمی تعلیم کا انتظام اس ملک میں اس وقت جاری تھا۔ بہر حال چین کے سوا ہر ملک میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص طبقہ پایا جاتا تھا، اکثریت اس ہنر سے بے گانہ تھی۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

کہ شروع میں قرآن اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کے عسیب یا لخاف (پتھر) یا ادم (چمڑے) وغیرہ پر لکھا جاتا تھا، سمجھ لیا گیا ہے کہ نوشت و خواند کے ساز و سامان کی کمی کا یہ نتیجہ تھا، حالانکہ پہلے ان الفاظ ہی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان سے واقعی مقصد کیا تھا؟ لوگوں نے دماغ پر تمنا زور دینا بھی گوارا نہ کیا کہ بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنے کی شکل ہی کیا ہو سکتی ہے یا کھجور کی شاخ اور اس درخت کے پتوں میں اتنی وسعت کب ہوتی ہے کہ اس پر کچھ لکھا جا سکے۔ بس کہہ دیا گیا اور لوگوں نے مان لیا، آگے بڑھ گئے۔ حالانکہ لغت کی کتابوں کا مطالعہ ذرا توجہ سے اگر کیا جاتا تو

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

اور یہی حال عرب کا بھی تھا کہ اکثریت یقیناً نوشت و خواند سے ناواقف تھی لیکن ہر شہر میں کچھ لوگ پائے جاتے تھے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ صرف قرآنی وحی کی کتابت کے لئے صحابیوں میں ۴۳ بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے ان کے سوا تلاش اور تتبع سے اس وقت بھی سینکڑوں آدمی کا نام بتایا جا سکتا ہے، ان امور کی تفصیل آپکو میری "تدوین قرآن" میں ملے گی۔ جس میں دکھلایا گیا ہے کہ عرب ایام جاہلیت میں کتابوں سے بالکلیہ مفلس نہ تھا، یمن وغیرہ میں مختلف خاندانوں میں کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق پائے جاتے تھے۔ عیسائیوں کے گرجے عرب میں جہاں کہیں تھے ان میں پتہ چلتا ہے کہ ۲۷ کتابیں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، یہی حال عرب کے یہودیوں کا بھی تھا، مدینہ منورہ، خیبر وغیرہ جہاں کہیں وہ تھے، یہودی مذہب کی کتابوں کا ذخیرہ بھی وہاں پایا جاتا تھا، جن کا ذکر بہ کثرت کتابوں میں کیا گیا ہے۔ عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا عام جاہلی خاندانوں میں "مجلہ لقمان" نامی کتاب کا پتہ چلتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کتاب پیش بھی ہوئی تھی۔ ایرانیوں کے شاہنامہ" کا عربی ترجمہ کہتے ہیں کہ لایا گیا تھا بلکہ نضر بن الحارث جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایرانی شاہنامہ کو لکھ کر حیرہ سے لایا تھا، اسی کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام سے بھی اسی قسم کا تاریخی لٹریچر وہ کہ لایا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ رومیوں کی تاریخ کا کچھ ہو، ان روایات پر اگر بھروسہ کیا جائے جو در منثور وغیرہ میں سیوطی نے نقل کی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کے بازاروں میں یہودی کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے، قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کا عربی میں ترجمہ کر کر کے عربوں میں اس کی اشاعت کرتے تھے۔ اور یہ تو بخاری میں بھی ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ میں تورات و انجیل کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ جاہلیت کا جو ماحول جاہلیت کے لفظ سے سمجھ لیا جاتا ہے، یہ درست نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی قسم کا علمی ماحول عرب بھی رکھتا تھا، ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حارث بن کلدہ باشندہ طائف نے ایران کی مشہور طبی درسگاہ جندسابور میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی میں ایک طبی کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ خود عربوں کے قصائد بھی مکتوبہ شکل میں پائے جاتے تھے۔ ۱۲

معلوم ہوسکتا تھا کہ یہ سارے الفاظ اصطلاحی ہیں، ان چیزوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے
جو خاص کر کے لکھنے ہی کے لئے مصنوعی تدبیروں سے اس زمانے میں بنائی جاتی تھیں، آپ ہی سے
میں پوچھتا ہوں کہ اسکولوں میں لوگ پتھر پر لکھتے ہیں، اس بیان میں اور اس میں کہ سلیٹ پر لکھتے
ہیں، کیا کوئی معمولی فرق ہے، لکڑی پر لکھنا اور تختی پر لکھنا، کیا دونوں ایک ہی بات ہے۔ درحقیقت
ہڈیاں ہوں یا لخاف (پتھر) یا کھجور کی شاخ عسیب، عربی زبان کے جو الفاظ اس موقعہ پر استعمال
کئے گئے ہیں، ان سے یہ قطعاً عام چیزیں مقصود نہیں ہیں، بلکہ سلیٹ کے لفظ سے جیسے لکھنے کی
چیز سمجھی جاتی ہے اگرچہ وہ پتھر ہی سے تیار ہوتی ہے، اسی طرح ان الفاظ سے خاص چیزیں مقصود
تھیں، نیز دو دو تین تین آیتیں جو نازل ہوتی رہتی تھیں جن کا تعلق مختلف سورتوں سے ہوتا تھا،
ان آیتوں کو ابتدائی یادداشت کے طور ایسی چیزوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے
جو نسبتاً کتابت کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے زیادہ پائیدار تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سامانِ کتابت کی
کمی اور قلت کی وجہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور مجھے اپنے اس خیال پر اصرار ہے کہ ان چیزوں
کا انتخاب قرآن کی نجماً نجماً نازل ہونے والی آیتوں کو قلمبند کر لینے کے لئے اختیار نہیں کیا گیا تھا، بلکہ
واقعہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے گویا یہ خیال کرنا چاہئے کہ شعراء کا جیسے یہ عام قاعدہ ہے کہ مصرعے
اور اشعار جیسے جیسے تیار ہوتے جاتے ہیں، ان کو چھوٹے چھوٹے پرزوں پر پہلے لکھ لیتے ہیں، اور
بعد کو پوری غزل کے تیار ہو جانے کے بعد کسی بڑے کاغذ پر سب کو ایک جگہ جمع کر کے نقل کرتے
ہیں، کچھ یہی صورت ان قرآنی آیتوں کی کتابت کی تھی جو تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہوتی رہتی
تھیں، فرق صرف یہ تھا کہ شاعر اپنی ابتدائی یادداشت کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاغذ ہی
کے استعمال کرتا ہے اور قرآنی آیات کی اہمیت کی وجہ سے بجائے کمزور چیزوں کے پرزوں کے ایسی
چیزوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال کئے گئے تھے جو نسبتاً زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار تھیں
مثلاً پتھر، ہڈی، کھجور کی شاخ سے لکھنے ہی کے لئے یہ ٹکڑے یا رقعے بنائے جاتے تھے اسی لئے
جو بیس پچیس سال بعد عہدِ صدیقی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لکھوائی ہوئی ساری ابتدائی

یادداشتیں محفوظ حالت میں مل گئیں، صرف سورۂ برات یا سورۂ احزاب کی چند آیتوں والا رقعہ نہ مل سکا۔[1] تقریباً ربع صدی تک ان تمام یادداشتوں کا محفوظ رہ جانا حیرت انگیز بات ہے، ان امور کی پوری تفصیل آپ کو میری کتاب "تدوین قرآن" میں ملے گی۔ اس وقت تو یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن کی کتابت کی متعلقہ روایتوں کا اثر چونکہ حدیث کی کتابت پر بھی پڑا ہے، سمجھنے والوں نے سمجھ لیا ہے اور دوسروں کو بھی وہ یہی سمجھاتے ہیں کہ ابتدا میں حدیثوں کے مکتوب نہ ہونے کی وجہ سامان کتابت کی کمی تھی۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط خیال ہے، مان لیا جائے کہ عرب میں مصر کا غذ یا چین کا کاغذ نہ بھی میسر آتا ہو، پھر بھی اس زمانے میں لکھنے کی جو عام چیز تھی، یعنی رق (یا پارچمنٹ) جو جانوروں کے معدے کے پاس کی باریک جھلیوں سے بنایا جاتا تھا اس کے قحط کی عرب میں کیا وجہ ہو سکتی تھی، عرب کی عام خوراک گوشت تھی، گوشت کھانے والے ملک میں جتنی آسانی کے ساتھ یہ جھلیاں فراہم ہو سکتی ہیں، کیا اس پر تقریر کرنے کی ضرورت ہے، یا رق شتر مرغ یا خرگوش وغیرہ کی باریک کھالوں سے تیار کرتے تھے، سو ظاہر ہے کہ عرب میں ان چیزوں کی قلت کے بھی کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ اور میں تو جو کچھ کہہ رہا ہوں اس حکومت کے امکانات کے متعلق کہہ رہا ہوں جو دین اسلامی کی پشت پناہی کے لئے ٹھیک اس دین کی ابتدار ظہور ہی کے دنوں میں قائم ہو چکی تھی، کیا ایسی حکومت جس کا اقتدار سارے عرب پر قائم تھا، اگر چاہتی تو تیس چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعے کے لکھوانے کا بھی بندوبست نہیں کر سکتی تھی، اس حکومت کے زیر اقتدار سارا عرب عہد نبوت ہی میں آگیا تھا، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جانبازوں کا جو گروہ صحابہ کرام کی شکل میں آپ کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا، جان مال اور ہر وہ چیز جو ان کے امکان میں تھا، سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں پر جب وہ نثار کر رہا تھا تو سوچنا چاہئے کہ ان سرفروشوں کے لئے بھلا یہ کوئی بڑی بات تھی؛ منشائے مبارک کا ہلکا سا احساس

---

[1] یعنی راوی کو یہ یاد نہیں رہا کہ ایک ٹکڑا ابتدائی یادداشت کے اس مجموعہ میں جو نہ ملا تھا، اس میں براۃ کی آخری دو تین آیتیں تھیں یا سورۂ احزاب کی۔ ۱۲

بھی یقین ملنے کہ ایک مجموعہ کیا ایسے سینکڑوں مجموعے لکھوانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھ دس سال کے بعد ہی کیا مصر اسلامی محروسہ میں شریک نہیں ہو چکا تھا، مصر اور مصر کے مشہور کاغذ بردی یا پیپرس کے تاریخی تعلقات سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ حدیثوں کے لکھوانے کے لئے اس کاغذ کی جتنی بڑی مقدار حکومت چاہتی، مصر سے فراہم کر سکتی تھی۔[1]

بہرحال بات ذرا طویل ہو گئی لیکن کیا کیا جائے غلط فہمیوں کی گتھیاں بھی تو کافی دراز اور لمبی ہیں، اگر ہوں پر گرہیں پڑتی چلی گئی ہیں جب تک ساری گرہوں کو صبر سے کام لیتے ہوئے کھول نہ لیا جائے، جس واقعہ کو پیش کرنا ہے شاید آسانی سے لوگوں کے دماغ میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ دینِ اسلامی کے لحاظ سے جن امور کی حیثیت البینات کی نظر آتی ہے، ان کی حفاظت واشاعت، تبلیغ ونگرانی میں غیر معمولی اہتمام شروع ہی سے جو کیا گیا اور یہ کیفیت

---

[1] اس مصری کاغذ کی تاریخی تفصیل پر مستقل مضمون، ہمارے مرحوم رفیق مولوی جمیل الرحمٰن غفر اللہ لہ نے ایک مقالہ کی شکل میں جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلہ میں شائع کرایا تھا جو پُرمغز معلومات سے معمور ہے، یہ کاغذ مصر میں کب سے بن رہا تھا، کیسے بنتا تھا، اس کی خصوصیت کیا ہوتی تھی، مصر کے سوا اور دوسرے ممالک میں بھی یہ صنعت پائی جاتی تھی، یہ سارے مباحث آپ کو اس مقالے میں ملیں گے۔ مسلمانوں نے مختلف مقامات میں مختلف ملکوں سے اس صنعت کو حاصل کیا۔ لکھا ہے کہ ۸۸ھ ہجری میں قطن (روئی) سے کاغذ بنانے کا کارخانہ یوسف بن عمرو نے مکہ میں جاری کیا۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر نے مغرب کے علاقہ میں کتان وغیرہ سے کاغذ بنانے کا طریقہ مروج کیا، ریشم سے بھی کاغذ بنایا جاتا تھا، انہی دنوں میں ایسے چکنے کاغذ تیار ہونے لگے تھے لکھا ہے کہ جس میں آدمی کو اپنا چہرہ تک نظر آسکتا تھا۔ (دیکھو وفیات الاسلاف للشہاب المرجانی ص ۳۳) مسلمانوں نے کاغذ کی طرف اتنی توجہ کی کہ بہت جلد ملک کاغذ سے بھر گیا، سلیمان بن عبدالملک کے زمانے تک کاغذ کی اتنی کثرت ہو چکی تھی کہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لئے الگ الگ مراسلہ دفاتر سے جاری کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو اسراف قرار دیا اور حکم دیا کہ ہر چیز کے لئے الگ الگ مراسلے کی ضرورت نہیں بلکہ چند ضرورتوں کا ذکر ایک ہی مراسلہ میں ممکن ہو تو خواہ مخواہ کاغذ ضائع نہ کیا جائے۔ نیز آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ خوش خطی کے لئے موٹے موٹے حروف کا لکھنا غیر ضروری ہے، باریک حرف سے کام نکل سکتا ہے تو اسی سے کام لیا جائے۔ ۱۲

اس غیر بیناتی حصہ میں جو نظر نہیں آتی ہے جس کا عام حدیثوں (یعنی خبر آحاد) سے تعلق ہے تو یہ نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے اور نہ قرن اول کے مسلمانوں کی بے اعتنائی اور بے توجہی کا العیاذ باللہ اسے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسباب حفاظت مثلاً کتابت و اشاعت وغیرہ کے ساز و سامان کی ابتداء اسلام میں کمی تھی، بلکہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے میرا دعویٰ ہے کہ ہوا نہیں بلکہ کیا گیا ہے، قصداً و ارادۃً کیا گیا ہے، ایسی صورتیں اور ایسے حالات جان بوجھ کر اختیار کئے گئے جن کا لازمی نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکل آیا، یعنی دین کے "بینات" کی حیثیت تو یہ ہوگئی ہے کہ ان کا انکار خود دین کا انکار ہے، گویا کسی کُل کے ان اجزا کا انکار ہے، جن کے نکل جانے کے بعد کُل کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے، یوں سمجھنا چاہئے کہ جسدِ انسانی کے ساتھ جیسے ان اجزا کا تعلق ہے جن کو نکال لینے کے بعد آدمی زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور ان ہی کے مقابلہ میں وہ چیزیں جو مذکورہ بالا حدیثوں سے پیدا ہوتی ہیں گو دینی زندگی کی تعمیر میں ان سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن حیثیت ان کی ایسے اجزا کی ہے جن کے نکل جانے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آدمی دین سے نکل گیا، گویا جو نسبت جسدِ انسانی سے ان اجزا کی ہے جن کے کٹ جانے اور نکل جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے یا رہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اپنی تیسیری اور سہولت پسندانہ خصوصیتوں پر جو ناز ہے[1]، اور یہ سمجھا جاتا ہے اور بجا طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی دین میں وہ سہولتیں نسل انسانی کو نہیں عطا کی گئی ہیں جن کی آسانیوں سے اس آخری دین میں بنی آدم کو سرفراز کیا گیا ہے، سچ پوچھئے تو سہولتوں کے ان ہی ابواب میں ایک بہت بڑا اساسی اور اصولی باب وہ امتیاز بھی ہے جو دینِ اسلامی کے بیناتی اور غیر بیناتی حصہ میں قصداً و ارادۃً پیدا کیا گیا ہے۔ ابتداء ہی سے ایک ایسا محتاط حکیمانہ طرزِ عمل دین کے ان دونوں شعبوں کے متعلق اختیار کیا گیا، کہ علاوہ بیناتی حصہ کے جو چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹوں

---

[1] مسند احمد میں اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے جس میں ہے کہ حبشیوں کے حربی رقص کا تماشا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ صدیقہؓ کو دکھا رہے تھے تو اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لِتَعْلَمَ يَهُودُ أَنَّ فِي دِيْنِنَا فُسْحَةً (یہود کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے دین میں کتنی وسعت و فراخی ہے۔ ۱۲

(در منثور ج ۱ ص ۱۹۳)

کو نبوتِ کبریٰ کے ان مقدس نمونوں سے معمور کھیں جنہیں محبوبیت حق کی آسمانی سند حاصل ہے تو
ان کے لئے بھی انتہائی سیر چشمی کے ساتھ راہیں بالکل کھلی رکھی گئی تھیں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے
کہ صرف دینی مشاغل اور مذہبی کاروبار ہی کی حد تک نہیں بلکہ سونے میں جاگنے میں، اٹھنے میں،
بیٹھنے میں، کھانے میں پینے میں، الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں ان ہی نمونوں کے مطابق جینے والے
چاہیں تو جی سکتے ہیں اور مرنے والے چاہیں تو مر سکتے ہیں، جن سے بہتر نمونے ارتقاء وعروج کیلئے
انسانیت کے آگے نہ ان سے پہلے رکھے گئے اور نہ ان کے بعد پیش ہوئے یا پیش ہو سکتے ہیں۔

اور جہاں ایجابی وسعت دامانیوں کا یہ حال ہے وہیں ان بے چاروں کے لئے جو ان نمونوں
کی پیروی سے محروم رہ جانے والے تھے، ان کے لئے یہ کتنی عظیم اور وسیع سلبی سہولت ہے کہ نہ دینی
زندگی ہی کے ان نتائج سے ان کو محروم ٹھیرایا گیا ہے جن کا استحقاق مذہب کے بنیادی حصہ کی تعمیل
سے ہر تعمیل کرنے والے کو حاصل ہو جاتا ہے اور نہ ان لوگوں کو بغاوت کے جرم کے مجرم ہونے کا موقعہ
دیا گیا ہے جو بدبختی سے ان معلومات ہی کے انکار پر آمادہ ہو جائیں جن سے قدرت کے ان محبوب
نمونوں کا علم حاصل ہوتا ہے، اف اگر معلومات کے اس حصہ کو بھی "بینات" ہی کی شکل عطا کر دی جاتی
اور چاہا جاتا تو عرض کر چکا ہوں کہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ "بینات" کو بینات بنانے میں جس قوت سے کام
لیا گیا تھا، کونسی چیز مانع ہوتی اگر اسی قوت سے کام لے کر ان معلومات کو بھی "بینات" کے قالب میں
ڈھال دیا جاتا لیکن سوچیے تو سہی کہ ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانے والوں کا انجام اس
کے بعد کیا ہوتا۔ خود ان نمونوں کی روشنی میں چلنے سے محروم رہ جانا یہی محرومی کیا کم ہے اور چونکہ ایسی
صورت میں دین کے "بینات" سے کترانے اور ہٹنے کے بھی یہ مجرم بن جاتے تو ان خمیازوں سے ان
کو کون بچا سکتا تھا جو اس جرم کے لازمی نتائج ہیں، لیکن آپ سن چکے ہیں کہ ان معلومات کی جو موجودہ
کیفیت ہے، یعنی خبر آحاد کی شکل میں ان کا ہونا محض اسی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ ان سے پیدا ہونے والے
نتائج کا تارک ہی نہیں بلکہ سرے سے ان معلومات کے انکار کرنے والوں کو بھی دین کے دائرہ سے
باہر کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ دینی زندگی کے ان ثمرات و نتائج

سے بھی ان کو محروم نہیں ٹھہرایا گیا ہے جن کی توقع ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے آنے والی زندگی میں رکھتا ہے، علماء نے تصریح کی ہے کہ

وَاَفْعَالُہٗ خَارِجَ الصَّلٰوۃِ مِنَ الْمَشْیِ وَاللُّبْسِ وَالْاَکْلِ فَاِنَّ الْعَبْدَ لَا یُطَالَبُ بِاِقَامَتِھَا وَلَا یَاْثَمُ بِتَرْکِھَا وَلَا یَصِیْرُ مُسِیْئًا۔

(کشف بزدوی ج ۲ ص ۳۱۰)

• نماز سے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے افعال مثلاً آپ کی رفتار، آپ کے لباس آپ کے کھانے کے طریقے، تو بندوں سے نہ ان امور کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نہ ان امور کے چھوڑنے والے گنہگار ٹھہرائے جائیں گے نہ ان کو برائی کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

اور اسی قسم کی چیزیں نہیں بلکہ اسی کتاب میں ہے کہ یہی حکم ان چیزوں کا بھی ہے جن کا نماز ہی سے تعلق کیوں نہ ہو مثلاً

تَطْوِیْلُ الصَّلٰوۃِ فِیْ حَالَۃِ الْقِیَامِ وَالرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ۔

نماز کے قیام و رکوع و سجود میں دیر تک مشغولیت اکا یہی حال ہے)۔

حتی کہ جن سنتوں کا نام سنن الہدیٰ رکھا گیا ہے مشہور اصولی امام ابوالیسر بزدوی کے حوالہ سے صاحب کشف نے ان کا فتویٰ نقل کیا ہے یعنی یہ فرمانے کے بعد کہ

کُلُّ نَفْلٍ وَاظَبَ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِثْلَ التَّشَھُّدِ فِی الصَّلٰوۃِ وَالسُّنَنِ الرَّوَاتِبِ فَحُکْمُھَا اَنْ یُنْدَبَ اِلٰی تَحْصِیْلِھَا وَیُلَامَ عَلٰی تَرْکِھَا مَعَ اِثْمٍ یَسِیْرٍ۔

ہر ایسی نفلی عبادت جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بانضباط پابندی فرماتے تھے مثلاً نماز میں تشہد (یعنی التحیات) و فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں پڑھی جاتی ہیں جنہیں سنن رواتب کہتے ہیں تو ان چیزوں کا بھی حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی تعمیل پر آمادہ تو کرنا چاہئے اور چھوڑنے والوں پر ملامت و نفرت بھی کی جائے گی تھوڑا سا گناہ کا پہلو بھی اس میں پیدا ہوتا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت ایسوں پر تعزیری کارروائی نہیں کر سکتی، زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی پر ملامت کی جائے اور اس کے طرزِ عمل کو موجب

نفریں ٹھہرایا جائے، رہا آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، صدر الاسلام ابوالیسر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا بہت گناہ اس کو ہوگا لیکن خود یہ گناہ کیا نتیجہ پیدا کرے گا، گو انہوں نے اس کی تعیین نہیں کی ہے لیکن بعض روایتوں کی بنیاد پر فقہاء کا خیال ہے کہ

حِرْمَانُ الشَّفَاعَةِ فِي الْعُقْبٰی (کشف ج ۲ ص ۳۰۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے آخرت میں محرومی

کے انجام کو اس کا یہ گناہ اس کے سامنے لائے گا۔ لیکن یہ تو "سنن الھدیٰ" کے ترک کا نتیجہ ہو سکتا ہے، باقی

كُلُّ نَفْلٍ لَمْ يُوَاظِبْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ تَرَكَهُ فِي حَالَةٍ كَالطَّهَارَةِ بِكُلِّ صَلٰوةٍ وَتَكْرَارِ الْغُسْلِ فِي أَعْضَاءِ الْوُضُوْءِ وَالتَّرْتِيْبِ فِي الْوُضُوْءِ فَإِنَّهُ يُنْدَبُ إِلٰى تَحْصِيْلِهٖ وَلٰكِنْ لَا يُلَامُ عَلٰى تَرْكِهٖ وَلَا يَلْحَقُ بِتَرْكِهٖ وِزْرٌ۔

(ج ۲ ص ۳۰۸)

ہر ایسا نفلی فعل جس کی باضابطہ پابندی رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی بلکہ کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیتے تھے مثلاً ہر نماز کے لئے تازہ وضو، یا وضو میں ہر ہر عضو کو بار بار دھونا یعنی بجائے تین دفعہ کے ایک ہی دفعہ دھولیا جائے) اور وضو کرنے میں اعضاء کی ترتیب (یعنی پہلے منہ پھر کہنی تک ہاتھ پھر مسح پھر پاؤں دھونا) تو اس قسم کے امور کی تعمیل چاہیے تو یہی کہ لوگ کریں، لیکن ان کے چھوڑنے پر نہ وہ ملامت اور نفرت ہی کے مستحق ہیں اور نہ اس کی بازپرس کا بار ان پر عائد ہوگا۔

بہرحال ان حدیثوں سے جو عام احکام و نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا یہی حال ہے، البتہ بعض ایسی چیزیں جن میں اپنے خصوصی حالات کی وجہ سے خاص قوت پیدا ہو گئی ہے، اگرچہ تواتر کے درجہ تک پہنچ کر "بینات" کا رنگ ان میں نہ پیدا ہوا ہو، مثلاً صاحب کشف نے امام محمد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

مَا كَانَ مِنْ أَعْلَامِ الدِّيْنِ فَالْإِصْرَارُ عَلٰى تَرْكِهَا اسْتِخْفَافٌ بِالدِّيْنِ

(ص ۳۱۰)

ایسے امور جن کا شمار دین اسلامی کی نشانیوں میں کیا جاتا ہے تو ان کے چھوڑنے پر اصرار اور حقیقت دین کے وزن کو سبک کرنا (اور اس کی اہمیت کو گھٹانا ہے

مثال میں لوگ اذان یا اقامت یا عیدین کی نماز کو پیش کرتے ہیں کہ گو ان کا شمار فرائض و واجبات میں نہیں ہے اور سنن ہی میں ان کو داخل سمجھا جاتا ہے مگر پھر بھی فتویٰ یہی دیا گیا ہے، امام محمدؒ ہی سے منقول ہے کہ

إِذَا أَصَرَّ أَهْلُ مِصْرٍ عَلَى تَرْكِ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ أُمِرُوا بِهِمَا فَإِنْ أَبَوْا قُوتِلُوا عَلَى ذٰلِكَ۔

اگر کسی شہر کے باشندے اذان یا اقامت کے چھوڑنے پر اصرار کرنے لگیں تو ان کو ان اعمال کی بجا آوری کا حکم دیا جائے گا، اگر اس حکم کی تعمیل سے وہ انکار کریں تو پھر ان سے لڑائی کی جائے۔

مگر ذرا ان دقیقہ سنجیوں کا اندازہ کیجئے کہ لوگ ان افعال کے صرف ترک پر نہیں، بلکہ ترک پر اصرار اور حکم دینے کے بعد اس حکم کے ماننے سے انکار پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے، یعنی فوجی طاقت حکومت ان کے تعمیل کرانے پر استعمال کرے، لیکن فوج کس قسم کے آلات استعمال کرے، لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف کا فتویٰ تھا کہ ہتھیار سے فوج ان پر حملہ نہ کرے بلکہ عام تادیبی کارروائیاں کی جائیں، البتہ امام محمد کہتے تھے کہ ہتھیار کی قوت ایسے موقعہ پر استعمال کرنی چاہئے۔ قاضی ابو یوسف اس کے جواب میں کہتے تھے کہ

اَلْمُقَاتَلَةُ بِالسِّلَاحِ عِنْدَ تَرْكِ الْفَرَائِضِ وَالْوَاجِبَاتِ وَأَمَّا السُّنَنُ فَإِنَّمَا يُؤَدَّبُوْنَ عَلَى تَرْكِهَا وَلَا يُقَاتَلُوْنَ عَلَى ذٰلِكَ لِيَظْهَرَ الْفَرْقُ بَيْنَ الْوَاجِبِ وَغَيْرِهٖ۔

(ص ۳۱۰)

ہتھیار سے فوجی کارروائی فرائض اور واجبات کے ترک پر کی جائے گی، باقی جو باتیں سنت سمجھی جاتی ہیں تو ان کے چھوڑنے والوں کے خلاف صرف تادیبی کارروائی کی جائے گی، سنت کے ترک پر فوجی کارروائی نہ کی جائیگی تاکہ فرض و واجب اور جو چیزیں واجب و فرض نہیں ہیں، دونوں میں فرق واضح ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بعض چیزیں گو ثابت ہیں وہ حدیثوں ہی سے اور گو تواتر کے درجہ تک وہ نہ پہنچی ہوں لیکن دوسرے حالات نے ان میں کافی قوت پیدا کردی ہو، جیسے زانی کی سزا رجم یا موزوں

پر مسح اگرچہ ان کے منکر کو بھی کافر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

وَلٰکِنْ یَخْشٰی عَلَیْہِ الْاِثْمُ — مگر گناہ کا اندیشہ اس کے متعلق ضرور کیا جائے گا۔

مگر ایسی چیزیں بہت تھوڑی ہیں، باقی ان کے سوا حدیثوں کا جو عام ذخیرہ ہے، شمس الائمہ سرخسی نے مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

مِثْلَ الْاَخْبَارِ الَّتِی اخْتَلَفَ فِیْھَا الْفُقَھَاءُ فِیْ بَابِ الْاَحْکَامِ۔ — مثلاً وہ ساری حدیثیں جن کا احکام سے تعلق ہے اور فقہاء کا جن کے متعلق اختلاف ہے۔

مثلاً آمین، رفع یدین اور اسی قسم کے مباحث کی متعلقہ حدیثیں سو ترک تو ترک شمس الائمہ نے فتوی نقل کیا ہے:

لَا یَخْشٰی عَلٰی جَاحِدِہٖ الْمَاْثَمُ — ان حدیثوں کے انکار کرنے والوں کو بھی گنہگار ہونے کا ڈر نہیں ہے۔

شمس الائمہ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک فریق دوسرے فریق کی تائیدی حدیثوں کو جو مسترد کر دیتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ الزام قائم کر کے کہ وہ پیغمبر کی حدیثوں کا انکار کر رہا ہے اس کو گنہگار ٹھہرانا قطعاً بے معنی ہے بلکہ ان ہی اختلافی مسائل کی طرف اشارہ کر کے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تو یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ

اِنَّ اَکْثَرَ صُوَرِ الْخِلَافِ بَیْنَ الْفُقَھَاءِ لَا سِیَّمَا فِی الْمَسَائِلِ الَّتِیْ ظَھَرَ فِیْھَا اَقْوَالُ الصَّحَابَۃِ فِی الْجَانِبَیْنِ کَتَکْبِیْرَاتِ الْعِیْدَیْنِ وَتَکْبِیْرَاتِ التَّشْرِیْقِ وَنِکَاحِ الْمُحْرِمِ وَتَشَھُّدِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَالْاِخْفَاءِ وَالْجَھْرِ بِالْبَسْمَلَۃِ وَالتَّامِیْنِ وَالْاِشْفَاعِ وَالْاِیْتَارِ — فقہاء اسلام کا جن مسائل میں نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کی اکثر صورتیں خصوصاً جن مسائل میں صحابہؓ کے اقوال ہر فریق کی تائید میں ملتے ہیں، مثلاً عیدین کی نماز کی تکبیروں کی تعداد کا اختلاف) یا تشریق کی تکبیریں، یا محرم (یعنی حج کا احرام باندھے ہوئے جو ہو) اس کے نکاح کے جواز و عدم جواز میں جو اختلاف ہے، اسی طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ (نمازوں میں) پڑھا جائے یا زور سے، یا آمین کے آہستہ

فِی الْاِقَامَةِ وَنَحْوُ ذٰلِکَ اِنَّمَا هُوَ تَرْجِیْحُ اَحَدِ الْقَوْلَیْنِ وَکَانَ السَّلَفُ لَا یَخْتَلِفُوْنَ فِیْ اَصْلِ الْمَشْرُوْعِیَّةِ وَاِنَّمَا کَانَ خِلَافُهُمْ فِیْ اَوْلَی الْاَمْرَیْنِ وَنَظِیْرُهٗ اِخْتِلَافُ الْقُرَّاءِ فِیْ وُجُوْهِ الْقِرَاءَاتِ۔

(انصاف ص ۸۸)

کہنے یا زور سے کہنے میں، یا اقامت کے کلمات دو دو دفعہ کہے جائیں یا ایک ایک دفعہ، الغرض یہ یا اسی قسم کے دوسرے اختلافات اسی نوعیت کے جو ہیں، تو ان میں (اختلاف کا مطلب صرف یہ ہے کہ) ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر صرف ترجیح دی جاتی ہے (یعنی سمجھا جاتا ہے کہ بہتر اس میں فلاں پہلو ہے) ورنہ سلف کا اس میں اختلاف نہ تھا کہ ان اختلافی پہلوؤں میں سے کوئی پہلو شریعت کے دائرے سے قطعاً خارج ہے بلکہ مشروعیت (یعنی شرعاً دونوں جائز ہیں) اس پر سب کا اتفاق تھا، ان اختلافات کی نوعیت وہی ہے جو قرآنی آیات کی قرات میں قراء کے اختلافات کا حال ہے۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ صرف گنہگار ہی قرار دینا نہیں بلکہ ان مسائل میں کسی فریق کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے مخالف کو برسر غلطی سمجھے، جیسے قرآن کی مختلف متواتر قراءتوں میں سے کسی قرات کے قاری کو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صحیح قرآن نہیں پڑھ رہا ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہؓ میں بھی اس قسم کے اختلافات موجود تھے، باوجود اس کے جب ان میں ہر ایک علی الہدیٰ اور برسر حق یقین کیا جاتا ہے تو ان کے بعد ان ہی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو برسر غلطی قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے جو تم دیکھتے ہو کہ سلف ان اختلافی مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مسلک کے متعلق اس قسم کے الفاظ لکھا کرتے تھے یعنی

هٰذَا اَحْوَطُ هٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ، وَهٰذَا اَحَبُّ اِلَیَّ وَمَا بَلَغَنَا اِلَّا ذٰلِکَ۔

یہی پہلو احتیاط سے زیادہ قریب ہے، یہی بات پسندیدہ ہے، یہ پہلو مجھے زیادہ مرغوب ہے یا یہ کہ نہ پہنچی مجھ تک مگر یہی بات۔

سلف کی کتابوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں :

وَهٰذَا اَكْثَرُ فِي الْمَبْسُوْطِ وَاٰثَارِ مُحَمَّدٍ وَكَلَامِ الشَّافِعِيِّ -

(انصاف ص ۸۹)

(مختلف پہلوؤں میں سے کسی مسئلہ کے متعلق کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے مذکورہ بالا نوعیت کے الفاظ) مبسوط اور کتاب الآثار مصنفہ امام محمد (شاگرد ابو حنیفہ) اور امام شافعی کے کلام میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے کسی گوشہ کو نبوت کی پرچھائیوں اور رسالت کی تجلیوں سے جو خالی رکھنا نہیں چاہتے، دین کے ان دیوانوں، شمع نبوت کے ان پروانوں کے قرار و سکون کے لئے ایک طرف اگر اتنے عظیم و وسیع پیمانے پر انتظام کر دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی پیغمبر کی امت کو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا اور پیغمبر ہی کیا سچ تو یہ ہے کہ پچھلی نسلوں کے لئے اتنے ہمہ گیر ہر جہتی معلومات اگلوں کی کسی چھوٹی یا بڑی شخصیت کے متعلق پیش کرنے سے انسانیت کی پوری تاریخ قاصر ہے لیکن جہاں یہ کیا گیا ہے وہیں ان کوتاہ نصیبوں کو بھی مایوس نہیں کیا گیا جن کا سعادت کی اس لازوال دولت میں کوئی حصہ نہ تھا، یا تھا تو بہت کم تھا۔

مولانا انور شاہ کشمیری کا قول

درس بخاری کی املائی تقریر (فیض الباری مطبوعہ مصر) میں اسی مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ الامام مولٰنا السید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا یہ فقرہ جو نقل کیا گیا ہے:

اِنَّ جَمِيْعَ الْاَحَادِيْثِ فِيْ عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ كَانَ اَحْسَنَ فِيْ بَادِي الرَّاْيِ اِلَّا اَنَّ الْمَرْضِيَّ عِنْدَ ذٰلِكَ كَانَ لَا تُدَوَّنُ الْاَحَادِيْثُ مِثْلَ تَدْوِيْنِ الْقُرْاٰنِ وَلَا يُحْفَظُ حِفْظُهٗ

(ج ۱ ص ۲۰۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں حدیثیں اگر جمع ہو جاتیں تو گو بظاہر یہ زیادہ اچھی بات نظر آتی ہے لیکن درحقیقت مقصد ہی یہ تھا کہ حدیثوں کی تدوین ہی اس طریقہ سے نہ ہو جیسے قرآن کی تدوین پر غیر معمولی توجہ صرف کی گئی اور قرآن کی حفاظت میں جو دلچسپی لی گئی یہ کیفیت حدیث کی تدوین میں نہ پیدا کی جائے۔

سچ پوچھئے تو اسی اجمال کی یہ تفصیلات تھیں جو اس وقت تک آپ کے سامنے پیش کی گئیں، شاہ صاحب نے اس کے بعد فرمایا کہ دین میں عام حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی جو ثانوی حیثیت ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ کسی حادثہ کا یہ اتفاقی نتیجہ ہے بلکہ شروع ہی سے ارادہ ہی یہ کیا گیا کہ حدیثوں کا یہ سرمایہ

لَاتَنتھِی فِی الْخَتَمِ نِھَایَۃً وَلَاتَبلغ فِی الاھْتِمَام بِاَلْفَاظِھَا مَبْلَغھا بَلْ تبقی فِی مَرْتَبَۃ ثَانِیَۃ یمشی فِیھَا الِاجْتِھَادُ وتفحّص العُلَماءِ وَغَوْرُالْفُقَھَاءِ وَبَحْثُ الْمُحَدِّثِیْن۔	قطعیت اور یقینی ہونے میں قرآن کے برابر نہ ہو جائے اور نہ اس کے ساتھ وہ سرگرمی دکھائی جائے (جو قرآن کی تدوین میں دکھلائی گئی) بلکہ قصداً وارادۃً حدیثوں کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا (کہ قرآن کے مقابلہ میں) ان کا درجہ دوسرا ہو گیا۔ ایسا دوسرا درجہ جس کی وجہ سے ان کے متعلق علماء کے اجتہاد اور تحقیق وتدقیق کی، فقہا کی غور ونظر اور محدثین کی تلاش وجستجو کی گنجائش ان میں پیدا ہو گئی۔

اور یہ کس لئے کیا گیا، شاہ صاحب اسی کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

لِیَنفَسِحَ عَلَیْھِمْ اَمْرُ الدِّیْنِ وَ یَتَوَسَّعَ عَلَیْھِمْ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ۔	تاکہ مسلمانوں پر ان کا دین زیادہ کشادہ ہو اور ہر طرح سے سہولتیں اس باب میں ان کو میسر آجائیں۔

اور آخر میں وہی بات کہ عام لوگوں کے لئے دین کو آسان بنانے کی یہی شکل تھی، اسی کی طرف شاہ صاحب مرحوم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

صَدَقَ حَیْثُ قَالَ اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ۔	سچ فرمایا گیا کہ الدین صرف سہولت اور آسانی ہے۔

کتابت وقلتِ رواۃِ حدیث سے متعلقہ
بعض اعتراضات کا جواب

جیسا کہ مسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ امت کو اپنے پیغمبر سے جو دین ملا ہے اس کا ایک حصہ تعامل وتوارث کی قوت کی پشت پناہی میں نسلاً بعد نسل بغیر کسی انقطاع کے اگلی نسلوں سے

پچھلی نسلوں میں تواتر و تواطؤ کے قانون کے تحت اس طریقہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس کے متعلق اس قسم کا شبہ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہنچایا ہوا ہے یا نہیں، اسی قسم کا شبہ ہے کہ کسی کو خود پیغمبر ہی کے متعلق یہ مالیخولیا ہو جائے کہ واقع میں اس نام کے کوئی آدمی تھے بھی یا نہیں، یا تھے تو رسالت کا انہوں نے دعوی بھی کیا تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جنونی اختلال سے پہلے اس قسم کے شکوک کی کسی صحیح دماغ میں قطعاً گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اور قرآن کے عملی مطالبات کے تشکیلات اور اس نوعیت کی چیزوں کا یہی حال ہے، یا بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق اس قسم کی ناقابل تزلزل یقین و قطعیت کا دعوی تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے متعلق شک اندازی بھی آسان نہیں ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسح خفین یعنی موزے پر وضو میں مسح کے متعلق اس قسم کے الفاظ جو منقول ہیں:

اَخَافُ الْکُفْرَ عَلٰی مُنْکِرِ الْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ۔	خفین (یعنی موزے) پر مسح کے انکار کرنے والوں پر مجھے کفر کا اندیشہ ہے۔

یا امام صاحب ہی نے اسی کے متعلق ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ

لَمْ اَقُلْ بِالْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ حَتّٰی جَاءَنِیْ مِثْلَ ضَوْءِ الصُّبْحِ۔	خفین (موزے) پر مسح کرنے کا فتوی اس وقت دیا، جب صبح کی روشنی کی شکل میں یہ مسئلہ میرے سامنے آگیا۔

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ گو قرآن میں ارجل یعنی "پاؤں" کے دھونے کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کا بظاہر مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ براہ راست وضو میں پاؤں کو دھونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ بجائے دھونے کے خود پاؤں کو نہیں بلکہ موزہ (خفین) جو پاؤں پر چڑھا ہو اسی کو کافی قرار دینا قرآنی مطالبہ میں گویا ایک طرح سے ترمیم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ قرآنی مطالبہ میں ہلکی سی ترمیم بھی کسی ایسی ہی چیز سے ممکن ہو سکتی ہے جو قطعیت اور یقین آفرینی میں قرآن کے مساوی ہو۔ امام صاحب کی پریشانی کا منشا، اس مسئلہ میں واقعہ کی یہی صورت تھی، لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ

قَدْ ثَبَتَ عَنْ سَبْعِيْنَ صَحَابِيًّا (عرف شذی وغیرہ) (مسح خفین، ستر صحابیوں (کی روایتوں) سے ثابت ہوئی

تب امام کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

بہرحال دین کے ان بینات یا بینات کے قریب قریب جو چیزیں ہیں، ان کے سوا دین ہی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے گو منسوب کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن شروع میں پیغمبر کی طرف منسوب کر کے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات صحابہؓ کے طبقہ میں یا ان کے بعد بھی ایک دو آدمی سے زیادہ اور کسی سے وہ نہیں سنی گئی ہیں، اصطلاحاً ان ہی چیزوں کا نام خبر آحاد رکھ دیا گیا ہے، سوال یہی ہے کہ جب ان کا بھی دین ہی سے تعلق تھا وہ بھی پیغمبر ہی کی عطا کی ہوئی چیزیں تھیں یعنی قرآنی حکم

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ رسول نے جو کچھ تمہیں دیا اسے لیا کرو اور جس سے روکا اس سے رک جاؤ۔

کے ذیل سے ان کو خارج نہیں کیا جا سکتا ہے تو اسلام کے ابتدائی ایام ہی میں بھی چند خاص افراد تک ان کی رعایت کیوں محدود رہی؟

آغازِ اسلام میں خاص افراد تک روایتوں کے محدود رہنے کی حکمت

علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر میں اس سوال کو اٹھایا ہے اور خود ہی پھر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہی بات یعنی چند خاص افراد ہی تک ان روایتوں کا محدود رہنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق تبلیغ عام کی کوشش نہیں کی، وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کی اشاعت عمومی رنگ میں فرمائی ہو لیکن بیان کرنے والے اس کے ایک دو آدمی ہوں اس موقعہ پر رؤیت ہلال (چاند دیکھنے) کے مسئلہ کا ذکر کیا ہے، اپنے مطلب کو اسی مثال سے واضح کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں:

یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک بڑا مجمع چاند کو ڈھونڈ رہا ہو اور آسمان میں کسی قسم کی علت

(یعنی گرد و غبار وغیرہ) بھی نہ ہو اور چاند کے ڈھونڈھنے والوں میں ہر ایک چاہ رہا ہے کہ چاند پر اس کی نظر پڑ جائے، ہر ایک کو اسی کی لو لگی ہوئی ہے مگر باوجود اس کے صرف چند آدمی اکے دکے تو چاند کو دیکھ پائیں لیکن دوسرے لوگ جن کی آنکھیں صاف ستھری، بھلی چنگی تھیں ان کی نظر چاند پر نہ پڑے (ایسا نہیں ہو سکتا)"۔ (ج ۱ ص ۲۰۲)

ایسی صورت میں جصاص کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ

"یہ چند اکے دکے جنھوں نے چاند دیکھنے کا دعویٰ (اس بھرے مجمع میں) ان عام نہ دیکھنے والوں کے مقابلہ میں جو کیا ہے قطعاً کسی نہ کسی غلطی کا شکار ہیں، یا یہ ہوا ہے کہ خیالی چاند کو انہوں نے چاند سمجھ لیا ہے، یا اگر یہ نہیں ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں"۔

علامہ کا مقصد یہ ہے کہ جیسے رؤیت ہلال کے مسئلہ میں یہی فیصلہ عقل کا ایک فطری فیصلہ ہوگا، بجنسہ اسی طرح ایسی بات جس کی عام اشاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لوگوں میں کی گئی ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی عام پھیلائی ہوئی خبر کو صرف ایک دو آدمی ہی بیان کریں، وہ لکھتے ہیں کہ

غَيْرُ جَائِزٍ عَلَيْهَا تَرْكُ النَّقْلِ وَ الِاقْتِصَارُ عَلَىٰ مَا يَنْقُلُهُ الْوَاحِدُ بَعْدَ الْوَاحِدِ۔

اس قسم کی خبر کے متعلق یہ جائز نہ ہوگا کہ عام لوگوں نے اس کی اشاعت و نقل ترک کر دی ہو اور ایک سے ایک اس کو روایت کرے۔

پس معلوم ہوا کہ خبر الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو چیزیں امت تک منتقل ہوئی ہیں، دراصل حقیقتاً خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حزم و عمل کو اس میں دخل ہے۔ عام اشاعت و تبلیغ ان چیزوں سے اس لئے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ عوام سے عمومی طور پر عمومیت کا رنگ پیدا کر دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ جو کیفیت اس وقت ان میں پائی جاتی ہے یہ باقی نہ رہتی، بلکہ عمومی تبلیغ کی وجہ سے بجائے ایک دو کے ان کے بیان کرنے والوں کی تعداد ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کے برابر ہو جاتی،

جن کی تعمیل کا مطالبہ ہر مسلمان سے کیا گیا ہے جو قطعاً خلافِ مقصود بات ہوتی۔

اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ تراویح کی نماز دو تین دن پڑھنے کے بعد آپ نے ترک فرمادی، اور ترک کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا کہ "مجھے ڈر ہوا کہ کہیں فرضیت کی شکل یہ نماز نہ اختیار کرلے" حج کے متعلق پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا ہر سال مسلمانوں پر حج فرض کیا گیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال پر خاموش ہو گئے لیکن پوچھنے والے صاحب نے دوسری دفعہ تیسری دفعہ جب سوال کو دہرایا، تب آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ ہر سال فرض نہیں ہے، آگے اسی طریقۂ تبلیغ کی خصوصیتوں کا اظہار، ان الفاظ میں فرمایا کہ

"جن باتوں کو میں چھوڑ دیا کروں تم لوگ بھی ان کو چھوڑ دو"

بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

"میں اگر ہاں کہہ دیتا تو پھر ہر سال حج مسلمانوں پر فرض ہو جاتا اور وہ تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ دیکھو! تم سے پہلے قومیں اسی کثرتِ سوال اور پوچھ گچھ کے ہاتھوں تباہ ہوئیں"

خود قرآن ہی میں مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا کہ ایسی باتیں نہ پوچھا کریں جو اگر بتادی جائیں تو تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی اور آخر میں اعلان کردیا گیا، قرآن میں اعلان کرایا گیا کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (مائدہ) — معاف کر چکا ہے اللہ ان باتوں کو، قطعاً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان دشواری میں نہ مبتلا ہو جائیں، اسی لئے بہت سی باتوں سے قصداً خاموشی اختیار کی گئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں پائی جاتی ہے یعنی فرماتے کہ

إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَحَرَّمَ — بیشک اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں تو انہیں کھونا مت اور اسی نے کچھ حدود مقرر کئے ہیں ان کو پھاند نا مت اسی نے

أَشْيَاءَ فَلَا تَقْرَبُوْهَا وَتَرَكَ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْهَا۔

(جمع الفوائد بحوالہ رزین)

کچھ چیزیں تم پر حرام کی ہیں تو ان کے نزدیک پھٹکنا اور اسی اللہ نے کچھ چیزیں چھوڑ بھی دی ہیں یعنی ان کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے) اور ایسا بھول کر نہیں کیا ہے تو ان کو کریدنا مت۔

اور بعض باتوں کا اس سلسلہ میں ذکر بھی فرماتے تو خاص لوگوں سے فرماتے، ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح کی باتیں یاد کی ہیں جنہیں لوگوں میں میں نے پھیلا دی ہیں وہ صرف ایک قسم کی چیز ہے۔ عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ساری باتوں کو میں لوگوں سے اس لئے نہیں بیان کرتا کہ جو نہیں جانتے ہیں وہ خواہ مخواہ میری مخالفت کریں گے۔ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۸)

حذیفہ بن یمانؓ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی تھے جن سے آپؐ نے بہت سی باتیں فرمائی تھیں جو دوسروں کو معلوم نہ تھیں، خصوصاً آئندہ پیش آنے والے حوادث و واقعات کا خصوصی علم حذیفہؓ کے پاس تھا، بکثرت حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کسی صحابی سے آپؐ نے حدیث بیان کی، صحابی نے اجازت چاہی کہ لوگوں میں اس کی اشاعت کروں، آپؐ نے منع کر دیا حضرت معاذ بن جبلؓ، ابوہریرہؓ اور بھی دوسرے صحابیوں سے اس قسم کی روایتیں نقل کی گئی ہیں اور عام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں بلکہ متعدد اصحاب مثلاً زبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص، زید بن ارقم وغیرہ سے ایسی روایتیں کتابوں میں جو پائی جاتی ہیں کہ لوگوں نے ان بزرگوں سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے؟ تو فرماتے کہ حدیثیں تو ہم نے بھی سنی ہیں، ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں سالہا سال تک رہے لیکن خوف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے جس کی سزا سخت ہے، صحابہؓ کے ان اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان معلومات کی عام اشاعت کے مشغلہ میں مصروف ہو کر خواہ مخواہ اس خطرے کو کیوں خریدیں جس سے بڑا ایمانی خطرہ مشکل ہی سے کوئی ہو سکتا ہے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کا جرم۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ افتراء علی اللہ، خدا پر جھوٹ باندھنے

کی ایک شکل ہے، اور جس کے مرتکب کو قرآن میں سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا گیا ہے۔ صرف خود ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس قسم کی حدیثوں کی عام اشاعت سے صحابہؓ اپنے زمانے میں منع کیا کرتے تھے، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح مسلم میں یہ روایت منقول ہے کہ لوگوں کو اس کی تاکید کیا کرتے تھے کہ عام لوگوں کی سمجھ سے جو باتیں باہر ہوں ان کا ان سے ذکر نہ کرنا چاہئے، ورنہ بعضوں کو فتنہ میں یہی باتیں مبتلا کر دیں گی (مسلم) حضرت علیؓ کا تو یہ قول مشہور ہی ہے یعنی

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا یَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ یُّکَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (بخاری وغیرہ)
عام لوگوں سے وہی باتیں بیان کیا کرو جنہیں وہ جانتے پہچانتے ہوں کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کو جھٹلا دیا جائے۔

دارمی نے حضرت علیؓ کے خطبہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے جس کا ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ

اِنَّ الْفَقِیْهَ حَقَّ الْفَقِیْهِ مَنْ لَمْ یُقْنِطِ النَّاسَ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔
سب سے بڑا سمجھ والا آدمی وہی ہے جو عام لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے۔

خود بخاری وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تاکیدی لہجہ میں صحابہؓ کو حکم دیا کرتے تھے:

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (بخاری ومسلم)
آسانی اختیار کیا کرو، دشواری میں لوگوں کو مبتلا نہ کرنا خوشخبریاں سنایا کرو (ایسی باتیں نہ کیا کرو) جن سے لوگوں میں نفرت پیدا ہو اور وہ بھاگ جائیں۔

سہیل بن حنیف صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کر کے ان الفاظ کو بیان کرتے تھے کہ عام لوگوں کو خطاب کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

لوگو! اپنے اوپر سختی نہ کیا کرو، تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ اپنے اوپر انہوں نے سختیاں کیں، ان لوگوں کی بچی کھچی یادگاریں اب بھی تم لوگوں کو کلیساؤں اور زیارات (عیسائیوں کی خانقاہوں) میں مل سکتی ہیں۔ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۰ بحوالہ طبرانی فی الکبیر والاوسط)

بہرحال علامہ ابوبکر جصاص نے نکتہ کی بات جو سمجھی ہے یعنی ایسی ساری روایتیں جن کے

بیان کرنے والے اسلام کے ابتدائی دور (عہد صحابہ و تابعین) میں گنتی کے چند آدمی بلکہ بسا اوقات ایک ہی آدمی ہیں، اصطلاحاً جن روایات کا نام خبر آحاد ہے، یا جصاص نے "خبر الواحد بعد الواحد" کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی ہے، اپنی کتاب "الرسالۃ" میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علم الخاصہ من خبر الخاصہ (الرسالہ ص۱۱) یا "خبر الواحد عن الواحد حتی ینتہی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یعنی ایک نے ایک سے سنا تا اینکہ اسی طرح یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو) وغیرہ الفاظ سے ان کو موسوم کیا ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا وہی حصہ ہے جس کی عام اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لئے ان کا ذکر بھی عام لوگوں سے نہیں بلکہ خاص خاص صحابیوں سے فرمایا گیا۔

بہرحال دین کے بنیاتی و غیر بنیاتی حصوں میں مطالبہ اور گرفت کی قوت وضعف کے لحاظ سے مدارج و مراتب کے جس فرق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرنا چاہتے تھے اس کی یہ پہلی تدبیر تھی جو اختیار کی گئی تھی، یعنی بنیاتی حصے کی تو عام اشاعت کا عام انتظام کیا گیا اور اسی کے مقابلہ میں غیر بنیاتی چیزوں کے متعلق اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ ان میں عمومیت کا وہ رنگ نہ پیدا ہو جو ان کو بنیاتی عناصر و اجزاء کے ساتھ مشتبہ کر دے۔

لیکن مراتب کے اس فرق کو پیدا کرنے میں نبوت کی اور نبوت کے بعد نبوت کے کاموں کی تکمیل کرنے والے بزرگوں یعنی خلفائے راشدین کی نگرانیاں کیا اسی حد تک محدود تھیں، واقعات سب ہی کو معلوم ہیں، لیکن ان کے اسباب کیا تھے تفصیل کے ساتھ لوگوں نے اس کے سمجھنے کی کوشش جیسی کہ چاہئے شاید نہیں کی۔

ممانعتِ تحریرِ حدیث کی روایت خود تحریرِ حدیث پر دلالت کرتی ہے،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے والوں کی طرف سے پہلی بات جو پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیثیں لکھی نہیں گئیں بلکہ لکھنے کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کر دی تھی، میرا اشارہ صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث کی طرف ہے یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ شَیْئًا فَلْیَمْحُہٗ۔ (مسلم) جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اس کو مٹا دے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ دوسری کوئی روایت اگر نہ بھی ہوتی صرف یہی ایک حدیث اور اس حدیث کے یہی الفاظ بھی ہوتے تو اسی کو عہد نبوت میں کتابتِ حدیث کا وثیقہ بنایا جا سکتا ہے یعنی اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو آنحضرتؐ کی زندگی ہی میں آپ ہی کے زمانہ میں صحابہؓ قلمبند کرنے لگے تھے، آخر خود غور کیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ" من کتب عنی غیر القرآن (جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے) کیا اپنے الفاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اطلاع نہیں دے رہے ہیں کہ بعض لوگوں نے قرآن کے سوا بھی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے عہدِ نبوت میں حدیث کے عدم کتابت کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں، یہ تو الگ بات ہے مگر حدیث عہد نبوت میں بھی لکھی جا چکی تھی اس کی شہادت تو بہرحال اس سے فراہم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عدم کتابت کے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے صرف حدیث کے اتنے الفاظ کافی نہیں ہیں بلکہ دعوی کرنے والوں پر اس کا بار ثبوت ہے کہ پیغمبر کے اس حکم کی صحابہ نے تعمیل بھی کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پیغمبر کے حکم کی صحابہ تعمیل نہ کرتے تو اور کون کرتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس حدیث کو آپ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش فرما رہے ہیں، اس میں تو اس کا ذکر نہیں ہے یعنی اس میں یہ نہیں ہے کہ حضورؐ کے اس ارشاد کے بعد لوگ لکھنے سے رک گئے اور جن کے پاس حدیثوں کا جو لکھا ہوا سرمایہ تھا اسے انہوں نے مٹا دیا یا ضائع کر دیا۔ البتہ صحابہ کے عام حالات کی بنیاد پر یہ استنباطی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کو جب حکم دیا گیا تھا تو اس حکم کی تعمیل چونکہ انہوں نے ضرور کی ہوگی اس لئے ماننا چاہیئے کہ اس حکم کے بعد حدیثوں کی کتابت کا سلسلہ بھی رک گیا اور جو کچھ لکھا گیا تھا اسے ضائع کر دیا گیا۔ پس اصل حدیث کے ساتھ جب تک اس بیرونی اضافے کو نہ جوڑا جائے آپ کا دعوی ثابت نہیں ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ اس

خارجی اضافے کے بعد بھی جو کچھ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کا اثبات مشکل ہے۔ آخر زیادہ سے زیادہ کہنے والے یہی تو کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ کی تعمیلی جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا چاہئے کہ لکھنے کے بعد جن جن لوگوں کو اپنی مکتوبہ حدیثوں کے مٹانے یا ضائع کرنے کا موقعہ ملا انہوں نے ضائع کر دیا ہوگا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ہر ایک کو اس کا موقعہ ضرور ہی ملا ہوگا۔ آخر ان ہی لکھنے والوں میں جن جن کی وفات ہو چکی ہوگی، اگر کوئی مسودہ ان کے گھر پڑا رہ گیا ہو یا وفات ہی نہیں تبدیل مقام مثلاً مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ بعضوں کی رسائی اپنے لکھے ہوئے مسودات تک آسان نہ ہو، اسی قسم کے دوسرے موانع بھی پیش آ سکتے ہیں اور یہ ساری باتیں اس وقت ہیں جب یہ مان لیا جائے کہ جن لوگوں کو یہ حکم دیا گیا تھا ان میں ہر ایک تک نبوت کا یہ ارشاد پہنچ بھی گیا اور جن تک پہنچا انہوں نے یقین بھی کر لیا ہو کہ اس حکم کی تعمیل واجب ہے، حالانکہ اس کا ثابت کرنا بھی آسان نہیں ہے[1]۔

مذکورہ ارشادِ نبوی کی حقیقت

اور سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا حکم کیوں دیا گیا تھا، جہاں تک میں جانتا ہوں عموماً اس کے تفصیلات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے کہ عہدِ نبوت

---

[1] آخر لکھے ہوئے الفاظ کے مٹانے ہی کا تو وہ قصہ ہے جس کا صلح حدیبیہ کے صلح نامے کے سلسلہ میں ذکر کیا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماتے ہوئے الفاظ حضرت علیؓ لکھ لیتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت علی کو حکم دیتے ہیں کہ ان الفاظ کو مٹا دو مگر حضرت علیؓ تعمیل سے قطعی طور پر اپنے آپ کو معذور بتاتے ہیں اور ان مکتوبہ الفاظ کے مٹانے کے حکم کی حضرت علی تعمیل نہیں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کا تعمیل حکم سے گریز یا انکار کسی سرکشی اور بغاوت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس انکار میں تعمیل کا ایسا عمیق جذبہ پوشیدہ تھا جس پر ہزاروں تعمیلی جذبات قربان کر دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ تو موقعہ اور محل کی بات ہوتی ہے، بسا اوقات انکار ہزار ہا اقرار پر بھاری ہو جاتا ہے، حکم دینے والے اور جنہیں حکم دیا گیا جس حال میں دیا گیا اور جس چیز کا حکم دیا گیا ہو ان ساری خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے موقعہ پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ بعض صحابہ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اشاعتِ عام کا رنگ ان حدیثوں میں نہ پیدا ہو اس لئے مکتوبہ حدیثوں کے مٹانے کا حضورؐ نے حکم دیا ہے، چونکہ میری مکتوبہ حدیثوں سے اشاعتِ عام کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ اس لئے میں نہ مٹاؤں تو کیا حرج ہے۔ بہر حال سب سے بڑی دلیل جو مخالفینِ حدیث کی طرف سے حدیثوں کی بنیاد کو متزلزل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنے گوناگوں احتمالات سے وہ بھری ہوئی ہے۔ ۱۲

جو جاہلیت سے بالکل متصل عہد تھا اس میں نوشت و خواند، کتابت کے ساز و سامان کی بھی عرب میں بہت کمی تھی اور ایسے لوگ جو لکھنا جانتے ہوں صحابہ میں محض گنتی کے چند آدمی تھے ، ان ہی عام سطحی معلومات سے متاثر طبائع نے سمجھ لیا کہ عہد نبوت میں حدیثیں اگر کچھ لکھی بھی گئی ہوں گی تو ان کے لکھنے والے گنے چنے چند صحابی ہی ہوں گے ، حالانکہ جہانتک واقعات اور روایات کا تعلق ہے واقعہ کی صورت حال اس سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے ۔

نوشت و خواند اور اس کے جاننے والوں کے قحط و قلت کی غلط فہمیوں کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا اس کتاب میں بھی اور دوسری کتابوں میں بھی ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں ، اسی کتاب میں کسی جگہ اس کی بحث آچکی ہے ۔ غالبًا ناظرین کے دماغ میں ابھی وہ معلومات تازہ ہوں گے اس لئے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے بعض نئی روایتیں اسی سلسلہ کی پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس موقعہ پر عمومًا یہ جو سمجھ لیا گیا ہے یا اب بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت کا تعلق محض معدودے چند محدود افراد تک ہوگا ۔ معلومات سے کتنی ناواقفیت پر یہ خیال مبنی ہے ، سنئے مجمع الزوائد میں ہیثمی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے سب صحیح بخاری کے راوی ہیں ، یہ ہیثمی کے بجنسہ الفاظ اسی روایت کے راویوں کے متعلق ہیں ۔ بہر حال عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کی یہ روایت ہے ، میں بجنسہ ان کے الفاظ ہی نقل کر دیتا ہوں :

قَالَ كَانَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَاَنَا مَعَهُمْ وَاَنَا اَصْغَرُ الْقَوْمِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ فَلَمَّا خَرَجَ الْقَوْمُ قُلْتُ كَيْفَ	عبد اللہ بن عمرو بن عاص صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آپ کے صحابیوں میں سے کچھ حضرات تھے ، میں بھی ان ہی میں تھا اور ان سب سے عمر میں چھوٹا میں ہی تھا (اسی مجلس میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان بوجھ کر جو میری طرف جھوٹ کو منسوب کر کے بیان کرتا ہے اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے ۔

يُحَدِّثُونَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ سَمِعْتُمْ مَا قَالَ وَأَنْتُمْ تَنْهَمِكُونَ فِي الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَحِكُوا وَقَالُوا يَا ابْنَ أَخِينَا إِنَّ كُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا فِي كِتَابٍ۔

(رواہ الطبرانی (مجمع الزوائد)

(عبداللہ کہتے ہیں کہ) مجلس مبارک سے لوگ جب باہر نکل آئے تو میں نے کہا کہ آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے باتیں بیان کرتے ہیں ایسا کیوں کرتے ہیں جب رسول اللہ سے سن چکے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا فرمایا حالانکہ آپ لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کرکرکے باتیں بکثرت بیان کرتے ہیں؟ (عبداللہ کہتے ہیں کہ) میری بات سن کر (سننے والے صحابہ) ہنسنے لگے اور بولے کہ میرے بھائی کے بیٹے! ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا ہے وہ سب کتاب میں ہے یعنی نوشتہ اور لکھا ہوا ہے۔

مذکورہ بالا روایت کے الفاظ ہی میں نے پیش کردیئے ہیں، کیا اس سے حسب ذیل نتائج نہیں پیدا ہوتے؟

۱. یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب عبداللہ بن عمرو بن العاص کمسن[1] تھے۔

۲. عبداللہ بن عمرو کی کمسنی کے زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو صحابہ لکھ لیا کرتے تھے۔ کُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا فِي كِتَابٍ میں کُلّ کا لفظ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔

پس اگر یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنی ہوئی بات کو ایک دو آدمی نہیں بلکہ عموماً سننے والے لکھ لیا کرتے تھے اور ان کے اس "طریقہ کار" کو اسی حال پر چھوڑ دیا جاتا تو مذہب کے ساتھ انسانی نفسیات کا جو تعلق ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ بالآخر اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ غور کرنا چاہئے کہ ان نتائج میں جو ان حدیثوں سے پیدا ہوتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ عام کی راہ سے مسلمانوں میں جن چیزوں کی اشاعت فرما رہے تھے ان دونوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں کیا کوئی فرق باقی رہ سکتا تھا؟

---

[1] اگرچہ بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے کہ اپنے باپ عمرو بن العاص سے پہلے بیعت اسلام کے شرف سے مشرف ہونے کا موقعہ ان کو ملا لیکن پھر بھی ان کی عمر کا حساب کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد یہ مدینہ منورہ ہی پہنچ کر مسلمان ہوئے ہیں ۱۲

میں تو سمجھتا ہوں صحیح مسلم کی یہ حدیث یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلانِ عام فرمایا کہ قرآن کے سوا لوگوں نے مجھ سے جو حدیثیں لکھی ہیں ان کو ضائع اور محو کر دیں، یہ حکم یکایک نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس حال سے واقف ہونے کے بعد یعنی آپ سے ہر سنی ہوئی بات لکھی جارہی ہے اس کی خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو اسی کے ردعمل کے لئے ضروری خیال کیا گیا کہ عام طور پر حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو روک دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اگر مسند احمد کی اس روایت کو ملا لیا جائے جسے اس وقت میں مجمع الزوائد سے نقل کرتا ہوں، روایت یہ ہے:۔

كُنَّا نَكْتُبُ مَا نَسْمَعُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ مَاهٰذَا! تَكْتُبُوْنَ فَقُلْنَا مَا نَسْمَعُ مِنْكَ فَقَالَ اَكِتَابٌ مَعَ كِتَابِ اللهِ اِمْحَضُوْا كِتَابَ اللهِ وَاَخْلِصُوْهُ قَالَ فَجَمَعْنَا مَا كَتَبْنَاهُ فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ ثُمَّ اَحْرَقْنَاهُ۔	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے تب ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو، ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اسی کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب (یعنی ایسا نہ کرنا چاہئے، پھر فرمایا) ستھری کر دو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اس کو پاک رکھو (صحابی کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ممانعت ہی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا تھا سب کو لوگوں نے ایک ہی جگہ پر لا کر جمع کیا اور آگ لگا کر اس کو ضائع کر دیا بلکہ اسی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ

اَكِتَابٌ مَعَ كِتَابِ اللهِ اِمْحَضُوْا كِتَابَ اللهِ وَاَخْلِصُوْهُ۔	کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ ستھری کر دو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے پاک کر دو اس کو۔

ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا جو بالآخر ان مکتوبہ حدیثوں کا انجام آئندہ زمانہ میں چل کر ہو سکتا تھا یعنی وہی بات کہ جن امور کی عام اشاعت مقصود نہیں ہے اگر نبوت ہی کے عہد میں اس

کثرت سے ان کے مکتوبہ مجموعے تیار ہوجائیں گے تو بتدریج ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام ونتائج میں اور قرآنی آیات سے پیدا ہونے والے احکام ونتائج میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا انسانی فطرت اور اس فطرت کے خصوصیات پر جس کی نظر ہے وہ بھی بآسانی اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، پھر پیغمبر کی نظر تو پیغمبر ہی کی نظر تھی جن سے زیادہ بنی آدم کی فطرت کا پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے باقی یہ کہنا جیسا کہ بعضوں نے حدیثوں کی کتابت کی ممانعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں اور حدیثوں میں خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کر دی مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہر لکھی ہوئی چیز کو صحابہ یا ان کے بعد مسلمان قرآن کیوں سمجھ لیتے۔ آخر جس وقت قرآن نازل ہو ہو کر لکھا جا رہا تھا اسی زمانہ میں تورات وانجیل کے بیسیوں نسخے عرب ہی میں موجود تھے، ان سے اختلاط کا شبہ کیوں نہ ہوا نہ صرف توراۃ وانجیل بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ عرب ہی میں لقمان کا مجلہ بھی مکتوبہ شکل میں پایا جاتا تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں خطوط لکھوائے اور لکھواتے رہتے تھے بس یہ سمجھ لینا کہ محض مکتوب ہو جانے کی وجہ سے لوگ غیر قرآنی چیزوں کو قرآن سمجھ لیتے، کم از کم میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ان دو چیزوں میں یعنی عمومی اشاعت جن چیزوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے ان میں اور جن چیزوں کے متعلق اشاعتِ عام کا یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا جاتا تھا ان دونوں کے نتائج واحکام میں فرق پیدا کرنے کی یہی صورت تھی مگر لوگوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیا تھا یعنی جیسے نازل ہونے کے ساتھ قرآن لکھ لیا جاتا تھا اسی طرح سننے کے ساتھ حدیثوں کو بھی لکھنے لگے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت فرما دی، گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلامی دین کے ان دونوں سرچشموں میں اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج واحکام کے مطالبہ کی قوت وضعف کا جو فرق آج سارے جہان کے مسلمانوں کا مانا ہوا اور مسلمہ مسئلہ ہے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش میں یہ پہلا تاریخی اقدام تھا جو نبوت ہی کے عہد میں خود

بارگاہِ رسالت کی طرف سے اختیار کیا گیا۔ واقعہ کی جو اصل صورت ہے وہ تو یہی تھی باقی اس زمانے کے قیل شناسوں کا ایک گروہ اسی قسم کی روایتوں سے جو نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاءِ مبارک یہ تھا کہ آپ کی حدیثوں سے مسلمان اپنی دینی زندگی سے مستفید نہ ہوں، اسی لئے لکھنے والوں کو حدیثوں کے لکھنے سے روک دیا گیا تھا اور جو لکھ چکے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ ان مکتوبہ حدیثوں کو ضائع کردیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ بدبختوں کی اس ٹولی نے تیرہ سو سال بعد ان روایتوں سے آخر یہ نتیجہ کیسے پیدا کرلیا۔ دور کیوں جائیے اسی روایت میں جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کی تعمیل میں صحابہ نے اپنے لکھے ہوئے مسودوں کو نذر آتش کردیا، اس کے آخر میں ہے کہ

فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَنَتَحَدَّثُ عَنْكَ قَالَ تَحَدَّثُوْا عَنِّيْ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔	تب ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ کی طرف منسوب کرکے ہم زبان سے بھی نہ بیان کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری طرف منسوب کرکے زبان سے بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جان بوجھ کر جھوٹ کو میری طرف منسوب کرکے جو بیان کرے گا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ وہ جہنم کو بنالے۔

سوال یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اگر یہی منشاء ہوتا جو کوتاہ نصیبوں کی یہ جماعت کہتی ہے تو صحابہ کے اس سوال پر کہ آپ کی حدیثیں کیا زبانی بھی لوگوں سے ہم بیان نہ کریں، ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں بجائے یہ فرمانے کے کہ "ہاں! مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے" یہ کہنا چاہئے تھا کہ "نہیں ہرگز ہرگز نہیں" بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے کی ممانعت جو اس زمانہ میں کی گئی، اگر اس کی غرض یہی تھی کہ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے استفادہ کا موقعہ نہ ملے تو بجائے اس مشہور حدیث کے جس کا آخر میں یہاں بھی تذکرہ کیا گیا ہے یعنی وہی مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جو جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کو منسوب کرے گا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) بجائے اس کے جھوٹ ہو یا سچ ہر قسم کی بات کو آپ کی طرف منسوب کرکے بیان کرنے کی ممانعت فرمادیتے بلکہ منکرین حدیث جس لب ولہجہ میں گفتگو

کر رہے ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں سے بجائے کسی فائدے کے مسلمان طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حاکم بد ہن العیاذ باللہ اگر پیغمبر کی گفتار و رفتار سیرت و کردار کے یہی نتائج تھے اور جیسا کہ ان دیوانوں کا بیان ہے کہ ان ہی خطرات کو محسوس کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں کی کتابت سے صحابہ کو روک دیا تھا، تو پھر اب میں کیا کہوں بعض روایتوں سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب کرنے کی وجہ سے حکم دیا گیا تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے اس سزا کو صرف انہی لوگوں کی حد تک محدود نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ جب پیغمبر کی باتوں سے مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچنے والا تھا، تو غلط ہی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح باتوں کو بھی منسوب کر کے بیان کرنے والوں کو اگر یہ نہیں تو کم از کم کسی نہ کسی سزا کا مستوجب قرار دینا چاہیئے تھا۔ سو سزا تو سزا مضمون کے ابتدائی اوراق میں متعدد روایتیں گزر چکی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو دوسروں تک پہنچانے والوں کو دعائیں دی گئی ہیں، آرزو کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کے چہروں کو ترو تازہ شاداب و بشاش رکھے۔

صرف یہی نہیں کہ زبانی بیان کرنے والوں کی ہمت افزائیاں مختلف الفاظ میں فرمائی گئی ہیں بلکہ جیسے مذکورہ بالا بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے قلم بند کرنے کی ممانعت کی گئی تھی؛ اسی طرح روایتوں ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ ایک سے زیادہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ اجازت ہی نہیں بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بعض صحابیوں نے کی تو آپ نے ان کو ہدایت کی کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو (ترمذی) بعضوں میں یہ بھی ہے کہ قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابِ[1] (علم کو لکھ کر مقید کرو) اور میں تو کہتا ہوں کہ کتابت کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں کے متعلق تو کچھ گفتگو کی سنداً گنجائش بھی ہے، لیکن صحیح حدیثوں سے جب یہ

---

[1] پہلی روایت ترمذی کی ہے لیکن روایت کی صحت پر ترمذی نے شبہ کا اظہار کیا ہے۔ دوسری روایت کا ذکر ابن عبدالبر نے اپنی مسلسل سند کے ساتھ کیا ہے بظاہر اس روایت کی سند میں کوئی قابل اعتراض راوی نہیں معلوم ہوتا۔ (دیکھو جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۲)

ثابت ہے کہ حدیثوں کے بھول جانے کی شکایت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابیوں نے کی تو بعض دعائی تدبیروں سے ان کے حافظہ کو قوی کر دیا گیا[1] سوال یہ ہے کہ جب یہی مقصود تھا کہ کسی طرح امت میں آپ کی حدیثوں کا ذکر نہ پہنچنے پائے۔ لکھنے سے ممانعت کی بھی یہی غرض اگر تھی تو ان صاحب کے حافظہ کو بجائے قوی کرنے کے چاہئے تھا کہ اور کمزور کر دیا جاتا تاکہ کوئی بات ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کو یاد نہ رہتی، خود بخود روایتوں کی منتقلی کا دروازہ اس تدبیر سے بند ہو جاتا۔

کتابتِ حدیث کی روایات و دلائل

یہ کتنی بڑی علمی خیانت ہے کہ حدیثوں کو مضمحل کرنے کے لئے تو اس زمانے کے بے باکوں کا طبقہ انتہائی فراخ دلی سے کام لیتا ہے، کمزور سی کمزور روایت سے ان کا کام چلتا ہو تو اس کے پیش کرنے سے وہ نہیں چوکتا اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ روایتوں کے متعلق بے اعتباری پھیلانے کے لئے لوگوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں پر جو بہر حال روایتیں ہی ہیں ان پر اعتماد کیا جائے اس غیر منطقی طرزِ عمل کی وہی بتائیں کہ کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دیانت و امانت کا اقتضا تو یہ تھا کہ جب روایتوں ہی سے کام لیا جا رہا ہے تو ساری روایتوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی آخر یہ بھی کوئی صحیح تحقیق و تلاش کا طریقہ ہوا کہ پہلے ایک نصب العین طے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد روایتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مفروضہ نصب العین کی تائید جن روایتوں سے ہوتی ہو اُن کو تو اُچھال اُچھال کر آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے اور جن سے اس طے شدہ نصب العین پر زد پڑتی ہو اُن سے گزرنے والے آنکھیں میچ میچ کر گزر جاتے ہیں آخر اسی قصہ میں دیکھئے حدیثوں کے لکھنے کی پیغمبر نے ممانعت کر دی تھی۔ اس کا ذکر تو بڑے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن جن روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر ہی نے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ان کے ذکر سے خاموشی

---

[1] میرا اشارہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں انھوں نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضور ہی کے حکم سے میں نے چادر بچھائی پھر اس کو سینے سے لگایا جس کے بعد بھولنے کی کمزوری کا مجھ سے ازالہ ہو گیا یہ روایت صحاح کی عام کتابوں اور بخاری وغیرہ میں پائی جاتی ہے ۱۲

اختیار کر لی جاتی ہے حالانکہ سنداً دونوں قسم کی روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تفاوت نہیں ہے بلکہ اگر اسناد کا صحیح علم ان مسکینوں کو ہوتا تو شاید وہ اجازت والی روایتوں کو ممانعت کی روایتوں سے زیادہ قوی پا سکتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اجازت دی گئی اور بعد کو ممانعت کی گئی کیوں کہ اجازت کی روایتوں میں بعض روایتوں کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے، یعنی آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس میں جو خطبہ ارشاد ہوا گزر چکا کہ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُكْتُبُوا لِاَبِي شَاهٍ ابو شاہ کے لئے خطبہ کو لکھ دو۔

بہر حال ساری روایتوں کے جمع کرنے سے واقعہ کی صحیح شکل میرے سامنے تو یہی آتی ہے کہ ابتداء میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھنا شروع کیا، اور لکھنے میں اتنے مبالغہ سے کام لینا شروع کیا کہ جو کچھ سنتے تھے سب ہی کو لکھ لیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص نے اس وقت جب ان کا شمار اصغر القوم میں تھا یعنی صحابیوں میں سب سے چھوٹے تھے انھوں نے صحابیوں کو اسی حال میں پایا تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ صورت حال ایسی تھی کہ اس کی اگر خبر نہ لی جاتی تو جن روایتوں میں عمومیت اور استفاضہ کا رنگ پیدا کرنا مقصود نہ تھا ان میں یقیناً یہی غیر مطلوبہ کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لازمی نتیجہ جس کا یہ تھا کہ آئندہ دین کے ان دونوں سرچشموں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا جن میں چاہا جاتا تھا اور یہی چاہئے بھی تھا کہ فرق باقی رہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ اَكِتَابٌ مَعَ كِتَابِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب کو بھی کیا وہی اہمیت دینا چاہتے ہو؟ عام صحابہ ان نتائج کا اندازہ نہ کر سکتے تھے جن پر نبوت ہی کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ اس کے بعد مَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْيَمْحُهُ (جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہے اس کو محو کر دے یعنی مٹا دے) کا اعلان کیا گیا اور اگر وہ روایت صحیح ہے کہ صحابہ نے اپنے مکتوبہ مجموعوں کو ایک میدان میں جمع کر کے سب کو نذر آتش کر دیا تو سمجھا جائے گا کہ اسی محو کرنے کے حکم کی یہ تعمیلی شکل تھی اور اس تدبیر سے اس خطرے کا ازالہ ہو گیا جو عہد نبوت میں حدیثوں کی مختلف

کتابوں اور مجموعوں کے تیار ہونے سے پیدا ہو سکتا تھا اور یوں عمومی طور پر حدیثوں کے لکھنے کا رواج صحابہ میں جو پھیل گیا تھا وہ مسدود ہو گیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث کی ممانعت کے اس عام اعلان سے اس خطرے کا تو دروازہ بند ہو گیا مگر احساسات کے جن نازک تاثرات کا تجربہ آدمی کی فطرت کے متعلق ہوتا رہتا ہے پھر وہی تجربہ سامنے آیا۔ گویا خطرے کے ازالہ کی اسی شکل نے ایک دوسرے خطرے کے سوراخ کو پیدا کر دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہی عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنھوں نے بیان کیا تھا کہ ان صحابیوں نے جن میں سب سے میں چھوٹا اور کم سن تھا انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میرے بھائی کے بچے! ہم جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے ہیں وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے عرض کیا تھا کہ یہی صورت حال اس زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی جس کا انسداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث کی ممانعت سے فرمانا چاہا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اپنے بڑوں سے جہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لوگ لکھا کرتے ہیں، وہیں کم عمری اور کم سنی کی وجہ سے وہ ممانعت کے حکم سے واقف نہ ہو سکے کیونکہ جہاں تک قرائن و قیاسات سے معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ میں ممانعت [illegible] اعلان جس وقت کیا گیا تھا عبداللہ ابن عمرو اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ہجرت کے وقت بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین ہی سال کے تھے۔ لیکن مان لیجئے کہ وہی روایت صحیح ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جس سال مدینہ تشریف لائے ہیں عبداللہ کی عمر سات سال کی تھی، ہجرت کے کچھ ہی دن بعد یہ اپنے والد عمرو بن عاص سے پہلے ہی مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے تھے شاید اس وقت یہ آٹھ نو سال کے ہوں گے اس عمر کے بچوں کا ایسے اعلانوں سے ناواقف رہ جانا کچھ تعجب نہیں ہے، یا مان لیجئے کہ ان کو بھی کتابتِ حدیث کی ممانعت کا علم ہو چکا تھا۔ مگر انہوں نے خود سمجھ لیا، یا جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے پر ان کو معلوم ہوا کہ ممانعت کا تعلق عمومی رواج سے ہے،

یہ مقصد نہیں ہے کہ بالکلیہ قطعی طور پر حدیثوں کا لکھنا گناہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ کچھ بھی ہوا ہو، ہوا یہ کہ جب عبداللہ سن رشد کو پہنچے اور نوعمری میں مدینہ منورہ آجانے کی وجہ سے ان کو نوشت وخواند میں مہارت حاصل کرنے کا کافی موقعہ مل گیا، کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان بچوں کی نوشت وخواند کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ تھی. قیدیوں تک کا فدیہ یہ مقرر کر دیا تھا کہ مدینہ کے دس بچوں کو جو لکھنا سکھادے گا، آزاد کر دیا جائے گا۔ بہر حال حضرت عبداللہ بن عمرو نے صرف یہی نہیں کہ عربی خط میں کمال پیدا کیا بلکہ مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سریانی اور عبرانی زبان اور ان زبانوں کے خطوط کے سیکھ لینے کا جو موقعہ میسر آگیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ایک سے زائد آدمیوں سے ابن سعد وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو سریانی زبان جانتے تھے اور اس زبان کی کتابیں پڑھا کرتے تھے. حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے یعنی انہوں نے دیکھا کہ میرے ایک ہاتھ میں شہد ہے اور دوسرے میں گھی ہے (کبھی میں اس ہاتھ کو چاٹتا ہوں اور کبھی اس کو۔ اس خواب کا وہی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو تعبیر بتاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تَقْرَأُ الْكِتَابَيْنِ التَّوْرَاةَ وَالْقُرْآنَ (ج ۱۳ ص ۱۱۲) تم دونوں کتابیں یعنی تورات وقرآن کو پڑھو گے۔

راوی نے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ وَكَانَ يَقْرَأُهُمَا (یعنی یہ واقعہ بھی تھا کہ عبداللہ دونوں کتابیں پڑھا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تورات وغیرہ کے پڑھنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر پیدا کر چکے تھے[1]۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ نوجوانی

[1] بعضوں کا خیال ہے کہ عہدِ فاروقی کے فتوحات کے بعد شام ومصر پہنچنے کے بعد عبداللہ بن عمرو نے سریانی وعبرانی زبانیں سیکھی تھیں لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ مدینہ منورہ ہی میں ان چیزوں کا سیکھ لینا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے آخر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیوں کے بیت المدارس میں ان کے خط اور زبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے کیا نہیں سیکھا تھا؟ پھر حضرت عبداللہ کے لئے کیا چیز مانع ہوسکتی تھی، باقی توراۃ وقرآن دونوں کا پڑھنا یہ بھی ان کے ساتھ مختص نہیں ہے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایک دن تورات اور ایک دن قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے (دیکھو ذہبی تذکرۃ الحفاظ) طبقات ابن سعد میں ابوالجلار الجونی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات کو ختم کرنے کا قاعدہ (باقی برصفحہ آئندہ)

کے زمانہ میں تدین، عبادات و مجاہدہ کا جوش ان کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ معلوم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کرنی پڑی لیکن آپ کے سمجھانے کے باوجود وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ جی نہیں میں اس سے زیادہ برداشت کر سکتا ہوں بعض روایتوں میں ان ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ

فَمَازِلْتُ اُنَاقِصُهٗ وَيُنَاقِصُنِيْ۔ یعنی مجھ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلسل ردو کد ہوتی رہی (آنحضرت نرمی پر اصرار کرتے تھے اور یہ اپنے اوپر زیادہ بار ڈالنا چاہتے تھے)۔ (ابن سعد ج ۴ ق ۲ ص ۱۰)

اگرچہ آخر عمر میں پچھتاتے تھے اور کہتے تھے کہ بڑھاپے میں اب پتہ چلا کہ میرے لئے کیا اچھا ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کو مان لیتا، خیر یہ تو تمہیدی قصہ تھا، اب اصل واقعہ کو سنئے۔

اصل واقعہ تو صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو یہ لکھا کرتے تھے ان کے اس لکھنے کا ذکر بخاری میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کیا گیا ہے جس کا تذکرہ گزر چکا ہے یعنی ابوہریرہ کہا کرتے تھے۔

كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ (عبداللہ بن عمرو بن عاص صحابی) لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

مگر پیش نظر اس وقت صرف ان کے لکھنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اسی قصہ سے ایک اور بات جو معلوم ہوتی ہے زیادہ تر میں لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ ان کے لکھنے کے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) انھوں نے مقرر کر لیا تھا اور لوگوں کو ختم کے دن جمع کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے (ابن سعد ج قسم ا ص ۱۶۲)۔ باقی طبرانی وغیرہ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کے متعلق جو یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ تورات کا ایک مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے اور عرض کرنے لگے کہ بنی زریق میں مجھے اپنے ایک بھائی سے یہ مجموعہ ملا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غضبناک ہو گیا، حضرت عمرؓ کو جب اس کا احساس ہوا تو معافی مانگنے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ رہتے تو بجز میری پیروی کے ان کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ جمع الفوائد میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ابوعامر قاسم بن محمد الاسدی ایک شخص ہے دراصل یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے نیز یہ ممکن ہے اس یہودی کو بھائی قرار دینے پر عتاب کیا گیا ہو نیز اور بھی اسباب اس کے ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ جانتے ہوئے کہ تورات کا نسخہ بہت کچھ محرف ہو چکا ہے پھر قرآن پڑھنے والے کو اسی محرف تورات کی تلاوت کی جو اجازت دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محرف تورات کا مصحح تو اس کے پاس موجود ہی تھا یعنی قرآن۔ اور قرآن کو مصحح بنا کر جو بھی تورات کو پڑھے گا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ گمراہی میں مبتلا ہو بلکہ کچھ فائدہ ہی حاصل کرے گا ۱۲

اس قصہ کا ذکر علاوہ بخاری کے مختلف کتابوں میں خود ان کے حوالہ سے بھی اور دوسروں کے حوالہ سے پایا جاتا ہے اس وقت آپ کے سامنے ان تمام روایتوں میں سے سنن ابوداؤد جو ظاہر ہے صحاح میں شمار ہوتی ہے اور ابن سعد یا جامع ابن عبدالبر وغیرہ کی روایتوں پر اس روایت کو ترجیح حاصل ہونی چاہئے۔ بہرحال ابوداؤد کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ خود عبداللہ بن عمرو بیان کرتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنا کرتا تھا اسے لکھتا جاتا تھا، کہتے ہیں میرے اس طرزِ عمل کی خبر جب قریش کو ہوئی، بظاہر اس لفظ سے اشارہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرف کیا، کیونکہ وہ خود قریشی تھے، یہ پتہ نہ چلا کہ یہ کون صاحب تھے، کوئی بھی ہوں لیکن تھے قریشی، عبداللہ کہتے ہیں کہ جب ان کو اس کی خبر ہوئی کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر بات کو لکھ لیا کرتا ہوں تو انہوں نے مجھے منع کیا۔ بس ان ہی الفاظ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ منع کرتے ہوئے ان ہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ

تَکْتُبُ کُلَّ شَیْءٍ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ یَتَکَلَّمُ فِی الرِّضَاءِ وَالْغَضَبِ۔	تم ہر چیز کو (جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو) لکھ لیا کرتے ہو، رسول اللہ آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی۔

گو حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ حدیث اور اس حدیث کے الفاظ عام طور پر مشہور ہیں عموماً لوگ سنتے پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ ذرا ٹھہرنے اور سوچنے کا مقام تھا۔

پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ جن قریشی صاحب نے عبداللہ کو ٹوکا تھا اگر حضرت عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد لکھ رہے تھے تو ان کے ٹوکنے پر بآسانی جواب دے سکتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے بجائے اس کے ان کا خاموش ہو جانا، بلکہ آگے جو الفاظ ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ فامسکت (یعنی ٹوکنے پر عبداللہ کہتے ہیں کہ میں لکھنے سے رک گیا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا حالانکہ اگر پہلے سے

اجازت یافتہ ہوتے تو اس کی بھی ضرورت نہ تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کسی وجہ سے کتابتِ حدیث کی ممانعت کی خبر نہ پہنچ سکی تھی۔ اب اس میں ان کی کمسنی کو دخل ہو یا کوئی اور وجہ ہو، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کمسنی کے زمانہ میں جب وہ اصغر القوم تھے، اپنے سے بڑی عمر والے صحابیوں سے ان کو یہ خبر ملی تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ سنتے ہیں اُسے لکھ لیتے ہیں۔ خود اسی خیال میں رہے بلکہ ان کی طبیعت کا جو انداز تھا خصوصاً عنفوانِ شباب میں دین کا نشہ ان پر جو چڑھ گیا تھا خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اتارنے سے بھی جو نہیں اترتا تھا۔[1] میں جب اس کو سوچتا ہوں تو خیال گزرتا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کے جوش میں بھی کہیں اس خبر کو دخل نہ ہو، جو اپنے بڑوں سے انھوں نے سنی تھی، یعنی ان کو یہی خیال آیا ہو کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھا کرتے ہیں تو میں بھی کیوں لکھنا سیکھ کر اس سعادت کا حصہ دار نہ بن جاؤں۔ بلکہ اسی روایت کے بعض طریقوں میں یہ لفظ بھی بڑھا ہوا جو ملتا ہے یعنی عبداللہ کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس لئے لکھا کرتا تھا تاکہ ان کو زبانی یاد کرلوں یعنی کہتے تھے کہ "ارید حفظہ" (مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۲) اس سے ان کی بلند ہمتی اور شدتِ ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ ان بزرگوں میں یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ ہم لوگ جو کچھ لکھتے ہیں اسے زبانی

---

[1] عام کتابوں میں تو صرف اسی قدر ہے کہ رات کی شب بیداری، دن کے روزوں اور تلاوت قرآن ہی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے تھے کہ اتنا زیادہ بار اپنے اوپر نہ ڈالا کرو، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے لیکن وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ یا رسول اللہ میری جوانی کا زمانہ ہے شباب کی قوت ہے میں سب برداشت کرلوں گا لیکن بعض روایتوں میں خصوصاً مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ مدینہ پہنچ کر جب یہ جوان ہوئے تو ان کے والد عمرو بن عاص نے ایک اونچے گھرانے کی خاتون جو قریش خاندان کی تھیں ان سے نکاح کر دیا۔ تین چار دن بعد عمرو بن عاص ان کے والد دلہن کے کمرے میں گئے پوچھا کہ اپنے دولہے کو تم نے کیسا پایا۔ ممکن ہے عمرو بن عاص کو بیٹے کے طرزِ عمل سے شبہ ہوا ہو اسی لئے خود دلہن سے جاکر پوچھا بے چاری نے کہا کہ بڑے اچھے شوہر ہیں آج تک اس کی خبر نہ لی کہ میں کہاں رہتی ہوں اور کس بستر پر سوتی ہوں۔ عمرو بن عاص کو بھی بیٹے سے یہی توقع تھی۔ باہر نکل کر جتنا کوئی باپ کسی جوان بیٹے کو کہہ سکتا ہے سب کچھ کہہ ڈالا لیکن دیکھا کہ یوں یہ لڑکا نہ مانے گا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کا حال عمرو بن عاص نے پہنچایا۔ آپ نے بلا کر ان کو سمجھانا شروع کیا۔

یاد کرتے ہیں، کچھ بھی ہو ان ہی وجوہ کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ بعض روایتوں میں اس قصہ کے بغیر صرف اتنا جو کہا گیا ہے کہ عبداللہ کہتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کے لکھنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور رضا و غضب ہر حال کی گفتگو کے قلمبند کرنے کی مجھے اجازت تھی، وہ دراصل ان کی پوری گفتگو کا اختصار ہے جو راویوں نے کر لیا ہے اور ایسا روایتوں میں بکثرت ہوتا ہے، خیر یہ سوال تو چنداں اہم نہ تھا۔ دوسرا سوال جو بہت زیادہ مستحق توجہ اور محلِ غور ہے، وہ ان کے بیان کا یہ حصہ ہے یعنی قریش کے بزرگ نے کتابتِ حدیث سے منع کرتے ہوئے آگے جو یہ الفاظ بڑھائے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی ہیں آپ غصہ کی حالت میں بھی بولتے ہیں اور خوشی کی حالت میں بھی بولتے ہیں۔"

ان الفاظ سے بزرگ قریش کی غرض کیا تھی؟

عمومی طور پر ممانعتِ تحریرِ حدیث کا راز

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی جو وہ کہہ رہے تھے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی عام کتابت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی طور پر ممانعت کا جو اعلان فرمایا تو قدرتاً دلوں میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ کیوں منع کیا جا رہا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ممانعت کی اسی تقریر کے الفاظ "اَکِتَابٌ مَعَ کِتَابِ اللّٰہِ امْحَضُوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَاَخْلِصُوْہُ" سے چاہئے تو یہی تھا کہ منشاءِ نبوت کو لوگ تاڑ لیتے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے کہ عمومی اشاعت کے رنگ میں ایک نسل سے دوسری نسل تک مسلمانوں میں کوئی کتاب، اللہ کی کتاب کے سوا بھی منتقل ہو لیکن طبائع ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے باوجود بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاءِ مبارک کو بعض لوگ نہ پا سکے اور بعض لوگ پا گئے۔ مشہور روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ احقاب میں تشریف فرما تھے اتنے میں ایک نو عمر نوجوان آدمی آیا اور آ کر اس نے یہ مسئلہ پوچھا کہ روزے کی حالت میں

اپنی بیوی کا بوسہ کیا آدمی لے سکتا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، وہ سن کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک کہن سال معمر آدمی آئے اور بجنسہٖ اسی سوال کو آنحضرت ؐ کی خدمت میں پیش کیا، ان کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ ہاں! لے سکتا ہے۔ ایک ہی مجلس میں ایک ہی سوال کے قطعاً منفی و مثبت دو جواب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تو صحابہ ہی کا بیان ہے کہ

نَظَرَ بَعْضُنَا اِلٰی بَعْضٍ   ہم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مجمع کو مخاطب کرکے فرمانا شروع کیا کہ

"تم لوگ باہم ایک دوسرے کو جس وجہ سے دیکھ رہے ہو میں اس کو سمجھ رہا ہوں، بات یہ ہے کہ بوڑھا آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے" (مسند احمد ج ۲ ص ۱۸۵)

مقصد مبارک یہ تھا کہ جوانوں کو اگر اجازت دی جائے گی تو ان کے لئے خطرہ ہے آگے بڑھ جانے کا اس لئے جوان کو تو میں نے اجازت نہیں دی اور بوڑھے بیچارے کے متعلق اس کا خطرہ نہ تھا، اس لئے ان کو اجازت دے دی گئی۔

یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ مبارک تک کے پالینے میں ان حضرات میں بھی بعضوں کو دشواری پیش آجاتی تھی جو براہِ راست صحبتِ نبوت سے سرفراز تھے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے تھے، اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ آج تیرہ صدیوں کے گزر جانے کے بعد اس قسم کے لوگ جن کا لے دے کر سارا علمی سرمایہ اس راہ میں چند افواہی قصے یا ناقص معلومات والی سطحی کتابوں کے چند اوراق سے زیادہ نہیں ہیں وہ پیغمبر کے صحیح مقاصد و اغراض تک ان بزرگوں کی راہ نمائی کے بغیر پہنچنے کی اس زمانے میں جو کوشش کر رہے ہیں جنہوں نے ساری عمر اور عمر کا ایک ایک لمحہ صرف ان ہی مقاصد کے سمجھنے میں خرچ کیا ہے خود ہی سوچنا چاہئے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔[1]

[1] جس وقت قلم سے یہ الفاظ نکل رہے تھے آج سے تیس اکتیس سال پہلے کا ایک نقشہ دماغ کے سامنے آگیا۔ خاکسار، سیدنا الامام العارف باللہ شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقۂ درس میں بمقام دارالعلوم دیوبند ایک ادنیٰ ترین طالب العلم کی حیثیت سے شریک تھا، ایک مسئلہ پر جو شوافع واحناف کے درمیان اختلافی ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

اسی مسئلہ میں دیکھئے حدیث کی عام کتابت کا جو رواج بڑھتا جارہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی ممانعت کا اعلان فرمایا جاتا ہے اور اعلان بھی ایسے الفاظ میں کیا جاتا ہے جن سے سمجھنے والے چاہتے تو ممانعت کی وجہ کو بھی سمجھ سکتے تھے اور یقیناً اکثر حضرات صحابہ نے اس کو سمجھ بھی لیا ہوگا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت عبداللہ کے ٹوکنے والے یہ بزرگ قریش، ان کا ذہن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوگیا۔ گویا جیسے اس زمانہ میں اسی قسم کی روایتیں جن میں عام حدیثوں کی عمومی اشاعت کی حد بندی کی ان تدبیروں کی خبر دی گئی ہے جو عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں اختیار کی گئی تھیں لیکن ایک طبقہ ہے جس کے کسی ایک فرد نے ابتداء میں ادھر اُدھر سے اسی قسم کی چند روایتوں کو جمع کرکے پھیلا دیا ہے اور تقریباً چالیس پچاس سال سے خصوصاً ہندوستان میں رٹنے والے ان ہی روایتوں کو رٹتے چلے جاتے ہیں اور ان ہی کو پیش کر کر کے مسلمانوں کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ قرآن کے سوا دین کا سارا سرمایہ جو تیرہ سو سالوں میں اب تک جمع ہوا ہے قطعی طور پر مسترد کر دینے کے قابل ہے۔

ظاہر ہے کہ صحابی بہرحال صحابی تھے وہ حقیقت سے اگر کچھ دور بھی ہوئے تھے تو اتنا دور کیسے ہوسکتے تھے جتنا اس زمانے کے بے بصروں اور بے باکوں کا یہ گروہ خود دور ہوچکا ہے، اور دوسروں کو دور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے جیسا کہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، شاید وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت حالتِ رضا اور عام معمولی حالت میں رہتے ہیں اس وقت تو آپ کی گفتار و رفتار غلطیوں سے پاک ہوتی ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے وہ نمونہ بن سکتی ہے لیکن آپ کو بشر قرار دیتے ہوئے ان کو یہ خیال گزرا کہ غصہ کی غیر معمولی حالت میں پیغمبر کی زبان سے جو چیزیں نکلتی ہیں غلطیوں سے پاک ہونے میں شاید ان کو

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) حضرت والا نے تقریر شروع کی جس میں بار بار اسی اصول کو دہراتے جاتے تھے کہ ہر شخص کا مذاق شناسِ نبوت ہونا ضروری نہیں ہے۔ نبوت کی مذاق شناسی، یہ بھی مذہبی حقائق کے سمجھنے کا ایک گر ہے۔ پہلی دفعہ اسی دن کان میں یہ بات پڑی اور جیسے جیسے تجربہ بڑھتا گیا اس اصول کی اہمیت بھی دل میں بڑھتی گئی۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء ۱۲

یہ کیفیت نہیں ہے، انھوں نے شاید یہ خیال کر لیا کہ حدیثوں کی کتابت کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے، انھوں نے عبد اللہ بن عمرو کو ٹوکتے ہوئے اسی وجہ کا ذکر کیا جو اُن کی سمجھ میں آئی تھی اور گو جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا اُن کی یہ غلطی معمولی غلطی نہ تھی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، آج جب کہ حدیث کے سارے دفتر ہی کو بھسم کر دینے کا مشورہ ان ہی روایتوں سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو ہو کر دینے والے دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے یقیناً ان کی غلطی کا وزن کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

انکارِ حدیث کی نبوی پیشین گوئی

آج تو جو کچھ کہا جا رہا ہے، سچ پوچھئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مشہور پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے جو صحاح کی مختلف کتابوں میں پائی جاتی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

اَلاَ ھَلْ عَسٰی رَجُلٌ یَبْلُغُہُ الْحَدِیْثُ عَنِّیْ وَھُوَ مُتَّکِیٌٔ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ فَیَقُوْلُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ فَمَا وَجَدْنَا فِیْہِ حَلَالاً اسْتَحْلَلْنَاہُ وَمَا وَجَدْنَا فِیْہِ حَرَامًا حَرَّمْنَاہُ اَلاَ وَاِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ۔ (ابوداؤد ترمذی وغیرہ)

خبردار! قریب ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کسی شخص کو میری حدیث پہنچے گی اور وہ اپنے چھپر کھٹ یا کرسی پر بیٹھا ہے (تو میری حدیث سن کر) وہ کہے گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن ہے پس قرآن میں جن چیزوں کو ہم حلال پائیں گے ان ہی کو حلال سمجھیں گے اور جن چیزوں کو اس میں حرام پائیں گے انھیں ہم حرام سمجھیں گے (یہ کرسی نشین کی بات ہوئی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ) خبردار! مجھے کتاب یعنی قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس جیسی چیز بھی قرآن کے ساتھ دی گئی ہے۔

اور یہ سب کس بنیاد پر کیا جا رہا ہے، ممکن ہے محرکات اس کے کچھ اور ہوں لیکن استدلال میں ان ہی تحدیدی روایتوں کو پیش کرتے ہیں، جن کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ قرآن کے سوا اپنی دینی زندگی کی تعمیر میں مسلمان اور کسی چیز سے قطعاً استفادہ نہ کریں بلکہ جیسا کہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ عمومی اشاعت کی راہ سے امت میں جن چیزوں کا منتقل کرنا مقصود تھا، محض ان سے الگ کرنے کے لئے عام

حدیثوں کے متعلق یہ خاص طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ اب عمومی اشاعت کی راہ سے جو چیزیں بھی پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں تک پہنچیں گی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جس پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر مان کر قرآن پر اعتماد کیا جا رہا ہے، اسی پیغمبر کی طرف منسوب ہونے والی ان باتوں کو مسترد کر دیا جائے جو اسی تواتر و توارث کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ جس راہ سے پیغمبر کی طرف منسوب ہو کر قرآن پہنچا ہے چونکہ یہ مسئلہ "تدوینِ حدیث" سے زیادہ "تدوینِ فقہ" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی پوری بحث تو اسی کتاب میں پڑھنی چاہئے لیکن یہاں بھی میں پوچھتا ہوں کہ قرآن کے سوا تواتر و توارث کی راہوں سے جو چیزیں ہم تک پہنچی ہیں ان کو اگر مسترد کر دیا جائے گا تو قرآن کے کسی ایک مطالبہ پر بھی عمل ممکن ہے؟ میں نے خود نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا قول تدوینِ فقہ میں نقل کیا ہے کہ کوئی نماز تک نہیں پڑھ سکے گا، یہ بھی نہیں جانا جا سکتا کہ ظہر کی کتنی رکعتیں ہیں اور عصر کی کتنی؟ بلکہ یہ بھی نہیں کہ ہر رکعت میں ایک سجدہ کرنا چاہیئے یا دو، یا سجدہ ہی کیسے کرنا چاہئے اور یہی حال تقریباً سارے قرآنی مطالبات کا ہے۔

حکمِ تحریرِ حدیث اور عصمتِ نبوی ؐ

پس عام حدیثوں کی کتابت ہو یا روایت، ان کے متعلق تحدیدی روایتوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ان کے مطالبوں کی گرفت میں اتنی سختی نہ پیدا ہو، جو صرف ان ہی مطالبوں کی خصوصیت ہو سکتی ہے جن کا انتساب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر قسم کے شکوک و شبہات سے قطعاً پاک ہے لیکن سمجھنے والوں نے ان روایتوں سے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی کتاب کے سوا ان ساری چیزوں کا مسترد کرنا مقصود ہے جو پیغمبر کی طرف منسوب ہیں اور جب عہدِ نبوت میں بعضوں کو یہ غلط فہمی لگ گئی کہ رضا کے حال کی چیزیں تو صحیح ہیں لیکن غصہ کے وقت کی جو باتیں پیغمبر کے منہ سے نکلتی ہیں ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں اور اپنے اسی غلط خیال میں مبتلا ہونے کے ساتھ یہ بھی چاہا کہ دوسروں کو بھی اسی غلط خیال میں مبتلا کر دیں یعنی عبداللہ بن عمرو کو یہی سمجھاتے ہوئے حدیث کے لکھنے سے منع کر دیا۔ حضرت عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ قریش کی

بزرگی اور خوردی کا خیال کر کے اس وقت تو قلم ہاتھ سے انہوں نے رکھ دیا لیکن اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا اظہار کیا۔ کتنی شدید بنیادی غلطی میں ٹوکنے والے یہ صحابی مبتلا تھے۔ ہم کو اور آپ کو اس کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن جو دنیا کے اغلاط ہی کی تصیح کے لئے بھیجا گیا تھا، صلوات اللہ علیہ وسلامہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سننے کے ساتھ ہی آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا جس کی زندگی کا ایک ایک پہلو رہتی دنیا تک پیدا ہونے والے انسانوں مردوں اور عورتوں سب ہی کے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے، اگر اس کی زندگی کے کسی پہلو میں ایک غلطی بھی رہ جائے گی تو وہ ایک غلطی نہ ہو گی بلکہ کروڑہا کروڑ بے شمار انسانوں کی غلطی بن جائے گی۔ ان صحابی صاحب کو اس کا اندازہ نہ ہوا،

لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — تمہارے لئے رسول اللہ میں بہت اچھا نمونہ ہے۔

کا اعلان جس ذات گرامی کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت اس کی زندگی کے کسی پہلو میں کسی غلطی کو باقی رکھ سکتی ہے[1]۔ اسی لئے تو یہ طے شدہ فیصلہ سلف سے لے کر خلف تک کا ہے کہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے۔

بہر حال حضرت عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ سمع مبارک میں جس وقت میرے الفاظ پہنچے اور معلوم ہوا کہ کتابت حدیث سے روکتے ہوئے ایسی بات مجھ سے کہی گئی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ پیغمبر غصہ میں جو کچھ بولتے یا کرتے ہیں ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے، میں نے دیکھا کہ آنحضرت

---

[1] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز بانی دار العلوم دیوبند نے اس کی کتنی اچھی مثال دی ہے کہ سلوانے والا، درزی سے مثلاً قمیص سلوانا چاہتا ہے، نمونہ کے لئے تمام قمیصوں میں جو بہتر قمیص ہوتی ہے، اس کو درزی کے حوالہ کر کے ہدایت کرتا ہے کہ بس اسی نمونے پر ساری قمیصوں کو تراش کر کے سی دو۔ اب اگر فرض کیجئے کہ نمونے ہی کی اس قمیص میں کوئی سقم یا خرابی ہوگی تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ساری قمیصیں جو اس نمونے پر تراشی جائیں گی خراب ہو کر رہ جائیں گی۔ پیغمبر کو بھی خدا نمونہ بنا کر پیدا کرتا ہے۔ بندوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اپنی زندگیوں کو اسی نمونے پر ڈھالتے چلے جائیں جو جس قدر اس نمونے سے قریب تر ہوگا خدا کے نزدیک وہی سب سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ غیر ممکن ہے کہ غیر محدود طاقت و قدرت رکھتے ہوئے خدا کسی ایسے نمونے کو پیدا نہیں کر سکتا جس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ ۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں اٹھیں جن کا رُخ دہن مبارک کی طرف تھا۔ عبداللہ بن عمرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

فَاَوْمَأَ بِاِصْبَعِهٖ اِلٰى فِيْهِ — پس اشارہ کیا اپنی انگلی سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے دہنِ مبارک کی طرف۔

اور وہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی طرف سے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ عام حدیثوں کے مطالبہ کی قوت قرآنی مطالبہ کی قوت کے برابر نہ ہو جائے چند دن پہلے یہ منادی کرائی گئی تھی کہ قرآن کے سوا جس کسی نے مجھ سے (یعنی میری طرف منسوب کر کے) جو کچھ لکھا ہے چاہئے کہ اسے محو کر دے، اسی پیغمبر کو دیکھا جا رہا ہے کہ ایک دوسرے خطرے کے انسداد کے لئے عبداللہ بن عمرو کو فرما رہے ہیں :

اُكْتُبْ — تم (قرآن کے سوا بھی میری باتیں) لکھا کرو۔

اور جس خطرے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اندیشہ کیا بلکہ مبتلا ہونے والے اس خطرے میں کلی طور پر نہیں تو کم از کم غصہ کی حالت کی باتوں کے متعلق اس غلط فہمی کے شکار ہو چکے تھے کہ ان کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے، اس خطرے کا ازالہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہو رہا ہے اور کتنے تاکیدی الفاظ میں ارشاد ہو رہا ہے پہلے قسم کھائی جاتی ہے یعنی فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ (قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) فرماتے ہوئے اصل غلطی کا ازالہ ان الفاظ میں فرمایا جاتا ہے یعنی دہن مبارک کی طرف انگلیاں اٹھی ہوئی ہیں اور کہا جا رہا ہے :

لَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا الْحَقُّ۔ (ابو داؤد وغیرہ) — نہیں نکلتا ہے اس سے (یعنی دہن مبارک سے) مگر صرف سچی بات۔

نبوت کے جو مذاق شناس نہ تھے ان کو پہلے حکم میں جس کی عام منادی کی گئی تھی یعنی حدیثوں کی کتابت کی ممانعت والے حکم میں، اور آج جو عبداللہ بن عمرو کو اُكْتُبْ (لکھا کرو) کے لفظ سے ان ہی حدیثوں کے لکھنے کی جو اجازت مرحمت فرمائی جا رہی ہے دونوں میں وہی منفی و مثبت حکم والا تضاد نظر آیا

حالانکہ بات بالکل واضح تھی۔ ممانعت کے جس حکم کی منادی کی گئی تھی اس کا بالکلیہ رُخ حدیث نبوی کی عام کتابت کے رواج کے انسداد کی طرف تھا، اور لکھنے والوں نے ایک میدان میں جمع ہو کر سب کو آگ میں جو جھونک دیا تھا، اس سے اسی رواج کے دروازے پر قفل چڑھ چکا تھا اور بجائے عمومی اجازت کے ایک خاص آدمی کو رضا و غضب ہر حال کی باتوں کے لکھنے کی جو اجازت دی گئی تھی اس سے اس خطرناک غلطی پر زد لگانی مدنظر تھی جو کتابتِ حدیث کی ممانعت کے عام حکم کی وجہ سے بعض دلوں میں پیدا ہو گئی تھی یعنی باور کر لیا گیا تھا کہ بشر ہونے کی وجہ سے نبی کی ہر گفتگو کا ورنہ کم از کم غصہ کی حالت میں جو کچھ وہ بولتے ہیں اس کا خطاؤں سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے۔ ممانعت کے حکم سے بھی آئندہ پیدا ہونے والی غلطی کا انسداد ہی مقصود تھا اور اب اجازت جو دی گئی اس کی غرض بھی اسی غلطی کا ازالہ تھا جس کے پیدا ہونے کا صرف اندیشہ ہی آئندہ زمانہ میں نہ تھا بلکہ عبداللہ بن عمرو کی رپورٹ سے تو آپ کو یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا بھی ہو چکے ہیں، اس کے سوا کہ رضا و غضب دونوں حال کی گفتگو کے لکھنے کی اجازت ان کو دے دی جائے۔ خود ہی سوچا جائے کہ اس غلطی کے ازالہ کی عملی شکل اور کیا ہو سکتی تھی، چونکہ ایک واحد شخص کو انفرادی طور پر لکھنے کی یہ اجازت دی گئی تھی اس لئے اس سے اس کا اندیشہ بھی نہ تھا کہ ان مکتوبہ حدیثوں میں وہی عمومی رنگ پیدا ہو جائے گا، جسے آپ صرف ان چیزوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے جن کا ہر مسلمان تک پہنچانا فرائضِ رسالت میں داخل تھا۔

اور یہ تھی پیغمبرانہ تدبیروں کی وہ داستان جن کی بدولت تیرہ سو سال سے یہ عجیب و غریب صورت مسلمانوں میں قائم ہے کہ ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو احاد یا خبر الواحد بعد الواحد یا خبر الخاصہ عن الخاصہ کی راہوں سے منتقل ہونے والی نبوی حدیثوں کے متعلق اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کے متعلق یہ خیال رکھتا ہو کہ گرفت اور مطالبہ میں ان کی قوت قرآنی مطالبوں اور دین کے ان مطالبوں کی قوت کے مساوی ہے جو قرآن ہی کی طرح نسلاً بعد نسل جیلاً بعد جیل عمومیت کی راہوں سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، اس سلسلہ میں علمائے مذہب کے جو فیصلے ہیں ان کا ذکر کر چکا ہوں مگر اس کے ساتھ ہر زمانہ میں ان بلند نظروں، عالی حوصلہ رکھنے والوں کے لئے بھی ہمیشہ اس کی راہ کھلی رہی اور

اس وقت تک کھلی ہوئی ہے، انشاء اللہ قیامت تک کھلی رہے گی جو چاہتے ہیں کہ ممکنہ حد تک پیغمبر کی زندگی اور اس زندگی کے نمونوں کے مطابق جینے کا اگر موقعہ ملے تو اس میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے[۱]۔

یہی "کج دار و مریز" ہی کی تو پیغمبرانہ حکمتِ عملی تھی اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا، آپ کے خلفاء برحق نے بھی اسی حکمت کی نگہداشت میں پورا زور صرف کر دیا اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ان شاہبازوں کی بلند پروازیوں کے لئے جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، یحببکم اللہ (خدا تم کو اپنا محبوب بنالے گا) کا اعلان قرآن میں ہر اس شخص کے لئے کر دیا گیا تھا جو پیغمبر کے نقش قدم پر قدم رکھتا ہوا جہاں تک بڑھ سکتا ہو، بڑھتا چلا جائے پھر بڑھنے والے بڑھتے چلے گئے اور جن حدیثوں کا ہر شخص تک پہنچانا مقصود نہ تھا، ان کی روشنی ان لوگوں تک پہنچتی رہی جو دین کے اسی نفلی حصہ[۲] سے اس مقام تک پہنچتے رہے جس کے متعلق یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ پہنچنے کے بعد جو بندہ اور مخلوق ہے وہ عروج اور ارتقاء کی اس کیفیت کو پاتا ہے جس کی تعبیر خالق ہی کے الفاظ میں یہ سنائی گئی ہے کہ

كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدُهُ الَّذِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا (صحاح بخاری وغیرہ)	میں اس بندے کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بینائی جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ "طبیعت ہی جن کی ادھر نہیں آتی" یہ خیر بجائے خود ان غریبوں کی مستقل بدبختی ہے مگر سوچئے تو سہی کہ ان حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ میں عمومیت کی

---

[۱] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ عمر بھر خربزہ آپ نے اس لئے نہیں کھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس کو کھاتے تھے اس کی ان کو تحقیق نہ ہو سکی ۱۲۔

[۲] میرا اشارہ اس مشہور روایت کی طرف ہے جس میں آیا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ "بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا ہے ہوتا چلا جاتا ہے تا اینکہ میں اس بندے کو چاہنے لگتا ہوں"۔ اسی کے بعد اس حدیث قدسی میں وہ بشارت سنائی گئی ہے جسے میں نے بجنسہ عربی الفاظ میں درج کر دیا ہے۔ ۱۲

کیفیت پیدا کرنے کے اگر ان کے مطالبوں کو بھی ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کر کے اسی طرح قطعی اور یقینی بن جانے کا موقعہ دے دیا جاتا، جیسے دین ہی کے ایک شعبہ میں اسی رنگ کو پیدا کیا گیا ہے تو ع۔ "پر طبیعت ادھر نہیں آتی" کی معذرت کو معصیت بلکہ تمرد و بغاوت بن جانے سے کون روک سکتا تھا، آج تو ان کی یہ معذرت اسی لئے معذرت ہے کہ جن چیزوں کی طرف ان کی طبیعت نہیں جاتی، ان کے مطالبہ میں اتنی قوت ہی نہیں ہے جو معذرت کو معصیت اور بغاوت بنا دیتی ہے اور کیا اس طول کلامی کے بعد بھی مزید ضرورت اس کی باقی رہ گئی ہے کہ میں لوگوں کو پھر یہ سمجھاؤں کہ یہ سارا کرشمہ اسی تج دلدوز مریز کی حکمتِ عملی اور ان نازک تدبیروں کا نتیجہ ہے جن کے حدود کی پوری پوری نگرانی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں نے فرمائی۔

بہر حال عبداللہ بن عمرؓو ایک خوش قسمت آدمی تھے، اگر ٹوکنے والے صاحب ان کو مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ نہ ٹوکتے، بلکہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ میاں! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو لکھتے ہو، کیا اس کا علم تمہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اتنی سی سیدھی سادی صاف بات وہ کہہ دیتے اور ان کے دماغ نے پیغمبر کے حکم کا جو فلسفہ پیدا کیا تھا یعنی بشری اغلاط کی گنجائش، انہوں نے یہ باور کرلیا تھا کہ اس حکم کے دینے کی یہی وجہ ہے۔ قریشی صاحب اپنے اس خود تراشیدہ فلسفہ کا اگر ذکر نہ کرتے تو عبداللہ کو اتفاقاً جس سعادت سے بہرہ اندوزی کا موقعہ مل گیا، شاید نہ ملتا۔ گویا اس فلسفہ کے شر سے خیر کا ایک پہلو یہ پیدا ہوگیا، اور یہی کیا اگر اس زمانہ میں پیدا ہو کر اس فلسفہ کی بنیاد ہی کے کھودینے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ نہ مل جاتا تو صرف قرآن کی ایسی آیتوں سے مثلاً

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔	پیغمبر نہیں بولتے "الہوی" (یعنی اپنی ذاتی خواہش سے)، نہیں ہے وہ (یعنی پیغمبر کا بول)، مگر وحی جس کی وحی ان پر کی جاتی ہے۔

وغیرہ سے مغالطہ کی ان گتھیوں کا سلجھانا کیا آسان تھا جن میں دعویٰ اسلام کے باوجود اس زمانے

ہیں حدیثوں کی ان ہی تحدیدی روایتوں کی بنیاد پر لوگ الجھ الجھ کر بھڑ بھڑا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا تعلق بھی صرف قرآن سے ہے اسی لئے وہ پیغمبر کو صرف قرآن کی حد تک پیغمبر مانتے ہیں۔ قرآن سے الگ کر لینے کے بعد العیاذ باللہ پیغمبر کی زندگی میں اور جو پیغمبر نہیں ہیں ان کی زندگی میں ان برگشتہ باد آنکھوں کے نزدیک کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے، مگر بحمد اللہ اس فلسفہ کے شر نے ایک ایسے خیر کو پیدا کیا جس نے ثابت کر دیا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیت کا واقعی مطلب بھی وہی ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے سمجھا جا رہا ہے یعنی قرآن ہی نہیں بلکہ نطق اور گفتگو جو بھی پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے اس کا قطعاً الھویٰ (پیغمبر کی ذاتی خواہش) سے تعلق نہیں ہے بلکہ قرآنی نطق ہو یا غیر قرآنی نطق پیغمبر کا ہر نطق اور ان کی ہر گفتگو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے کی جاتی ہے۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اور حضرت عبداللہ کو سمجھاتے ہوئے قسم کھا کر دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے بھی اسی مفہوم کی مزید تائید اور تاکید ہو گئی، اور محقق ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی ہر حال میں اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کی زبان کا ہر بول ذاتی فکر و نظر یا خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سب وحی ہے خواہ خوشی کے حال میں بات کی گئی ہو یا غصہ کی حالت میں۔ سچ پوچھئے تو اس قرآنی نص کی بنیاد پر پیغمبر کی معصوم زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے روشنی کا مینار ہے، فرق آئندہ صرف ان ذرائع کی قوت و ضعف سے پیدا ہوتا ہے۔ جن کی راہ سے امت میں پیغمبر کی زندگی، زندگی کے آثار، گفتار و رفتار کے متعلق معلومات پہنچے ہیں، ان ہی کی قوت و ضعف کے ساتھ ان احکام و نتائج کی گرفت اور مطالبوں کی قوت و ضعف کا مسئلہ وابستہ ہے جو ان معلومات سے نکلتے ہیں یا نکل سکتے ہیں۔

قرآن کو کافی سمجھنے کا مغالطہ،
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ایک خاتون کا سبق آموز واقعہ

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک خاتون صاحبہ پہنچیں اور حدیثوں میں عورتوں کو وشم یعنی گودنا گدانے سے جو منع کیا گیا ہے اس کا اور اسی قسم کی چند

باتوں کا ذکر کر کے کہنا شروع کیا:

بَلَغَنِيْ اَنَّكَ قُلْتَ ذَيْتَ وَذَيْتَ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَلَنِيْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَلَمْ اَجِدِ الَّذِيْ تَقُوْلُ۔

مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم فلاں فلاں باتیں کہتے ہو اور کہتے ہو کہ گودنا لگانے والی اور جو اپنے بدن میں گودنا لگاتی ہو (ان پر لعنت کی گئی ہے) حالانکہ میں نے قرآن کے دونوں لوحوں کے درمیان جو کچھ ہے سب کو پڑھا، اس میں تو ایسی کوئی بات نہ ملی جو تم کہتے ہو۔

+

یہ عجیب و غریب مغالطہ جس پر اس زمانے میں تحقیق کے بڑے بڑے دعوؤں والے مردوں کو شاید ناز ہے۔ اسی مغالطہ کو عرب کی ایک عورت کی زبان سے سن کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بی بی صاحبہ کو پہلے تو کہا کہ جاؤ پھر قرآن کو پڑھ کر آؤ، وہ تعمیل حکم کے بعد پھر حاضر ہوئیں اور بولیں کہ مجھے اب بھی قرآن میں وہ باتیں نہ ملیں جو تم سے مجھے پہنچی ہیں، تب ابن مسعودؓ نے ان کو سمجھایا کہ

اَمَا قَرَأْتَ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

کیا تم نے (قرآن میں) نہیں پڑھا ہے کہ جو کچھ دے تمہیں رسولؐ، تو اسے لے لیا کرو اور جس سے تم کو روکیں اس سے رک جاؤ۔

بی بی صاحبہ نے کہا کہ ہاں یہ تو میں نے قرآن میں پڑھا ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ

فَهُوَ ذَاكَ[۱]

تو بس یہی وہ بات ہے۔

چونکہ وہ سمجھنے ہی کے لئے آئی تھیں اس لئے دوسرے درپردہ محرکات کے زیر اثر اس مناظرانہ گفتگو کو اپنی کامیابی کا انھوں نے ذریعہ نہ بنایا، یعنی بندوں کو خدا نے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ پیغمبر جو کچھ دیں اور جس چیز سے روکیں اس کو مان لینا چاہئے خواہ قرآن کے نام سے وہ چیز دی گئی ہو یا اس کو یہ نام نہ دیا گیا ہو۔ قرآن کو بھی ماننے والے قرآن کے دینے والے پر اعتماد ہی کی بنیاد پر تو مانتے ہیں:

---

[۱] الفاظ کے معمولی اختلاف سے اس روایت کا صحاح کی مختلف کتابوں میں ذکر پایا جاتا ہے، نیز مسند احمد میں بھی ہے۔ ۱۲

اس لحاظ سے قرآنی اور غیر قرآنی مطالبات میں خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا فرق ہے۔ ہاں پیغمبر کی عطا کی ہوئی چیزوں میں امتیاز درحقیقت ان راہوں کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جن سے گزر کر امت تک وہ چیزیں پہنچی ہیں، اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ توارث و تواتر کی عمومیت عامہ کی راہ سے جو چیزیں پہنچی ہیں خود ان کی اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی قوت مطالبہ اور گرفت میں ایک ہوگی خواہ قرآن کے نام سے وہ پہنچی ہوں یا یہ نام ان کو نہ دیا گیا ہو، بلکہ اس راہ سے ان چیزوں کا پہنچنا یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک سے چونکہ ان کا مطالبہ مقصود تھا اسی لئے ان کے پہنچانے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ پیغمبر کی طرف ان کے انتساب میں قطعاً کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، بخلاف ان چیزوں کے جو امت میں خبر الواحد بعد الواحد کی خصوصی راہوں سے پہنچی ہیں، اس نوعیت کے ساتھ ان کی منتقلی ہی دلیل ہے اس بات کی کہ پیغمبر ان کو پہنچانا تو چاہتے تھے لیکن ہر شخص تک اس طریقہ سے ان چیزوں کا پہنچانا مقصود نہ تھا کہ ان سے گریز قطعی طور پر اللہ اور اس کے رسول سے گریز کی شکل اختیار کر کے بھاگنے والوں کو معصیت اور بغاوت کا مجرم ٹھہرا دے۔

حجیتِ حدیث کے چند قرآنی دلائل

فلسفہ کے اس شر سے خیر کا یہ پہلو جو پیدا ہوا وہ تو اتنا اہم ہے کہ رہتی دنیا تک اسی سے قرآن کے اجمالی آیات کا مطلب معین کیا جائے گا، یعنی مذکورہ بالا آیات مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ یا مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا کے سوا قرآن ہی میں بار بار پلٹ پلٹ کر اسی قسم کی آیتوں کا جو اعادہ کیا گیا ہے مثلاً قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ	پس کچھ بھی نہیں تیرے رب کی قسم ہے وہ ہرگز ایمان نہ
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	لائیں گے جب تک تجھے (اے پیغمبر) ان تمام باتوں میں
لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ	حکم اور فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں جو ان کے باہمی جھگڑوں
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	میں پیدا ہوئی ہیں، پھر اپنے اندر کسی قسم کی تنگی اس فیصلہ

يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء)

کے متعلق نہ پائیں جو تم نے کر دیا ہو، اور کلیۃً اس فیصلہ کے آگے جھک جائیں۔

یا ارشاد ہوا ہے:

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اسی لئے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔

یا دھمکایا گیا ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (نور)

پس چاہیے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ وہ مبتلا ہو جائیں یا ان کو دکھ بھرا عذاب پکڑ لے۔

یا صلائے عام دیا گیا ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہت اچھا نمونہ ہے، جو اللہ کی اور پچھلے دن کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

یہ یا اسی نوعیت کی دوسری آیتیں جن سے خواص کیا عوام مسلمین بھی شاید ناواقف نہیں ہیں، اب ان اطلاقی آیات پر تحدید عائد کرنے کی راہ ہی کیا باقی رہی، صاف معلوم ہو گیا کہ پیغمبر کی زندگی کے مثبت و منفی، ایجابی و سلبی، غرض ہر پہلو میں مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے، رضا اور غضب کی تقسیم کرنے والے دراصل اپنے ایمان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

اَعَاذَنَا اللّٰهُ وَالْمُسْلِمِيْنَ

مِنْ هٰذِهِ

الْهَفَوَاتِ۔

تاریخ تدوین حدیث

آنحضرتؐ کے دَور میں تدوین حدیث

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ معلومات کے حفظ و نگہداشت اور ان پر اعتماد کیلئے خواہ مخواہ نہ سوچنے والوں نے کتابت کے طریقہ کو غیر معمولی جو اہمیت دے رکھی ہے اور اس کے مقابلہ میں زبانی یاد کرنے کے طریقہ کو اس سلسلہ میں بے قیمت ٹھہرانے پر غل غپاڑہ مچایا جا رہا ہے۔ یہ دونوں ناسمجھی کی باتیں ہیں۔ علم کی حفاظت کے یہ دونوں قدرتی ذرائع ہیں، ہر ذریعہ اعتماد کے لئے ذمہ داریوں کو ان لوگوں پر عائد کرتا ہے جو اس سے کام لینا چاہتے ہیں اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل خود بخود آدمی کی فطرت کو اعتماد پر مجبور کر دیتی ہے اور جیسے یہ انسانی فطرت کا ایک طبعی قانون ہے، اسی طرح ان ذمہ داریوں سے لاپروائی ہر حال میں اشتباہ اور بدگمانیوں کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے، خواہ کتابت کے ذریعہ کو اختیار کیا جائے، یا زبانی یادداشت کے طریقے کو، تاہم عصر حاضر کے نابالغ عقول کے طفلانہ تقاضوں کی تسکین کا ایک ذریعہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی کتاب بھی بن گئی ہے آج کل کے متکلمین اسلام نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، کچھ بھی ہو ایک پہلو نفع کا اس واقعہ میں یہ بھی نکل آیا ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض کتابوں مثلاً مستدرک حاکم اور البغوی کی کتاب میں یہ روایت جو پائی جاتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھا ہوا ایک مجموعہ تھا جس کے متعلق وہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پیش کی ہوئی کتاب ہے، اس روایت کا میں ذکر کر چکا ہوں، ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی اسی اجازت کو دیکھ کر حضرت انسؓ کے دل میں بھی ان کی ریس کا جذبہ پیدا ہوا ہو۔ بہرحال حضرت انسؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں یہ کہتے ہوئے پیش کیا تھا کہ

هٰذَا ابْنِيْ وَهُوَ غُلَامٌ كَاتِبٌ ۔ یہ میرا لڑکا ہے اور ایسا لڑکا ہے جو کاتب ہے یعنی لکھنے سے واقف ہے۔ (ابن سعد ص ۱۲ ج ۷، قسم اول)

حضرت انسؓ چونکہ آخر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، خود فرماتے تھے، نو سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہا گویا وہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ہجولی تھے۔ لکھنا بھی آتا ہی تھا اور پھر بارگاہ نبوت میں رسوخ کا حال یہ تھا کہ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یا بُنَیَّ (میرے بیٹے) کے لفظ سے پکارتے تھے، ایسے چہیتے خادم کی بات کا ٹال دینا اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بامروت طبیعت سے آسان نہ تھا، میں سمجھتا ہوں کہ کچھ ان ہی وجوہ سے ان کو بھی حدیثوں کے قلمبند کرنے کی اجازت مل گئی کیونکہ ایک آدمی کے لکھنے سے ظاہر ہے کہ عمومیت کا وہ رنگ کیسے پیدا ہو سکتا تھا جو قرآن کے صحیفوں کی عام اشاعت سے پیدا ہو چکا تھا، کچھ ایسا خیال بھی ہوتا ہے کہ گو حضرت انسؓ بچپن ہی سے لکھنا جانتے تھے اور کاتب ہو چکے تھے، مگر ظاہر ہے کہ کہاں عبداللہ بن عمروؓ کی مہارت و حذاقت، بھلا جس شخص نے عربی چھوڑ سریانی اور عبرانی خطوط اور زبان کو بھی سیکھ لیا ہو، ان کا مقابلہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا کر سکتے تھے، حضرت انسؓ جو یہ کہتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نسخہ کو پیش بھی کر دیا تھا اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو غالباً مشورہ دیا ہوگا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے مجھے سنا بھی دو، عبداللہ بن عمروؓ کے نسخے کے متعلق پیش کرنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں آیا ہے، شاید ان کی تحریری حذاقت پر اعتماد تھا، اور ان پر اعتماد نہ کیا جاتا تو کس پر کیا جاتا۔ آئندہ یعنی عہدِ نبوت کے بعد ان دونوں کتابوں کی حیثیت کیا رہی، اس تفصیل کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام پر کیا جائے گا، اس وقت تو عہدِ نبوت تک کے واقعات کا صرف ذکر مقصود ہے۔

بہر حال عام حدیثوں کے متعلق "کج دار و مریز" کی مذکورہ بالا حکمت عملی یعنی جو پانا چاہیں، ان تک پہنچ بھی جائے لیکن اس طور پر نہ پہنچے کہ ان حدیثوں کے مطالبات کی قوت عمومی راہ سے

منتقل ہونے والے دینی عناصر کے برابر ہو جائے انتہائی نزاکتوں کے ساتھ اس حکمت عملی کی نگرانی کرتے ہوئے ایک خاص حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان حدیثوں کو چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے جو آج خبر آحاد کی شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ علاوہ ان خطوط، معاہدے نامے یا مختلف اقوام و افراد کے نام ہدایت نامے یا صدقات وغیرہ کے تحریری ضابطے جن کے چند نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے یا حجۃ الوداع کے خطبہ کو ابو شاہ یمنی کے لئے لکھوا کر عطا فرمانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں، ان متفرق چیزوں کے سوا حدیث کی یہی دو کتابیں (یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ والا نسخہ اور دوسری کتاب حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی ان دو کتابوں کے سوا اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے کہ واقعۂ تحریق (جلانے) کے بعد صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی حدیثوں کو کتابی شکل دی ہو یا ان کو قلمبند کیا ہو ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو آئندہ شاید اس سلسلہ میں کوئی اور نئی چیز ہاتھ آئے۔ کچھ بھی ہو حدیثوں کے ان انفرادی نسخوں سے وہ حکمت عملی متاثر نہیں ہو سکتی تھی جو اپنی عام حدیثوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی جیسے ان مکتوبہ خطوط و معاہدات وغیرہ میں بھی محض قلمبند ہو جانے کی وجہ سے وہ کیفیت نہ پیدا ہوئی اور نہ پیدا ہو سکتی تھی جو مثلاً قرآن میں پیدا ہو چکی تھی، کیونکہ عمومیت یا استفاضۂ عام، شہرت بین الانام کا تعلق کتابت سے نہیں بلکہ تعدد وکثرت سے ہے، ایک خط اگر لکھا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی خط کی شکل میں رہ گیا بھلا وہ قرآن کے ان نسخوں کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا جو گھر گھر میں پھیلا ہوا تھا۔ مشہور حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن فرما رہے تھے کہ مسلمانوں سے آخر یہ علم اٹھ جائے گا یعنی پیغمبر سے جو جدید علم مسلمانوں کو میسر آیا ہے اس کا چرچا باقی نہ رہے گا کہتے ہیں کہ ایک صحابی جن کا نام زیاد بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ تھا، انہوں نے عرض کیا کہ اب یہ علم کیسے مٹ سکتا ہے، قرآن کی اشاعت جس وسیع پیمانے پر اس وقت تک ہو چکی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے زیاد نے اس وقت عرض کیا تھا کہ

كَيْفَ يُرْفَعُ الْعِلْمُ مِنَّا وَبَيْنَ أَظْهُرِنَا كِتَابُ اللّٰهِ وَقَدْ تَعَلَّمْنَا مَا فِيْهِ وَعَلَّمْنَاهُ نِسَاءَنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَخَدَمَنَا (مجمع الزوائد ج ۱)

ہم لوگوں میں سے علم کیسے اٹھ جائے گا کہ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے، اس کتاب میں جو کچھ ہے اسے ہم نے خود سیکھا ہے اور اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو، اپنے خادموں کو سکھایا ہے۔

الفاظ کے تھوڑے ردّ و بدل سے ترمذی وغیرہ صحاح کی کتابوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ عورتوں، بچوں، حتیٰ کہ خادم و ملازمین تک کو اس زمانے میں جب یہ کتاب پڑھائی جا چکی تھی تو اس عمومیت و استفاضہ کا مقابلہ بھلا وہ مکتوبہ سرمائے کیا کر سکتے تھے جو اکّے دکّے گنتی کے چند آدمیوں کے پاس موجود تھے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دین کے جس حصہ کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی رنگ میں فرمائی تھی، جس کی بدولت آئندہ ہر زمانے میں ان کی حیثیت ان امور کی ہو گئی جن کا علم تواتر و توارث و تعامل کی شکل میں اس وقت تک منتقل ہوتا ہوا مسلمانوں کی اگلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک پہنچ رہا ہے، اسلامی دین کے ان قطعی اور یقینی عناصر و اجزا کے متعلق علم و یقین کی جو کیفیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابیوں کی تھی، قطعاً یہی کیفیت اس علم کی بھی ہے جو ان ہی امور کے متعلق مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تواتر کی راہ سے پیدا ہونے والے علم میں اور وہ علم جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے، دونوں میں قطعیت اور یقین کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں جن لوگوں نے مثلاً لندن کو دیکھا ہے اور اس شہر کے متعلق مشاہدے نے جس یقین کو پیدا کیا ہے اس یقین میں اور ان لوگوں کے یقین میں جنہوں نے لندن کو خود نہیں دیکھا ہے مگر تواتر کی راہ سے اس بات کا یقین ان میں پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے شہروں میں ایک شہر لندن بھی ہے، اس حد تک یعنی لندن کا وجود یقینی ہے، کیا ان دونوں یقینوں میں کسی قسم کا فرق پیدا کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ جن لوگوں نے لندن کو نہیں دیکھا ہے، محض اس لئے ان کے یقین میں شک اور احتمال اسی

قسم کا شک اور احتمال ہوگا جیسے ان لوگوں کے متعلق جو لندن جا چکے ہیں وہاں رہ چکے ہیں، ان کے متعلق شبہ پیدا کرنے والا یہ شبہ پیدا کرلے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا سب خواب کی حالت میں دیکھا تھا، یا آنکھ کا دھوکہ تھا جو لندن کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا واقع میں کچھ نہ تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کے احتمالات وہی لوگ پیدا کر سکتے ہیں جن کی عقل کسی بیماری کی وجہ سے اپنے فطری حدود سے ہٹ گئی ہو۔ فخر الاسلام بزدوی نے اسی لئے شریعت کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو تواتر کی راہ سے مسلمانوں میں منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے، یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

حَتّٰی صَارَ کَالْمُعَایَنِ الْمَسْمُوْعِ۔ (ج ۲ ص ۳۶۰) — ان کی حالت ایسی ہے جیسے خود کسی معائنہ کی ہوئی یا براہ راست سنی ہوئی شئے کی ہو سکتی ہے۔

ان کا دعوی ہے کہ یہ حال صرف قرآن ہی کا نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ انہوں نے اسی راہ سے منتقل ہونے والی بہت سی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

مِثْلَ نَقْلِ الْقُرْاٰنِ وَالصَّلٰوٰتِ الْخَمْسِ وَاَعْدَادِ الرَّکْعَاتِ وَمَقَادِیْرِ الزَّکٰوۃِ وَمَا اَشْبَہَ ذٰلِکَ۔ (ج ۲ ص ۳۶۱) — جیسے قرآن کے منتقل ہونے کا حال ہے اور یہی حال پانچوں وقتوں کی نمازوں کا، نمازوں کی رکعتوں کا، زکوٰۃ کی مقررہ مقداروں کا اور ان ساری چیزوں کا ہے جو اسی راہ سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابہ جو عہد نبوت میں موجود تھے، شریعت کے اس حصہ کے متعلق ان کے یقین کی جو نوعیت تھی، یہی نوعیت اس یقین کی مسلسل باقی رہی ہے، اس لئے ان امور کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، یا اس کے بعد پیدا ہوئے، علامہ ابو زید دبوسی نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقویم میں لکھا ہے:

وَمَتٰی ارْتَفَعَتِ الشُّبْھَۃُ ضَاھٰی — (تواتر کی وجہ سے) جب شبہ باقی نہ رہا تو اس راہ سے جو

الْمُتَّصِلُ مِنْهُ بِكَ الْحَاسَّةُ سَمْعُكَ۔

چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہو کر تم تک پہنچی ہیں ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ براہِ راست اپنے کان سے تم نے ان کو سُنا ہو۔

(کشف ج ۲ ص ۳۶۲)

اسی طرح صاحب مسلّم کے ان الفاظ کے تحت یعنی

إِنَّ التَّوَاتُرَ لَيْسَ مِنْ مَبَاحِثِ عِلْمِ الْإِسْنَادِ۔

تواتر کا تعلق ان مباحث سے نہیں ہے جن میں روایت کی سند سے بحث کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم نے بھی لکھا ہے کہ

بَلِ التَّوَاتُرُ كَالْمُشَافَهَةِ فِي إِفَادَةِ الْعِلْمِ۔

یقین آفرینی میں تواتر کا حال وہی ہے جو حال مشاہدہ کا اس سلسلہ میں ہے۔

(فواتح الرحموت ج ۲ ص ۱۱۹ مطبوعہ مصر)

پھر مولانا نے ایک دلچسپ مثال سے اس کو سمجھانا چاہا ہے یعنی بخاری میں بعض روایتوں کو ثلاثیاتِ بخاری کہتے ہیں، یہ ان روایتوں کا نام ہے جن میں امام بخاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کل تین آدمی کا واسطہ واقع ہوتا ہے۔ مولانا بحر العلوم نے ان ہی ثلاثیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بخاری کے بعد تو ان کی کتاب متواتر ہو گئی اس لئے بخاری کے بعد آئندہ صحیح بخاری کے ان سارے ثلاثیات کی حیثیت ہر مسلمان کے لئے رباعیات کی ہو گئی ہے،

مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

وَمِنْ ثَمَّةَ كَانَ ثُلَاثِيَّاتُ الْبُخَارِيِّ رُبَاعِيَّاتٍ لَنَا لِأَنَّ صَحِيحَهُ مُتَوَاتِرٌ عَنْهُ فَكَأَنَّا سَمِعْنَا مِنَ الْبُخَارِيِّ فَلَمْ يَزِدْ إِلَّا وَاسِطَةٌ وَهِيَ نَفْسُهُ۔

اسی بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ بخاری کے ثلاثیات (یعنی تین واسطوں والی روایتیں) ہمارے لئے رباعیات کی حیثیت رکھتی ہیں (یعنی چار واسطوں والی روایتوں کی حیثیت ان کی ہو گئی) وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کی کتاب (صحیح بخاری) امام بخاری کے لحاظ سے تو متواترہ ہو چکی ہے پس گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے اس کتاب کو براہِ راست امام بخاری ہی سے سنا ہے اس لئے ثلاثیات کے متعلق صرف ایک ہی واسطہ کا تو اضافہ ہوا یعنی خود امام بخاری کی ذات نے چوتھے

واسطے کی حیثیت اختیار کرلی۔ (فواتح ج ۲ ص ۱۱۹)

بہر حال شروع ہی سے اس کا باضابطہ نظم کردیا گیا تھا کہ دین کے ایک حصہ کی حیثیت تو ایسی ہوجائے جن کے علم میں قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کے اعتماد کا حال قدرتی طور پر ایک ہوجائے۔ قرآن اور ایسی ساری چیزیں جو اسی راہ سے مسلمانوں میں پیغمبر کے زمانے سے چلی آرہی ہیں جس رنگ میں قرآن منتقل ہوتا چلا آرہا ہے ان کی یہی کیفیت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دین کے اس حصہ کو اسی حال میں چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے اور بحمد اللہ اس وقت دین کا یہ حصہ اسی رنگ میں مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے آئندہ بھی خدا سے امید ہے کہ اس کی اس کیفیت کی حفاظت فرماتا رہے گا۔ دین کے اس حصہ کے علم ویقین میں اشتباہ واضمحلال کے پیدا ہونے کی وہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ خدانخواستہ مسلمانوں کو تاریخ کے آئندہ زمانہ میں محکومیت کی کسی ایسی ملعون کیفیت میں اپنے کرتوں کی بدولت مبتلا ہونا پڑے، جیسے یہود وغیرہ گزشتہ ملعون قوموں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ غیر قوموں کو ان پر مسلط کیا گیا اور یہ تسلط اتنا سخت تھا کہ اپنے دین کے نام لینے کی بھی اجازت محکومیت کی حالت میں ان کو نہیں دی جاتی تھی، ان کی کتابیں غائب ہوگئیں، ان کے علما چن چن کر قتل کردیئے گئے، کوشش کی گئی کہ آئندہ ان کی پیدا ہونے والی نسلوں کے کانوں میں دینِ موسیٰ اور اس کی کسی بات کی کوئی بھنک بھی نہ پڑنے پائے، صدیاں اسی حال پر گزر گئیں، جو جانتے تھے وہ مرگئے اور جو زندہ رہے انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کا کوئی دین بھی تھا یا اللہ کے کسی برگزیدہ رسول کی وہ بھی امت ہیں، ان کے رسول کی بھی کوئی کتاب تھی؟ یہودیوں کی تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات سے ان کو تاریخ کے طویل ادوار میں دوچار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی جگر خراش روح فرسا شکل حق تعالیٰ کے عتاب کی ہے کہ خدا کے غصہ کی اس آگ میں جو کچھ بھی جل جائے اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، تاہم بے چارے یہودیوں کو جب کبھی سر اٹھانے کا موقعہ ملا، ادھر ادھر سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پھر اپنے گمشدہ دین کو کسی راہ سے جیسا کہ ان کا خیال ہے، پالینے میں وہ کامیاب ہوئے لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی تاریکیوں میں ان کو گھرنا

پڑا ہے کہ مشکل ہی سے یہ کہا جا سکتا ہے جو دین ان کے پاس اس وقت جس شکل میں پایا جاتا ہے وہ واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیا ہوا اور پہنچایا ہوا صحیح دین ہے۔

برخلاف اس کے مسلمانوں کے دین کی ابتدا ہی سلطنت سے ہوئی اور گو پچھلی چند صدیوں سے دنیا کی سیاسی امامت کی باگ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے لیکن دین کی حد تک بحمد اللہ کوئی ایسا واقعہ ان کے ساتھ اب تک پیش نہیں آیا ہے کہ درمیان میں صدی دو صدی تو بڑی بات ہے گھنٹے دو گھنٹے کے لئے بھی اس دین سے وہ جدا نہیں ہوئے ہیں جسے وراثت میں ان کے پچھلے اگلوں سے پاتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مہیب خطرات آنکھیں دکھا رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اس واقعہ کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ گزشتہ زمانے کے معلومات کی حفاظت کے اتنے بے شمار اسباب و ذرائع قدرتی طور پر اس عہد میں پیدا ہو چکے ہیں اور پریس وطباعت وغیرہ کے رواج کی بدولت ایک ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ اس زمانے میں معمولی چیزوں کا مٹنا یا مٹانا آسان نہیں ہے۔ پھر اسلامی بینات جو اس وقت دنیا کے اکثر حصے کے کروڑہا کروڑ باشندوں میں کتابی و عملی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے یقین میں اضمحلال پیدا کرنے کی کوشش بظاہر مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ کچھ اس کا خیال بھی آتا ہے کہ "اسلام کی محمدی شکل" جب انسانی زندگی کے اس دستور العمل کی جس پر پیدا کرنے والا اپنے بندوں کو چلانا چاہتا ہے اسی کی جب یہ آخری شکل ہے تو ارحم الراحمین کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ نہ چلنے والے باغیوں کی وجہ سے دین پر چلنے کی راہ ان لوگوں کے لئے بھی بند کر دے گا۔ جو بہر حال اسی راہ پر چلتے ہوئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں، امید تو اسی کی ہے کہ ان کے لئے سچے دین پر چلنے کا امکان بہر حال باقی رکھا جائے گا جیسا کہ عرض کیا گیا حالت ناگفتہ بہ حدود تک بگڑتے ہوئے۔ پہنچ چکی ہے جس کے بدلنے کے لئے دوسری عام تدبیروں کے ساتھ ساتھ زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ خود مسلمان دین پر چلنے کے جذبہ کو نئے سرے سے زندہ کریں، ورنہ قدرت ہی کا ایک قانون ہے کہ طلب کسی چیز کی جب باقی نہیں رہتی تو رسد بھی بند کر دی جاتی ہے پچھلے دنوں کے سارے جاں گداز حالات سچ پوچھئے تو ان کے ذکر سے بھی شرم

آتی ہے لیکن واقعہ کا اظہار کیسے نہ کروں بہ نسبت دوسروں کے یہ حال زیادہ تر اکتا جانے کی اسی کیفیت سے پیدا ہوا ہے جو دین کے متعلق خود مسلمانوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بد قسمتی سے پیدا ہو گیا ہے اور آہ! کہ اس وقت تک بجائے گھٹنے کے عملی طور پر[1] اس کیفیت میں کمی تو کیا پیدا ہوتی بظاہر شدت ہی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خیر میں کدھر نکل گیا، آئندہ کیا ہونے والا ہے، علیم و خبیر ہی اسے جان سکتا ہے اور اس وقت مستقبل کے متعلق مجھے کچھ لکھنا بھی نہیں ہے بلکہ اس وقت تک جن حالات سے گزرتے ہوئے موجودہ نسلوں تک دین پہنچا ہے میری بحث کا دائرہ اسی حد تک محدود ہے۔ غرض یہ کر رہا تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم امت میں دین کو جس حال میں چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے، اس وقت ایک حصہ کی حالت تو وہی تھی جسے تبلیغِ عام کی راہ سے ایک ایسا قالب عطا کر دیا گیا تھا کہ اس کی یافت میں اگلوں پچھلوں کی حالت کا ایک ہو جانا ناگزیر تھا۔ بحمد اللہ ہزار سال کے بعد بھی چند صدیاں گزر چکی ہیں، اس وقت تک دین کا یہ حصہ اسی حال میں موجود ہے۔ اور دوسرا حصہ دین ہی کا تھا جس کے متعلق اگلوں اور پچھلوں کو تو کیا برابر کیا جاتا خود عہدِ نبوت میں جو موجود تھے ان لوگوں میں بھی اس کی اشاعت عمومی شکل میں اسی لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس میں قصداً و ارادةً اس رنگ کو چاہا جاتا تھا کہ نہ پیدا ہو، جو دین کے پہلے حصہ میں اور اس حصہ کے مطالبہ میں یا اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔

---

[1] "عملی طور پر" کا اضافہ میں نے جس لئے کیا ہے، ہر مسلمان جو اپنے حال سے واقف ہے غالباً اس اضافہ کی ضرورت تسلیم کرلے گا بعض علاقوں میں جہاں غیر قوموں سے مسلمانوں کو کش مکش کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہاں دیکھا جا رہا ہے کہ دین کی طرف واپسی کا چرچا زبانوں پر کچھ دنوں سے ذرا زیادہ چڑھ گیا ہے۔ لیکن جس سے معاملہ ہے کاش! بجائے "سمیع و علیم" ہونے کے وہ صرف "سمیع" ہی ہوتا تو امید کی جا سکتی تھی کہ صرف سنا کر اس کو منا لینے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن سننے کے ساتھ جو دیکھتا بھی ہے اور ہر چیز جس حال میں ہے اس کو جانتا بھی ہے اس کے سامنے اس قسم کے چرچے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ رَبَّنَا تُبْ عَلَيْنَا وَارْحَمْنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَمْ يَرْحَمْنَا رَبَّنَا وَلَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۱۲

آنحضرتؐ سے روایت کرنے والوں کی تعداد

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے ہیں دین کا یہ ثانی الذکر حصہ کچھ تو مذکورۂ بالا کتابی شکل میں افراد کے پاس تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی تعداد بہت محدود تھی اور زیادہ تر یہ ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جن کے دل و دماغ کی تربیت دنیا کے سب سے بڑے معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں ہوئی تھی اور جن واقعات کے تجربے و مشاہدہ کا موقعہ صحبتِ نبوت میں ان کو ملا تھا، ان ہی کا تذکرہ دوسروں سے وہ کرتے تھے بعض لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ دین کا یہ حصہ جن لوگوں میں پھیلا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی۔ اصابہ میں علی بن زرعۃ الرازی کے حوالہ سے یہ مشہور قول منقول ہے کہ

تُوُفِّیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَآہُ وَسَمِعَ مِنْہُ زِیَادَۃٌ عَلٰی مِائَۃِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِّنْ رَّجُلٍ وَّامْرَءَۃٍ کُلُّھُمْ قَدْ رَوٰی عَنْہُ سِمَاعًا اَوْ رُؤْیَۃً[1]۔ (اصابہ ج ۶ ص ۳۰)

وفات پائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں کہ جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ سے آپ کی باتیں سنی تھیں ان کی تعداد ایک لاکھ انسانوں سے زیادہ تھی جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں یہ ایک لاکھ سے زیادہ تعداد والی جماعت وہ ہے جس نے سن کر یا دیکھ کر آپ سے ان میں ہر ایک نے روایت کی ہے۔

---

[1] لیکن الخطیب نے خود ابو زرعہ رازی سے اپنی متصل سند کے ساتھ اس قول کو جو نقل کیا ہے اس میں بجائے ایک لاکھ کے ایک لاکھ چودہ ہزار ان صحابیوں کی تعداد بتائی گئی ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار یا رفتار کے متعلق کسی قسم کا علم لوگوں تک پہنچایا ہے۔ ابو زرعہ سے پوچھا بھی گیا تھا کہ اتنی بڑی تعداد ان صحابیوں کی کیسے ہو سکتی ہے۔ آخر اتنے آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیسے سنیں اور آپ کو کہاں دیکھا۔ اس کے جواب میں ابو زرعہ نے کہا کہ مدینہ والے کے والے اور ان دو شہروں کے بیچ میں جو لوگ آباد تھے اسی طرح عام اعراب وصحرا کے باشندے جو خدمت مبارک میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ نیز حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ جو شریک تھے اور عرفات کے میدان میں جن لوگوں نے آپ کی باتیں سنیں یا آپ کو کچھ کرتے دیکھا (تدریب الراوی ص ۲۰۶)۔ اسی کتاب میں سیوطی نے رافعی کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ساٹھ ہزار مسلمان آپ کے بعد عرب میں موجود تھے جن میں تیس ہزار مدینہ میں اور تیس ہزار مختلف عربی قبائل میں پھیلے ہوئے تھے مگر خود اس تخمینہ کی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ باقی برصفحہ آئندہ

لیکن اس سلسلہ میں جن بزرگوں کے معلومات حدیث کی کتابوں میں جمع ہوسکے ہیں یا اس وقت جن کے معلومات تک رسائی ممکن ہے غالباً ان کی تعداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الحاکم نے لکھا ہے کہ
تَدْ رَوَیٰ عَنْہُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الصَّحَابَۃِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی جماعت میں روایت کرنے
اَرْبَعَۃُ اٰلَافِ رَجُلٍ وَّامْرَأَۃٍ (مدخل ص ،) والوں کی تعداد چار ہزار ہے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی یعنی وفات کے بعد دین کا یہی حال تھا اس کے بعد کیا ہوا؟ اب کچھ قصہ اس کا سنئے :۔

عہدِ صدیقی اور حدیث

ابوبکر صدیق رضی کی خلافت کا زمانہ اگرچہ مدتاً ایک مختصر زمانہ ہے، کل ڈھائی سال حکمرانی کا ان کو ملا اور وہ بھی ایسے حال میں کہ اچانک مختلف قسم کے فتنے اور فساد خود عرب میں بھی پھوٹ پڑے اور عرب سے باہر بھی ایسی تیاریاں تھیں جن کی طرف توجہ ضروری تھی، تاہم ان ہی حالات میں حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین اصولی اقدامات کا کتابوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :۔

حضرت ابوبکر رضؓ نے پانسو حدیثیں قلمبند کیں

جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اگرچہ بظاہر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت زیادہ تجلد اور صبر و ثبات استقلال و استقامت کا اظہار کیا لیکن درحقیقت یہ ان کا ظاہر حال تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حضور کے بعد ابوبکر پر ان کی زندگی دوبھر ہوگئی تھی، عبداللہ بن عمر اور زیاد بن حنظلہ کے حوالہ سے ابن اثیر وغیرہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) بخاری کی اس روایت کا لوگ اکثر تذکرہ کرتے ہیں جس میں کعب بن مالک جن کے ساتھ تبوک کی مہم میں پچھڑ جانے کی وجہ سے بڑا قصہ پیش آیا۔ وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے کہ لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ ایک دیوان (دفتر) میں ان کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا تھا یا نہیں کیا جاسکتا تھا یعنی فرمایا کہ وَاَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ کَثِیْرٌ لَا یَجْمَعُہُمْ کِتَابُ حَافِظٍ یَعْنِی الدِّیْوَانَ۔ یہ حضرت کعب کے اصلی الفاظ ہیں لیکن اس سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کے حالات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دس ہزار سے زیادہ تعداد نہیں پائی جاتی، حالانکہ لکھنے والوں نے سب ہی کا تذکرہ کیا ہے یعنی جن لوگوں کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوگیا تھا یا جو آپ کے سامنے پیدا ہو چکے تھے لیکن کمسن اور چھوٹے تھے۔

كَانَ سَبَبُ مَوْتِ أَبِي بَكْرٍ الْكَمَدُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (اسد الغابہ ج ۳ ص۲۲۴)

ابوبکر کی موت کی وجہ وہ اندرونی سوز و غم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ان میں پیدا ہو گیا تھا۔

ایک ایسا جان لیوا اور جاں گداز غم جو آخر موت ہی پر منتج ہوا، شاید اسی اندرونی خلش اور سوزش کی تسکین کی یہ تدبیر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سمجھ میں آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو معلومات ان کے دماغ میں تھے ان کو قلمبند کر کے اپنا جی بہلائیں مشاغل کے اس ہجوم اور کثرت کے باوجود جن میں خلافت کے بعد وہ گھر گئے تھے، اتنا وقت انھوں نے نکال لیا کہ دس بیس نہیں بلکہ پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ جو قریب قریب موطا امام مالک کی مرفوع حدیثوں کی تعداد کے مساوی ہے[1]۔ اپنے قلم سے لکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے تیار کر لیا۔ الذہبی نے ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

جَمَعَ أَبِي الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ خَمْسُ مِائَةِ حَدِيثٍ (ص۵)

جمع کیا میرے والد (ابوبکر) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اور یہ پانسو حدیثیں تھیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ جس کام کو سو سال بعد حضرت امام مالکؒ نے موطا، کی شکل میں انجام دیا، یہی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ایک ایسی صورت میں انجام پا چکا تھا جس سے زیادہ بہتر صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں سوچی نہیں جا سکتی جو کہتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں حدیثوں کو قلم بند نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کاغذ دستیاب نہیں ہوتا تھا، یا لکھنے والے میسر نہیں آتے تھے یا جہاد وغیرہ کے مشاغل کی وجہ سے اس قسم کے علمی کام کے لئے مواقع نہیں تھے، ان سارے احتمالات کا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے عملی جواب دیا جا چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کفِ افسوس ملنے والے آج تدوینِ حدیث کی

---

[1] موطا کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں جو حدیثوں کے تعداد کی کمی و بیشی کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں شاہ ولی اللہ نے مسوّی شرح موطا، میں ابوبکر ابہری کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موطا، میں مسند مرفوع حدیثیں چھ سو ہیں لیکن ابن حزم کا قول شاہ صاحب ہی نے نقل کیا ہے کہ شمار کردم آنچہ در موطا است پس یافتم از مسند پانصد و چند حدیث ص۱ مسوّی شرح موطا۔

عام تاریخ پڑھ کر جو کفِ افسوس مل رہے ہیں ان کی آرزو ایسی شکل میں پوری ہو چکی تھی جس سے بہتر شکل سوچی نہیں جا سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے دینی اور سیاسی جانشین کے براہِ راست قلم کا لکھا ہوا حدیثوں کا یہ نسخہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں میں اگر شائع ہو جاتا تو خیال کیجئے کہ آج پیغمبر کی ان حدیثوں کے متعلق کیا کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی، الغرض آرزو کرنے والے حدیثوں کے متعلق جو کچھ آرزو اس زمانے میں کر رہے ہیں، ان کی وہی آرزو واقعہ کا قالب اختیار کر چکی تھی۔

جنھوں نے پیغمبر کے دین کے مصالح کو نہیں سمجھا ہے ان کے لئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام کتنا بڑا مبارک اور ضروری اقدام قرار دیا جا سکتا ہے لیکن خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مصلحتوں کے پیشِ نظر دین کے اس حصہ کی اشاعت میں پوری کوشش اس پہلو پر صرف فرمائی تھی کہ عمومیت کا رنگ اس میں نہ پیدا ہو کیا ان پیغمبرانہ مصلحتوں پر پانی نہ پھر جاتا، اگر لکھنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنی حکومت کی طرف سے عام مسلمانوں میں اس کو شائع بھی فرما دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اس جذبہ کی تائید تھوڑی دیر کے لئے ان کو عقل سے مل گئی۔ خیال آیا ہوگا کہ پیغمبر نے بھی تو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بعض لوگوں کو حدیثوں کے لکھنے کی اجازت دے دی تھی پھر میں بھی اگر کچھ لکھ رہا ہوں تو اجازت کے اس دائرے سے باہر تو میرا یہ کام نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے اس جذباتی فیصلہ کے وقت شاید ادھر ان کا دھیان نہ گیا کہ جن لوگوں کو کتابتِ حدیث کی انفرادی اجازت بارگاہِ نبوت سے ملی تھی ان میں کوئی ابوبکر بھی نہ تھا اور نہ ان میں نبی کا کوئی جانشین اور مسلمانوں کا دینی و سیاسی امیر تھا اور نہ ان میں کوئی ایسی ہستی تھی جس کا کام حکومت کا کام سمجھا جا سکتا تھا۔

اسی روایت میں صدیقہ رضؓ کے بعض الفاظ جن کا ابھی ذکر آ رہا ہے، ان سے جو یہ معلوم ہوتا ہے

کہ لکھنے کے بعد بجائے عام اشاعت کے اس نسخہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عائشہ صدیقہؓ کو رکھنے
کے لئے دے دیا تھا، میں تو ان الفاظ سے یہ سمجھتا ہوں کہ کسی فوری جذبہ سے مغلوب ہو کر اس کام کو
گو ابوبکر صدیق کر گزرے تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ ابوبکر صدیق رضؓ ہی کیوں ہوتے اور نبی کی جانشینی
کے لئے ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا اگر اس مصلحت سے وہ قطعی طور پر خالی الذہن ہو کر اپنے
اس کام کو اسی طرح بڑا کام تصور فرمالیتے جیسے اس زمانے کے آرزو کرنے والے سوچ رہے ہیں
ان کا تو یہ حال ہے کہ آج یورپ یا امریکہ میں ابوبکر صدیق کے اس نسخہ کا اگر پتہ چل جائے تو اس کو
اپنی ایک بڑی کامیابی قرار دے کر شاید آسمانوں کو سر پر اٹھالیں۔

اپنے ذخیرۂ حدیث کو جلا کر حضرت ابوبکر رضؓ نے سنتِ نبویؐ اور مصلحتِ پیمبری کی تجدید کی

لیکن یہ حال تو ان کا ہے جنھوں نے نہ پیغمبر کو دیکھا نہ پیغمبر کی صحبت سے استفادہ کا موقع ان کو ملا
مگر جو زندگی کے ہر شعبہ میں نبی کا ثانی سمجھا جاتا تھا دیکھتے ہو ان کا کیا حال ہے، ان ہی کی صاحبزادی
ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضؓ جن کے پاس یہ "صدیقی نسخہ" حدیثوں کا رکھوایا گیا تھا، ان ہی کی زبانی
سنئے وہ کیا فرماتی ہیں۔ اسی روایت کے آخر میں ہے:۔

فَبَاتَ لَيْلَةً يَتَقَلَّبُ كَثِيرًا۔ پھر ایک شب میں (دیکھا گیا) کہ وہ یعنی حضرت ابوبکر رضؓ بہت
زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔

تم تو اس پر خوش ہو کہ ابتداء اسلام ہی میں حکومت کی طرف سے نبی کے بعد ہی خود پیغمبر کے
خلیفہ نے حدیثوں کا مجموعہ جمع کرلیا گویا سارے شکوک و شبہات جو آج حدیثوں کے متعلق دلوں میں
پیدا ہوتے ہیں ان کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہوگیا تم اس لئے خوشی سے پھولے نہیں سماتے اچھل
رہے ہو کہ بڑا کام ہوگیا، لیکن خود جس نے اس بڑے کام کو انجام دیا تھا وہ یہی سوچ کر کہ ایسا کیوں
ہوگیا کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا ہے، نیند آنکھوں سے اُڑ گئی ہے۔ آخر عائشہ صدیقہؓ سے نہ رہا گیا
باپ کی اس غیر معمولی بے چینی کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، سرہانے تشریف لائیں خود فرماتی ہیں کہ

فغمنی (والد کی اس حالت نے مجھے غم میں مبتلا کر دیا) اور عرض کیا کہ

اَتَتَقَلَّبُ بِشَکْوٰی اَوْ بِشَیْءٍ آپ یہ کروٹیں کیا کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا

بَلَغَکَ۔ کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بےچین ہو رہے ہیں)۔

ابوبکر ایک قطعی فیصلہ پر پہنچ چکے تھے، اسی لئے کسی دوسرے سے حتیٰ کہ ام المومنین جیسی صاحبزادی سے بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مشورہ اس باب میں سنیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوچھتی رہیں لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا، عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ

فَلَمَّا اَصْبَحَ قَالَ اَیْ بُنَیَّۃُ ھَلُمِّی جب صبح ہوئی تو حضرت ابوبکر رضؓ نے) فرمایا بیٹی ان حدیثوں

الْاَحَادِیْثَ الَّتِیْ عِنْدَکِ۔ کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔

کچھ نہیں معلوم کہ جن حدیثوں کو اتنی محنت اور کاوش سے لکھا ہے ان کو کیا کریں گے مگر حکم تھا لاکر عائشہ صدیقہ نے کتاب حاضر کر دی اس کے بعد کیا ہوا ان ہی سے سنئے فرماتی ہیں۔

فَدَعَا بِنَارٍ فَحَرَّقَھَا۔ پھر آگ منگوائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔

اور اب صدیقہ کی سمجھ میں آیا کہ رات بھر والد بےچینی کے ساتھ کروٹیں جو بدل رہے تھے اس کا اصلی راز کیا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی ابوبکر کو نظر آگئی کہ ان کی بہت بڑی ناکامی ہوگی اگر دنیا میں ان کے ہاتھ کی یہ لکھی ہوئی کتاب باقی رہ گئی جو نہیں جانتے ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں اور جو جانتا تھا اس نے کیا سمجھا، باپ بیٹی کی آئندہ گفتگو سے اس کا اندازہ کیجئے۔ صدیقہ فرماتی ہیں جب والد نے کتاب میں آگ لگادی اور اس کو جلا دیا تب میں نے عرض کیا کہ

لِمَ اَحْرَقْتَھَا۔ آپ نے اسے کیوں جلا دیا۔

یہی سننے کی بات ہے جو جواب میں حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمائی کہ

خَشِیْتُ اَنْ اَمُوْتَ وَھِیَ عِنْدِیْ مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مرجاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے

فَیَکُوْنَ فِیْھَا اَحَادِیْثُ عَنْ رَجُلٍ پاس رہ جائے (بایں طور) کہ اس مجموعے میں ایسے شخص کی بھی

قَدِ ائْتَمَنْتُہٗ وَوَثِقْتُہٗ وَلَمْ یَکُنْ حدیثیں ہوں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے

كَمَا حَدَّثَنِيْ فَاكُوْنَ قَدْ نَقَلْتُ — بیان پر اعتماد کیا مگر جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا بات ویسی نہ ہو اور

ذَاكَ فَهٰذَا لَا يَصِحُّ۔ — میں نے (اپنے مجموعہ) میں اسے نقل کر دیا۔ ایسا کرنا درست نہ ہوگا۔

میرے خیال میں تو بغیر کسی تاویل کے واضح اور صاف مطلب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا الفاظ کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن حدیثوں کے متعلق عمومیت اور اشاعت کا طریقہ پیغمبر نے اختیار نہیں فرمایا تھا بلکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی بات آخر جن بنیادوں پر مان لیا کرتا ہے اور وہ بنیادیں کیا ہوتی ہیں، یہی کہ بظاہر خبر دینے والا ایسا آدمی ہو جس کے متعلق سننے والے یہ خیال رکھتے ہوں کہ یہ ایک معتبر اور قابل بھروسہ آدمی ہے۔ دنیا کا عام کاروبار اسی پر چل رہا ہے حتیٰ کہ عدالتوں میں اسی قسم کے گواہوں کی شہادتوں پر اعتماد کر کے حکام فیصلے صادر کیا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قطعی یقین جو لازوال ہو اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی پس ان حدیثوں کے باب میں بھی یہی راہ جب اختیار کی گئی تھی اور اسی راہ سے جن حدیثوں کا علم انھیں حاصل ہوا تھا۔ یعنی ان کے بیان کرنے والوں کے متعلق اس کی ضمانت نہیں تلاش کی گئی کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں سچ ہی کہہ رہے ہیں، بلکہ ان کے عام حالات کو دیکھتے ہوئے جو کچھ انھوں نے بیان کیا تھا حضرت ابو بکرؓ نے مان لیا تھا اور ان کی روایت پر بھروسہ کر کے ان کی روایت کردہ حدیثوں کو اس مجموعہ میں جمع کر دیا تھا، اصل نوعیت تو ان حدیثوں کی یہی ہے، ان کی تبلیغ ہی ایسے ڈھنگ سے پیغمبر نے کی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا، مگر اسی وجہ سے کہ بالکلیہ ہر قسم کے شکوک و شبہات کے ازالہ کی کوشش ان حدیثوں کے متعلق نہیں کی گئی ہے اس کا بھی احتمال ان میں باقی ہے کہ بیان کرنے والوں کا بیان ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو جیسا کہ گزر چکا، اس احتمال کی گنجائش دین کے اسی حصہ میں قصداً رکھی گئی ہے اسی گنجائش نے اس کے مطالبہ کی قوت کو دین کے اس حصہ کے مطالبہ کی قوت کے مقابلہ میں کچھ کمزور کر دیا ہے جس میں قطعاً اس احتمال کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک حضرت ابو بکرؓ نے ان روایتوں کو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اپنی کتاب

میں درج نہیں کیا تھا، ان کا یہی حال تھا مگر سوچنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ اور دینی و سیاسی جانشین کی حکومت کی طرف سے جو کتاب مرتب کرائی گئی ہو اس میں مندرج ہو جانے کے بعد کیا ان حدیثوں کا یہی حال جس کا باقی رکھنا مقصود تھا باقی رہ سکتا تھا، ابوبکر صدیقؓ کی وہ کتاب آج مسلمانوں میں ہوتی تب بتایا جا سکتا تھا کہ اس کتاب کی حدیثوں کے ساتھ اور ان حدیثوں سے پیدا ہونے والے احکام و قوانین کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور گرویدگی کا کیا حال ہے۔

فَاكُونُ قَدْ نَقَلْتُ ذَاكَ فَهٰذَا لَا يَصِحُّ۔ جو اس نے (حدیث بیان کرنے والے نے) مجھ سے بیان کیا بات ویسی نہ ہو اور میں نے (اپنے مجموعہ) میں اسے نقل کر دیا ایسا کرنا درست نہ ہو گا۔

ان الفاظ کا کم از کم میری سمجھ میں یہی مطلب آیا ہے بلکہ شاید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسرے مطلب کی گنجائش بھی ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی اوروں سے بھی میری یہی استدعا ہے کہ ان الفاظ کا کوئی دوسرا مطلب ان کے ذہن میں پہلے سے اگر موجود ہو یا غور کرنے سے اب معلوم ہوتا ہو مجھے مطلع فرما سکتے ہیں کیونکہ اس کا احتمال ہی نہیں ہے کہ شبہ کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے ان حدیثوں کو قابل قبول نہ قرار دیا ہو کیونکہ ان کا مسلک اگر یہی ہوتا تو شروع ہی سے ان حدیثوں کے جمع کرنے کا ارادہ چاہئے تھا کہ نہ فرماتے۔ آخر یہ احتمال کہ باوجود سچ بولنے کے ہر وہ شخص جو معصوم نہیں ہے اس کی خبر میں صدق کے ساتھ کذب اور سچ کے ساتھ جھوٹ ہونے کا بھی اندیشہ کیا جا سکتا ہے، یہ اندیشہ تو لکھنے سے پہلے ان ساری روایتوں کے متعلق پیدا ہو سکتا تھا جنہیں دوسروں سے سن کر انھوں نے اپنے اس مجموعہ میں درج کیا تھا لیکن باوجود اس اندیشہ کے جب ان حدیثوں کو لکھ چکے تو لکھنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ مزید کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اضافہ اگر ہوا تھا تو اسی امر کا کہ ان کے قلم بند کر دینے کے بعد وہ شبہ جس کا ہر حدیث کے ساتھ احتمال لگا ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا بلکہ خلافت کی طرف سے اگر اس کی اشاعت نہ بھی کرتے گھر ہی میں رکھے رہتے مگر ان کے بعد لوگوں کو یہی کتاب ملتی تو ظاہر ہے کہ ابوبکر کی طرف منسوب ہو جانا ہی اس شبہ کے ازالہ کے لئے کافی ہوتا بلکہ

ان کے الفاظ "خَشِيتُ اَنْ اَمُوْتَ وَهِيَ عِنْدِيْ" (مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ میں مرجاؤں اور حدیثوں کا یہ مجموعہ میرے پاس رہ جائے) ان الفاظ سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے کہ اشاعت بھی ان کی زندگی میں اس کتاب کی اگر نہ کی جاتی جب بھی ان کے پاس سے اس کتاب کا نکلنا یہی اس نوعیت اور اس کیفیت کو بدل دینے کے لئے ان کے نزدیک کافی ہوتا جس کو قصداً ان حدیثوں میں باقی رکھنا پیغمبر کا مقصود تھا سچی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کا مسلک اگر یہی ہوتا کہ خبر احاد میں چونکہ غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے چاہئے کہ اپنی دینی زندگی میں مسلمان اس سے قطعاً استفادہ نہ کریں اور اسی وجہ سے اپنی اس کتاب کو انھوں نے اگر نذر آتش کیا تھا تو چاہئے تھا کہ کبھی ایک دو آدمیوں کی روایتوں پر وہ بھروسہ نہ کرتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ پیش ہونے پر اسی کے مطابق صرف فیصلہ ہی نہیں بلکہ ضرورت کے وقت لوگوں سے اسی قسم کی حدیثوں کی جستجو اور تلاش بتایا گیا ہے کہ ان کا یہ ایک عام دستور العمل تھا۔ آخر طبقات ابن سعد میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف اس اصول کو جو منسوب کیا گیا ہے کہ

اَنَّ اَبَا بَكْرٍ اِذَا نَزَلَتْ بِهٖ قَضِيَّةٌ لَمْ يَجِدْ لَهَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اَصْلًا وَلَا فِي السُّنَّةِ اَثَرًا فَقَالَ اَجْتَهِدُ بِرَأْيِيْ فَاِنْ يَّكُنْ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ يَّكُنْ خَطَأً فَمِنِّيْ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ۔ (ج ۳ ص ۱۳۶)	حضرت ابوبکر کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی صورت حال ان کے سامنے ایسی پیش ہوتی جس کے متعلق نہ کتاب اللہ ہی میں کوئی اصل ملتی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اس کے متعلق کسی اثر کا پتہ چلتا تو فرماتے کہ اپنی رائے سے اب میں اجتہاد کرتا ہوں میرا یہ اجتہادی نتیجہ اگر درست ہوا تو یہ اللہ کی طرف سے (توفیق) ہوگی اور اگر غلط ہوا تو اس کی ذمہ داری میری طرف عائد ہوگی۔ میں خدا سے اس غلطی کے متعلق معافی چاہتا ہوں۔

یہ کسی معمولی آدمی کا نہیں بلکہ ابن سیرین جیسے محقق صادق کا بیان ہے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی نیا مقدمہ پیش آتا تو پہلے قرآن میں اس کی اصل تلاش کرتے اس میں نہ ملتا تو سنت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، وفعل میں کوئی

اثر اور نمونہ مل سکتا ہے تو اس کو ڈھونڈھتے، جب ان دونوں میں کوئی چیز نہ ملتی تو پھر خود اجتہاد فرماتے۔ یہی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جب کوئی اصل نہ ملتی تو سنت میں اثر تلاش کرنے کا کیا طریقہ تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی کتاب ایسی اس وقت تو موجود نہ تھی جس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ یہی کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے متعلق حضرت ابوبکر کے پاس جو معلومات تھے ان میں ڈھونڈتے اپنے پاس نہ ہوتا تو دوسروں سے پوچھتے متعدد واقعات میں انھوں نے یہی کیا بھی تھا جس کا کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے وہی جدّہ (دادی) کی میراث کا مسئلہ ہے کون نہیں جانتا کہ خود حضرت ابوبکر کے پاس اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا، الذہبی میں ہے کہ

ثُمَّ سَأَلَ النَّاسَ (تذکرہ ص ۲) تب حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے دریافت کیا۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور کسی کو معلوم ہو تو بتائیں تب حضرت مغیرہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فیصلہ کا اس مسئلہ کے متعلق ان کے پاس علم تھا اس کو پیش کیا جو ظاہر ہے کہ ایک خبر تھی، صدق وکذب کا احتمال اس میں بھی تھا جیسا کہ لکھا ہے زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ کوئی اور صاحب بھی اس فیصلہ کی شہادت دے سکتے ہیں۔ محمد بن مسلمہ نے جب تائید کی تو اسی حدیث کے مطابق حضرت ابوبکر نے فیصلہ کر دیا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک آدمی کی خبر ہو یا دو کی غلطی کا احتمال دونوں میں رہتا ہے۔ البتہ دوسرے آدمی کی تائید سے اس احتمال میں کچھ کمی ضرور ہو جاتی ہے جیسے عدالت کے مقدمات میں بھی یہی کیا جاتا ہے کہ بجائے ایک گواہ کے دو گواہوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی حضرت ابوبکرؓ نے بھی کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لکھا ہے کہ بجائے اس کے مقدمات ہی کے سلسلہ میں مزید اطمینان کا جو طریقہ ہے یعنی قسم کھلوانا یا حلف لینا اس پر عمل کرتے تھے[1]۔ حالانکہ جب آدمی جھوٹ بول سکتا ہے اور بولتا ہے تو کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اور سکتا کیا معنی

[1] ذہبی نے خود حضرت والا کا قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست کوئی بات جب میں سنتا تو جتنی توفیق ہوتی اس پر عمل کرتا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جب دوسرے سے سنتا تو قسم لے کر اطمینان حاصل کرتا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰)۔

آئے دن جھوٹی قسموں کا بھی اسی طرح تجربہ ہوتا رہتا ہے جیسے جھوٹ بولنے کا، البتہ قسم سے جھوٹ کا احتمال ایک حد تک کم ہو جاتا ہے جیسے مزید ایک اور گواہی سے بھی یہی فائدہ ہوتا ہے۔

بہرحال شبہ تو بہرحال باقی رہتا ہے پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلک اگر یہ ہوتا کہ خبر آحاد میں چونکہ غلطی کا شبہ ہے اس لئے اس کو مسترد کر دینا چاہیئے اور اسی خیال کے زیر اثر اگر اپنی جمع کی ہوئی حدیثوں کو انھوں نے جلا دیا تھا تو چاہیئے تھا کہ باوجود شبہ کے محض ایک یا دو آدمی کے بیان پر بھروسہ کر کے قطعًا فیصلہ نہ کرتے۔

پس کوئی وجہ اس مجموعہ کے جلانے کی اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابوبکر کی کتاب میں داخل ہو جانے کے بعد کم از کم پانسو حدیثوں کے اس مجموعہ کے متعلق مسلمانوں میں وہ احساس قطعًا باقی نہ رہتا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی روایتوں میں قائم رکھنا چاہتے تھے، جذبہ کی مغلوبیت میں اگرچہ ایک فعل ان سے سرزد ہو گیا لیکن اس کے انجام پر جب ان کی نظر گئی تو ان کو یہ محسوس ہوا کہ نبوت کا جو منشا تھا ان کے اس فعل سے متاثر ہو جائے گا اور یہی سوچ کر میرا خیال بھی ہے کہ اس مکتوبہ مجموعہ کو حضرت نے ضائع فرما دیا۔ یقینًا آج مسلمانوں کے پاس حضرت ابوبکرؓ کی یہ کتاب اگر موجود ہوتی تو یقینًا اس کتاب کی مندرجہ حدیثوں کے نتائج کے مطالبہ اور گرفت کی وہ نوعیت قطعًا باقی نہ رہتی جو اس وقت خبر آحاد کی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی ہے[1]۔

---

[1] اس موقعہ پر اپنی طالب العلمی کے زمانہ کا ایک لطیفہ بے ساختہ یاد آگیا دارالعلوم دیوبند میں جب فقیر طالب العلم تھا میرے ساتھ ایک کافی مجمع دوسرے طلبہ کا بھی تھا میں ان لوگوں سے اکثر کہتا تھا کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ فقیر آپ لوگوں کے زمانہ میں پیدا ہو گیا خدانخواستہ سو سوا سو سال بعد اگر پیدا ہوتا اور آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب کتاب لکھ کر چلے جاتے۔ آپ کی کتاب کہیں مصر میں چھپ جاتی تو میرے لئے گویا تم ہی جیسے لوگوں کی باتیں حجت کی حیثیت اختیار کر لیتیں ہر شخص ڈراتا کہ فلاں علامہ نے اپنی کتاب میں اس کی تصریح کی ہے اب تیرے لئے نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے مگر میں جانتا ہوں کہ تم میں کتنے ہیں جو کتاب کا بھی صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔ شریعت کے گرا ودۃ تک پہنچنا تو بڑی بات ہے بہرحال کتابی قالب کسی چیز کا اختیار کر لینا خصوصًا مذہب اور دین سے اس کا تعلق ہو تو انسانی نفسیات پر اس کے عجیب وغریب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں کے کتابی ذخیرے کی تحریق یا نذرِ آتش کرنے کا پہلا واقعہ عہد نبوت میں اس لئے پیش آیا تھا کہ کتابوں کی کمیت اور کثرتِ تعداد سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں عمومیت کا رنگ پیدا کر کے آئندہ مسلمانوں کی زندگی میں ضیق اور تنگی کی وجہ یہی حدیثیں نہ بن جائیں، دین کے دونوں حصوں میں مراتب کے فرق کو باقی رکھنے کے لئے خود پیغمبر کے زمانہ میں حدیثوں کے اس کتابی ذخیرے کو جلا کر ختم کر دیا گیا اور ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں اگرچہ کتاب تو ایک ہی تھی لیکن جس نے کتاب مرتب کی تھی اس کی ذاتی خصوصیات کا نفسیاتی اثر بھی اس فرق کو ختم کرنے کے لئے کافی تھا جسے بالارادہ قصداً دین کے دونوں حصوں میں باقی رکھنا مقصود تھا اسی لئے ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی پیغمبر کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس کتاب کو جلا کر خطرے کا انسداد فرمایا گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے عہدِ نبوت میں اسی فرق کو باقی رکھنے کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اسی طرزِ عمل کی تجدید و احیاء کا ایک قدرتی موقعہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی مل گیا۔

بہرحال میرے نزدیک تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ پہلی خدمت تھی جسے آپ نے انجام دی، لیکن ظاہر ہے اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ اس نوعیت کی حدیثوں کو کسی تحقیق و تنقید یا چھان بین کے بغیر قبول کر لیا جائے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا جو انتظام تھا اس کا ذکر کر چکا ہوں "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا" والی حدیث کی ایسی عمومی اشاعت کہ معنیً اس میں تواتر کا رنگ پیدا ہو گیا یہ اسی انتظام کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اور گو عام طور پر لوگ اس روایت کا کم ذکر کرتے ہیں، لیکن مجمع الفوائد وغیرہ میں طبرانی کے حوالہ سے یہ قصہ جو نقل کیا گیا ہے راوی اس کے وہی عبداللہ ابن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، فرماتے ہیں کہ

اَنَّ رَجُلًا لَبِسَ حُلَّةً مِثْلَ حُلَّتِهٖ ایک شخص اسی قسم کا لباس پہن کر مدینہ منورہ کے کسی صاحب کے گھر

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) اسلام میں حالانکہ شروع ہی سے مراتب و مدارج کے فرق کو باقی رکھنے کے لئے بڑے بڑے انتظام کئے گئے ہیں لیکن با ایں ہمہ عام مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے دیکھا جاتا ہے کہ فلاں کتاب میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کافی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس مسئلہ کا سرچشمہ کیا ہے۔ کتاب ہے، سنت ہے، اجماع ہے، قیاس ہے، استحسان ہے یا صرف گزشتہ زمانے کے لوگوں کا تجربہ یا رواج ہے ۱۲

النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَتٰى اَهْلَ بَيْتٍ مِّنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِيْ اَيَّ بَيْتٍ شِئْتَ اسْتَطَعْتَ فَقَالُوْا عَهْدُنَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَوَاحِشِ فَاَعَدُّوْا لَهٗ بَيْتًا وَاَرْسَلُوْا رَسُوْلًا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرُوْهُ فَقَالَ لِاَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ انْطَلِقَا اِلَيْهِ فَاِنْ وَجَدْتُّمَاهُ حَيًّا فَاقْتُلَاهُ ثُمَّ حَرِّقَاهُ النَّارَ۔ (جمع الفوائد ص ۲۷)

میں پہنچا جیسا لباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیب تن فرمایا کرتے تھے اور گھر والوں سے اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جس گھر میں چاہو تم جھانک سکتے ہو تب لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد ہم سے لیا ہے (اسے ہم جانتے ہیں) کبھی آپ بے شرمی کی باتوں کا حکم نہیں دیتے، پھران ہی لوگوں نے اس کے لئے ایک گھر خالی کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی بھیجا اور جو بات اس شخص نے کہی تھی اس کے متعلق دریافت کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شخص کی غلط بیانی کا جب علم ہوا تو آپؐ نے ابوبکر و عمر کو حکم دیا کہ اس شخص کے پاس جاؤ، اگر اس کو زندہ پاؤ تو قتل کر دینا اور آگ میں جلا دینا۔[1]

آگے بیان کیا گیا ہے کہ ان حضرات کے پہنچنے سے پہلے اس شخص کو سانپ نے ڈس لیا، جب تک یہ لوگ پہنچے وہ مر چکا تھا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور پیشین گوئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ اصابہ میں ہے کہ بھیجتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں تم دونوں اس شخص کو نہ پا سکو گے۔ (اصابہ ج ۱ ص ۲۴۸)

بہرحال اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کرنے والے کو حکومت چاہے تو قتل تک کی سزا دے سکتی ہے اور بعد کو سلاطینِ اسلام نے اس قسم کے زنادقہ کو یہی سزا دی بھی ہے جس کا ذکر انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گا۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے اصابہ میں بھی اس روایت کو الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اصابہ والی روایت میں ہے کہ اس شخص نے آکر لوگوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نکاح فلاں عورت سے کر دیا ہے اسی طرح بجائے حضرت ابوبکر و عمر کے اصابہ والی روایت میں ہے کہ حضرت علی و مقداد کو رسول اللہ نے اس شخص کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا ۱۲

تحقیقِ حدیث کے لئے اصولِ شہادت کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ نے رکھی

پس اصلی کام دین کے اس حصے کے متعلق وہی "کج دار مریز" کے اصول کی نگرانی تھی ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ نے اس خطرے کے انسداد کے لئے کہ دین کے اس حصے میں عمومیت کا رنگ نہ پیدا ہو جائے جس کی عمومی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی اپنے لکھے ہوئے مجموعہ کو ضائع بھی فرما دیا، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے خبروں کی تحقیق و تنقید کے عام اصول کے سوا حضرت مغیرہ کے بیان کرنے پر جو یہ فرمایا کہ هل معك غيرك (کیا تمہارے ساتھ اس خبر میں کوئی دوسرا آدمی بھی شریک ہے) اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ جیسے فصلِ خصومات کے لئے کم از کم شہادت کا نصاب دو ہے، اسی طرح اس نوعیت کی حدیثوں پر اعتماد کرنے کے لئے کم از کم دو راویوں کا ہونا ضروری ہے کیونکہ دین کے اس حصہ پر اعتماد کرنے کے لئے اس کو قانونی نصاب کی شکل اگر دے دی جائے گی تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نوعیت کی حدیثوں کی تبلیغ کم از کم دو آدمیوں کو ضرور فرماتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری ہے، ایک ذخیرہ روایات کا پایا جاتا ہے جن کے متعلق خود صحابی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کیا تھا۔ نیز دنیا کے عام کاروبار میں جیسے اس وقت تک دیکھا جا رہا ہے عہدِ نبوت میں بھی بقول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہی دستور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ضرورتوں کے لئے ایک ہی آدمی کو روانہ فرمایا کرتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے اس آدمی پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہو کہ

أَنْتَ وَاحِدٌ وَلَيْسَ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنَّا مَالَمْ نَسْمَعْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّهُ بَعَثَكَ عَلَيْنَا۔ (الرسالہ ص ۱۱۰)

تم تنہا اکیلے آدمی ہو اس لئے تمہیں اس کا حق نہیں ہے کہ ہم سے کچھ اس وقت تک وصول کرو جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم یہ نہ سن لیں کہ ہم لوگوں سے (صدقہ وغیرہ وصول کرنے کیلئے) تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔

خود ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدد روایتیں ایسی مروی ہیں جن کے تنہا وہی راوی ہیں خصوصاً وراثتِ انبیاء والی روایت، "اور پیغمبر کے مدفون ہونے کی جگہ وہی ہوتی ہے جہاں ان کی وفات واقع ہو" ان دونوں حدیثوں کے وہ تنہا راوی ہیں؛ اور ایک وہی کیا آپ کے بعد خلفا اور دوسرے صحابہ صرف ایک صحابی کے بیان پر بھروسہ کرکے حدیثوں کو عموماً مانتے رہے ہیں اس کے متعلق واقعات کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو ایک جگہ اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب ان سے تیار ہو سکتی ہے۔ الخطیب نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ان روایتوں کو مستقل کتاب کی شکل میں انہوں نے جمع کر دیا ہے۔

بہر حال جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی نہ کہ اعتماد کی شرط تھی، بجنسہ یہی حال حضرت ابوبکر کے اس طرزِ عمل کا ہے کہ اعتماد میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے اس لئے آپ نے چاہا کہ کوئی اور صاحب بھی جانتے ہوں تو بیان کریں، اتفاقاً محمد بن مسلمہ بھی اس روایت کے جاننے والے نکل آئے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اگر محمد بن مسلمہ کی تائید نہ ملتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مغیرہ کے بیان کو مسترد فرما دیتے۔

تاہم ان کے اس طرزِ عمل سے یہ سبق مسلمانوں کو ضرور ملا کہ دین کا یہی حصہ کیوں نہ ہو یعنی خبر الخاصہ بالواحد بعد الواحد کی راہ سے جو پہنچایا گیا ہے اس کے رد و قبول میں لاپروائی سے کام نہ لینا چاہئے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے بیان کرنے کے بعد بھی مزید تائید کا انھوں نے مطالبہ کیا تو جو صحابی نہیں ہیں خود سمجھنا چاہئے کہ ان کی روایتوں کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو کس درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اور غالباً مزید اطمینان کیلئے شاید یہ سبق بھی اپنے اس طریقۂ کار سے وہ دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے بعد ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں کہ اسی سنتِ صدیقی کی پیروی کرتے ہوئے بعض صحابیوں کی روایت پر تائید کا آپ نے بھی مطالبہ فرمایا بلکہ اپنی خاص فطرت کے لحاظ سے اس مطالبہ میں کچھ شدت کی راہ بھی اختیار کی۔[1]

[1] میرا اشارہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس مشہور دلچسپ روایت کی طرف ہے، (باقی بر صفحہ آئندہ)

اس طرح سچ پوچھئے تو خبر احاد کے متعلق اس طرزِ عمل کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دن رکھ دی تھی جس دن مغیرہ کی روایت کو سن کر آپ نے مزید

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی ہر کتاب میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ ابو موسیٰ اشعری حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لئے حاضر ہوئے۔ آپ اندر تھے۔ جیسا کہ اسلامی دستور ہے کہ اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ باہر ہی سے حضرت عمر کو سلام کیا لیکن جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ تیسری دفعہ بھی جب ان کو جواب نہ ملا تو لوٹ گئے۔ ان کا لوٹنا تھا کہ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اپنا آدمی یہ ہدایت کر کے روانہ کیا کہ ابو موسیٰ کو بلا کر لے آؤ۔ جب وہ آئے تو فرمایا تم نے جو کچھ آج کیا ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم تم نے پائی ہے؟ حضرت ابو موسیٰ ؓ نے کہا ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اجازت تین دفعہ لی جائے نہ ملے تو آدمی واپس لوٹ جائے اسی پر میں نے عمل کیا۔ حضرت عمرؓ نے ذرا آنکھ نکالتے ہوئے فرمایا لتقیمن علیہ بینۃ (تم کو اس پر شہادت پیش کرنی پڑے گی)۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ لافعلن (میں تمہارے ساتھ کچھ کروں گا) گویا دھمکی کی ایک شکل تھی بعضوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ

اِنْ كَانَ هٰذَا شَيْئًا حَفِظْتَهٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَا وَ اِلَّا لَاَجْعَلَنَّكَ عِظَةً۔ (جمع الفوائد بحوالہ خمسہ صفحہ ۱۴۴)

اگر یہ کوئی ایسی بات ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر تم نے یاد کر لیا ہے تو خیر ورنہ تم کو میں دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بناؤں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقۂ گفتگو کے اس خاص انداز سے ابو موسیٰ کچھ گھبرا سے گئے۔ انصار کا ایک مجمع کہیں قریب میں تھا اسی مجمع میں پریشان حال پہنچے۔ سید القراء حضرت ابی بن کعب اس جماعت میں سب سے بڑے تھے۔ ان ہی سے یہ دریافت کرتے ہوئے کہ آپ لوگوں میں کوئی صاحب ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہو اور حضرت عمرؓ نے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا تھا اس کا بھی اظہار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے جو مذاق شناس تھے وہ ان کے اس طرزِ عمل کو سن کر ہنس پڑے لیکن حضرت اُبَیؓ نے ان لوگوں کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ یہ بیچارے تو پریشان ہیں اور تم لوگ ہنستے ہو۔ پھر کہا کہ اس حدیث سے تو غالباً ہم انصار میں جو سب سے عمر میں چھوٹا ہے وہ بھی واقف ہوگا۔ ابو سعید خدریؓ سب سے عمر میں چھوٹے تھے، ان ہی کو حکم دیا گیا، ابو موسیٰ کے ساتھ گئے اور ان کے بیان کی حضرت عمرؓ کے سامنے توثیق کی۔ بہر حال یہ قصہ تو ختم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو موسیٰ ؓ کو خوف زدہ پاکر کچھ حضرت ابی بن کعبؓ کو خیال آیا۔ اسی وقت یا اس کے کچھ دیر کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا:۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

شہادت کا مطالبہ فرمایا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہدِ خلافت میں وقتاً فوقتاً اس بنیاد کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتے رہے، ابوموسیٰ ہی کے ساتھ نہیں بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) يَا ابْنَ الْخَطَّابِ فَلَا تَكُونَنَّ عَذَابًا عَلَى اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

یعنی اے ابن الخطاب (خدا نے تم کو مسلمانوں کا اگر امیر بنا دیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے لئے تم عذاب نہ ہو۔

ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شکایت کو سن کر جو واقعہ تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا کہ

سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّمَا سَمِعْتُ شَيْئًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُثَبِّتَ۔

سبحان اللہ سبحان اللہ میں نے ایک بات سنی میں نے یہ چاہا کہ پایۂ ثبوت تک وہی بات پہنچائی جائے۔

بعض روایتوں میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ابوسعید خدری کی مزید تائید کے بعد ابوموسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ

اَمَا اِنِّي لَمْ اَتَّهِمْكَ وَلٰكِنْ خَشِيْتُ اَنْ يَّتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلط بیانی کے ساتھ تم کو میں متہم نہیں کرتا لیکن مجھے اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی باتیں لوگ منسوب کرنے لگیں۔

اور بات درحقیقت یہی تھی یہ نہ تھا کہ تنہا ابوموسیٰ کی روایت پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتماد نہ تھا ان کے حالات میں پڑھئے خدا جانے اس نوعیت کی حدیثوں میں یعنی صرف ایک صاحب کے بیان پر ان ہی حضرت عمرؓ نے کتنی دفعہ اعتماد کیا ہے، لیکن اس وقت ذرا سختی دکھا کر جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے صحابی جیسے ابوموسیٰ تھے ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے تو جو صحابی نہیں ہیں ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ پیغمبر کی طرف لاپروائی کے ساتھ باتوں کے منسوب کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محدثین میں بعد کو "شواہد و متابعات" کا جو ذوق پیدا ہوا یعنی ایک ہی حدیث حتی الامکان جتنے زیادہ طریقوں سے مل سکتی ہو ان طریقوں کے تلاش کرنے اور جمع کرنے میں عجیب و غریب والہانہ جذبات کا ظہور ان سے جو ہوا ہے کچھ تفصیل اس کی بھی گزر چکی ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقعہ پر ان کوششوں کا ذکر انشاء اللہ آئے گا۔ خصوصاً امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کی روایتوں کا جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا منجملہ دوسرے امتیازات کے ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے یعنی شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں عموماً ان دونوں کتابوں کی روایتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

"طرق متعددہ دارد کہ یکے گواہ دیگر تواند بود و ہر یکے متماسک بود"۔ (مکتوبات شاہ ولی اللہ ص۲۱)

اور اسی چیز نے منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ان دونوں کتابوں کے درجہ کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ حدیثوں کا کوئی مجموعہ ان کے ہم پلہ باقی نہیں رہا ہے ۱۲

کہ اوروں کے ساتھ بھی حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ اسی طرزِ عمل کو دہرایا۔ لہ

الغرض تدوینِ حدیث کی تاریخ میں "شواہد و متابعات" کا جو دیوان رفیع بعد کو قائم ہوا سچ پوچھئے تو وہ اسی صدیقی بنیاد پر اس کی تعمیر کھڑی کی گئی۔ الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت

لہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف قصہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مکان کا ہے جو مسجد نبوی سے متصل تھا بیان یہ کیا جاتا ہے کہ مدینہ کی آبادی عہدِ فاروقی میں جب بہت زیادہ بڑھ گئی اور مسجد نبوی میں تنگی محسوس ہونے لگی تو اطراف و جوانب کے مکانات کو حضرت عمرؓ نے بیت المال سے خرید خرید کر مسجد کے ساتھ ملانا شروع کیا۔ آخر میں حضرت عباسؓ کا مکان رہ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بھی حکم دیا کہ فروخت کر دیجئے لیکن وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ چچا تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی وجہ سے وہ اڑ گئے گو حضرت عمرؓ مختلف قسم کی رعایتوں کا ان کے ساتھ وعدے کرتے رہے لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر ایک دن طے ہوا کہ اس قصے کو پنچایت میں دے دیا جائے۔ ابی بن کعب سید القراء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دونوں نے حَکم تسلیم کرلیا۔ قصہ ان کے پاس پیش ہوا۔ ابی نے دونوں کے بیانات کو سن کر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا حکم داؤد علیہ السلام کو جب ہوا اور تعمیر میں جب وہ مشغول ہوئے تو کسی آدمی کا مکان درمیان میں کچھ ایسا حائل ہوا کہ اس مکان کا نقشہ اس سے بگڑتا تھا (یعنی تربیع یا چاروں سمت برابر ہو) اس میں نقص پیدا ہوتا تھا۔ اس شخص سے حضرت داؤدؑ نے کہا کہ فروخت کر دو مگر وہ راضی نہ ہوا آخر حضرت داؤد نے دل میں طے کیا کہ (بزورِ حکومت) اس پر قبضہ کروں گا۔ حق تعالیٰ کو ان کا یہ ارادہ ناگوار گزرا ابھی ہوئی کہ داؤد میں نے تم کو حکم دیا کہ میری یاد کے لئے گھر بناؤ سو تم نے ارادہ کیا کہ غصب اور زبردستی چھینی ہوئی زمین کو اس مکان میں شریک کرو، مگر میری شان یہ نہیں ہے کہ میرے گھر میں منصوبہ زبردستی چھینی ہوئی چیز داخل ہو۔ اس ارادے کی تم کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کی تعمیر تم پوری نہ کرسکو گے تب داؤدؑ نے کہا کہ پروردگار! میں نہیں تو اس کی تکمیل میرے فرزند کے ہاتھوں کرادی جائے۔ ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ ہوگا۔ حضرت ابیؓ نے یہ حدیث جو سنائی تو حضرت عمرؓ بے اختیار ہوگئے اور اُبی کے دامن کو پکڑ کر فرمانے لگے کہ میں تو تمہارے پاس اس لئے آیا تھا کہ سہولت پیدا کرو گے تم نے تو اور بھی زیادہ سخت بات پیش کردی اور کہا کہ تم کو اپنے اس بیان کی تائید میں شہادت پیش کرنی پڑے گی۔ دونوں مسجد آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کا ایک مجمع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت ابوذر بھی تھے۔ اُبی نے مجمع کی طرف خطاب کرکے کہا کہ میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ بیت المقدس کی تعمیر کے اس قصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اگر سنا ہو تو بیان کرے۔ حضرت ابوذرؓ کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سنا ہے تب حضرت ابیؓ نے کہا کہ عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مجھے متہم کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے تم کو متہم نہیں ٹھہرایا لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں (باقی برصفحہ آئندہ)

ابو موسیٰ اشعری کے مذکورہ بالا قصہ کو درج کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ

وَفِي ذَٰلِكَ حَضٌّ عَلَى تَكْثِيرِ طُرُقِ الْحَدِيثِ۔ ص‌‌‌ـــ

یعنی حدیثوں کے طرق میں بعد کو جس کثرت کا خیال لوگوں کو ہوا اس پر لوگوں کو (حضرت عمرؓ) ہی کے طرزِ عمل نے آمادہ کیا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ بنیاد اس کی تو ابوبکر صدیق رکھ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس بنیاد کے استحکام و استواری میں مدد ملی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج دین کے اس حصہ کی کیفیت تیرہ سو سال بعد تک مسلمانوں میں اپنی خاص خصوصیتوں کے ساتھ جو موجود ہے یعنی ایک طرف مسلمانوں نے اس حصہ کو دین کے بنیاتی حصہ کے برابر نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ مدارج و مراتب کے اس فرق کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی، جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً و ارادۃً اس حصہ میں پیدا کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح ہر زمانے میں اس کا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) عام طور پر پھیل جائیں یعنی وہی مطلب کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں عمومیت کا رنگ اگر ان حدیثوں میں پیدا کر دیا جائے گا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی اور انفرادی راہوں سے پہنچائی ہیں تو آنحضرتؐ کا جو منشاء مبارک ہے وہ جاتا رہے گا۔ حضرت ابی یہ سنکر مطمئن ہو گئے۔ اور جب حضرت عباسؓ کو بھی محسوس ہوا کہ حکم کی راہ سے میرے گھر پر قبضہ کرنے سے عمر مایوس ہو چکے تو حاضر ہو کر فرمایا کہ عمر لو! اب اس مکان کو مسلمانوں کے لئے میں خیرات کرتا ہوں اور ان کی مسجد میں اس کا اضافہ کر کے گنجائش پیدا کرتا ہوں۔ (ابن سعد ج ۴ ص ۱۴)

مسجد نبوی کے پاس حضرت عباسؓ کے اسی مکان کا ایک اور دلچسپ قصہ ہے۔ بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ اس کا ذکر کر دوں، ابن سعد ہی میں ہے کہ اسی مکان کے چھت میں ایک پرنالہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کپڑے بدل کر حضرت عمرؓ خلافت کے زمانہ میں مسجد جا رہے تھے اس دن مرغی کے بچے حضرت عباسؓ کے لئے ذبح کئے گئے تھے اس بچے کے گوشت وغیرہ کے دھونے کا خون اور آلائش چھت سے کسی نے بہا دیا۔ اسی وقت حضرت عمر پرنالے کے پاس سے گزر رہے تھے، سارا پانی ان کے جسم پر گرا، اس وقت ایسا جذب طاری ہوا کہ آدمی بلوا کر خود اپنے ہاتھ سے اس پرنالے کو آپ نے اکھڑوا دیا۔ حضرت عباسؓ کو جب خبر ہوئی تو اور کچھ نہ بولے صرف اتنا فرمایا کہ اس پرنالے کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نصب کیا تھا۔ یہ سننا تھا کہ عمرؓ بے چین ہو گئے اور قسم دے کر حضرت عباسؓ کو آمادہ کیا کہ عمرؓ کے کندھے پر چڑھ کر اس نالی کو اسی جگہ پر نصب کر دیں جہاں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو نصب کیا تھا۔ آخر یہی کیا گیا۔ (ابن سعد ج ۴ ص ۱۳) ۱۲

بھی خیال کیا گیا کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین، تحقیق و تلاش تنقید و تحص کی کوششوں میں مسلمان ابتداء اسلام سے اس وقت تک مشغول ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسی خاص علاقہ یا ملک میں جہل کے پھیل جانے کی وجہ سے کچھ دن کے لئے بے تمیزیاں پھیل گئی ہوں۔

تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک اور اہم خدمت

لیکن حضرت ابوبکرؓ کا کام تدوینِ حدیث کے سلسلے میں صرف ان ہی دو خدمات تک محدود نہیں ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن شاید اس کی اہمیت کا اندازہ جیسا کہ چاہئے تھا لوگوں کو نہ ہوا۔ بات میں ممکن ہو کچھ طوالت پیدا ہو، لیکن کیا کیا جائے مجھ سے پہلے کام لینے والوں نے اختصار سے کام لیا میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جس اہمیت کے مستحق تاریخ کے یہ وثائق تھے ان کی اہمیت کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہ ہو سکا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بجائے عمومی اشاعت کے دین کے اس حصہ کے متعلق یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا کہ پہنچانے کی حد تک تو وہ پہنچا دیا جاتا لیکن عموماً ہر شخص تک پہنچ جائے اس کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا اسی سے مسلمانوں کی دینی زندگی میں اس حصہ کے لحاظ سے سہولتیں پیدا ہوئیں جو ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن محروموں کی محرومی میں اس لئے اضافہ نہیں ہوتا کہ اس حصہ کے مطالبہ و گرفت میں وہ نوعیت نہیں پیدا ہوتی جو بیناتی حصہ کی خصوصیت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ یعنی ان روایتوں کے جاننے والوں اور جو ان سے ناواقف تھے ان دونوں طبقوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا واقفیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے ناگزیر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ ہی کے متعلق دو قصے اس سلسلہ میں گزر چکے معمولی آدمی نہیں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں یعنی استیذان (اجازت) کے خاص طریقے اور بیت المقدس والی مسجد کے اس قصے سے جس کا ذکر میں نے حاشیہ

میں کیا ہے آپ سن چکے وہ ناواقف تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر دوسرے صحابیوں سے فرمایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کے اس حصہ کو جس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا تھا ایسی صورت میں بعضوں کا اس سے واقف ہونا اور بعضوں کا ناواقف رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتی، خصوصاً جن لوگوں کو معاشی یا اسی قسم کے دوسرے کاروبار کی وجہ سے چوبیس گھنٹہ کی حاضر باشی کا دربار نبوت میں موقعہ میسر نہ تھا، استیذان والی روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراف کرنا پڑا،

خَفِيَ عَلَيَّ هٰذَا مِنْ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْهَانِيْ عَنْهُ الصَّفْقُ فِي الْاَسْوَاقِ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۴۴)

یعنی یہ روایت مجھ سے جو مخفی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بازاروں کے کاروبار کی مشغولیت نے اس کا موقعہ میرے لئے نہیں رکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کثرت روایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ

اِنَّ اِخْوَانِيْ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ فِي الْاَسْوَاقِ وَكُنْتُ اَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مِلْءِ بَطْنِيْ۔

میرے دوسرے مہاجر بھائیوں کو بازار کے کاروبار نے اپنے ساتھ مشغول رکھا مگر میں تو صرف پیٹ پر رسول اللہ کے آستانے پر پڑا ہوا تھا۔

غالباً ابوہریرہؓ کی اس پوری روایت کا ذکر کہیں پہلے بھی آچکا ہے حاصل اس کا یہی تھا کہ مہاجرین تو بازار کے کاروبار میں عموماً مشغول رہتے تھے اور انصار کو اپنے باغوں اور کھیتوں کی وجہ سے زیادہ فرصت میسّر نہیں آتی تھی البتہ یہ فقیر ابوہریرہ صرف پیٹ پر پیغمبر کے آستانے پر پڑا ہوا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ فَاَشْهَدُ اِذَا غَابُوْا وَاَحْفَظُ اِذَا نَسُوْا (میں اس وقت حاضر رہتا تھا جس وقت یہ لوگ غائب رہتے تھے اور جن باتوں کو دوسرے بھول جاتے تھے مجھے حاضر باشی کی وجہ سے یاد رہ جاتی تھیں، کیونکہ بار بار سننے کا موقعہ ملتا تھا۔

اگرچہ یہ باتیں کس نوعیت کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ حضرت عمرؓ والی ان ہی دو روایتوں سے ہوسکتا ہے۔ استیذان اصولی طور پر ایک قرآنی قانون ہے، قرآن ہی میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی

دوسرے گھر میں بے دھڑک بغیر اجازت مسلمانوں کو گھسنا نہ چاہیے بلکہ صاحب خانہ کو مانوس بنا کر اور سلام کلام کر کے داخل ہونا چاہیے قرآنی قانون ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ عام ہو چکی تھی باقی سلام کتنی دفعہ کرنا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عمومی طریقہ سے لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ تین دفعہ سلام کرنے بعد بھی جواب نہ ملے تو پلٹ جانا چاہیے۔ بس یہی تین دفعہ سلام کرنا اس کی عمومی اشاعت مسلمانوں میں ضروری نہ تھی۔ پس استیذان یعنی کسی گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی کے وقت سلام کرنے کا جو قرآنی حکم ہے اسی حکم کی یہ تفصیل کہ تین دفعہ سلام کیا جائے یہ ایسا مسئلہ تھا جو عمومی اشاعت پانے والے مسائل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اسی طرح بیت المقدس کے متعلق حضرت داودؑ کا قصہ۔ سو ظاہر ہے کہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ ہر تاریخی واقعہ کی تبلیغ ہر شخص تک کھلی ہوئی بات ہے کہ فرائضِ نبوت میں داخل نہیں ہے بقول ابوبکر الجصاص۔

لَيْسَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوْقِيفُهُمْ عَلَى الْأَفْضَلِ مِمَّا خَيْرُهُمْ فِيهِ۔ (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

یعنی جن امور میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان کے اس پہلو سے امت کے ہر فرد کو آگاہ کرنا جو بہتر اور افضل ہو یہ پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے۔

اسی لئے بعضوں تک پیغمبر کی اس قسم کی باتیں پہنچیں اور بعضوں تک نہ پہنچیں۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی کہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لحاظ سے اس کی جو بھی قیمت ہو لیکن جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہو جانا اس کا ایک لازمی و ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسی کے ساتھ شرعی قوانینِ منصوصہ کی محدودیت اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث و واقعات کی لامحدودیت نے اس ضرورت کو جو پیدا کیا تھا کہ شرعی کلیات کو پیشِ نظر رکھ کر شریعت کے ان ہی محدود قوانین کی روشنی میں نت نئی پیش آنے والی صورتوں کے لئے احکام پیدا کئے جائیں جس کا اصطلاحی نام تفقہ ہے۔ دین اور وہ بھی دینِ اسلامی جو مدعی ہے کہ ہر وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوٰی نبوت و رسالت کے بعد انسان بن کر زمین کے کرے پر قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا اس کے لئے یہ آخری قانون ہے، ایک ایسے عالمگیر

وسیع دینی آئین کے لئے تفقہ کے اس باب کا کھلا رکھنا کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ آپ کو عام دنیاوی قوانین کے ماہرین کے بیانوں سے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کسی محدود علاقے کے لئے محدود زمانے میں حکومتیں ان قوانین کو بناتی ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسا کہ سر سائمنڈ نے اپنی مشہور کتاب "اصولِ قانون" میں لکھا ہے:۔

"بہر حال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصالِ مقدمات ناممکن ہے"۔ (مترجمہ دارالترجمہ سرکار عالی ص۲۲)

تفصیل کے لئے تو دیکھئے میری کتاب "تدوینِ فقہ" یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تفقہ" کی اسی ناگزیر صورتِ حال سے اختلافات کا پیدا ہو جانا لابدی تھا اور وہ پیدا ہوا مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کا ایک بڑا حصہ عموماً ان ہی دونوں باتوں یعنی احاد خبروں کی واقفیت و عدم واقفیت پر مبنی ہے یا اس کا تعلق اجتہادی نقاطِ نظر سے ہے جن کا پیدا ہو جانا اجتہادی کوششوں میں قدرتی امر ہے اور خواہ ان اختلافات کے متعلق نہ جاننے والوں میں جس قسم کے خیالات بھی پھیلے ہوئے ہوں[1]

---

[1] میرا اشارہ اس عام چرچے کی طرف ہے جو مسلمانوں کے متعلق پھیلا ہوا ہے کہ بدترین قسم کی فرقہ بندیوں میں یہ قوم مبتلا ہے غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس پر بسا اوقات چھاتی پیٹتے دیکھا گیا ہے لیکن جو اصل واقعہ ہے اسے اپنی مختلف کتابوں مقالات و مضامین میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ مکتبہ ندوۃ المصنفین نے "مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ" کے نام سے خاکسار کا اسی سلسلہ میں ایک رسالہ بھی الگ شائع کر دیا ہے۔ حاصل یہی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فوج در فوج دنیا کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو اس میں شک نہیں کچھ دن کے لئے جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نت نئے خیالات و عقائد کے رکھنے والے فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں بعض فرقوں کی بنیاد تو سیاسی اختلافات پر مبنی تھی اور ایسے فرقے بھی تھے جو در حقیقت اپنے قدیم موروثی دین اور دھرم کے جراثیم کو بھی اپنے ساتھ لائے، شعوری یا غیر شعوری طور پر شروع میں یہ چاہا گیا کہ اسلامی تعلیمات اور ان کے موروثی خیالات میں تطابق و مصالحت پیدا کی جائے اسی غیر محمود کوشش نے جہاں تک میرے معلومات کا اقتضا ہے ان مختلف فرقوں کو اسلام میں پیدا کر دیا تھا لیکن جوں جوں آئندہ نسلوں کے قدم حقیقی اسلام میں راسخ ہوتے چلے گئے آبائی موثرات کا دباؤ ڈھیلا پڑتا گیا، صحیح اسلام جوں جوں نومسلموں کے سامنے بے نقاب ہوتا چلا گیا، اپنے آبائی خیالات سے ان کا تعلق کمزور ہوتا رہا تا آں کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے بتدریج یہ رنگ اتنا اترا کہ یہ سارے فرقے خود بخود مضمحل ہو کر ناپید ہو گئے صرف مسلمانوں کی مذہبی تاریخوں میں لوگ ان فرقوں کا (باقی بر صفحۂ آئندہ)

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان ہی اختلافات کے سلسلے میں یہ عجیب وغریب صورت حال جو نظر آرہی ہے کہ مسلمانوں کی قوم حالانکہ دنیا کے مختلف اقالیم وممالک میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے۔ تخمینہ کرنے والے افراد کے نزدیک چالیس سے ستر کروڑ افرادِ انسانی پر یہ قوم مشتمل ہے جن میں مختلف زبانوں کے بولنے والی سیکڑوں نسلیں بنی آدم کی شریک ہیں۔ ان میں گورے، کالے زرد، گندمی الغرض ہر رنگ اور ہر شکل کے لوگ ہیں لیکن بایں ہمہ بجز شیعہ وخوارج جن کی اقلیت اتنی ناقابلِ لحاظ اقلیت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں گویا ان کا وجود عدم سمجھنا چاہیئے کہ برابر ہے۔ بہر حال یہ ساری عظیم اکثریت اہلِ سنت والجماعت کے ایک ہی فرقہ کی شکل میں جو پائی جاتی ہے، لوگ اس کو کیوں نہیں سوچتے کہ اختلافات کے ان دو مستقل آتش فشاں پہاڑوں پر جس قوم کی دینی زندگی کی تعمیر کھڑی کی گئی ہے، اسی دین میں وحدت ویگانگت کا یہ حیرت انگیز مدھش مگر ساتھ ہی دلکش روح پرور رنگ کیسے پیدا ہوگیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے لوگوں کا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) نام لکھتے ہیں لیکن دنیا سے ان کا وجود معدوم ہوچکا ہے معمولی چھوٹے ناپرسانِ حال فرقوں ہی کا یہ انجام نہیں ہوا بلکہ بعض بڑے منہ زور، صاحب السیف والقلم فرقے مثلاً معتزلہ تک کا یہ حال ہے کہ اس وقت اس فرقے کے کسی آدمی کا ملنا تو دور کی بات ہے، کتب خانوں میں اس مذہب کے عقائد وخیالات کی کوئی خالص کتاب بھی نہیں پائی جاتی لغت یا تفسیر وغیرہ کے سلسلے میں گنتی کی چند کتابیں ہیں ان میں کچھ ان کے خیالات ملتے ہیں یا اہل سنت نے تردید کے لئے ان کے مسلمات کا اپنی کتابوں میں جو ذکر کیا ہے اس سے کچھ ان کے خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ باقی حنفی، شافعی، مالکی وحنبلی فقہ کے یہ چار مکاتبِ خیال بلاشبہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے اختلافات پر فرقہ بندی کے اختلافات کا اطلاق قطعاً غلط ہے آخر جب ان میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ دوسرے مکتبِ خیال کے ائمہ واکابر کا اسی قدر احترام کرتے ہیں جتنا اپنے بزرگوں کا تو پھر ان میں کسی ایک جماعت کے دین کو دوسری جماعت کے دین سے جدا کیسے قرار دیا جاسکتا ہے، یہی نہیں کہ ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت کے پیروں کے ہاتھ پر بیعت تک کرتے ہیں۔ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادرؒ کا وجود اس کی سب سے بڑی تاریخی مثال ہے۔ فقہاً حضرتِ والا حنبلی مسلک کے پابند تھے لیکن ایسا کون سا مسلمان ہے جو آپ کو سید الاولیا نہیں مانتا۔ واقعی فرقہ کا اطلاق صرف شیعوں پر یا خوارج پر ہوسکتا ہے سو خوارج کا وجود کروڑہا کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہیں ہے۔ شیعہ فرقے کے مسلمانوں کی تعداد اس میں شک نہیں کہ خوارج سے زیادہ ہے لیکن اہل سنت کی اکثریت کثیرۂ عظیمہ کے مقابلہ میں سچ پوچھئے تو ان کی تعداد بھی سمندر میں چند تنکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مطالعہ اگر صحیح ہوتا تو ان کے سامنے ان سارے انتظامات اور استقدامی و احتیاطی تدبیروں کا نقشہ آ جاتا جو شروع ہی سے اس راہ میں اختیار کئے گئے۔ عہدِ نبوت میں تو اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کیا تھی، پیغمبر کا وجود قولِ فیصل تھا جو براہِ راست خدا سے علم پا رہے تھے، ہر اختلاف کا فیصلہ پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا تھا۔ قرآن ہی میں بار بار مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ ہر اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ تاہم ایک چیز اس زمانے میں بھی پیدا ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہانتک میں سمجھتا ہوں اسی کو اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافاتِ باہمی سے مسلمانوں کو جو منع کیا گیا ہے، ہمیں سوچنا چاہئے کہ واقعی اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہر مسلمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہی معلومات اپنے پاس رکھے جو دوسرے رکھتے ہیں، یا یہ کہ ہر مسلمان وہی بات سوچے جو دوسرے سوچتے ہیں، مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ خصوصاً دین کے اس ثانوی حصہ کو جب پیغمبر اس طریقے سے پہنچا رہے تھے کہ اور تو اور ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے مقربینِ بارگاہ کو بھی بسا اوقات اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا ایسی صورت میں یہ خیال کہ معلومات کے اختلاف سے جو اختلاف قدرتاً پیدا ہوتا یا ہو سکتا تھا اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے خود ہی سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اسی طرح جب تفقہ کا باب کھولا گیا تھا اور عرض کر چکا کہ عملی طور پر کوئی دنیوی قانون بھی اس کے بغیر چل نہیں سکتا تو قیامت تک کے لئے ساری دنیا کے لئے جو دینی دستور دیا گیا تھا وہ اس دروازے کے بند کرنے کے بعد نت نئی روزانہ پیش آنے والی صورتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت کیسے رکھ سکتا تھا اور "تفقہ" کے دروازے کو کھلا رکھنے کے بعد یہ توقع کیا پوری ہونے والی توقع ہو سکتی ہے کہ شرعی کلیات اور نصوص کو پیش نظر رکھ کر نئے پیش آنے والے حوادث کے متعلق حکم پیدا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ تک پہنچیں گے۔

میرے نزدیک تو اختلاف سے ممانعت کا اگر یہی مطلب لیا جائے گا تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سارے انسانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کے رنگ کو ایک کر دو

اپنے قدوں کو برابر کرلو، ہر شخص ایک ہی قسم کی آواز منہ سے نکالے، الغرض جو کچھ ایک کے پاس ہے ضروری قرار دیا جائے کہ وہی سب کچھ دوسرے کے پاس بھی ہو اور وجہ یہ بیان کی جائے ان ہی چیزوں کے اختلاف سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ حکم ہمیشہ ان ہی چیزوں کا دیا جاتا ہے یا دیا جا سکتا ہے جو آدمی کے اختیاری حدود میں ہوں۔ بھلا غریب آدمی کے بس میں ہے کہ اپنے چہروں کے رنگ و روغن شکل و صورت، قد و قامت، چال ڈھال وغیرہ قدرتی اختلافات اور انفرادی خصوصیتوں کو مٹا کر ایک کر دے اور جیسے یہ اس کے بس کی بات نہیں یقین کیجئے کہ ذہنی اور دماغی یا باطنی خصائل و غرائز کے فطری اختلافات جن کی وجہ سے فکری اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ان اختلافات کو بھی آدمی اپنی قدرت اور اپنے ارادے سے مٹا نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ تفقہ میں ہر مسلمان فقیہ کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جس نتیجہ تک شرعی قوانین کی روشنی میں دوسرے پہنچیں اسی نتیجہ تک وہ بھی پہنچے اور یہ باور کیا جائے یا کرایا جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہنے والے قرآن کے ان مطالبوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کو تفرق و اختلاف سے بچنے کی شدید تاکیدیں کی گئی ہیں اور عذاب عظیم کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہ ہو گا، مسلمانوں کی تاریخ کے سارے روشن اوراق یقیناً اس کے بعد اچانک سیاہ پڑ جائیں گے۔ میں اوروں کے متعلق تو نہیں کہتا کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات کیا ہیں لیکن جہاں تک اپنی ناقص غور و فکر سے کام لینے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچا ہوں اسے پیش کر دیتا ہوں۔

میں تو یہی سمجھتا ہوں اختلاف و تفرق سے جن آیتوں میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے گا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اسی قسم کا مطالبہ ہو گا کہ کالے رنگ والوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کو گورا بنا لیں ورنہ عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے میرے نزدیک تو دونوں مطالبوں میں اصولاً کسی قسم کا فرق نہیں ہے پس سوچنے کی بات یہی ہے کہ قرآن جس اختلاف سے منع کر رہا ہے وہ ہے کیا؟ یقیناً یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کی تعمیل انسانی دسترس سے باہر ہو آخر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا یعنی وسعت اور گنجائش ہی کو دیکھ کر مطالبہ کیا جاتا ہے یہ بھی تو قرآن

ہی کا کلی قانون ہے جب ہر باب میں اس قانون کی ہمہ گیری مسلم ہے تو اختلاف کا مسئلہ اس کے دائرے سے کیسے باہر ہوسکتا ہے اس معیار پر اس مسئلہ کی جو واقعی حقیقت ہوسکتی ہے اسے متعین کیجئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں یعنی وہی گورے اور کالے کے اختلاف کو دیکھئے، چہروں کے رنگ کے اس اختلاف کو یہ تو ظاہر ہے کہ آدمی ختم نہیں کرسکتا، گوروں کو کالا اور کالوں کو گورا یا رنگینوں کو پھیکا اور پھیکوں کے چہروں پر وہ رنگ نہیں بھرے جاسکتے جو رنگین چہروں والے کی خصوصیت ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر چاہا جائے تو چہروں کے رنگ کے ان قدرتی اختلافات کو مخالفت کا ذریعہ بنا کر بنی آدم کو مختلف ٹولیوں میں یقیناً بانٹا جاسکتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن یہ کیا جارہا ہے کتنی بے دردی کے ساتھ رنگ کے اسی قدرتی اختلاف کو خوں ریز مخالفتوں کا ذریعہ بنالیا گیا ہے پس اختلاف تو ایک قدرتی بات ہے لیکن اس قدرتی اختلاف کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانا یہ قطعاً انسان کی ایک مصنوعی حرکت ہے، قدرتی اختلافات کی راہوں کو بند کرنا اور کلیۃً ان کا استیصال یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے مگر ان ہی قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانی یہ قطعی طور پر آدمی کی اختیاری چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ اس مسئلہ کا یہی اختیاری پہلو ہے، بالفاظِ دیگر مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ معلومات یا افکار و خیالات یا اجتہادی نتائج کے اختلاف کو چاہیئے کہ باہمی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنائیں یعنی ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک طبقہ کے دین کو دوسرے طبقے کے دین سے جدا کرنے کے جرم کے مرتکب نہ ہوں قرآن اسی جرم سے مسلمانوں کو روکنا چاہتا ہے حاصل یہ ہے کہ جن اختلافات کا مٹانا آدمی کے بس میں نہیں ہے ان کے مٹانے یا ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے، بلکہ ان اختلافات کو ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا یعنی ایک کے دین کو دوسرے کے دین سے جدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ فعل چونکہ ہمارے اختیاری حدود میں داخل ہے، اس لئے درحقیقت اسی سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اور منع کرنے کی چیز یہی ہوبھی سکتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں جو حکم دیا ہے وہ بالکل واضح اور بین ہے مثلاً ارشاد ہے :-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران)

اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو ایک دوسرے سے جدا جدا ہوئے اور مختلف ہوئے بعد اس بات کے ان کے پاس "بینات" آچکے تھے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے

آپ دیکھ رہے ہیں اِخْتَلَفُوا سے پہلے "تَفَرَّقُوا" کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں بظاہر اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفرق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلافات کو بنا لیتے ہیں حالانکہ "البینات" ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطۂ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت "بینات" کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آرہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اتنا بیّن اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز، رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے۔

بہر حال ان ہی "البینات" پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے "غیر بیناتی" حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذابِ عظیم کی مستحق بنا دیتی ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں وہ داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہئے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جُدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رُخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اس کا رخ ہے بھی۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ عہدِ نبوت میں ان قدرتی اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارکہ کی وجہ سے تھی ہی نہیں، تاہم اس وقت بھی اختلاف کی

ایک صورت سامنے آہی گئی یعنی زبانوں کا دستور ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان لوگوں میں بھی تھوڑا بہت لہجہ، طریقہ ادا، تلفظ وغیرہ کے اختلافات پیدا ہی ہو جاتے ہیں کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں کے ان اختلافات کا تجربہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اس مشاہدے کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں مذکورہ بالا اختلافات کو ہر جگہ لوگوں نے پایا ہے، ہماری اردو زبان ہی کو دیکھ لیجئے، شمال و جنوب، مشرق و مغرب کے اکثر ہندوستانی علاقوں میں یہ بولی جاتی ہے لیکن باوجود ایک زبان ہونے کے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنوبی ہند کے اردو بولنے والے ایک ہی لفظ کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں کہ شمالی ہند والے اگر چاہیں بھی تو اس طریقے سے اس لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتے اور یہی حال مختلف صوبجاتی مقامی اختلافات کا ہے۔ عربی زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا یہ زبان سارے عرب کی تھی۔ لیکن عرب کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی زبان میں بھی وہ سارے اختلافات پائے جاتے تھے، جن سے کوئی زبان بچی ہوئی نہیں ہے۔ حجاز، یمن، نجد یا مختلف قبائل قریش، بنی تمیم، قحطانی، غیر قحطانی قبائل کے اندر اس قسم کے کافی لسانی اختلافات پائے جاتے تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود جیسی جلیل ہستی جن کی ساری زندگی قریش میں بلکہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں گزری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو قرآن پڑھایا تھا، لیکن نسلاً و اصلاً یہ ذہلی تھے اس لئے حتّٰی کا تلفظ آخر عمر تک وہ عتّٰی کرتے رہے۔ مسند احمد میں ہے کہ مشہور حدیث جس میں ہے کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں گے جب تک ملت عوجاء (ٹیڑھی ملت) سیدھی نہ ہو جائے۔ جس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور جن قلوب پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کھول دیں گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حَتّٰی یُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَیَفْتَحُ بِهَا

اَعْیُنًا عُمْیًا وَّ اٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا۔ حضرت عطاء فرماتے تھے کہ میں نے کعب احبار سے جو تورات کے مستند عالم اس زمانے میں سمجھے جاتے تھے ان سے پوچھا کہ آپ کا علم ان الفاظ کے متعلق کیا ہے یعنی تورات میں یہ الفاظ کیا پائے جاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کعب نے اس کی تصدیق کی صرف فرق یہ نظر آیا کہ

اَنَّ کَعْبًا یَقُوْلُ بِلُغَتِہٖ اَعْیُنًا عُمُوْمِی اٰذَانًا صُمُوْمِی وَقُلُوْبًا غُلُوْفِی۔ یعنی کعب بجائے اعینا عمیا کے اعینا عمومی اور اذانا صما کے اذانا صمومی اور قلوبا غلفا کے قلوبا غلوفی کے ساتھ ان الفاظ کا اپنی لغت کی وجہ سے تلفظ کرتے تھے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۴)

درحقیقت یہ زبان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ لہجہ کا اختلاف ہے جس کی تعبیر عطاء نے "لغت" کے لفظ سے کی ہے۔ کعب یمن کے رہنے والے تھے۔ حجازی لہجہ اور یمنی لہجہ کے فرق کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے "عمیا" کو کھینچ کر یمنی "عموما" اور "صما" کو "صموما" "غلفا" کو "غلوفا" بنا دیتے تھے۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ و لہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوئے۔ غیر اصولی اختلافات کے متعلق چاہیئے کہ باہمی رواداری اور ان اختلافات کے برداشت کرنے کی صلاحیت مسلمان اپنے اندر پیدا کریں۔ لب و لہجہ کے ان ہی اختلافات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عہد مبارک ہی میں عملی طور پر مسلمانوں کی تربیت کا موقعہ مل گیا، بڑے عجیب و غریب دلچسپ اور سبق آموز واقعات اس سلسلہ میں پیش آئے۔ قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت اور تفرق و جدائی کا ذریعہ بنا لینا اس بدعادت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے، معمولی ناقابل لحاظ اسی نوعیت کے غیر اہم اختلافات کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف ہو ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحب عزم و ارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات

مثلاً رنگ ونسل کے اختلافات یا وہمی و فرضی بنیادوں پر جو اختلافات مبنی ہیں، مثلاً وطن[1] اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں، وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ وجدال، قتل وقتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

خیر اس عام قصہ کو چھوڑیئے میں عرب کا ذکر کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہد نبوت میں رونما ہوئے تو شروع میں بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلے میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

"ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو سنا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا۔ اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوں[2]۔ لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لئے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقے سے قرآن کس نے

---

[1] ظاہر ہے کہ چہروں پر مڑھی ہوئی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے زید کے مثلاً بکر کے خاندان میں پیدا ہو جانا یا اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح زمین کا کرہ جو واقعی میں مٹی کا ایک واحد بسیط کرہ ہے ملکوں اور اقلیموں میں اسی خاکی کرے کی تقسیم ظاہر ہے کہ ایک فرضی اور وہمی تقسیم ہے۔ کسی دریا یا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا جو اس پار ہے، پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے۔ اسی طرح الفاظ اور معانی میں کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ آخر کہنے والے اسی ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو جل بھی تو کہتے ہیں مگر لوگوں نے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کینوں اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا اور اس وقت تک کر رہے ہیں وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔

[2] میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ "فکدت ان اساورہ" کا کیا ہے۔ (دیکھو جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۲۴)

پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سنا۔ ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔"

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورہ پڑھی ہے آپؐ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا، ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورہ مجھے نہیں پڑھائی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ اَرۡسِلۡہُ (تم اس کو یعنی ہشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ہشام کی طرف خطاب کر کے فرمانے لگے کہ

"ہشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے۔"

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا۔ جب ان کا پڑھنا ختم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں

هٰكَذَا اُنْزِلَتْ — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ کی طرف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ

"عمر! اب تم پڑھو۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسب ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہو گیا تو دیکھا کہ میری قراءۃ کی طرف بھی اشارہ کر کے فرما رہے ہیں:

هٰكَذَا أُنْزِلَتْ — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔ یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو چاہیئے کہ تمہارے لئے جو آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو۔

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ شارحین حدیث نے "سبعہ احرف" کی شرح میں بہت کچھ لکھا ہے حالانکہ میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی کچھ اسی نوعیت کے اختلافات ہر زبان میں عموماً ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جس تلفظ اور جس طریقہ کی عادی ہے اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ میرے نزدیک ان بزرگوں کی رائے اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعہ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورے میں "تعدد" کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے بیس کا خاص عدد بولنے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے، اور عربی زبان کا یہ ایک علم محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح سے بھی نہیں بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی کے برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی قرآنی اختلافات کی وجہ سے مل گیا۔ کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے کہ قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ و تلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی ہونے کے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً روایتوں میں آیا ہے کہ سورۂ رحمٰن کی آیت "عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ" کی جو آیت ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا کہ اسی کو "عَلٰى رَفَارِفَ خُضْرٍ وَّعَبَاقِرِيَّ حِسَانٍ" کی شکل میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبار "عموما" اور "صما" کو "صمومی"، "غلفا" کو "غلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قصہ اگرچہ ایک شخصی واقعہ ہے لیکن قدرتی غیر ارادی اختلافات کو ارادی و اختیاری مخالفت و مخاصمت کے قالب میں ڈھال دینے کی عادت عربوں میں کتنی راسخ تھی اسی عام عادت کی یہ کتنی اچھی مثال ہے۔ خیال تو کیجئے کہ نماز ہی میں اچھل کر دبوچ لینے کا ارادہ کرنا اور نماز کے بعد گردن میں ہشام بیچارے کے چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانا اور سب سے زیادہ بڑی بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کو محض اس اختلاف کی وجہ سے بے دھڑک کَذَبْتَ (تم جھوٹ بولتے ہو) کہہ دینا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے باب میں عرب کے جذبات کس حد تک نازک تھے مگر پیغمبر کی تربیت نے ان ہی عربوں میں پھر کس رنگ کو پیدا کر دیا؟ یہی حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کسی ناگوار اور بری بات کی خبر آپ کو ملتی تو فرماتے کہ

مَا بَقِيْتُ اَنَا وَهِشَامٌ فَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ ۔ جب تک میں اور ہشام دونوں آدمی باقی یعنی زندہ ہیں اس وقت تک تو ایسا نہ ہوگا۔ (اسد الغابہ ج ۵ ص ۶۱)

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طریقۂ کار کا اعلان ہوا کہ باوجود اختلاف رہنے کے آپس میں ایک کا دوسرے سے جدا ہو جانا یا مخالف ہو جانا غیر ضروری ہے بلکہ اختلاف کے ساتھ اتفاق کو بہرحال باقی رکھنا چاہئے جب قرآنی قرأت کے ذریعہ آپؐ نے صحابہ کی عملی تربیت اس سلسلہ میں شروع کی تو ابتداء میں بعض خطرناک واقعات بھی پیش آئے جن میں سب سے زیادہ اہم حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے، صحابہ میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان میں وہ اَقْرَءُهُمْ تھے یعنی قرآن کے پڑھنے والوں میں یہ سب سے اچھے تھے اَقْرَءُهُمْ

۱؎ چونکہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہشام کے والد حکیم بن حزام کی حقیقی پھوپھی تھیں کچھ تو اس کی وجہ سے ان کی ہستی صحابہ میں ممتاز تھی، ماسوا اس کے قریش کے بھی ممتاز گھرانے سے ان کا تعلق تھا لیکن حضرت عمرؓ میں اس وقت تک اختلافات کے برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اتنے بڑے معزز قریشی آدمی کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت روا رکھیں ۱۲

یعنی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے صحابہ میں وہی ہیں اسی کی سند بارگاہِ نبوت سے ان کو ملی تھی۔ قرآن کے ساتھ ان کی خصوصیت کا ذکر مختلف طریقوں سے کتابوں میں کیا گیا ہے۔ بہرحال ان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ مسجد نبوی میں دو صاحبوں کو نماز میں قرآن کو اس طریقے سے پڑھتے ہوئے انھوں نے سنا جو ان کی قرأت کے مطابق نہ تھا اور خود ان دونوں کی قرأتوں میں بھی اختلاف تھا۔ حضرت ابی ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے دربار رسالت پناہی میں حاضر ہوئے اور جو واقعہ تھا اس کا اظہار حضرت ابی نے کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا تھا مجھے سناؤ، جب دونوں سنا چکے تو حضرت اُبی کہتے ہیں کہ فَحَسَّنَ شَأْنَهُمَا (دونوں ہی کی قرأۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا اور کہا کہ خوب پڑھتے ہو) حضرت ابی جن کا خیال تھا کہ قرأۃِ قرآن میں تمام صحابہ میں سند سمجھا جاتا ہوں ایسی صورت میں ان کے اس احساس پر متعجب نہ ہونا چاہیئے کہ جس قرأۃ کو میں نے ناپسند کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کو ناپسند کریں گے، لیکن ناپسند تو کیا کرتے پڑھنے والوں کی تعریف کی گئی اور پھر ایسی دو قرأتوں کو آپ نے سراہا جن میں خود بھی ہر ایک کی قرأت دوسرے کی قرأت سے مختلف تھی۔ یہ حالات تھے ہی ایسے کہ اُبی جیسے راسخ الاعتقاد مومن کا بیان ہے کہ (العیاذ باللہ) فَسَقَطَ فِي نَفْسِي مِنَ التَّكْذِيبِ وَلَا إِذْ كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ۔

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ حضرت ابیؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرأۃ کے ان قدرتی اختلافات میں سے ہر ایک کے لئے گنجائش پیدا کرنا بلکہ دو مختلف باتوں کی تحسین و تعریف ان کی اس فطرت کے لئے جس میں سرے سے اختلافات ہی کی برداشت کی صلاحیت نہ تھی اسی فطرت کو قرآن کے متعلق تین تین اختلافی شکلوں کے برداشت کر لینے پر آمادہ کرنا ایک ایسی بات تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود پیغمبرؐ کی نبوت اور رسالت ہی کے متعلق شک نہیں بلکہ جیسا کہ وہی کہتے ہیں کہ تکذیب کا شعلہ (العیاذ باللہ) ان کے اندر بھڑک اٹھا، اور کیسا شعلہ؟ کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت یعنی اسلام لانے سے پہلے تکذیب کی جو کیفیت قلب میں تھی اس کو اس

تکذیب سے کیا نسبت[1]؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ اسی حسی ذکاوت پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے پائی جاتی تھی اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اُبی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر ان کے قلب کی حالت کھل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت اس بیچارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لینا ضروری خیال کیا۔ حضرت اُبی کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کر کے

ضَرَبَ فِی صَدْرِی ؎ وہ ہتھڑ میرے سینہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل ہے[2]، توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ مطلب میں نے معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے بعض لوگ جو عربی محاوروں سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی غیر ضروری کوشش اس لئے جو کرتے ہیں تاکہ حضرت اُبی کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے اولاً وہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا پیدا کیا ہوا مطلب مضمحل کر دیتا ہے۔ حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابی ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

[2] فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ دینا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے، ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس واقعہ کا جو حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ بالیدہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک کر فرمایا کہ اب بیٹھے رہو بیان کیا گیا ہے کہ اس نبوی توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی ہے۔

کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ ابی کہتے ہیں:

ففضت عرقا وکانما انظر الی اللّٰہ تعالیٰ فرقا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) (میں اس توجہ کے بعد) پسینے سے تر بتر ہو گیا اور گویا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔

ایک شر تھا جس سے حضرت ابی کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس کا موقعہ ان کو مشکل ہی سے میسر آسکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کر دیا، سارے مقامات طے ہو گئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ ان اختلافات کو بنانا اسی عادتِ بد کا انسداد مقصود ہے، مطالبہ کی کوئی بات اگر ہو سکتی ہے تو یہی ہو بھی سکتی ہے کہ یہی چیز آدمی کے اختیار کی ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتداء سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہد صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپروائیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں قرآنی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت سامنے آگئی کہ مسئلہ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقعہ عملاً آپ کو مل گیا جس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو آپ دیتے رہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی، ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قرآن کو کچھ ایسے طریقے سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس سے میں نے سنا تھا بیان کیا۔ ابن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ

اِقْرَأْ فَکِلَاکُمَا مُحْسِنٌ — دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔

ابن مسعودؓ کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ اخْتَلَفُوْا فَهَلَکُوْا۔ (جمع الفوائد) — آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب وہ تباہ ہو گئے۔

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو، دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قراءتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات نہ تھی کہ اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی لَا تَخْتَلِفُوْا (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آئے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے علم و عدم علم کے اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوئے تھے ان ہی کو پیشِ نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

حدیث سے متعلق عہدِ صدیقی کا ایک اہم وثیقہ اور اس پر مبسوط بحث

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبر آحاد کے معلومات میں کمی و بیشی یا ان کے متعلق علم وعدم علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تفقہ کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج و نظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلاف کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالہ سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

إِنَّ الصِّدِّيقَ جَمَعَ النَّاسَ بَعْدَ وَفَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّكُمْ تُحَدِّثُونَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَادِيثَ تَخْتَلِفُونَ فِيهَا وَالنَّاسُ بَعْدَكُمْ أَشَدُّ اخْتِلَافًا فَلَا تُحَدِّثُوا عَنْ رَسُولِ اللهِ شَيْئًا فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ فَاسْتَحِلُّوا حَلَالَهُ وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ۔ (تذکرۃ الحفاظ الذہبی ج ۱)	حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو، پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں عہدِ صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیقِ اکبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انھوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن

اس کا کیا مطلب ہے ؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو ہر پڑھنے والا ان سے اسی نتیجہ تک پہنچے گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ ہمیشہ کے لئے روک دیا جائے۔

فَلَا تُحَدِّثُوا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کسی قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہو سکتی ہے ؟

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا نہ صرف پچھلے ہی زمانے میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کیا کہا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفاء میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

نزدیک بصدلہ و پنجاہ حدیث از مرویاتِ او در دست محدثین باقی ماندہ است (ج ۲ ص ۲۴) — تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابوبکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہیں۔

لہ شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے یہ سوال اٹھا کر کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبرؐ کے ساتھ ان کے گوناگوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے ؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقعہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا۔ بیچارے حضرت ابوبکر کو چونکہ آنحضرتؐ کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقعہ نہ ملا اور جو ملا بھی سو خلافت اور اس زمانے کی سیاسی پیچیدگیوں کے نذر ہو گیا۔ نیز ان کے زمانے میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، ورنہ جو خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے "محتاج نشدند در بسیارے از احادیث توسط وے بلکہ اکثر آں حدیث از زبانِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند" (ج ۲ ص ۲۴) نیز ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات و حوادث کے پیش آنے کے وقت ہوئی تھی ابوبکر صدیق رضؓ کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ وقائع ان کے سامنے کم پیش آئے۔

ابن جوزی نے ایک سو بیالیس[۱۴۲] حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص[۱۸۵]) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سوڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبرؓ پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں۔ مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے یہ سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے۔

سوال یہی ہے کہ پھر آخر ان کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا، قطع نظر ان باتوں کے کہ نہ عام مسلمانوں ہی نے ان کی اس تجویز پر عمل کیا اور نہ صحابہ نے ان کے اس حکم پر پرواہ کی بلکہ خود ان کا طرز عمل ان کی اس تجویز کے خلاف ہی نظر آتا ہے۔ اصولی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گزر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس کے عمل پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرت اشاعت سے روکتے ہوئے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی ہمت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گزر چکی۔

بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے۔ حقیقت جوئی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آئیے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابوبکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے:

اِنَّکُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَادِیْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْھَا وَالنَّاسُ بَعْدَکُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا۔

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو، جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں بلکہ ناگزیر قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں میں ارادی و اختیاری مخالفتوں کے طوفان جو اٹھائے گئے ان ہی اختلافات کی طرف تاریخ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ دوسرا حادثہ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلا حادثہ تو اس سلسلہ کا وہی تھا جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی قرآن کے قرأتی اختلافات سے قریب تھا کہ پھوٹ پڑے، اور قریب تھا کیا معنی؟ جن واقعات کا ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ کی آگ بھڑک چکی تھی، اور آپ نے دیکھا کتنی بڑی بڑی ہستیاں اس مغالطہ کی شکار ہو چکی تھیں، بلکہ بعضوں کا تو ایمان ہی خطرے میں آ گیا تھا وہ تو نبوت کا مبارک عہد تھا، سر اٹھانے کے ساتھ ہی نبوت کی طاقت سے فساد کے شعلوں کو دبا دیا گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ لَیْسَ مِنْھَا اِلَّا شَافٍ کَافٍ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و مسند النسائی)

اتارا گیا ہے قرآن سات حرفوں پر نہیں ہے ان حروف میں کوئی حرف مگر سب کے سب شفا بخش اور کافی ہیں۔

کے مسلسل اعلانات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرأت قرآن کے قدرتی اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت و عادت صحابہ میں اگر پیدا نہ کر دیتے، تو مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت شاید یہی اختلاف حاصل کر لیتا کیونکہ براہ راست اس کا تعلق قرآن سے تھا۔ اختلاف پسند جھگڑالو طبائع کے لئے قرآن کا لفظ ایک ایسی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا کہ چاہنے والے جتنا چاہتے اسے بڑھا سکتے تھے لیکن فتنہ کی اس آگ کو چونکہ ابتدا ہی میں نبوت کی قوت بجھا چکی تھی، کریدنے والوں نے گو پچھلی صدیوں میں کرید کرید کر اس کو بھڑکانے کی کوششیں کیں لیکن رائے عامہ نے ان اغوائی کوششوں کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ کم از کم میں نہیں جانتا کہ قرأت

قرآن کے قدرتی اختلافات نے کسی ملک میں کسی زمانے میں کسی اجتماعی فتنہ کی شکل اختیار کی ہو۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآنی اختلاف کے مذکورہ بالا حادثہ کے بعد مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں

کو ادا چاہنے والوں نے اس سلسلہ میں کمی کیا کی؟ جن لوگوں نے قرآنی الفاظ کے خاص تلفظ اور خاص لہجوں کی مشق کو اپنا پیشہ بنالیا ہے اور "القرار" کا لفظ جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عام علماء کے مفہوم کو ادا کرتا تھا بتدریج عام معنی سے ہٹتے ہوئے خاص ان ہی پیشہ وروں کے لئے مختص ہو گیا، یعنی خاص تلفظ اور خاص لہجہ میں قرآن پڑھنے کی مشق جن لوگوں نے حاصل کی ہے ان ہی کا نام "قرار" ہو گیا خواہ اس مشق کے سوا اسلامی علوم میں سے کسی علم کا ایک حرف بھی ان کو نہ آتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عرب جس طریقہ سے عربی الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں، اسی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا کرنا ایک اچھی بات ہے اور میرے نزدیک تو ایسے لہجہ میں قرآن کا پڑھنا جس سے اس کی تاثیری کیفیت میں اضافہ بھی ہو، یہ بھی کوئی بری بات نہیں ہے اگرچہ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے، بہرحال بجائے خود تلفظ اور لہجہ کے متعلق "القرار" کی کوششیں محمود کوششیں ہیں لیکن یہ کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا اس نے تو قولاً و فعلاً بار بار اس پر اصرار کیا کہ تلفظ کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور جس سے جس طرح بن آئے اسی طرح قرآن پڑھنے کی اسے اجازت دی جائے۔ عربی لہجہ یا تلفظ میں قرآن پڑھنے والوں کو ان ہی لوگوں کے تلفظ اور لہجہ کو برداشت کرنا چاہیئے جو خالص عربی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا نہیں کر سکتے ہیں۔
حضرت جابر بن عبد اللہ سے ابو داؤد وغیرہ صحاح کی کتابوں میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے وَفِينَا الْأَعْرَابِيُّ وَالْأَعْجَمِيُّ یعنی ان پڑھنے والوں میں بعض لوگ عربی (عرب کے باشندے) تھے اور بعض اعجمی (غیر عربی ممالک) کے بھی لوگ تھے۔ آگے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو خطاب کر کے فرمایا "اِقْرَءُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ" یعنی "پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے"۔ صحاح ہی کی مختلف کتابوں مثلاً ترمذی میں ہے کہ اس کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے جو ملی کہ قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے اور سب کافی اور شفا بخش ہے تو بارگاہ الٰہی میں یہ اس درخواست کے جواب میں بشارت ملی تھی جو حضورؐ نے یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ میری امت میں بوڑھے مرد بھی ہیں بوڑھی عورتیں بھی ہیں، جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ لَمْ يَقْرَءُوْا كِتَابًا (جس نے کوئی کتاب نہیں پڑھی) یعنی ناخواندہ لوگ بھی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں ایک عجمی مسلمان پر اس لئے طعن کہ وہ بے چارا ضاد کے حروف کو اس مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے جس سے عرب اس لفظ کو نکالتے ہیں، کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ السیوطی نے اتقان میں ابو شامہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بعض کم علم لوگوں نے پھیلا دیا ہے کہ حدیث میں "سبعۃ احرف" کے الفاظ جو آئے ہیں ان سے مراد قرأت کے مشہور سات مکاتب ہیں، ان لوگوں کی اس جرأت بے جا کی بھی انھوں نے شکایت کی ہے جو کہتے ہیں کہ قرأت کے مقررہ طریقوں سے جو قرآن نہیں پڑھتا وہ خطا کار ہے بلکہ بعضوں نے تو کفر تک کا فتویٰ صادر کر دیا دیکھو اتقان ج ۱ ص ۱۱۵۔ کچھ بھی ہو اجمالی طور پر بحمد اللہ مسلمانوں پر پیغمبر کی تعلیم ہی کا اثر ہے کہ ان پیشہ ور قاریوں نے جیسا کہ آپ نے دیکھا کفر تک بات پہنچائی ہے لیکن محض اس لئے کہ ان قاریوں کے طریقے سے قرآن پڑھنا چونکہ نہیں آتا اس لئے قرآن کی تلاوت کسی نے ترک نہیں کی (باقی بر صفحہ آئندہ)

کی تاریخ میں یہ دوسرا حادثہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدیقی کے زمانہ میں رونما ہوا جیسا کہ صدیق اکبرؓ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی مخالفت کی اس شکل نے ان ہی حدیثوں کی راہ سے سر اٹھایا تھا جن کا علم کئی ہزار صحابہ میں بکھرا ہوا تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان حدیثوں کے پہنچانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خاص طریقہ اختیار کیا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، یعنی عام طور پر ان حدیثوں کے متعلقہ معلومات کے علم میں لوگوں کی حالت متفاوت اور مختلف تھی اختیار تو کیا گیا تھا یہ طریقہ اس لئے کہ مسلمانوں کی زندگی میں اس سے سہولت پیدا ہوگی بڑھنے والوں کے لئے بڑھنے کی راہیں کھلی رکھی گئی تھیں لیکن اسی کے ساتھ مجرم ہونے سے ان لوگوں کو بچا لینا مقصود تھا جو آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی حدیثوں کا یہ اختلاف اور تفقہ کے جس دروازے کو قیامت تک پیش آنے والی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کھلا رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کا شرعی کلیات و نصوص کی روشنی میں ایک ہی نتیجہ تک پہنچنا ضرور نہ تھا۔ ناگزیر اختلافات کی یہ دونوں شکلیں ایسی تھیں کہ ہلکی سی لغزش سے یہ آتش فشاں پہاڑوں کی شکل اختیار کر سکتے تھے۔

ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان اس کی ایک تاریخی شہادت ہے کہ سابق الذکر یعنی حدیثوں والے اختلاف سے ارادی مخالفت کی پیدائش کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ اسی لئے "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں ان کی تمہیدی تقریر کے ان الفاظ کو ایک خطرناک منزل کا نشان سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت طیبہ میں جن بزرگوں کی تربیت ہوئی تھی خصوصاً قرآنی قرأت کے اختلافات کے ذریعہ سے اس قسم کے اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت جن لوگوں میں آپ پیدا کر چکے تھے جب ان ہی میں حدیثوں کے اس اختلاف نے یہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا تھا تو آئندہ اختلاف کی اس شکل میں کتنی شدت

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) میرا خیال ہے کہ وقت اور موقع ہو تو بیشہ ور قاریوں سے آدمی مزید مشورہ لے لیکن قرآن کی تلاوت کو ان کے مشورہ پر موقوف نہ رکھے۔ اِقْرَءُوا فَكُلٌّ حَسَنٌ (پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل کرتے چلے جانا چاہئے ۱۲

پیدا ہو جائے گی۔ حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ اس کی پیش بینی اور کون کر سکتا تھا انھوں نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا اسی لئے باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس کو انھوں نے مدعو کیا ان کی پیش بینی نے جس خطرے کو ان کے سامنے بے نقاب کیا تھا مجلس کے سامنے اسی کو واضح کرتے ہوئے اس خطرے کے انسداد کی جو تدبیر ان کی سمجھ میں آئی تھی، اسی کو ایک تجویز کی شکل میں ان لوگوں کے سامنے آپ نے رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تمہیدی تقریر کے مطلب کو سمجھ لینے کے بعد ان کی انسدادی تدبیر کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی، کیونکہ جس خطرے کے پیش آجانے کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ دے رہے ہیں۔ اس خطرے سے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً دوچار ہونا پڑا ہے، حتیٰ کہ ابھی کچھ دن پہلے اسی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا اقتدار جس وقت ختم ہوا خواہ بجائے خود اسلام اور اسلامی قوانین سے اس حکومت کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کسی نئی بات کو چھیڑ کر مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کی آگ بھڑکانا آسان نہیں ہے لیکن حکومت کے اس دباؤ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جائز یا ناجائز مزاحمتوں کا اندیشہ دلوں سے نکل گیا۔ اور خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے طرح طرح کے مشورے مسلمانوں کو ملنے لگے، اسی سلسلے میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے یہاں سب سے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ ان احباب سے معافی چاہتے ہوئے جن کے دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگاتے ہوئے مجھے خود بھی تکلیف محسوس ہو رہی ہے مگر کیا کروں، واقعہ کے اظہار کے بغیر شاید صحیح طور پر میں اس چیز کے سمجھانے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتا جس کے سمجھانے کے لئے اس تازہ تاریخی مثال کا میں نے انتخاب کیا ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی مثال کے جو اعاظم رجال و اکابر ابطال تھے اب وہ بیچارے تو دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں پھر بھی بچے کچھے ان کے نام لیواؤں کا خیال آہی جاتا ہے جو اپنے گزرے ہوئے ان ہی بزرگوں کے نشان سرمزار کی حیثیت سے اس طویل و عریض ملک کے بعض گوشوں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اب کچھ بھی ہو کہنا یہ چاہتا ہوں کہ احیاء سنت وقمع بدعت اور خدا جانے کن کن الفاظ، کن کن ارادوں، کن کن نیتوں کے ساتھ کچھ دن پہلے اسی ملک ہندوستان میں

اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے جو اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آرہے ہیں غیر مسنون زندگی ہے، پھر اس غیر مسنون زندگی کو مسنون زندگی بنانے کے لئے اسی خبر الخاصہ، یا خبر الواحد بعد الواحد والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے چن چن کر ان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتداء اسلام ہی سے ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھے، وہ خود بھی جانتے تھے یا ان کو جاننا چاہئے تھا کہ اختلافات کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے نیز آگاہ کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو آگاہ کرتے چلے آئے تھے ہندوستانی مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا تھا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ حیثیت نہیں ہے جو کفر و اسلام بلکہ طاعت وعصیان کے اختلافات کی ہوتی ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہ، جن کی طرف منسوب کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اسی غلط تحریک کی قیادت اور اولیت کو منسوب کر دیں وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ اور اجتہاد سے تھا۔ میں نے اپنی کتاب "تدوینِ فقہ" میں فقہی واجتہادی اختلافات کے متعلق شاہ صاحب کے اقوال مختلف کتابوں سے نقل کر کے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں، اور صحیح محل ان کے ذکر کا وہی کتاب تھی بھی، بہر حال ان ہی اجتہادی مسائل کی حد تک نہیں بلکہ خبر احاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہؒ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے مجھے خیال آتا ہے کہ اسی کتاب میں کسی موقعہ پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب الانصاف سے میں نقل کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ

"ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین وتشریق کی تکبیریں، محرم کا (بحالت احرام حج) نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد (التحیات) کے کلمات جو ابن مسعودؓ

اور ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکار کر کہنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات کو ادا کرنا یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق ہے اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے بلکہ سلف کا اختلاف اگر تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب ہی متفق تھے۔ (انصاف ص ۸۹)

اسی موقعہ پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہی وجہ تو ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتووں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بہ ضرورت ایک امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اور ایک شاہ ولی اللہ صاحب کیا؟ اسلام کے جلیل القدر ائمہ ابو حنیفہ، مالک، شافعی، امام احمد بن حنبل، ان سارے بزرگوں کے اقوال اسی نقطۂ نظر کی تائید میں کتابوں میں موجود ہیں، ان ائمہ سے پہلے تبع تابعین بھی ہمیشہ مسلمانوں کو یہی سمجھاتے رہے۔ چونکہ زیادہ تر ان اقوال کا تعلق ان اختلافات سے ہے جن کا اجتہاد و تفقہ کے نتائج سے تعلق ہے اس لئے بجائے تدوینِ حدیث کے جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی کتاب تھی۔ لیکن خبر احاد کی حدیثوں سے اختلافات کے متعلق یہی شاہ ولی اللہ تنہا آدمی نہیں ہیں ان سے پہلے بھی علماء اور ائمہ نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار ان اختلافات کے متعلق بھی کیا ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان مسائل میں بہتر شکل کیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ مطابق صورت اس مسئلہ میں کیا ہو سکتی ہے؟ ابو بکر الجصاص نے خبر الواحد بعد الواحد کے اختلافات کا تذکرہ کر کے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"ان حدیثوں کی بنیاد پر مسائل کی جتنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ

ان میں جس شکل کو چاہیں اختیار کریں فقہاء اور ائمہ میں یہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان شکلوں میں افضل و بہتر شکل کیا ہے۔" (تفسیر جصاص ج ۱ ص ۲۰۴)

بلکہ الجصاص اور ان کے سوا معتبر علماء کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو خبر احاد کی ان اختلافی روایتوں کے متعلق ایک خیال یہ بھی رکھتا ہے کہ

"مختلف روایتوں کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمان ان شکلوں اور پہلوؤں میں سے جس شکل اور جس پہلو کو چاہیں اختیار کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ہی کر کے دکھایا ہو تاکہ معلوم رہے کہ ساری صورتیں جائز ہیں۔ (تفسیر جصاص ج ۸ ص ۲۰۴)

ائمہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ان اختلافی آثار و روایات کے متعلق زیادہ تر یہی تھا (جس کی تفصیل تدوینِ فقہ میں ملے گی کیونکہ امام کی اہمیت فقہ کے باب میں زیادہ تر ان کے اسی رجحان کی وجہ سے ہے)۔

یہی نہیں بلکہ براہِ راست جن لوگوں کی دینی و علمی تربیت صحابۂ کرام کے زیر سایہ ہوئی تھی اپنے زمانے میں ان کی طرف سے بھی بار بار اسی نقطۂ نظر کا اعلان ہوتا رہا۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھائی محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے قاسم بن محمد کا شمار مدینہ منورہ کے فقہاءِ سبعہ میں ہے وہ بچپن ہی میں اپنی پھوپھی ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آغوشِ تربیت میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے آگئے تھے۔ اجتہادی مسائل کے اختلافات کے متعلق ان کے اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے جو اقوال کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان دونوں حضرات میں جو گفتگو ان اختلافات کے متعلق ہوئی اور آخر میں دونوں نے ان اختلافات کے ہر پہلو کے جواز پر جو اتفاق فرمایا، بقدرِ ضرورت ان سارے قصوں کو اپنی کتاب "تدوینِ فقہ" میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے میں نے بیان کیا ہے[1]، یہی نہیں کہ

---

[1] حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے اپنی متصل سند کے ساتھ رجاء بن جمیل کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ اور قاسم بن محمد دونوں حضرات جمع ہوئے اور حدیثوں کا تذکرہ شروع ہوا عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا جا رہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبدالعزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کر دیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے مخالف ہوتا آخر دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد (باقی بر صفحہ آئندہ)

صرف اجتہادی وفقہی نتائج ہی کی حد تک ان بزرگوں کا یہی نقطۂ نظر تھا بلکہ خبر احاد والی حدیثوں سے جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اس کا اندازہ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں متصل سند کے ساتھ انھوں نے کیا ہے یعنی اسامہ بن زید کہتے ہیں :-

سَأَلْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيمَا لَمْ تَجْهَرْ فِيهِ فَقَالَ إِنْ قَرَأْتَ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ وَإِذَا لَمْ تَقْرَأْ فَلَكَ فِي رِجَالٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ -

میں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے (یعنی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ اس پر قاسم بن محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ ہے اور نہ پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں ہی میں اس کا نمونہ تمہارے لئے موجود ہے۔

(جامع ج ۲ ص ۸۰)

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) ان کے طریقۂ کار سے کچھ گرانی محسوس کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز نے قاسم سے کہنا شروع کیا، آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کر رہے ہیں۔ آخر میں عمر بن عبدالعزیز کا اس باب میں جو خیال تھا اسی کو ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے :

"صحابہ کی روایتوں میں جو اختلافات پائے جا رہے ہیں میں سچ کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے میں اتنا خوش نہیں ہو سکتا جتنا کہ ان اختلافی روایات سے خوش ہوں !"

"سرخ اونٹ" ایک عربی محاورہ تھا انمول جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے اسے عرب "سرخ اونٹ" کہتے تھے کیونکہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی چیز عربوں کی نگاہ میں کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی اسی گفتگو ہی کا شاید یہ اثر تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں فرمایا کرتے تھے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی" آج ان ہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی۔ اب تو آزادی سے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آ جائے وہ کامیاب ہے۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)

جاننے والے جانتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرأۃ کے مسئلہ میں جو اختلافات ہیں ان اختلافات کا تعلق تفقہ و اجتہاد سے نہیں بلکہ خبر احاد کی حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے جس میں امام کے پیچھے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں طرح کی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جنھیں روایت کرنے والوں نے قولاً و فعلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ اگر میں یہ دعوٰی کروں تو اس کی شکل ہی سے تردید ہو سکتی ہے کہ خبر احاد کی روایتوں سے جتنے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، ان میں قرأت خلف الامام کا مسئلہ غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ عہد صحابہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی طور پر بحث و تحیص کا مرکز یہ مسئلہ بنا ہوا تھا مگر اس سلسلہ میں ایسے شدید "خلافیہ" کے متعلق بھی ہمارے پاس اتنا واضح اور صاف تاریخی فیصلہ جب موجود ہے تو نسبتاً ان ہی حدیثوں کی بنیاد پر جن اختلافات کی اہمیت بہت کم ہے ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ حدیثوں ہی کی بنیاد پر سہی، جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت ایسے حلال و حرام امور کی ہے جن پر حرمت و حلت کا حکم شریعت کے اس حصہ کے نصوص پر مبنی ہے جس کی تعبیر قرآن نے "البینات" سے کی ہے۔

امام مصر لیث بن سعد جن کے حالات کا تذکرہ کسی موقعہ پر گزر چکا ہے، ان کے حوالہ سے یحیٰی بن سعید القطان نے یہ کتنی پختہ بات نقل کی ہے یعنی لیث کہا کرتے تھے:۔

مَا بَرِحَ اُولُوا الْفَتْوٰی یُفْتُوْنَ فَیُحِلُّ هٰذَا وَ یُحَرِّمُ هٰذَا فَلَا یَرَی الْمُحَرِّمُ اَنَّ الْمُحِلَّ هَلَكَ لِتَحْلِیْلِهٖ وَلَا یَرَی الْمُحِلُّ اَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِیْمِهٖ۔

(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۰)

فتوٰی دینے والے لوگ ہمیشہ سے فتوٰی دیتے ہوئے اگرچہ کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام ٹھہراتے چلے آرہے ہیں لیکن ان فتوی دینے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا گیا کہ حرام قرار دینے والے یہ سمجھتے ہوں کہ حلال ٹھہرانے والے تباہ ہوگئے (یعنی دین سے خارج ہو کر نجات سے محروم ہوگئے) اسی طرح حلال ٹھہرانے والوں نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ اسی مسئلہ کے متعلق حرمت کا فتوے دینے والے ہلاک و تباہ ہوگئے۔

اور سچ پوچھئے تو کتابوں میں اگرچہ اس قسم کے اختلافی نتائج پر بھی حلال و حرام کے الفاظ کا اطلاق

کر دیا جاتا ہے لیکن یہ صرف خطرناک قسم کی غلطی ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک تو بڑی جسارت ہوگی، اگر حرام و حلال کے الفاظ کا وہی مطلب یہاں بھی سمجھا جائے جو شریعت کے "بیناتی" حصہ میں حلال و حرام کے الفاظ کا مطلب ہوتا ہے، آخر اتنی بات تو تقریباً ہر عامی مسلمان بھی جانتا ہوگا کہ جس چیز کو "البینات" کے نصوصِ صریحہ میں مثلاً حرام قرار دیا گیا ہے اس کی حرمت کا انکار کر کے جو اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دے گا، یا برعکس اس کے "البینات" میں جو چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں ان کو حرام قرار دینے والا دونوں کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا وہ گناہ کے نہیں بلکہ جرمِ بغاوت کے مجرم بن جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے منکر کا جو انجام ہوگا وہی انجام اس قسم کے باغیوں کے سامنے بھی آئے گا۔

پھر کیا کسی حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اسی چیز کی حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو، کیا حلت و حرمت کے یہ اختلافات جو خبر احاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کا بھی اندیشہ کر سکتا ہے کہ اس فتوے کی وجہ سے فضل و قرب کے مدارج و مراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہو گئی ہے، یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات کے حضرت امام ابوحنیفہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یا دعاءِ خیر کرنے سے کسی شافعی کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو۔ فقہی مسائل کے اختلافات کی کیا نوعیت ہے اور خود ائمۂ اجتہاد و تفقہ سے ان اختلافات کے متعلق جو باتیں کتابوں میں ملتی ہیں میں نے کتاب "تدوینِ فقہ" میں سب کو سمیٹ کر ایک ہی جگہ پر جمع کر دیا ہے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی معلومات کے تازہ کرنے کے لئے اس کا مشورہ ضرور دوں گا کہ ناظرین "تدوینِ فقہ" کے اس حصہ کا اس موقع پر مطالعہ کر لیں[1]۔

---

[1] "تدوینِ فقہ" میں علاوہ ائمہ اربعہ دوسرے ائمۂ اجتہاد کے اقوال بھی آپ کو ملیں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والے یہ جو کہتے ہیں کہ ائمہ نے یا علماء نے اختلاف کیا بجائے اس کے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ علماء نے وسعتِ نظر سے کام لیا۔ امت کے لئے سہولت بہم پہنچائی ہے، امام احمد بن حنبل سے پوچھنے والے نے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

میں ذکر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوالِ حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے تھے وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزمگاہوں کا قالب اختیار کر لیا، نماز کی صفیں نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئی تھیں جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹک رہے تھے۔ آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اٹھایا، یا امام ولا الضالین پر جب پہنچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہ کہی کیونکہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں، جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا، خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقعہ کیوں نہ دیا۔ مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں ہی کی مسجدوں سے نکال رہا تھا، اس لئے نکال رہا تھا کہ امام نماز میں قرآن کے جس حصہ کو پڑھتا ہے

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) جب پوچھا اور کہا کہ کیا آپ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں جس کا وضو آپ کے فتویٰ کی رو سے باقی نہیں رہا ہے اگرچہ دوسرے ائمہ کے قول کے مطابق اس کا وضو نہ ٹوٹا ہو، اسی طرح کے بعض دوسرے جزئیات کا بھی اس نے ذکر کیا تو جواب میں فرمانے لگے کہ اے شخص تو کیا کہتا ہے میں سعید بن المسیب (جو افضل التابعین سمجھے جاتے ہیں) ان کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا کیونکہ اس مسئلہ میں سعید کا مذہب بھی یہی تھا کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی موقع پر میں نے یہ بھی نقل کیا ہے اور تقریباً یہ روایت درجۂ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے کہ امام مالک سے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے باصرار بلیغ کہا کہ آپ کے فقہی اجتہادات کو میں بزور شمشیر مسلمانوں میں چاہتا ہوں کہ نافذ کرادوں۔ اس پر امام مالک نے شدت سے اس کو منع کیا اور کہا کہ جس علاقہ کے مسلمان جن امور کے پابند ہو چکے ہیں ان کو اسی حال میں چھوڑ دو۔ میں پوچھتا ہوں کہ امام مالک اگر ان مسائل کو جو ان کے اجتہادی مسائل سے مخالف تھے قطعی طور پر خلاف شرع سمجھتے تھے تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ جن کے نفاذ کا ایک بہترین ذریعہ ان کو مل گیا تھا اس سے نفع نہ اٹھاتے اور مسلمانوں کو غلط مسائل پر قائم رکھنے کا مشورہ دیتے؛ الغرض اسی قسم کی باتیں تقریباً تمام ائمہ کے حوالہ سے اس کتاب میں نقل کی گئی ہیں، کتاب "تدوینِ فقہ" جو ابھی غیر مطبوع ناکمل حال میں ہے اس کا یہ حصہ جس میں فقہی اختلافات کے اس پہلو کا ذکر آیا ہے "نذ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں شائع ہو چکا ہے جامعہ کے تحقیقاتی شعبہ سے غالباً یہ مل سکتا ہے۔ نیز برہان وغیرہ شہری مجلات میں بھی قسط وار یہ سلسلہ شائع ہو چکا ہے۔ ناشرین چاہیں تو صرف اسی مطبوعہ حصہ کو بھی شائع کر کے دین کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بڑی تقطیع کے سو صفحات پر ٹائپ کے حروف میں یہ مقالہ شائع ہوا ہے۔

تم نے اُسے سُنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کے دہرانے میں کیوں مشغول نہ ہوگئے جسے امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا اور بات اسی تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پر پہنچ کر وہ ختم ہوگئی لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے بخوشی و رضا یہ اپنے دین کو لے کر بھی پہنچے جن کی عدالتوں میں پیٹ کے جھگڑوں کے لے جانے پر تو سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن میں ان کے رسول کی حدیثیں تھیں ان سب کتابوں کو لے کر یہ عرض ہوئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دونوں فریقوں میں ان کتابوں کی رو سے واقعی مسلمان کون ہے اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے طیش کی آگ اور غصہ کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا ان فیصلوں پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والی امت کی ایک جماعت عبادت گاہوں سے ڈھکیلی جا رہی تھی جو نہ عیسائیوں کر گرجے تھے اور نہ یہودیوں کی سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دلخراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جا رہا تھا کہ جو مسلمان نہیں تھے ان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے حاصل کیا تھا۔

سوال یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں آج سے تیس چالیس سال پہلے غیروں کی تالیوں اور اپنوں کی گالیوں کے درمیان رسوائیاں اور بر سر بازار فضیحتوں کے مذکورہ بالا قصے جن کی آگ نصف صدی کے قریب قریب ہندوستان کے مختلف گوشوں کے تقریباً ہر اس گھر میں بھڑکی ہوئی تھی جس میں قرآن کی پڑھنے والی اور رسول کو ماننے والی امت آباد تھی۔ یہی میں پوچھتا ہوں کہ ارادی مخالفتوں کی اس آگ کے سلگانے میں کام لینے والوں نے کس چیز سے کام لیا تھا؟ ان اختلافات کے سوا آپ ہی بتائیے اور بھی کوئی چیز تھی جن کا ان حدیثوں کے علم وعدم علم کی وجہ سے پیدا، دجلانا ایک

قدرتی بات تھی جو پیغمبر کی ہی طرف سے عمومی رنگ میں اس لئے نہیں پھیلائی گئی تھیں کہ ان کے مطالبہ اور گرفت میں نرمی اسی تدبیر سے پیدا ہو سکتی تھی اور اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فَلَا تُحَدِّثُوا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ شَیْئًا (رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کرو) اس کا مطلب بھی مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ارادی مخالفتوں کو پیدا کرنے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے وہ منع فرما رہے ہیں، ورنہ جیسا کہ گزر چکا روایتِ حدیث سے مطلقاً ممانعت کی تجویز اگر ہم اس کو قرار دیں گے تو خود ان کے طرزِ عمل، صحابہ کے طرزِ عمل بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے خلاف العیاذ باللہ یہ تجویز ہوگی، بلکہ آگے انہوں نے جو یہ فرمایا کہ "جب تم سے کوئی بات پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تجویز کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہے جو ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لئے حدیثوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور پھیلاتے ہیں انہوں نے اسی لئے قاعدہ ہی بنا دیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لئے حدیثوں کے متعلق کوئی پوچھ گچھ، کنج و کاؤ شروع کرے تو اعلان کر دینا چاہئے کہ مسلمانوں کو اتفاقی نقطہ پر سمٹے رہنے کے لئے وہی باتیں کافی ہیں جنہیں "البینات" کی شکل میں قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قرآن کے "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ غیر بیناتی مسائل میں بھی ایک ہی نقطہ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کی فضول کوشش کی جائے کہ اس کوشش سے بجائے ختم ہونے کے اختلاف بڑھے گا۔ بڑھتا ہی چلا جائے گا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں تم سے زیادہ اختلاف میں سخت ہو جائیں گی۔ بہرحال دین کے غیر بیناتی حصے کے متعلق صحیح مسلک یہی ہے اور اسی کو ہونا چاہئے کہ باہم مسلمان اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے اختلاف کے برداشت کرنے کی صلاحیت اور گنجائش اپنے اندر پیدا کریں، قرآن کے قرأتی اختلاف کو ذریعہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اسی گنجائش کے پیدا کرنے کی مشق صحابہ سے کرائی اور ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مذکورہ بالا تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا خیال یہی ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی مبارک منشا کی تعمیل پر ان مسلمانوں کو آمادہ کرنا چاہا تھا جو ان کے زمانے میں موجود تھے اپنے عہد کے لوگوں کو بھی انہوں نے اسی حکم کی تعمیل کی طرف توجہ دلائی۔ خبر احاد والی روایتوں کی بنیاد پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں فساد اور فتنے سے بچنے کی ایک دوامی تدبیر یہ بتادی کہ جب وہ پیدا ہو یا اس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس زہر کے ازالہ کی یہی صورت ہے کہ قرآن کے "البینات" پر سمٹ جانے اور جمع ہونے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے، دین کے غیر بیناتی مسائل کے ناگزیر قدرتی اختلافات، ارادی واختیاری جنگ وجدال کی شکل اختیار نہ کرنے پائیں، اس خطرے کے انسداد کی واحد تدبیر یہی ہے ورنہ "البینات" سے ہٹ کر "غیر بیناتی" مسائل میں بھی ایک ہی مسلک کا پابند مسلمانوں کو بنانے کا ارادہ جب کبھی کیا جائے گا درحقیقت یہ اجتماع واتفاق کی دعوت نہ ہوگی بلکہ مسلمانوں کو مختلف ٹکریوں میں بانٹنے کی طرف خطرناک اقدام ہوگا، بس سیدھا، صاف، روشن راستہ "لَیۡلُھَا وَنَھَارُھَا سَوَاءٌ" کا یہی ہے کہ "البینات" میں جو ایک ہیں وہ بہرحال ایک ہیں خواہ "غیر بیناتی مسائل" میں وہ جس حد تک مختلف ہوں۔ اس اختلاف سے ان کا اتحاد قطعًا متأثر نہیں ہوتا۔ اختلاف کے ساتھ اتحاد، اور اتحاد کے ساتھ اختلاف کی یہی حکیمانہ درمیانی راہ تھی، جس کی عملی مشق کا موقعہ مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ملا اور ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانے میں قریب تھا کہ راہ سے مسلمان ہٹ جائیں لیکن پُر ہونے سے پہلے فتنے کے اس سرچشمہ پر ہمیشہ کے لئے آپ نے ایک ایسی ڈاٹ لگا دی کہ وقت پر اگر اس کی خبر نہ لی جاتی تو بقول سعدی ہاتھیوں سے بھی اس سیلاب کا روکنا ناممکن تھا[1]۔ صدیق اکبر رضؓ نے اپنے زمانے میں بھی لوگوں کو اسی مسلک پر قائم رکھنے کی کوشش کی، اور آئندہ رہتی دنیا تک کے لئے آپ نے اختلاف کے ساتھ اتحاد کو باقی رکھنے کا یہ کارگر بے خطا نسخہ مسلمانوں کے حوالہ فرمادیا کہ اتحاد کا معیار ہمیشہ دین کے بیناتی حصہ کو رکھا جائے جس کی تعبیر حضرت والا نے "کتاب اللہ" کے لفظ سے فرمائی۔

---

[1] گلستان سعدی کے مشہور کتبی شعر ؎ سرچشمہ باید گرفتن بہ میل ؛ چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل۔ کی طرف اشارہ ہے۔

اور جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل تاریخ میں مسلمانوں کی وسیع وعریض امت جو کروڑہا کروڑ کی تعداد میں دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، دین کے غیر بنیاتی حصہ میں اختلافات رکھتے ہوئے بھی ان کی اکثریت عظیمہ اہل السنت والجماعت کی ایک ہی جماعت کی شکل میں جو پائی جارہی ہے تو یہ اسی حکیمانہ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور جب کبھی غیر دینی یا اندرونی یا بیرونی مؤثرات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس راہ سے منحرف کیا ہے تو وہی صدیقی دعوت جس کا حاصل یہی ہے کہ

"ہمارے اور تمہارے درمیان (اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے آؤ ہم سب اس کی حلال کی ہوئی باتوں کے حلال ہونے پر اور حرام کی ہوئی باتوں کے حرام ہونے پر جمع ہو جائیں"۔

ہمیشہ کام آئی، اور مسلمانوں کی دینی وحدت کی محافظ بن گئی۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی غیر بنیاتی مسائل کے اختلافات شروع ہوئے اور بعض لوگوں میں اس کا جوش پیدا ہوا کہ اختلافی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں جن پہلوؤں کو اپنے معلومات کی بنیاد وہ زیادہ بہتر اور اولیٰ سمجھتے تھے ان ہی پہلوؤں کا پابند ہندوستان کے ہر مسلمان کو بنا دیں لیکن پوری صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ "البینات" پر متحد ہو جانے کے بعد غیر بنیاتی مسائل کے اختلافات کے برداشت کرنے کی گنجائش اب ان میں بھی پیدا ہو چکی ہے اب وہ بھی کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ حقیقت ان پر واضح ہو چکی ہے بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کر کے جی رہے ہیں۔ شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے گا۔[1]

---

[1] پچھلے چند دنوں سے دیکھا جارہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا ہے، بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث یا عامل بالحدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی "شافعی" کبھی "حنبلی" وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں۔ "حنبلی" ہو جانے کے بعد وہی بات سامنے آجائے گی جو پہلے سے چلی آرہی تھی، میں عرض کر چکا ہوں کہ لفظ "حنبلی" کے ساتھ حنفی یا شافعی وغیرہ الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ (باقی برصفحہ آئندہ)

اس میں شک نہیں کہ ایک مختصر سی بات کے لئے غیر معمولی طور پر مجھے طول کلامی سے کام لینا پڑا لیکن سچ پوچھئے تو دیکھنے کی حد تک ابوبکر صدیقؓ کے مذکورہ بالا الفاظ مختصر نظر آتے ہیں لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ خدمت ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے عہد صدیقی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق صرف دو مسئلے اہمیت رکھتے تھے، یعنی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ یہ تو پہلی خدمت تھی جس کی نگرانی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل تھی اس کے ساتھ دوسری اہم خدمت جیسا کہ بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں یہ تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں چاہا جاتا تھا کہ عمومیت کا ایسا رنگ نہ پیدا ہونے پائے جس کے بعد نرمی اور مسامحت کی وہ کیفیت ان میں باقی نہیں رہ سکتی تھی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان حدیثوں کے مطالبہ اور گرفت میں بہرحال باقی رکھنا

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) سارے حنفی و شافعی وغیرہ مسلمانوں میں جس کی شخصیت قدسیہ "غوثیتِ کبریٰ" کے مقام سے سرفراز سمجھی جاتی ہے اور مانا جاتا ہے کہ جن کا قدم مبارک "علی رقبۃ کل ولی" ہے یعنی سیدنا الشیخ عبدالقادر الجیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ "حنبلی" ہیں۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آ رہا ہے، میں نے براہِ راست بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرقۂ اہلِ حدیث کے ایک ممتاز و نمایاں عالم وہیں حاضر ہوئے۔ مولانا ابراہیم سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مرادآبادی نے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ عامل بالحدیث ہیں۔ بولے جی ہاں الحمد للہ۔ مولانا نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے وقت کون سی دعا پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے بولے وہ بھی یاد نہیں ہے۔ الغرض یوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات اور مقامات میں جو دعائیں پڑھا کرتے تھے جیسے اکثر مولویوں کو عموماً یاد نہیں ہوتیں، مولوی صاحب بیچارے کو بھی یاد نہ تھی۔ تب مولانا نے ان ہی اہل حدیث مولوی صاحب کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کیوں مولانا! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لئے آپ نے ضروری خیال نہ کیا۔ کیا اسی کا نام "عمل بالحدیث" ہے۔ کہتے ہیں کہ مولوی ابراہیم جھینپ سے گئے۔ مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانہ میں مولوی ابراہیم نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کے بعد حنفی مسلک پر واپس ہو گئے تھے۔ شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا حضرت مولانا محمد علی کے پاس موجود تھا۔

چاہتے تھے۔ ہر شخص تک ان حدیثوں کو نہ پہنچانا، مکتوبہ مجموعے جو آپ کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے ان کا ضائع کرا دینا عمومی طور پر آئندہ ان حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو منع کر دینا۔ ابوبکر رضؓ کا اپنے ہاتھ سے جمع کی ہوئی حدیثوں کو نذر آتش کر دینا یہ اور اس کے سوا اس سلسلہ میں جن دوسرے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، بتا چکا ہوں کہ غرض وغایت سب کی یہی تھی اور عہدِ صدیقی سے ان ہی حدیثوں کے متعلق مسلمانوں کے ذمہ یہ تیسری خدمت سپرد ہوئی کہ مسلمانوں کو لڑانے بھڑانے، ان کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کا ذریعہ ان حدیثوں کو نہ بنایا جائے۔ بالفاظ دیگر گویا سمجھنا چاہئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ خبر احاد کی حدیثوں میں انفرادی معلومات کے لحاظ سے قدرتاً جو اختلافات رہ گئے ہیں ان کو ارادی و اختیاری مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کا ایندھن اگر کوئی بنانا چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے اس غلط استعمال سے اس کو روکا جائے اس میں شک نہیں عملی طور پر تدوینِ حدیث کی تاریخ میں حضرت ابوبکرؓ کی اس خدمت کا اور اس کی قدر و قیمت کا لوگوں نے بہت کم تذکرہ کیا ہے بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابوبکر صدیقؓ کی طرف مذکورہ بالا روایت جو منسوب کی گئی ہے گزرنے کی حد تک تو تاریخ حدیث کے پڑھنے والوں کے سامنے دوسری روایتوں کے ساتھ یہ روایت بھی گزرتی ہی ہوگی لیکن اس کا واقعی کیا مطلب ہے ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت شاید ہی کسی نے محسوس کی ہو لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عملاً ابوبکر صدیقؓ کی عائد کی ہوئی اس ذمہ داری کو صحابہؓ نے قبول کیا اور بعد کو بھی تقریباً ہر زمانہ میں مسلمانوں کو اس باب میں ہم صحابہ کرام کی اس روش کا پابند پاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کے جو مختلف معلومات ان حدیثوں کے متعلق تھے، اور ان میں ہر ایک اسی پر عامل تھا جو وہ جانتا تھا لیکن عملی اختلاف کے باوجود آج تک کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے کسی صحابی نے دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو یا ان اختلافات کی بنیاد پر اپنے دین کو کسی صحابی نے دوسرے کے دین سے الگ قرار دیا ہو، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں شاید ہی کسی صحابی نے اپنی دینی زندگی کو دوسرے صحابی کی دینی زندگی سے افضل و برتر خیال کیا ہو، کم از کم کوئی روایت مجھ تک تو

ایسی نہیں پہنچی ہے، صحابہ کا بھی طرزِ عمل یہی تھا، جسے ان کے فیض یافتوں یعنی تابعین نے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے حضرت قاسم بن محمد کا یہ فتویٰ جو میں نے نقل کیا تھا کہ پوچھنے والے نے امام کے پیچھے قرأت کے متعلق جب حضرت سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"کہ اگر پڑھو گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں اس کا نمونہ موجود ہے اور نہ پڑھو گے تو اس کا نمونہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے صحابیوں میں تم کو ملے گا۔"

اپنی حکمرانی کے زمانے میں سلف صالح کے جن بزرگوں اور ان بزرگوں کے علم و تحقیق پر بھروسہ کر کے دین کے غیر بیناتی شعبہ میں جن پہلوؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں نے افضل و اولیٰ قرار دے کر غیروں کے سامنے اس کفرستان میں اپنے مذہبی نظام کی وحدت و یکرنگی کے دل آویز سماں کو سیکڑوں سال محفوظ اور قائم رکھا تھا مگر زوالِ حکومت کے ساتھ ہی نہ معلوم کن اسباب و مؤثرات کے تحت اچانک بعضوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا علم اور ان کی تحقیق سلف کے ان بزرگوں کے علم و تحقیق سے زیادہ بہتر اور صحیح ہے جن پر مسلمانانِ ہند نسلاً بعد نسلٍ بھروسہ کرتے چلے آتے تھے اس خیال کے زیرِ اثر عام مسلمانوں سے پھٹ کر اگر اپنے علم اور اپنی تحقیق کے وہ صرف پیرو بن جاتے تو شاید شکایت کرنے والوں کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن وہ آگے بڑھے اور عہدِ صحابہ و تابعین کے تربیت یافتہ دماغوں، اسی عہد کے تقویٰ و طہارت سے منور قلوب کے فیصلوں سے بدکا بدکا اور بھڑکا بھڑکا کر وہ اپنے دماغوں کے پیدا کئے ہوئے نتائج کی تقلید کی دعوت احیاءِ سنت یا اتباعِ سنت کے نام سے اس ملک میں مسلمانوں کو دینے لگے، قرآن جس فعل کو جرم ٹھہرا چکا تھا اور مختلف الفاظ میں اس کے حرام ہونے کا قطعی اعلان کر رہا تھا تفریق بین المسلمین کا یہ فعل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک نہ جرم ہے اور نہ کوئی ایسا کام ہے جو نص قطعی کے رو سے حرام قرار پا چکا تھا، وہ بدترین جرم کا ارتکاب صرف اسی لئے کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پابند بنانے میں شاید وہ کامیاب ہو جائیں جن کی پابندی سے انحراف خود ان کے نزدیک بھی نہ جرم تھا اور نہ گناہ۔ ان جائز پہلوؤں میں جن کا ہر پہلو شرعی حدود سے باہر نہ تھا

زیادہ سے زیادہ وہ پہلو بہتر اور افضل تھا جس کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

اللہ اللہ خبر احاد کی حدیثوں کے اختلاف کا قصہ جو نرم تھا، موم سے بھی زیادہ نرم تھا، اس میں سختی اور شدت بھری گئی ایسی سختی اور ایسی شدت کہ پتھر اور لوہا بھی اس کے سامنے شاید پانی نظر آتا تھا، اختلافی حدیثوں کا یہی سرمایہ ان کا گویا اسلحہ خانہ تھا۔ پیغمبر کی ایک ایک حدیث، حدیث نہیں بلکہ حرب کا آلہ اور ضرب کے اوزار بن چکی تھی وہ اس پر ان ہی حدیثوں میں سے کسی حدیث کو "السکین" (چھری) بنا کر وار کرتا تھا اور یہ اس پر حبل ڈوری کی شکل میں حدیثوں ہی کی کمند پھینکتا تھا اور اپنی اسی جنگ میں کبھی اس صف سے "ظفر مبین" کا شادیانہ بجایا جاتا تھا[۱] اور کبھی اس صف سے "فتح مبین" کا نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، تحقیق کے بعد ہمیشہ یہی ثابت ہوتا تھا کہ ہر فریق جنگ کے پہلے گھنٹے پر جس مقام پر تھا وہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھا ہے اور نہ پیچھے ہٹا ہے، بلکہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے کہ ہر ایک ہتھیاروں کے نہ ختم ہونے والے لامحدود ذخیرے پر قابض تھا۔

بہرحال کچھ بھی ہو اس سارے طول و طویل قصے کے ذکر سے میری غرض یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے ساتھ ان گستاخانہ بازی گریوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کا کوئی بندہ جھگڑنے والوں کے اس گروہ کو اگر یہ مشورہ دے کہ جب تمہارا یہی حال ہے تو ایسی صورت میں حدیثوں کا بیان کرنا ہی ترک کر دو، تو کیا مشورے کے ان الفاظ کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ مشورہ دینے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو دنیا سے ناپید کرنا چاہتا ہے، یا پیغمبر نے اپنی جن حدیثوں سے استفادے کی راہیں امت پر کھلی رکھی ہیں ان کے فوائد سے امت کو محروم کرنا چاہتا ہے۔

کن لوگوں سے کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، کن حالات میں کہہ رہا ہے، گفتگو کی ان تمام ماحولی

---

[۱] پچھلی صدی میں جو رسالے اور کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوتی رہی ہیں ان ہی کے ناموں کی طرف تلمیح کی گئی ہے، یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ان رسالوں میں ایک رسالے کا نام "السکین" (چھری) تھا جو مسئلہ اس کے متعلق لکھا گیا تھا اسی مسئلہ میں دوسرا رسالہ حبل المتین تھا، باقی الظفر المبین اور الفتح المبین تو اس سلسلے کی مشہور کتابیں ہیں۔ بہرحال یہ ایک بڑی طویل تاریخی داستان ہے ۱۲

خصوصیتوں سے قطع نظر کر کے مذکورہ بالا دعویٰ گفتگو کے الفاظ، صرف الفاظ سے تہمت تراشی کی میرے خیال میں یہ بدترین مثال ہوگی۔

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابۂ کرامؓ کو اس واقعہ سے مطلع کرنے کے بعد یعنی تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتے ہو، اور باہم ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے ہو، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ ان اختلافات میں اور زیادہ سخت ہو جائیں گے، ان الفاظ کے ساتھ جو مشورہ دیا تھا کہ

فَلَا تُحَدِّثُوا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا   تم لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔

تو صرف ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کلیۃً حدیثوں کے بیان کرنے سے صحابہ کو روک دینا چاہا خود ہی سوچئے کہ بہتان وافترا کے سوا اور بھی کچھ ہے، صاف اور واضح مطلب اسی کا وہی ہے اور وہی ہو سکتا ہے کہ مخالفانہ اغراض کو ہوا دینے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے لوگوں کو وہ روکنا چاہتے تھے[1]۔ غرض حضرت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے جو معلومات و تاثرات ہیں خواہ مخواہ ان کی پابندی کا مطالبہ اپنے معلومات کے زور پر دوسروں سے کرے بلکہ صحیح مسلک ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یا تفقہ کے سلسلے میں اجتہادی نتائج کے اندر جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں مسلمانوں کو اس قسم اختلافات کے متعلق چاہئے کہ ایک دوسرے کے اختلافات کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں دین کے اس غیر بنیادی حصہ کے اختلافات کے بارے میں مسلمانوں کو ایک ہی نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش غلط کوشش ہے

---

[1] فلا تحدثوا کی ابتدا میں جو ف کا حرف ہے عربی زبان کی معمولی واقفیت رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی جاتی ہے اسی کے نتیجہ کا اظہار جب کرنا چاہتے ہیں تو اس کے شروع میں ف کے حرف کا اضافہ کرتے ہیں پس صاف مطلب اس کا یہی ہے کہ ان کا یہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ مربوط ہے جس سے لوگوں کو آپ نے مطلع کیا تھا اور وہ واقعہ کیا تھا؟ یہی تو کہ حدیثوں کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانے والے بنانے لگے ہیں، اگر آج ہی اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آئندہ اس کے نتائج زیادہ سخت اور زیادہ ہولناک شکلوں میں سامنے آئیں گے ۱۲

اس کوشش کے لئے ہمارے پاس "البینات" کے احکام و مسائل ہیں ان کے متعلق کسی مسلمان میں خدانخواستہ کسی قسم کا انحراف اگر محسوس ہو تو بلاشبہ اس وقت فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے قرآن کی آیتیں تلاوت کی جائیں، نصوص صریحہ کو پیش کر کے اس انحراف اور اختلاف سے اس کو روکا جائے کہ ان میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ دین کا یہی وہ حصہ ہے قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ "بینات" کے ہوتے ہوئے گزشتہ قومیں جدا جدا ہو کر آپس میں مختلف ہو گئی ہیں جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اس حصہ کو اتنا واضح اور روشن شکل میں رکھا گیا ہے کہ عام و خاص، اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب ہی اس پر متفق ہو کر ایک ہو سکتے ہیں "البینات" کے ہوتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دین میں ایسی کوئی چیز تھی ہی کب جس پر ہم سب اپنے اختلافات کو ختم کر کے سمٹ جاتے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ یہی مطلب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان الفاظ کا بھی ہے، جو آخر میں فرمایا کہ یعنی

فَمَنْ سَأَلَكُمْ فَقُولُوا بَيْنَنَا	پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو، کہ ہمارے تمہارے درمیان
وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ فَأَحِلُّوا	(اشتراک کا نقطہ) اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے
حَلَالَهُ وَحَرِّمُوا حَرَامَهُ۔	جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام
(تذکرۃ الحفاظ ج اص ۳)	ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

تابعین کے بعد بھی مسلمانوں کو ہم اسی مسلک کا پابند پاتے ہیں، معلومات کا اختلاف صرف علم تک محدود تھا لیکن "عمل" میں اختلاف کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اہم اصلاحی اقدامات کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے بعضوں کے اندر پھر ان اختلافات کی کچھ لہریں اٹھی تھیں لیکن زہر کے ساتھ ساتھ سیدنا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ایک تریاقی وجود اسلام کو عطا ہوا، آپ نے اپنی بے لاگ صداقت بے تھاہ علم، مستحکم تقوے کے زور سے ان اٹھنے والی لہروں کو اتنی قوت سے دبا دیا کہ پھر صحیح معنوں میں ان اختلافات کو پھلنے پھولنے کا موقعہ مسلمانوں کی عمومیت میں کبھی نہ ملا۔ بعض پیشہ ور مولوی

ان میں ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا رنگ اپنے خاص اغراض کے تحت بھرنا بھی چاہتے تھے تو ان کے خاص تعلیمی حلقوں سے آگے اس کا اثر عام مسلمانوں تک بحمد اللہ کبھی نہیں پہنچا۔ ممکن ہے کہ میرے اس خیال سے بعضوں کو اختلاف ہو لیکن میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ طبقۂ صوفیہ سے لوگوں کو اور جتنی بھی شکایتیں ہوں اس وقت ان سے بحث نہیں ہے لیکن انصاف کی یہ بات ہے کہ غیر بیناتی مسائل کے اختلافات کے جس رنگ کو مولویوں کا ایک گروہ پختہ کرنا چاہتا تھا صوفیہ کا عام گروہ اس کے مقابلہ میں ہمیشہ اس رنگ کو دھیما اور پھیکا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ نہیں تو صوفیہ کے گروہ کا مسلمانوں پر یہی ایک احسان کیا کم ہے۔ بہرحال یہ ایک بڑی مفصل اور مبسوط بحث ہے۔ اہلِ علم کے لئے تو شاید یہ چند اشارے بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن کے لئے اتنے اشارے ناکافی ہیں ان کو میری کتاب "تدوینِ فقہ" کا انتظار کرنا چاہئے کہ ان مسائل کی تفصیل کے لئے وہی کتاب موزوں ہو سکتی ہے۔ امام شافعی کے اصلاحی اقدامات کیا تھے، ان سے بعضوں کو کیا غلط فہمیاں ہوئیں، حضرت امام احمد بن حنبل نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کن تدبیروں سے کیا، ظاہر ہے کہ فقہ اور ائمہ فقہ کے حالات سے ان سوالوں کا حقیقی تعلق ہے ضمناً و ذیلاً تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں بھی ان کا ذکر کر دیا گیا۔ [۱]

---

[۱] مختصراً یہ ہے کہ امام شافعی حجاز سے تعلیم پا کر جب دار الخلافت بغداد پہنچے تو خود ان کا بیان ہے کہ جامع مسجد میں درس کے چالیس حلقوں میں بیٹھنے کے بعد مجھ پر ظاہر ہوا کہ ہر پڑھانے والا نہ اللہ کا نام لیتا ہے اور نہ رسول کا، یعنی نہ کوئی قال اللہ کہتا ہے اور نہ قال الرسول بلکہ ہر ایک قال اصحابنا یعنی میرے استادوں نے یہ کہا۔ بس یہی سننا ہے صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر دین کے اصل سرچشمے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے علماء اسلام کی اس بے تعلقی کو دیکھ کر قدرتاً امام میں برہمی پیدا ہوئی اور اعلان کیا کہ علماء جن کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں ہر ایک کے تشریحات اور اجتہادی فیصلوں کو میں پھر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کر کے جانچوں گا۔ آپ نے بغداد میں بیٹھ کر حنفی مذہب پر تنقید کی اور مصر جہاں ان کے استاد امام مالک کا مذہب زیادہ عروج پر تھا وہاں پہنچ کر مالکی مذہب پر تنقید فرمائی۔ امام شافعی کو اس کا اجر ملتا رہے گا کہ ہٹنے کے بعد دین کے حقیقی سرچشموں کتاب اللہ اور سنت کی طرف مسلمان ان ہی کے طرزِ عمل کی وجہ سے لوٹتے رہے ہیں مگر فروعی اختلافات کو امام شافعی کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت جب حاصل ہو گئی تو امام احمد نے مفاہمت و مصالحت کی راہ کھولی ان کی طرف ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلو کے جواز و عدم جواز کا عموماً انتساب کتابوں میں جو کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر پہلو اس مسئلہ کا ان کے نزدیک شرعی حدود سے باہر نہیں سمجھا جاتا ۱۲

بہر حال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں حدیث کے متعلق جو اہم خدمت انجام پائی وہ یہی تھی اسی حال میں پیغمبر کے دین اور پیغمبر کی امت کو چھوڑ کر آپ اپنے محبوب نبی کے بازو میں جاکر سو گئے۔ آپ کے بعد حضرت عمر فاروق رضہ کا زمانہ آتا ہے (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّكَ وَحَبِیْبِكَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَخُلَفَائِہٖ اَجْمَعِیْنَ)۔

عہدِ فاروقی اور تدوینِ حدیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض احتیاطی طریقۂ عمل کا ذکر عہدِ صدیقی کے واقعات کی ذیل میں کر چکا ہوں اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ کی اشدیت دین کے دوسرے شعبوں میں جیسے نمایاں ہے حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں مستفید نہ ہوتا۔ عدل و انصاف، سیاست و حکومت اور ازیں قبیل دوسرے معاملات میں فاروقِ اعظم کے بے لاگ فیصلوں کا جیسے لوگ اب تک ذکر کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی تاریخ میں بھی حضرت عمر رضہ کے رعب و داب کا وہی اثر ہے، ان کے بہت بعد یعنی تقریباً اس وقت جب دوسری صدی ہجری گزر رہی تھی مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حدیث کے طلبہ ان کے حلقہ میں جب آتے تو ان کی طرف خطاب کر کے کہتے کہ

لَوْ اَدْرَكَنَا وَاِیَّاكُمْ عُمَرُ لَاَوْجَعَنَا ضَرْبًا (جامع ج ۲ ص ۱۳۰) اگر پالیتے ہمیں اور تمہیں عمرؓ تو مار کر دکھ پہنچاتے۔

دراصل سفیان کا اشارہ اشدیت کے ان ہی واقعات کی طرف ہے جن کا روایتِ حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف انتساب کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں بعض فاسد اغراض کے تحت اسی نوعیت کی فاروقی روایات کی کافی تشہیر کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ابوسلمہ راوی ہیں کہ میں نے ابوہریرہؓ سے کہا کہ جس آزادی کے ساتھ آج کل آپ حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی ایسا کر سکتے تھے۔ جواب میں ابوہریرہؓ نے جو بات کہی تھی یعنی

لَوْكُنْتُ أُحَدِّثُ فِي زَمَانِ عُمَرَ مِثْلَ مَا أُحَدِّثُكُمْ لَضَرَبَنِي بِمِخْفَقَتِهِ (الذہبی ج ۱ ص ۷)۔

اگر عمر کے زمانے میں اسی طرح میں حدیثیں بیان کرتا جیسے تم سے بیان کرتا ہوں تو اپنے کوڑے سے عمر مجھے مارتے۔

اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو صرف اندیشہ ظاہر کیا تھا سعید بن ابراہیم کے حوالہ سے الذہبی ہی نے یہ دوسری روایت درج کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے کہ

اِنَّ عُمَرَ حَبَسَ ثَلَاثَةً اِبْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَبَا الدَّرْدَاءِ وَاَبَا مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيَّ فَقَالَ اِنَّكُمْ قَدْ اَكْثَرْتُمُ الْحَدِيْثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (ص ۷)

حضرت عمرؓ نے تین آدمیوں کو روک[1] دیا تھا، ابن مسعود کو ابودردار کو اور ابومسعود انصاری کو اور ان سے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بہت زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اندیشہ واقعہ کی صورت بھی بعض لوگوں کے ساتھ اختیار کر چکا تھا، یہ اور اسی قسم کی بعض دوسری روایتوں کو درج کرکے حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں) سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں انھوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے۔" (جامع ج ۲ ص ۱۲۱)

پھر اس غلط نتیجہ کی تردید میں حافظ نے ایک طویل بحث کی ہے اور آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں بھی شبہ ہے، ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف اس سلسلہ کی منسوبہ روایات کے راویوں پر جرح کرکے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے۔

---

[1] بعض لوگوں نے حبس کا ترجمہ قید بھی کیا ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تینوں صحابیوں کو قید کر دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی روایات کی تعداد

مگر میں کہتا ہوں اور پہلے بھی کہا ہے کہ باوجود روایت ہونے کے اعتماد کرنے والوں نے ان ہی روایتوں پر جب اعتماد کیا ہے تو انصاف کی بات یہی ہے کہ ان حدیثوں کو بھی چاہئے تھا کہ یہ لوگ نہ بھولتے جو روایات ہی والی کتابوں میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ جن روایتوں سے یہ گروہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ان کے اسناد کو یعنی جن راویوں سے یہ روایتیں مروی ہیں اور حضرت عمرؓ سے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن راویوں کے توسط سے مروی ہیں دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ حدیثیں عموماً صحاح ستہ بلکہ بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں اور جن روایتوں کو مخالفتِ حدیث میں یہ لوگ پیش کرتے ہیں کم از کم صحاح کی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ابن جوزی نے تلقیح میں ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں پانسو سینتیس (۵۳۷) بتائی ہے۔ فرض کیجئے کہ متون کے ساتھ طرق کو بھی اس میں شمار کر لیا گیا ہو لیکن ابو نعیم اصفہانی کے اس بیان میں تو اس شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے ابو نعیم حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

اَسْنَدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُتُوْنِ سِوَى الطُّرُقِ مِائَتَيْ حَدِيْثًا وَّنَيِّفًا۔ (تلقیح ص ۱۸۴)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سو سے کچھ اوپر حدیثیں مروی ہیں اس تعداد میں صرف متون کو شمار کیا گیا ہے طرق کی کثرت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

مان لیجئے کہ دو سو حدیثیں سہی۔ خیال تو کیجئے کہ جس شخص کا مسلک یہ قرار دیا جاتا ہو کہ وہ دنیا سے حدیثوں کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہی کیا دو ایک نہیں دو دو سو حدیثوں کا خود راوی بن سکتا ہے؟

اور تعداد کا یہ قصہ تو محدثین کی خاص اصطلاح کی بنیاد پر ہے ورنہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں فن حدیث کے بعض نکات کا ذکر کر کے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ کا شمار صحابہ کے اس طبقہ میں کرنا چاہئے جنھیں مکثرین کہتے ہیں،

نی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار یا ہزار سے بالا ہو۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔

"پس ایں عزیزاں[لہ] از مکثرین باشند وشواہد ایں مقدمہ بسیار است لکن بسط مقال دراں باب فرصتے می طلبد" (ازالہ ج ۲ ص ۲۱۴)

یعنی ان بزرگوں کو چاہئے کہ طبقہ مکثرین (ہزار یا ہزار سے بالا حدیثوں کی روایت کرنے والوں) میں ان کو شمار کیا جائے۔ اس دعویٰ کی تائید میں بہت سی شہادتیں پیش ہو سکتی ہیں مگر اس کی تفصیل کے لئے فرصت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن روایتوں کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتے تھے قطع نظر ان کمزوریوں کے جو ان روایتوں کی سندوں میں پائی جاتی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں صحاح کی ان حدیثوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جن کی اتنی بڑی تعداد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کتابوں میں ملتی ہیں اور یہ بحثیں تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب خواہ مخواہ یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کی طرف یہ روایتیں جو منسوب کی گئی ہیں ان کا مقصد وہی ہے جو حدیث کے مخالفین ان سے سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ معمولی تامل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو روایتوں کے اکثار سے منع فرماتے تھے یعنی چاہتے تھے کہ کَمًّا وَ کَیْفًا حدیثوں کے بیان کرنے میں کثرت کی راہ لوگ نہ اختیار کریں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن صحابیوں کو آپ نے روکا تھا، ان پر الزام حضرت کا یہی تھا کہ تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثار کی راہ اختیار کی آپ کے الفاظ إِنَّكُمْ أَكْثَرْتُمُ الْحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت کو وہ روکنا چاہتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا

لہ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں چند اور صحابیوں کو بھی شمار کیا ہے "عزیزاں" کے لفظ سے سب ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں حضرت عمرؓ بھی شریک ہیں ۱۲

کہ ان کے کس لفظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سرے سے کلیتہً روایتِ حدیث کے رواج ہی کو وہ مسدود کرنا چاہتے تھے بلکہ اسی سلسلہ میں قرظہ بن کعب صحابی سے شعبی نے یہ قصہ جو نقل کیا ہے اور مخالفین حدیث اس کو بھی عموماً اپنے خیال کی تائید میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی شعبی کہتے تھے کہ حضرت قرظہ بن کعب نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ

خَرَجْنَا فَشَيَّعَنَا عُمَرُ إِلَىٰ صِرَارٍ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ قَالَ أَتَدْرُونَ لِمَ خَرَجْتُ مَعَكُمْ قُلْنَا أَرَدْتَ أَنْ تُشَيِّعَنَا وَتُكْرِمَنَا قَالَ إِنَّ مَعَ ذٰلِكَ لِحَاجَةٍ خَرَجْتُ إِنَّكُمْ تَأْتُونَ بَلْدَةً لِأَهْلِهَا دَوِيٌّ بِالْقُرْآنِ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَلَا تَصُدُّوهُمْ بِالْأَحَادِيثِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَشْغَلُوهُمْ جَوِّدُوا الْقُرْآنَ وَأَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِمْضُوا وَأَنَا شَرِيكُكُمْ۔

(جامع ج ۲ ص ۱۲۰ وتذکرۃ الحفاظ)

ہم (مدینہ سے) نکلے تو میری مشائعت میں حضرت عمرؓ صرار نامی مقام تک آئے پھر آپ نے پانی طلب کیا اور وضو کیا، پھر فرمایا تم لوگوں نے سمجھا بھی کہ تمہارے ساتھ میں بھی (مدینہ سے نکل کر یہاں تک) کیوں آیا، میں نے عرض کیا ہم لوگوں کی مشائعت کے لئے آپ تشریف لائے اور ہماری عزت افزائی فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے تب کہا کہ اس کے سوا ایک اور ضرورت بھی تھی جس کے لئے میں مدینہ سے نکل کر تمہارے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ایک ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے تو دیکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو بیان کر کر کے تم لگ ان لوگوں کو (قرآن کی مشغولیت سے) روک نہ دینا قرآن کو استوار کرتے چلے جائیو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔ اب جاؤ میں تمہارا ساتھی ہوں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تین صحابیوں والی روایت میں حضرت عمرؓ نے حدیثوں کے اکثار کی جہاں شکایت کی وہیں قرظہ کی اس روایت میں اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے قطعی طور پر حدیثوں

کی روایت سے لوگوں کو منع نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ

اَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔

ممانعت تو خیر دور کی بات ہے، میں تو حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو روایتِ حدیث کا حکم سمجھتا ہوں، البتہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی کثرت کی راہ نہ اختیار کی جائے ورنہ اقلال اور کمی کی شرط کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کا یقیناً حکم دے رہے ہیں، حافظ ابن عبد البر نے بھی ان روایتوں کا تذکرہ کر کے یہی لکھا ہے کہ

هٰذَا يَدُلُّ عَلٰى نَهْيِهٖ عَنِ الْاِكْثَارِ وَاَمْرِهٖ بِالْاِقْلَالِ مِنَ الرِّوَايَةِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ص۱۲۲)	حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو وہ روکنا چاہتے تھے اور اس کا حکم دے رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

پھر آگے چل کر وہی لکھتے ہیں اور بالکل سچ لکھتے ہیں کہ

وَلَوْ كَرِهَ الرِّوَايَةَ وَذَمَّهَا لَنَهٰى عَنِ الْاِقْلَالِ وَالْاِكْثَارِ۔	اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت مطلقاً ان کے نزدیک ناپسند ہوتی تو چاہئے تھا کہ روایتوں کے بیان کرنے میں کثرت وزیادتی اور قلت وکمی دونوں ہی سے لوگوں کو روک دیتے۔

حضرت عمرؓ کے کثرتِ روایات سے منع کرنے کا مقصود

باقی اکثار سے کیوں منع کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کے منسوب کرنے میں منسوب کرنے والوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع احتیاط کے اسی طریقہ سے ممکن ہے، حافظ ابن عبد البر نے بھی اسی توجیہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے:۔

کثرت روایت سے ممانعت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اسی لئے دیا تھا کہ کثرت کی

صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات کے منسوب ہو جانے کا زیادہ اندیشہ تھا۔
نیز اس کا بھی خوف تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں اور پورا بھروسہ اپنی یاد پر
نہ ہو اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے پر لوگ جری ہو جائیں گے۔

آخر میں اپنے اس بیان کو حافظ نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

إِنَّ ضَبْطَ مَنْ قَلَّتْ رِوَايَتُهُ أَكْثَرُ مِنْ ضَبْطِ الْمُسْتَكْثِرِ وَهُوَ أَبْعَدُ مِنَ السَّهْوِ وَالْغَلَطِ الَّذِي لَا يُؤْمَنُ مَعَ الْإِكْثَارِ (جامع ج ۲ ص ۱۲۲)

روایت میں کمی اور قلت کی راہ اختیار کرنے والوں کے لئے ضبط واحتیاط کی توقع روایتوں میں کثرت کی راہ اختیار کرنے والوں سے بھی زیادہ ہے، نیز بھول چوک اور غلطی سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا جو روایت میں کثرت کی راہ اختیار کرے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ کلیۃً لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے سے روک دیا جائے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ہی حدیثوں کی حد تک لوگ اپنے بیان کو محدود رکھیں، جن کے متعلق پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا یا سنا ہے وہی وہ بیان کر رہے ہیں، ایک خاص حدیث جس کا ذکر آگے آ رہا ہے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بیان کرتے ہوئے لوگوں سے کہا تھا کہ

مَنْ وَعَاهَا وَعَقَلَهَا وَحَفِظَهَا فَلْيُحَدِّثْ بِهَا حَيْثُ تَنْتَهِي بِهِ رَاحِلَتُهُ وَمَنْ خَشِيَ أَنْ لَا يَعِيَهَا فَإِنِّي لَا أُحِلُّ لَهُ أَنْ يَكْذِبَ عَلَيَّ۔ (ص ۱۲۲)

جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظہ میں جما لیا اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کر لیا، چاہئے کہ وہی اس کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے، جہاں تک پہنچ کر اس کا اونٹ رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو دل میں پورے طور پر جما نہیں سکا ہے میں اس کے لئے کبھی اس کو جائز نہ قرار دوں گا کہ میری طرف جھوٹ کو وہ منسوب کرے۔

حافظ نے حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو جو صحاح ستہ بلکہ بخاری ومسلم میں بھی موجود ہیں۔
پیش کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کا وہی مسلک ہوتا، جسے مخالفین حدیث

ان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں تو لوگوں کو اس حدیث کے بیان کرنے کا حکم کیوں دیتے بلکہ ان کے آخری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی یاد پر پورا اطمینان اور بھروسہ نہ ہو صرف ان ہی کو روکنا یہی حضرت عمرؓ کا اصل مقصود ہے۔ حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

يَخْرُجُ مَعْنَاهَا عَلٰى اَنَّ مَنْ شَكَّ فِيْ شَيْءٍ تَرَكَهٗ وَمَنْ حَفِظَ شَيْئًا وَاتْقَنَهٗ جَازَلَهٗ اَنْ يُّحَدِّثَ بِهٖ وَاِنْ كَانَ الْاِكْثَارُ يَحْمِلُ الْاِنْسَانَ عَلَى التَّقَحُّمِ فِيْ اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ مِنْ جَيِّدٍ وَرَدِيٍّ وَغَثٍّ وَسَمِيْنٍ۔ (ص ۱۲۳)

حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حدیث کے متعلق کسی قسم کا شک جو اپنے اندر رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اس حدیث کی روایت ترک کر دے اور جس نے حدیث کو یاد رکھا ہے اور اچھی طرح سے اس کو محفوظ کر لیا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ لوگوں سے اسے بیان کرے، بہر حال اکثار یعنی روایت میں کثرت و زیادتی کے جس طریقہ کا حضرت عمرؓ انسداد کرنا چاہتے تھے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بھلی بری درست و نادرست جو بات بھی ان کے کان پڑی اسے بیان کرنے لگتے ہیں، وہی اس حکم کے مصداق ہیں اور ان ہی سے اس کا تعلق ہے۔

آخر دینی زندگی کی جوہری تعمیر خبر احاد کی ان حدیثوں پر جب موقوف نہیں ہے، اسی لئے ہر مسلمان تک ان کا پہنچانا یوں ہی غیر ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تبلیغ میں عمومیت کی راہ اسی لئے اختیار نہیں فرمائی ایسی صورت میں کھلی ہوئی بات ہے کہ جو کچھ بیان کر رہا ہے بیان کرنے والے کو جب اس پر پورا اطمینان بھی نہ ہو تو خواہ مخواہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے بلکہ مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے میں عائد کی گئی ہیں ان کا اقتضا یہی ہے کہ ایسی روایت سے آدمی دامن کش ہو کر گزر جائے۔ مشہور حدیث نبوی جس میں فرمایا گیا ہے کہ

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ — کسی شخص کے جھوٹ کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا چلا جائے۔

اس میں جیسا کہ حافظ ابن عبد البر نے بھی لکھا ہے، احتیاط کے اسی طرز عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی نقطۂ نظر تھا جس کا ذکر بعض صحابہ اس وقت کرتے تھے جب لوگ ان سے کہتے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کیوں نہیں بیان کرتے۔ بخاری میں حضرت عبد اللہ بن زبیر کے حوالہ سے یہ مکالمہ نقل کیا گیا ہے یعنی عبد اللہ بن زبیر کہتے تھے کہ میں نے اپنے والد زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ عرض کیا کہ آپ کو میں دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے، جواب میں حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ

اَمَا اِنِّیْ لَمْ اُفَارِقْهُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلٰكِنِّیْ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ — واقعہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں کبھی جدا نہ ہوا لیکن میں نے ان ہی سے سنا ہے کہ قصداً مجھ پر جو جھوٹ باندھتا ہے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔

حالانکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیثوں کی کافی تعداد مروی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی حضرت سے کمی روایت کی شکایت تھی، ان ہی شکایتوں کو سن کر آپ فرماتے

اِنِّیْ لَيَمْنَعُنِیْ اَنْ اُحَدِّثَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ الخ۔ (طبرانی) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو میں کثرت سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنْ تَعَمَّدَ والی روایت مجھ کو اس سے روکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ روایت کی کثرت میں حضرت انسؓ کو اس کا اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ بعض صحابی جب زیادہ معمر اور بوڑھے ہو گئے تھے لوگ ان سے عرض کرتے کہ رسول اللہ کی کچھ حدیثیں بیان کیجئے تو فرماتے

كَبِرْنَا وَنَسِيْنَا وَالْحَدِيْثُ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ — ہم اب سن ہو گئے، بھول گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَشَدِيْدٌ۔ (ابن ماجہ) — طرف منسوب کر کے حدیث کا بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔

قرظہ بن کعب جن کو کوفہ رخصت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اقلالِ روایت کی وصیت کی تھی ان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ جب وہ کوفہ پہنچے اور لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کچھ بیان کیجئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ

نَهَانَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (جامع ص ۱۲۱/۲) — ہمیں عمر بن الخطاب نے اس سے منع کیا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ قرظہ نے کہا کہ عمرؓ کی اس وصیت کے بعد

مَا حَدَّثْتُ بَعْدَهُ حَدِيْثًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (جامع ص ۱۲۰/۲) — حضرت عمرؓ کی ممانعت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے میں نے کوئی حدیث نہیں بیان کی۔

حدیثوں کے باب میں احتیاط ہی کی روش تھی جس کی پابندی بعد کو لوگ کرتے رہے، امام مالکؒ کے متعلق ان کے شاگرد رشید امام شافعی تو کلیہ ہی بیان کرتے تھے کہ

كَانَ مَالِكٌ إِذَا شَكَّ فِي الْحَدِيْثِ تَرَكَهُ كُلَّهُ۔ (الدیباج المذہب ص ۲۴) — امام مالکؒ کو جب کسی حدیث میں شک پیدا ہو جاتا تو اس کو کلیۃً ترک کر دیتے (یعنی اس حدیث کو بیان ہی نہیں کرتے تھے)۔

لوگوں نے لکھا ہے کہ حضرت امام مالک کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کے کمرے سے سات صندوق نکالے جن میں صرف ابن شہاب زہری کی حدیثوں کے مسودات بھرے ہوئے تھے، مسودوں کی حالت یہ تھی کہ

ظُهُوْرُهَا وَبُطُوْنُهَا مَلَأى۔ — یعنی ہر ورق کے دونوں صفحات بھرے ہوئے تھے۔

ان کو باہر نکال کر لائے اور امام مالک کے شاگردوں کے حوالہ کیا۔ لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کو معلوم ہوا کہ ان مسودوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے امام مالک نے ایک چیز بھی کسی کے سامنے ان سے بیان نہ کی تھی۔ ان ہی کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ

لَمَّا مَاتَ مَالِكٌ فَأُصِيبَ فِي بَيْتِهٖ صَنَادِيقُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا لَيْسَ فِي الْمُوَطَّا مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا حَدِيْثَيْنِ۔ (ص ")	جب امام مالک کی وفات ہوئی تو گھر میں چند صندوق پائے گئے جن میں عبداللہ بن عمرؓ کی روایتیں تھیں ایسی روایتیں جن میں سے ان کی کتاب موطا میں صرف دو حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

امام مالک کی کتاب موطا کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ شروع میں دس ہزار حدیثوں پر یہ کتاب مشتمل تھی، لیکن ہر سال امام مالک اس پر نظر ثانی کرتے اور جس روایت میں معمولی شک بھی ہوتا اس کو کتاب سے ساقط کر دیتے۔ اس طریقہ سے بڑا حصہ روایتوں کا موطا سے خارج ہو گیا (دیباچ ص۲۵)۔ امام مالک خود بیان کرتے تھے کہ ابن شہاب زہری سے میں نے جتنی حدیثیں سنی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔

الخطیب نے امام بخاری کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ

تَرَكْتُ عَشَرَةَ آلَافِ حَدِيْثٍ لِرَجُلٍ فِيْهِ نَظَرٌ وَ تَرَكْتُ مِثْلَهٗ أَوْ أَكْثَرَ بِغَيْرِهٖ فِيْهِ نَظَرٌ۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۵)	کسی شخص (راوی) کی روایت کردہ دس ہزار حدیثوں کو میں نے اس لئے چھوڑ دیا کہ اس شخص میں کوئی بات محل غور و فکر نظر آئی تھی اور اسی قدر یا اس سے زیادہ مقدار والی حدیثوں کو میں نے اسی لئے ترک کر دیا کہ ان کے بیان کرنے والے میں بھی کوئی بات قابلِ غور نظر آئی۔

احتیاط کرنے والے اس سلسلہ میں کن حدود تک پہنچ گئے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر ابن عساکر نے تاریخِ دمشق میں کیا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے ایک محدث ابن رستم ہیں جن کا نام احمد بن مہدی بن رستم تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ

إِفْتَقَدَ مِنْ كُتُبِهٖ كِتَابُ قُبَيْصَةَ ثُمَّ رُدَّ عَلَيْهِ فَتَرَكَ قِرَاءَتَهٗ۔ (ج ۲ ص ۱۰۱)	قبیصہ (تابعی) کی روایت کردہ حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ گم ہو گیا، بعد کو گم ہونے کے بعد وہی نسخہ ابن رستم کو مل گیا مگر اس لئے کہ درمیان میں نسخہ غائب ہو گیا تھا اس کی مندرجہ روایتوں کا پڑھنا چھوڑ دیا۔

یعنی ان کو شبہ ہوا کہ جس زمانہ میں کتاب غائب رہی ممکن ہے اس میں کسی نے کچھ کمی و بیشی کردی ہو صرف اس شک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حصہ کا پڑھنا ہی انھوں نے ترک کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ حدیثوں کی روایت میں احتیاط کی ان نزاکتوں کا احساس خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا کرایا ہوا تھا، عرض کر چکا ہوں کہ من کذب علی متعمداً والی روایت قریب قریب تواتر کے درجہ میں جو پہنچ گئی ہے اس کی وجہ وہی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً صحابہ میں روایتِ حدیث کی ذمہ داریوں کو مختلف طریقوں سے راسخ کرانا چاہتے تھے، صحاح کی کتابوں میں تو مجھے یہ روایت نہیں ملی لیکن امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار میں اپنی متصل سند کے ساتھ اس کو درج کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، مجلس میں حضرت مالک بن عبادہ صحابی بھی شریک تھے، آپ نے فرمایا کہ

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَھِدَ اِلَیْنَا فِیْ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ فَقَالَ عَلَیْکُمْ بِالْقُرْاٰنِ وَاِنَّکُمْ سَتَرْجِعُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ یَّشْتَھُوْنَ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ فَمَنْ عَقَلَ شَیْئًا فَلْیُحَدِّثْ بِہٖ وَمَنِ افْتَرٰی عَلَیَّ فَلْیَتَبَوَّأْ بَیْتًا اَوْ مَقْعَدًا فِیْ جَھَنَّمَ۔ (مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۷۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (آخری حج) میں ہم لوگوں کو اس عہد کا پابند بنا کر فرمایا کہ چاہئے کہ قرآن کو پکڑے رہو، قریب ہے کہ تم ایسے لوگوں کے پاس واپس کئے جاؤ گے جو چاہیں گے کہ میری حدیثیں ان سے بیان کرو بس اس سلسلہ میں جس کسی نے کسی بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہئے کہ اس حدیث کو بیان کر دے (اور یاد رکھو) کہ قصداً میری طرف جو جھوٹ کو منسوب کرے گا اسے اپنا ٹھکانہ یا (فرمایا) کہ اپنا گھر چاہئے کہ جہنم میں بنالے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وداعی وصیت کے ان الفاظ میں اور حدیثوں کی روایت کرنے میں حضرت عمرؓ لوگوں پر جن الفاظ کے ساتھ تاکید فرماتے تھے۔ کچھ بھی فرق ہے اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی مبارک وصیت کی تجدید اپنے عہد

خلافت میں حضرت ابوبکرؓ بھی اور حضرت عمرؓ بھی فرماتے رہے، صحابہ کو بھی روایت حدیث کی
ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی اور صحابہ کے بعد مسلمانوں کی جو جماعت حضرت عمرؓ
کے سامنے آئی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے استفادے کا موقع تو کیا ملتا،
ان میں بڑی تعداد ایسوں کی تھی جنھوں نے پیغمبر کو دیکھا بھی نہ تھا مگر حضرت عمرؓ کی دار و گیر کی
غیر معمولی سختیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جب بڑے بڑے صحابہ میں کامل اطمینان کے بغیر حدیثوں کی
روایت کرنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی تو دوسروں کے لئے جسارت کا موقعہ ہی کیا تھا، یہی وجہ تھی
جو امیر معاویہؓ اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ

عَلَيْكُمْ مِنَ الْحَدِيْثِ بِمَا كَانَ فِيْ عَهْدِ عُمَرَ فَإِنَّهُ قَدْ أَخَافَ النَّاسَ فِي الْحَدِيْثِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (تذکرۃ الحفاظ ص)

لوگو ان ہی حدیثوں کو قبول کرو، جو عمرؓ کے زمانے کی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے پر عمرؓ نے لوگوں کو ڈرایا اور دھمکایا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اکثار یعنی بہ کثرت حدیثوں کی روایت سے ممانعت کی صرف یہ توجیہ
کہ زیادہ روایت کرنے والوں سے احتیاط کی توقع جیسی کہ چاہئے نہیں کی جاسکتی۔ عام حالات میں
تو یہ صحیح ہے مگر مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ صحابہ میں بھی اور صحابہ کے بعد بھی محدثین میں
ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کی یادداشت اور حافظہ کی قوت کا تجربہ کیا گیا۔ تجربے ثابت
ہوا کہ دو تین نہیں بلکہ سیکڑوں حدیثیں ان بزرگوں کو اس طریقہ سے یاد تھیں کہ سال سال بھر کے
بعد ان سے دوبارہ پھر وہی حدیثیں پوچھ کر لکھی گئیں اور پہلے لکھائے ہوئے مسودے سے ان کا
مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف کی کمی بیشی نہیں پائی گئی۔ آخر جن لوگوں کو اپنی روایتوں پر اتنا اعتماد ہو
جیسا کہ ابوزرعہ کے حال میں گزر چکا کہ قسم کھانے والے نے یہ قسم کھائی کہ ابوزرعہ کو ایک لاکھ
حدیثیں اگر زبانی یاد نہ ہوں تو میری بیوی کو طلاق پڑجائے پھر ان:- سے دریافت کرنے آیا۔
جواب میں ابوزرعہ نے کہا تھا کہ اطمینان سے تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔ ظاہر ہے کہ اس
سے زیادہ اطمینان کی کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے۔

میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی روایتوں کے متعلق جن کے اطمینان کی یہ حالت ہو آخر ان کو کثرتِ روایت سے روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یاد رکھنے والوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی روایت کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ حضرت عمرؓ بھی لوگوں سے یہی کہتے تھے کہ جن لوگوں نے میری باتوں کو یاد رکھا ہے، چاہیئے کہ وہ ان کو دوسروں تک پہنچائیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ ہی کے حوالہ سے ان کا ایک قول حدیثوں کی روایت کے متعلق نقل کیا ہے، یعنی قیس بن عباد کہتے تھے:

سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ مَنْ سَمِعَ حَدِيْثًا فَادَّاهُ كَمَا سَمِعَ فَقَدْ سَلِمَ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۳)

میں نے عمر بن الخطابؓ سے سنا کہ جس نے حدیث سنی اور جو کچھ سنا تھا اسی کو اس نے ادا کر دیا تو وہ محفوظ ہو گیا (یعنی روایت کی ذمہ داریوں کو اس نے پورا کر دیا)۔

ظاہر ہے کہ حضرت کے یہ الفاظ عام ہیں، ان لوگوں کو بھی شامل ہیں جن کی روایتوں کی تعداد قلیل ہو، اور ان کو بھی جن کی روایتوں کی تعداد کثیر ہو، شرط صرف یہ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ اس نے سنا ہوا سی کو اگر وہ بیان کر رہا ہے تو اپنی ذمہ داری اس نے پوری کر دی۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے متعلق جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ يُنْظَرُ اِلَيْهِ وَيُؤْخَذُ عَنْهُ (جامع ج ۲ ص ۸۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ان لوگوں میں ہیں جن کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ان سے (دین) کو اخذ کیا جاتا ہے۔

اگر یہ ان ہی کا بیان ہے اور نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں، رسول اللہ کے اصحاب کے متعلق جس کا یہ خیال ہو اور ان ہی صحابۂ کرامؓ کی باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں جو اہمیت حاصل ہو سکتی تھی اس کا اظہار بار بار مختلف مواقع میں جو بایں الفاظ کرتا ہو کہ

اَنْتُمْ مَعَاشِرُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتٰى مَا تَخْتَلِفُوْنَ

تم لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، جب تم ہی لوگ اس میں اختلاف کرو گے تو جو تمہارے بعد آنے والے

يَخْتَلِفُ مَنْ بَعْدَكُمْ۔ (ازالۃ الخفاج ۲ ص ۹۸) ہیں وہ بھی باہم مختلف ہو جائیں گے۔

جو ان ہی صحابیوں کو خطاب کر کرکے یہ پیش گوئی کرتا ہو کہ

أَنْتُمْ أَصْحَابُ بَدْرٍ وَقَدِ اخْتَلَفْتُمْ فَمَنْ بَعْدَكُمْ أَشَدُّ اخْتِلَافًا۔ (ازالۃ الخفاج ۲ ص ۸۸)

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں میں ہو جو بدر میں شریک تھے تم ہی جب اختلاف کر رہے ہو تو تمہارے بعد جو ہوں گے وہ زیادہ اختلاف کریں گے۔

کیا اسی فاروقی بصیرت سے یہ امر مخفی رہ سکتا تھا کہ ان ہی صحابیوں میں خبر آحاد کی حدیثیں عام طور پر مشہور و معروف ہو کر عمومیت کا رنگ جب اختیار کرلیں گی تو آئندہ نسلوں میں یہی رنگ کتنا پختہ اور گہرا ہوتا چلا جائے گا اور دین کے اس حصہ کی تبلیغ میں خاص روش پیغمبر نے قصداً جس مصلحت سے اختیار کی تھی اس مصلحت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

کچھ بھی ہو میرا خیال تو یہی ہے کہ منجملہ دیگر مصالح و وجوہ کے اقلالِ روایات پر حضرت عمرؓ کے اصرار کا ایک راز یہ بھی تھا، ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ نے قرظہ والی روایت جس میں اَقِلُّوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (روایتیں رسول اللہؐ سے کم بیان کرنا) کی وصیت کو فہ رخصت کرتے ہوئے صحابہ کی ایک جماعت کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی تھی، اسی روایت کو الدارمی کی کتاب سے نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے دارمی ہی کا ایک تشریحی فقرہ جو اس حدیث کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا یہ بھی درج کیا ہے:

قَالَ أَبُو مُحَمَّدٍ (هُوَ الدَّارِمِيُّ) مَعْنَاهُ عِنْدِي الْحَدِيثُ عَنْ أَيَّامِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ السُّنَنَ وَالْفَرَائِضَ۔ (ص ۱۴۱)

ابو محمد (یعنی دارمی) نے کہا کہ میرے خیال میں حضرت عمرؓ کے اس قول کا (یعنی اقلالِ روایت پر اصرار) کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام کی حیثیت سنن اور فرائض کی نہیں۔

الدارمی کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ افسوس ہے کہ اس کی تفصیل کا صحیح مقام "تدوینِ فقہ" والی کتاب ہو سکتی ہے، تاہم مختصراً یہاں بھی اتنا اشارہ نامناسب نہیں ہوگا کہ "البینات" میں نے دین کے جن عناصر و حقائق کا نام رکھا ہے اس کی تعریف تو پہلے کر چکا ہوں لیکن مصداقاً

قرآنی مطالبات اور ان کے عملی تشکیلات ان کے اہم اجزاء ہیں مثلاً اقیموا الصلوۃ میں الصلوۃ کا مطالبہ قرآن میں کیا گیا ہے لیکن الصلوۃ کی عملی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ۔ میرے نزدیک الدارمی کے مذکورہ بالا الفاظ میں فرائض سے قرآنی مطالبات اور سُنن سے ان ہی فرائض کی عملی شکلیں مقصود ہیں۔ کچھ یہی نہیں بلکہ عام طور پر حدیثوں میں فرائض کے بعد سنن کا لفظ جہاں جہاں آیا ہے میں تو اس کا مطلب یہی سمجھتا ہوں ، مثلاً حضرت ابو موسیٰؓ جب کوفہ کے والی حضرت عمرؓ کی طرف سے مقرر ہو کر آئے تو اس وقت آپ نے تقریر کرتے ہوئے یہ جو کوفہ والوں سے فرمایا تھا کہ

بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اُعَلِّمُکُمْ کِتَابَ رَبِّکُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ۔	مجھے تم لوگوں کے پاس عمر بن الخطابؓ نے اس لئے بھیجا ہے کہ تمہارے رب کی کتاب (قرآن) تمہیں سکھاؤں
(ازالۃ الخفاء۔ ج ۲ ص ۲۱۵)	اور تمہارے رسول کی سنت کی تعلیم تمہیں دوں۔

تو کتاب کے بعد سنت کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے وہ کتابی اور قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں ایک شخص نے جب یہ مطالبہ پیش کیا کہ

لَا تُحَدِّثُوْنَا اِلَّا بِالْقُرْاٰنِ۔	قرآن کے سوا ہمارے سامنے اور کچھ نہ بیان کرو۔

تو یہی "سنن" تھے جن کو پیش کرتے ہوئے آپ نے سمجھایا تھا کہ ان "سنن" یا عملی طریقوں کے بغیر قرآنی احکام کی تعمیل کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے ، روایت میں ہے کہ جس شخص نے کہا تھا کہ قرآن کے سوا اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کیا جائے ، حضرت عمرانؓ نے اس سے کہا کہ میاں ! ذرا میرے قریب آجاؤ ۔ جب وہ آپ کے پاس آگیا تو آپ نے اس کو سمجھانا شروع کیا ، پہلے آپ نے الصلوۃ ہی کو لیا جس کا بار بار قرآن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے ، پوچھنا شروع کیا ؛

اَرَاَیْتَ لَوْ وُکِلْتَ اَنْتَ وَاَصْحَابُکَ اِلَی الْقُرْاٰنِ اَکُنْتَ تَجِدُ فِیْہِ صَلٰوۃَ الظُّھْرِ	تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقاء ہیں صرف قرآن ہی پر ٹیک لگالیں گے ، تو کیا قرآن میں پا سکتے ہو کہ ظہر

أَرْبَعًا وَصَلٰوةَ الْعَصْرِ أَرْبَعًا وَالْمَغْرِبَ ثَلَاثًا۔ کی نماز چار رکعتوں پر اور عصر کی بھی چار اور مغرب کی نماز تین رکعتوں پر مشتمل ہے۔

پھر آپ نے تمثیلاً حج کا ذکر کیا اور فرمانے لگے:

أَرَأَيْتَ لَوْ وُكِلْتَ أَنْتَ وَأَصْحَابُكَ إِلَى الْقُرْآنِ أَكُنْتَ تَجِدُ الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَالطَّوَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقاء ہیں صرف قرآن ہی پر ٹیک لگالیں گے تو تم قرآن میں پاسکتے ہو کہ بیت اللہ (کعبہ) کا طواف سات دفعہ کرنا چاہیئے اور صفا و مروہ کا طواف بھی سات دفعہ کرنا چاہیئے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے حج کے متعلق یہ بھی پوچھا تھا کہ

وَالْمَوْقِفَ بِعَرَفَةَ وَرَمْيَ الْجِمَارِ۔ عرفات میں وقوف (قیام) اور رمی جمار کے مسئلہ کو کیا قرآن میں تفصیلاً پاسکتے ہو۔

یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا قرآن میں اسلامی حکمرانوں کو جو ذمہ دار بنایا گیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ

وَالْيَدَ مِنْ أَيْنَ تُقْطَعُ أَمِنْ هٰهُنَا أَوْ مِنْ هٰهُنَا۔ اور ہاتھ کس طریقہ سے کاٹا جائے، کہاں سے، یہاں سے یا وہاں سے؟

راوی کا بیان ہے کہ پہلے آپ نے گٹے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ یہاں سے پھر کہنی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے؟ پھر کندھے کے قریب ہاتھ لے گئے اور پوچھا کہ کیا یہاں سے[1]؟

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت اس مسئلے کے تفصیلات میرے پیش نظر نہیں ہیں تفصیلات کے لئے کتاب "تدوین فقہ" کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں مجھے الدارمی کے ان الفاظ کی شرح مقصود ہے جن کا حضرت عمرؓ والی روایت کے اندراج کے بعد انہوں نے اضافہ کیا ہے یعنی "فرائض" اور "سنن" کے متعلق اقلال کا یہ حکم حضرت عمرؓ نے نہیں دیا تھا بلکہ اَلْحَدِيثَ عَنْ أَيَّامِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے آپ کے اس حکم کا تعلق ہے، یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایسے موقعوں پر "سنن" کو

[1] الکفایہ خطیب ج ۱۲ ص ۱۶۔

لفظ "فرائض" کے بعد جب بولا جاتا ہے تو مراد ان سے قرآنی فرائض و مطالبات کی عملی شکلیں ہوتی ہیں اور یہی وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کی اشاعت میں تو عمومیت ہی مقصود ہے پھر ان کے متعلق "اقلال" کا حکم حضرت عمرؓ کیسے دے سکتے تھے۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے یا آپ کے سامنے کرنے والے جو کچھ کرتے تھے یا ان ہی دنوں میں بجائے عام امت کے خاص خاص افراد سے جو باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں یا خاص لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کرتے دیکھا تھا۔ الغرض عہدِ نبوت کی وہی چیزیں جن کی عمومی اشاعت پیغمبرؐ کی طرف سے نہیں کی گئی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ایام کا جو لفظ دارمی نے استعمال کیا ہے اس کا یہی مطلب ہے جیسا کہ میں یہی کہتا چلا آرہا ہوں۔ امام بخاری نے بھی اس قسم کی حدیثوں کی تعبیر قریب قریب ان ہی الفاظ سے کی ہے انہوں نے بھی اپنی مرتبہ کتاب صحیح بخاری کا یہ نام جو رکھا ہے یعنی

"اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِیْحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ اُمُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَیَّامِہٖ"

میں نے پہلے بھی اس کا تذکرہ کہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ایامہ" یہ ان ہی حدیثوں کی تو تعبیر ہے جنہیں اپنی کتاب میں امام نے جمع کیا ہے۔ الدارمی اور بخاری میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایام کے ساتھ "امور" کا اضافہ بھی امام بخاری نے کیا ہے اور الدارمی نے صرف "ایام" کے عام اور حاوی لفظ کو کافی خیال کیا بظاہر یہ ایک قسم کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، گویا "خبر آحاد" کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے وہی بات یعنی دین کا بنیادی حصہ غیر بنیادی چیزوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے جو یہ طریقہ فرمایا تھا کہ ایک کی تبلیغ و اشاعت میں عمومیت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پورا زور صرف کر دیا گیا اور گو پہنچانے کی حد تک پہنچا تو دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شعبے کو بھی لیکن اس کو ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے زمانے میں اس امتیاز کے باقی رکھنے پر زور دیا اور یہی غرض حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان

تدبیروں سے تھی، جن کا انتساب روایتوں میں ان کی طرف کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی ازالۃ الخفا میں حدیثوں کے متعلق حضرت عمرؓ کے خدمات کی تفصیل کرتے ہوئے منجملہ دوسرے مصالح کے ان روایات کا ایک مطلب یہ بھی قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

باستقرا، تام معلوم شد کہ فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیر آں مصروف می ساخت۔

(ص ۱۴۱)

اچھی طرح چھان بین تلاش و تفتیش سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز پیدا کرنے پر جی رہی یعنی وہ حصہ جس سے شرائع کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے تعلق تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصہ میں انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے؛

"تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر" کے الفاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات ہی کا تعلق ہے گویا الدارمی نے "سنن" کے لفظ سے جس مقصد کو ادا کیا تھا، شاہ صاحب نے زیادہ واضح الفاظ میں ان ہی کی تعبیر کی ہے۔ اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ

لہذا احادیث شمائل و احادیث سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت می کرد۔

(ازالۃ الخفا، ج ۲ ص ۱۴۱)

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل شکل و صورت سے جن حدیثوں کا تعلق تھا اور سنن زوائد (یعنی قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات کے سوا) حدیثیں، جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس و عادات سے تعلق ہے حضرت عمرؓ اس قسم کی حدیثوں کو کم بیان کرتے تھے۔

ان روایتوں کو حضرت عمرؓ خود بھی کم بیان کرتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے تھے کہ ان کا زیادہ چرچا نہ کریں یعنی اقلال روایت کی توجیہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ

اینہا از علوم تکلیفیہ تشریعیہ نیست یحتمل کہ چون اہتمام تام بروایت آں بکار برند بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدیٰ

چونکہ ان حدیثوں کا شمار ان علوم میں نہیں ہے جن کا مکلف لوگوں کو بنایا گیا ہے اور عام تشریع و قانون کی حیثیت ان کی نہیں ہے اس لئے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ توجہ

مشتبہ گردد۔ ان کے بیان اور اشاعت کی طرف کی جائے گی تو سنن زوائد اور سنن

(ص ۷) ہدیٰ باہم ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ خلط ملط ہو جائیں گے۔

دارمی یا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال کے پیش کرنے سے میری غرض یہی ہے

کہ "اقلالِ روایت" کی جو وجہ میں نے بیان کی ہے یہ میرا کوئی انفرادی خیال نہیں ہے بلکہ اربابِ تحقیق

نے دوسرے مصالح و وجوہ کے ساتھ مختلف الفاظ میں مجھ سے پہلے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

کچھ بھی ہو خبر آحاد والی روایتوں کے متعلقہ خدمات میں سے ایک خدمت جو یہ تھی یعنی

عمومیت کی ایسی کیفیت ان میں نہ پیدا ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بیناتی حصہ کے

مطالبوں کی جو قوت ہے کہیں اسی قوت کو لوگ اس میں محسوس نہ کرنے لگیں جیسے عہد نبوت میں

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نگرانی فرمائی اور گو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وقت

ہی کیا ملا، لیکن جتنا وقت بھی ملا، جہاں دوسرے فرائض آپ نے ادا کئے وہیں اس کی طرف بھی

آپ نے خاص توجہ مبذول رکھی پھر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو اپنے عہدِ خلافت

کے ابتدائی سالوں میں ہم ان کو بھی اس مسئلہ کی طرف متوجہ پاتے ہیں، بعد کو کچھ واقعات پیش آئے

جن کا ذکر آئندہ آرہا ہے لیکن اس سے پہلے ان ہی حدیثوں کی وجہ سے قدرتاً معلومات میں لوگوں

کے اختلاف کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اختلاف کو اختیاری

و ارادی مخالفت کے قالب میں ڈھلنے سے جیسے روکا تھا میں چاہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نے اس سلسلے میں جو کاروائیاں کی ہیں پہلے ان کا تذکرہ کراؤں۔

اس قسم کے مسائل میں بعض چیزوں کے متعلق تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی

روایتیں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کے دونوں پہلوؤں کے جواز اور تصحیح کی آپ

نے کوشش کی ہے۔ مثلاً نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی جائے یا آہستہ،

یا رکوع سے نماز میں سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی اٹھائے جائیں یعنی وہی رفع الیدین کا مشہور خلافیہ

یا اور اسی قسم کے متعدد مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دونوں طرح کی روایتیں کتابوں

میں ملتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان مختلف روایات کو درج کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ حضرت عمرؓ دونوں پہلوؤں کے جواز کے قائل تھے مثلاً رفع الیدین کے اختلافی روایات کے ذکر کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

وَالْاَوْجَهُ عِنْدِیْ اَنَّ عُمَرَ رَأٰی رَفْعَ الْیَدَیْنِ عِنْدَ الرُّکُوْعِ وَالْقَوْمَةِ مِنْهُ مُسْتَحَبًّا فَکَانَ یَفْعَلُ تَارَةً وَیَتْرُكُ اُخْرٰی۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۳)	میرے نزدیک سب سے زیادہ لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ رکوع میں جانے اور سر اٹھانے کے وقت ہاتھ اٹھانے (یعنی رفع الیدین) کو مستحب خیال کرتے تھے اسی لئے کبھی کرتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے۔

یہی بات کہ مسئلہ کے دونوں اختلافی پہلو کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے بسم اللہ کے باآواز و بلند و پست کے قصے میں درج کرنے کے بعد شاہ صاحب نے بھی اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے جس کا تفصیلی ذکر میں پہلے کر چکا ہوں یعنی قرآنی الفاظ میں قرارت اور تلفظ کے اختلافات کے ہر پہلو کو جائز قرار کافی ٹھہراتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں اختلافات کے برداشت کرنے کی جو گنجائش پیدا کی تھی، اسی واقعہ کا ذکر شاہ صاحب نے بھی کیا ہے بسم اللہ والے اختلافی روایات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

اَلْاَوْجَهُ عِنْدِیْ اَنَّ عُمَرَ تَعَلَّمَ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ قِصَّةٍ مَعَ هِشَامِ بْنِ حَکِیْمٍ اَنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کُلُّهَا کَافٍ شَافٍ (ص ۹۲)	میرے خیال میں لگتی ہوئی بات یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قصے میں جو ہشام بن حکیم کے ساتھ پیش آیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سیکھی تھی کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے سب ٹھیک اور شفا بخش ہے۔

اس کے بعد پھر بسم اللہ کے متعلق حضرت عمرؓ سے نقل کرنے والوں نے مختلف روایتیں جو نقل کی ہیں، سب ہی کی شاہ صاحب نے تصحیح کی ہے اور قرار دیا ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے اسی لئے کبھی یہ کرتے تھے کبھی وہ کرتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے عجیب بات لکھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ صرف قراتوں کے

اختلافات ہی کی حد تک نہیں بلکہ قرآنی عبارت کے مطالب کے سمجھنے میں بھی دو مختلف نقاطِ نظر کی تصحیح کی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخی نظیر چھوڑی ہے یہ مسئلہ کافی دلچسپ مگر ذرا تفصیل طلب ہے خلاصہ یہ ہے کہ پانی کے نہ ملنے کی صورت میں بجائے وضوء کے تیمم کرکے نماز پڑھ لینی چاہیئے، یہ تو خیر اتفاقی مسئلہ ہے لیکن بجائے وضوء کے اگر کسی کو غسل کی حاجت ہو یعنی ناپاک اور جنب ہونے کے بعد کو نہانا چاہے اور پانی وقت پر نہ ملے تو بجائے غسل کے تیمم ہی کرکے کیا نماز پڑھ سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اب تو سارے ائمہ اجتہاد کی طرف سے اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جاتا ہے یعنی طے کر دیا گیا ہے کہ تیمم جیسے وضوء کا قائم مقام بن سکتا ہے اسی طرح غسل کی قائم مقامی کا کام بھی ضرورت کے وقت تیمم سے لیا جاسکتا ہے۔

لیکن تیمم کے مسئلہ کی جو تاریخ ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتداءِ اسلام میں بعض لوگ تیمم کو صرف وضوء ہی کا قائم مقام سمجھتے تھے اور غسل کے مسئلہ میں ان کا خیال تھا کہ

لَا يَتَيَمَّمُ الْجُنُبُ وَاِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَاءَ شَهْرًا۔ (بحوالہ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۹)

جنب (یعنی ناپاک آدمی) تیمم نہ کرے خواہ مہینہ بھر ہی اسے پانی نہ ملے۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی خیال تھا، ان دونوں حضرات کے اس خیال کی بنیاد تھی، اس وقت اس کی تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہے بلکہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں اس موقعہ پر جو ایک عجیب و غریب نکتہ درج کیا ہے صرف اس کا ذکر مقصود ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یعنی تیمم غسل جنابت کا قائم مقام ہو سکتا ہے یا نہیں اس میں ابتداءً اختلاف ایک سفر کے موقعہ پر حضرت عمر اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان میں پیش آیا، حاشیہ[1] میں جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] قصہ یہ ہے کہ ایک دن کوفہ میں ابو موسیٰ اشعری صحابیؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے یہی مسئلہ پوچھا کہ بجائے غسل کے ناپاک آدمی کیا بصورت تیمم نہیں کرسکتا اس پر عبداللہ نے کہا کہ ہاں نہیں کرسکتا خواہ پانی ایک مہینے تک نہ ملے۔ تب ابو موسیٰ نے قرآن کی آیت سورۂ مائدہ والی تلاوت کی جس میں دوسری باتوں کے ساتھ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

سفر سے واپس ہونے کے بعد مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا ہر ایک نے اپنا خیال اور خیال کی جو بنیاد تھی بارگاہِ نبوت میں اسے عرض کیا۔ روایت کو لوگوں جس طریقہ سے بیان کیا ہے جس کی حاشیہ میں تفصیل کی گئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمارؓ ہی کے خیال کی تائید کی، صرف غسل والے تیمم کے متعلق ان کا جو یہ خیال تھا کہ گرد میں لوٹ پوٹ کر پورے جسم پر گرد کا اثر پہنچانا چاہیئے، صرف اس خیال کی ترمیم کردی گئی اور سمجھا دیا گیا کہ وضوٗ والے تیمم کی شکل غسل کے تیمم کے لئے بھی کافی ہے۔ بظاہر چاہیئے تو یہی تھا کہ اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ اپنے خیال سے ہٹ کر عمارؓ کے خیال کو مان لیتے لیکن حاشیہ والی روایت میں ابن مسعودؓ نے جو یہ کہا کہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) یہ بھی ہے کہ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ (یعنی لگو تم عورتوں کو) فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً (پھر نہ پاؤ تم پانی) فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (تم تیمم کرو پاک مٹی کے ساتھ) جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہم بستری میں مبتلا ہونے کے بعد پانی اگر کسی کو نہ ملے تو تیمم کرلے۔ ابن مسعودؓ بجائے اس بات کے کہ آیت کا جواب دیتے کہنے لگے کہ اگر اس کی اجازت دے دی جائے گی تو معمولی سردی اور ٹھنڈک میں بھی لوگ بجائے غسل کے تیمم سے کام چلانے لگیں گے۔ ابو موسیٰؓ نے کہا کہ اچھا تو تم لوگ تیمم کو جو ناپسند کرتے ہو اس کی وجہ یہ ہے؟ ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہاں! اب حضرت ابو موسیٰؓ نے ابن مسعودؓ کو حضرت عمرؓ اور حضرت عمارؓ کے سفر کا واقعہ یاد دلایا جس میں عمرؓ اور عمارؓ میں اسی مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا۔ عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ بجائے غسل کے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرکے نماز پڑھنی چاہیئے مگر عمارؓ کو وضوٗ والا تیمم تو معلوم تھا لیکن غسل کی جگہ تیمم کرنے کی شکل کیا ہونی چاہیئے اس کا علم ان کو نہ تھا۔ قیاس کرکے انہوں نے زمین میں لوٹ لگائی۔ گویا بجائے پانی کے خاک دھول سے انہوں نے غسل کیا۔ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، قصہ جو پیش آیا تھا دہرا دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ سے کہا کہ زمین لوٹ لگانے کی ضرورت نہ تھی صرف یہ کافی تھا یعنی اشارہ کرکے آپ نے بتایا کہ وضوٗ والا تیمم جیسے کیا جاتا ہے بس یہی غسل کے لئے بھی کافی تھا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے عمارؓ ہی کے خیال کی توثیق ہوتی ہے جضرت عمرؓ کا خیال اگر صحیح ہوتا تو چاہیئے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمارؓ سے کہتے کہ تم نے جو تیمم کیا وہی غلط تھا۔ ابو موسیٰؓ نے ابن مسعودؓ کو یہی یاد دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمارؓ کے خیال کی توثیق کی تو غسل کا قائم مقام تیمم نہیں ہوسکتا اس خیال کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے ابن مسعودؓ نے ابو موسیٰؓ کے اس بیان کو سن کر کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ (تم نے نہیں دیکھا کہ عمارؓ کے قول پر حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا)۔ ۱۲

اَلَمْ تَرَ اَنَّ عُمَرَ لَمْ یَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ — تم نے نہیں دیکھا کہ عمارؓ کے قول پر حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس فیصلہ کے صادر ہونے کے بعد بھی حضرت عمرؓ اپنے خیال ہی پر قائم رہے اور حضرت عمرؓ ہی نہیں بلکہ ابن مسعودؓ جو عمارؓ والے واقعہ سے واقف تھے انہوں نے بھی حضرت عمرؓ ہی کے خیال کا اعادہ ابو موسیٰؓ کے سوال پر کیا۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ میں سخت پیچیدگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بھلا یہ کون مان سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد بھی حضرت عمرؓ کا اپنے خیال پر اصرار باقی رہا۔ لیکن واقعہ بیان کرنے والے جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سامنے یہی دشواری جو روایت کے الفاظ سے پیدا ہوتی ہے آئی، اسی دشواری کا حل ان کی سمجھ میں جو آیا ہے وہ یہ ہے، فرماتے ہیں کہ

وَتَتَبَّعْتُ اَنَا فَوَجَدْتُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰھُمْ اخْتَلَفُوْا فِیْ تَاْوِیْلِ الْاٰیَتَیْنِ اٰیَۃِ الْمَآئِدَۃِ وَاٰیَۃِ النِّسَآءِ فَصَوَّبَ کِلَا التَّاْوِیْلَیْنِ وَتَرَکَ کُلَّ مُؤَوِّلٍ عَلٰی تَاْوِیْلِہٖ۔ (ص ۸۹)

یعنی چھان بین سے میں نے اس مسئلہ میں جہاں تک کام لیا اس سے مجھ پر واضح ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ اور عمارؓ کو دیکھا کہ قرآن کی دو آیتوں کے مطلب کی تعیین یعنی تاویل میں مختلف ہو گئے ہیں یعنی سورۂ مائدہ[۱] اور سورۂ نساء کی آیتوں کی تاویل یعنی مطلب کے سمجھنے میں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا کہ جس نے قرآن سے جو کچھ سمجھا وہ ٹھیک ہے اور ہر ایک کو آپ نے اسی کے مسلک پر چھوڑ دیا۔

---

[۱] دراصل دونوں آیتوں میں لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کے الفاظ آئے ہیں۔ میں نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی اتباع میں لٰمَسْتُمْ کا ترجمہ "لگو تم" کے لفظ سے کیا ہے۔ محل اختلاف درحقیقت یہی لفظ لٰمَسْتُمْ کا معلوم ہوتا ہے عام طور پر اس کا مطلب "ہم بستری" سمجھا جاتا ہے لیکن لگنے کے اردو لفظ میں جیسے اس کی گنجائش ہے کہ بجائے ہم بستری کے اس کا مفہوم "چھونا" لیا جائے یعنی عورتوں کے بدن کا صرف چھونا مراد ہے نہ کہ ان کے ساتھ ہم بستری کرنا۔ چونکہ قرآنی لفظ میں دونوں کی گنجائش ہے اس لئے بعض لوگوں نے ہم بستری مراد لیا اور بعضوں نے صرف عورت کا چھونا مراد لیا ہے۔ ثانی الذکر طبقہ کا خیال ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے پس اسی ٹوٹے ہوئے وضو کے متعلق قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ پانی اگر نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو، ایسی صورت میں (باقی برصفحہ آئندہ)

یہ ارقام فرمانے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ

وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَجَلُّ اَنْ يَخْفٰى عَلَيْهِ هٰذَا الْحَدِيْثُ وَاَتْقٰى لِلّٰهِ مِنْ اَنْ يَبْلُغَهُ هٰذَا الْحَدِيْثُ ثُمَّ لَا يَقُوْلُ بِهٖ اِلَّا لِمَعْنًى فَهِمَهٗ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(ص ۸۹)

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ ان پر یہ حدیث پوشیدہ رہتی اور خدا سے ڈرنے والوں میں جتنے زیادہ ڈرنے والے وہ تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ رسول اللہ کی یہ حدیث ان تک پہنچی اور اس کے بعد بھی اس کے وہ قائل نہ ہوئے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کوئی بات ان کی سمجھ میں آئی۔

شاہ صاحب کا مقصد مبارک یہ ہے کہ گو بظاہر عمارؓ والی روایت کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے حضرت عمرؓ کے، عمارؓ ہی کے خیال کی توثیق فرمائی یعنی غسل کی جگہ بھی آدمی بضرورت تیمم کر سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کے بعد بھی حضرت عمرؓ اپنے خیال پر جمے رہتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابن مسعودؓ جو حضرت عمرؓ کے اس مسئلہ میں ہم نوا تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کردہ طرزِ عمل کے خلاف فتویٰ دیتے۔

شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے اور بجا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دوسرے حالات جو تواتر کے ساتھ امت تک پہنچے ہیں قطعاً ان کا یہ اصرار جو گویا پیغمبرؐ کے حکم سے سرتابی کے مرادف ہے مخالف ہے،

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) تیمم غسل کا قائم مقام ہو سکتا ہے یا نہیں، قرآن کی آیت سے اس کا حکم نہ نکلے گا۔ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ اَشَارَ الشَّافِعِيُّ اِلٰى اَنَّ عُمَرَ وَابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَا يَحْمِلَانِ الْمُلَامَسَةَ عَلَى اللَّمْسِ بِالْيَدِ (امام شافعیؒ نے اشارہ کیا ہے حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ ملامسہ (لگنے) کا مطلب عورتوں کو ہاتھ سے چھو لینا لیتے تھے) شاہ صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ فَكَانَتِ الْاٰيَتَانِ سَاكِتَتَانِ عِنْدَ هُمَا مِنَ التَّيَمُّمِ عَنِ الْجَنَابَةِ (پس حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ کے خیال کے مطابق سمجھا جائے گا کہ سورۂ نساء و مائدہ کی دونوں آیتیں غسل والے تیمم سے خاموش ہیں) یعنی ان دونوں آیتوں میں اس کا حکم نہیں بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت عمرؓ و ابن مسعودؓ کی اس تفسیر کی بنیاد پر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں نے قرآن کے خلاف مسلک اختیار کیا ہے۔ ۱۲

پس یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ گو حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر تشفی فرمائی کہ تمہارے لئے وضو والے تیمم کا کر لینا کافی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طرزِ عمل سے حضرت عمرؓ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میرے خیال کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید نہیں فرمائی ہے بلکہ آپ نے عمارؓ کو یہ سمجھا دیا کہ تم نے جب قرآن سے یہی سمجھا تھا کہ غسل کا قائم مقام بھی تیمم ہو سکتا ہے تو وضو والا تیمم کر لیتے۔ اور حضرت عمرؓ کو بھی آپ نے چھوڑ دیا کہ قرآن سے تمہاری سمجھ میں اگر یہی آیا ہے کہ تیمم کی آیتوں کا غسل سے تعلق نہیں ہے تو تم کو بھی اپنے مسلک پر قائم رہنے کا اختیار ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ عذر جسے شاہ صاحب نے پیش کیا ہے، اگر صرف اسی پر اکتفا کر کے وہ گزر جاتے تو مشکل ہی سے ان کی یہ توجیہ شاید لائق پذیرائی ہو سکتی تھی بلکہ ایسی صورت میں میرے نزدیک تو یہ بات زیادہ آسان تھی کہ راویوں کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا کہ خدا جانے واقعہ کی تعبیر میں ان سے کیا غلطی ہوئی جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ پر ایسا صریح الزام عائد ہوتا ہے۔

لیکن اسی مقام سے شاہ ولی اللہؒ کی محدثانہ وسعت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے مذکورہ بالا عذر کو پیش کرنے کے بعد شاہ صاحب نے النسائی کے حوالہ سے ایک روایت بھی نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ

عَنْ طَارِقٍ اَنَّ رَجُلًا اَجْنَبَ فَلَمْ یُصَلِّ فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَہٗ فَقَالَ اَصَبْتَ فَاَجْنَبَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَتَیَمَّمَ وَصَلّٰی فَاَتَاہُ فَقَالَ لَہٗ نَحْوًا مِمَّا قَالَ لِلْاٰخَرِ یَعْنِیْ اَصَبْتَ۔ (ص ۸۹)	طارق سے مروی ہے کہ ایک شخص حالت جنابت ناپاکی میں مبتلا ہوا اور اس نے نماز نہیں پڑھی پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس قصے کا ذکر کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا، پھر ایک دوسرا آدمی جنابت میں مبتلا ہوا اور تیمم کر کے اس نے نماز پڑھ لی، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس سے بھی رسول اللہ نے وہی بات کہی جو پہلے سے کہی تھی یعنی تم نے ٹھیک کیا۔

کوئی شبہ نہیں کہ اس روایت کے بعد حضرت عمرؓ کی طرف سے جو توجیہ پیش کی گئی وہ بار نہیں

بلکہ معقول توجیہ کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے سوا بھی بعض صحابیوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار فرمایا تھا یعنی جس نے بجائے غسل کے تیمم نہیں کیا اور قرآنی آیت سے اس نے یہی سمجھا تھا اس کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلک پر رہنے دیا اور جن صاحب کی سمجھ میں قرآن سے یہ آیا کہ غسل کی جگہ بھی تیمم کیا جاسکتا ہے، ان کو بھی کو ان کے سمجھے ہوئے مطلب پر قائم رہنے کا اختیار دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نے بھی جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی کیا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ بنی قریظہ کی مہم کے سلسلے میں بخاری وغیرہ صحاح کی کتابوں میں جو یہ مشہور حدیث پائی جاتی ہے یعنی چند صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بنی قریظہ کی بستی میں پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھنا، لوگ روانہ ہوئے مگر بعضوں نے راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی اور بعض نے بنی قریظہ میں پہنچ کر نماز پڑھی، راستہ میں نماز پڑھنے والوں نے خیال کیا کہ مقصود رسول اللہؐ کا یہ ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو بنی قریظہ کے محلہ میں ہم لوگ پہنچ جائیں، اور جنہوں نے بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھی انہوں نے لفظاً بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کیا۔ جب دونوں نے اپنا اپنا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو بخاری میں ہے کہ لَمْ يُعَنِّفْ أَحَدًا یعنی دونوں میں سے کسی پر ملامت نہیں کی گئی اور پیغمبرؐ کے قول کا جو مطلب جس کی سمجھ میں آیا اسی کو درست قرار دیا گیا۔

اگر یہ ہے تو یہ ایک جزئی واقعہ لیکن اس جزئیہ سے جو کلیہ اختلافات کے مسئلہ میں پیدا ہوتا ہے، میرے نزدیک وہ قرآنی الفاظ کے قراتی اختلافات سے کم اہم نہیں ہے۔ قرات والی روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف قرآنی الفاظ کے تلفظ کے اختلافات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی اختلافات کی برداشت کی صلاحیت صحابہ کرامؓ میں آپ نے پیدا کرنی چاہی تھی لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عمارؓ کے سوا النسائی میں جن دو اور صحابیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلقہ قصہ سے تو علاوہ الفاظ کے قرآنی الفاظ کے معانی اور مطالب کے اختلافات کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل سے یہ دکھا دیا کہ ہر ایک کو اپنے سمجھے ہوئے

مطلب پر قیام کی آزادی حاصل ہے حالانکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو مسئلہ کے دو
پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو متعین فرما دیتے، اور اگر آپ کے منشائے مبارک سے صحابہؓ کی سمجھ میں
یہی بات آجاتی کہ کسی ایک پہلو پر آپ سب کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اپنے خیال
سے دست بردار ہو کر وہ حضور کے منشا کی تعمیل کی سعادت حاصل نہ کرتے جن بے چاروں نے اپنے
سارے آبائی خیالات وعقائد، رسوم ورواج سب کو جس کے قدموں پر یک لخت نثار کر دیا تھا ان
کے متعلق یہ کتنی گندی بدگمانی ہوگی کہ منشائے نبوت کے خلاف ایک معمولی جزئی مسئلہ میں اپنے خیال پر
وہ اڑے رہے بس بات وہی ہے کہ نبوت کے مذاق شناس ہونے کی وجہ سے ان کو اندازہ
ہو گیا کہ کسی ایک مسلک پر اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواہ مخواہ ہر ایک کو قائم کرنا نہیں
چاہتے بلکہ آزادی عطا فرمائی گئی ہے کہ جس کی سمجھ میں جو بات اس مسئلہ میں آتی ہے، چاہے تو اسی
پر وہ قائم رہ سکتا ہے، یہی راز تھا کہ حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ حضرت عمارؓ والے واقعہ کے
بعد بھی غسل والے تیمم میں اپنے خیال پر قائم رہے۔ پوچھنے والا ان سے جب پوچھتا تو جو ان کا
خیال تھا اسی کو ظاہر کرتے، لیکن اسی کے ساتھ اس مسئلہ میں جن کا خیال اس سے مختلف تھا،
سمجھتے تھے کہ اختلاف کا یہ حق ان کا جائز حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجودیکہ خلافت کبریٰ
کی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا کہ بعض مسائل میں خاص وجوہ سے
انہوں نے مسلمانوں کو بزور ایک ہی لفظ پر جمع ہونے کا حکم بھی دیا ہے ماسوا اس کے ایک بات
غور کرنے کے قابل یہ بھی ہے کہ حدیثوں کی روایت میں اقلال اور کمی کی تاکید کا مقصد اگر صرف
یہی تھا کہ کثرتِ روایت میں غلطیوں کی گنجائش زیادہ پیدا ہو سکتی ہے تو اس کے لئے فقط یہ کہنا
کافی تھا کہ بجائے اکثار کے حدیثوں کی روایت میں اقلال کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن اور
اس کے ساتھ لوگوں کی مشغولیت کے ذکر کی ضرورت کیا تھی، حالانکہ حضرت عمرؓ کو بھی ہم دیکھتے
ہیں کہ قرظہ کو وصیت کرتے ہوئے یہی فرماتے ہیں کہ حدیثوں میں مشغول کر کے ایسا نہ ہو کہ قرآن سے
لوگوں کی توجہ کو تم ہٹا دو اور حجۃ الوداع والی وصیت نبوی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

جارہا ہے کہ عَلَیْکُمْ بِالْقُرْآنِ (قرآن کو پکڑے رہنا) کے الفاظ کے ساتھ اپنی اس وصیت کو شروع فرماتے ہیں اور آخر میں صرف ان لوگوں کو جنہیں بھروسہ ہو کہ حدیث صحیح طور پر ان کو یاد ہے اور انہوں نے اس کو سمجھا ہے روایت کی بھی اجازت مرحمت فرمائی جاتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ یہاں قرآن کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ میرے نزدیک تو خود یہ بھی ایک مستقل قرینہ اس بات کا ہے کہ اقلال روایت کے اس حکم میں ان اغراض کے ساتھ جو حافظ ابن عبد البر وغیرہ نے بیان کیا ہے، ایک بڑی غرض وہی معلوم ہوتی ہے کہ ابتداء اسلام میں قصداً یہ چاہا جاتا تھا کہ جن حدیثوں کو پیغمبر نے عمومیت کی راہ سے لوگوں تک نہیں پہنچایا ہے، ان میں عمومیت کی ایسی کیفیت نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ان کے مطالبہ اور گرفت میں بھی لوگ اسی قسم کی قوت محسوس کرنے لگیں، جو صرف قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات کے ساتھ مختص ہے قرآن پر زور دینے کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں میں عام اشاعت اور اکثار ان ہی مطالبوں کی کی جائے جن کا نام قرآن نے "البینات" رکھا ہے اور دین کے اس حصہ کو دوسرے حصہ سے ممتاز کرنے کی اصولی شکل اس زمانہ میں یہی ہو سکتی تھی کہ عمومیت کے رنگ کے پیدا ہونے سے اس کو بچایا جائے، اس کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

اَقِلُّوا الرِّوَایَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں کم بیان کیا کرو۔

سے فرمائی، ورنہ اقلال کے اس حکم کا مطلب اگر صرف یہی تھا کہ غلطیوں سے محفوظ رہنے کی راہ یہی ہے تو اس موقعہ پر قرآن کی مشغولیت پر زور دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی حالانکہ خبر آحاد کی حدیثوں کے متعلقہ خدمات کے سلسلہ میں یہ خدمت یعنی ان سے پیدا ہونے والے احکام و نتائج کی گرفت میں "البینات" کے نتائج و احکام کی گرفت کی کیفیت نہ پیدا ہونے پائے ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اس کی پوری نگرانی فرمائی، بلکہ بجائے عام صحابیوں کے ان کا علم خاص خاص صحابیوں تک جو محدود نظر آتا ہے، عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً ان حدیثوں کے پہنچانے میں یہ طریقہ عمل جو اختیار فرمایا تھا

یہ ان روایتوں کی تبلیغ کے اسی طریقۂ خاص ہی کا تو نتیجہ تھا جو اتفاقاً پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ چاہا گیا تھا کہ اسی رنگ میں لوگوں تک وہ پہنچے۔ بتایا جاچکا ہے کہ جن چیزوں سے آحاد کی ان روایتوں کی اس خصوصیت کے متاثر ہونے کا اندیشہ عہدِ نبوت اور عہدِ صدیقی میں پیدا ہوتا تھا، ان کے ازالہ کی طرف توجہ کی گئی۔ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نکتہ اوجھل رہ جاتا اسی لئے میرا خیال ہے کہ حدیثوں کے اقلال کے متعلق جتنی روایتیں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں ان سے منجملہ دوسرے اغراض کے ایک بڑی غرض یہ بھی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ ان حدیثوں کے متعلق یہ خدمت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے یہ ایسی بات ہے جس کی نگرانی کے تو مسلمان قیامت تک ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، اس خدمت کا تعلق کسی خاص عہد اور زمانے میں محدود نہیں ہے بلکہ جیسے پہلی صدی ہجری میں اس امر کے نگرانی کی ضرورت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے والے کوئی غلط بات منسوب نہ کردیں، وہی ضرورت آج بھی موجود ہے اور قیامت تک اس کی ضرورت باقی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ کہ خبر آحاد کی حدیثوں میں "البینات" کا رنگ نہ پیدا ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس خدمت کا تعلق ایک خاص زمانے تک محدود رہ سکتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صحاح کی کتابوں میں مدون ہوجانے کے بعد کون نہیں جانتا اور میں کہہ چکا ہوں کہ خبر آحاد کی ان حدیثوں کی نوعیت متواتر روایتوں کی ہوگئی ہے یعنی یہ بات کہ صحاح کے مصنفین ہی کی یہ مدون کی ہوئی حدیثیں ہیں شک وشبہ سے یہ مسئلہ اسی طرح بالا وبرتر ہوچکا ہے۔ جیسے مشہور کتابوں کا ان کے مصنفین کی طرف انتساب متواتر واقعہ ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ مصنفین صحاح کے بعد متواتر ہوجانے کی وجہ سے ان روایتوں میں "البینات" کا رنگ پیدا نہیں ہوسکتا۔ "البینات" کی حیثیت تو ان ہی چیزوں کی ہوسکتی ہے جن کی اشاعت میں عہدِ نبوت ہی سے عمومیت کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو ورنہ اسلام کے ابتدائی قرون میں جو چیزیں خبر آحاد کی شکل میں الواحد سے واحد کی طرف

منتقل ہوتی رہیں یعنی اکّے دکّے آدمیوں تک ان کا علم اور ان کی روایت محدود رہی بعد کے قرون میں خواہ ان کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوئے تواتر کے درجہ تک ترقی کر کے کیوں نہ پہنچ گیا ہو لیکن شریعت کے "بینات" میں وہ داخل نہیں ہو سکتیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں خبرِ آحاد کے متعلق اس خدمت کی یہی نوعیت یعنی صرف ابتدائی قرون تک اس کا محدود ہونا اسی نے ان دوسری خدمتوں کے مقابلہ میں جن کی طرف توجہ کسی خاص زمانے تک محدود نہ تھی اس کی اہمیت کو جیسا کہ چاہیئے تھا لوگوں پر واضح ہونے نہ دیا حالانکہ یہ سوچنے کی بات تھی کہ دین کے "بیناتی حصہ" کو جن ذرائع سے عام لوگوں میں منتقل کیا گیا تھا ان ذرائع کو خبرِ آحاد کی حدیثوں کی تبلیغ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار فرمانا چاہتے تو اس میں کونسی چیز مانع ہو سکتی تھی؟ سو یہی نہیں کہ ان ذرائع سے ان کی تبلیغ میں کام نہیں لیا گیا بلکہ عمومیت کی کیفیت کے پیدا ہونے کا خطرہ جن جن چیزوں سے پیدا ہو سکتا تھا پوری طاقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں بھی ان کے انسداد کی کوشش فرمائی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ بھی اس کی نگرانی فرماتے رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو روایتوں کے اقلال اور کمی میں اتنی غیر معمولی دار و گیر سے اپنے زمانے میں کام لیا کہ ان کے طرزِ عمل سے بعضوں کو اس کا مغالطہ ہو گیا کہ سرے سے وہ حدیثوں کی اشاعت ہی کے مخالف تھے لیکن یہ ساری غلط فہمیاں اسی پر مبنی ہیں کہ لوگوں نے اس فرق ہی کو محسوس نہیں کیا جسے دین کے ان دونوں مختلف شعبوں کی تبلیغ میں شروع ہی سے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

حیرت ہوتی ہے کہ لوگ عام طور پر کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقعہ پر فلسطین تشریف لے گئے اور گرجا کا معائنہ فرماتے ہوئے آپ نے ظہر کی نماز پڑھنی چاہی، کلیسا کے اساقفہ اور پادریوں نے حالانکہ حضرت سے عرض کیا کہ آپ گرجے کے اندر نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ میرے نماز پڑھنے کے بعد مسلمان آئندہ اس گرجے میں کسی حق کے مدعی ہو جائیں گے، بجائے اندرون کلیسا کے اس کی بیرونی سیڑھیوں پر

نماز ادا کی، پیش بینوں اور ان کے متعلق دقیقہ سنجیوں کے یہ انمول نمونے جو حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ملتے ہیں، جس درخت (الشجرہ) کے نیچے بیعتِ رضوان کا واقعہ پیش آیا تھا، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسی درخت کے نیچے نماز پڑھنے کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر جیسا کہ صحاح کی کتابوں میں مذکور ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف ہیں۔ حضرت عمرؓ کا حکم دینا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے یا حج سے واپسی کے موقعہ پر یہ دیکھ کر کہ راستہ کے بعض خاص خاص مقامات میں لوگ نماز پڑھنے میں سبقت کر رہے ہیں حضرت کا دریافت فرمانا کہ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ جواب میں کہا گیا کہ جن جن مقامات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفرِ حج میں نمازیں پڑھی تھیں لوگ انہی جگہوں میں خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ دیکھ کر آپ کا اعلان فرمانا کہ

مَنْ عَرَضَتْ لَهٗ مِنْكُمُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَمَنْ لَمْ تَعْرِضْ لَهٗ مِنْكُمُ الصَّلٰوةُ فَلَا يُصَلِّ۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۱)

نماز کا وقت ان ہی مقامات میں جس کے سامنے پیش آجائے چاہئے کہ وہ نماز پڑھ لے لیکن جو ایسے وقت پر ایسی جگہ پہنچے کہ اس کی نماز کا وقت نہ ہو تو چاہئے کہ نماز نہ پڑھے۔

لیکن غسل والے تیمم کے مسئلہ میں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ حضرت عمرؓ کے خیال کے خلاف جن کا مسلک تھا آپ نے کبھی ان سے کبھی پوچھا بھی ہو کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔

بہر حال کچھ بھی ہو اختلافی مسائل میں رواداری کی یہ اپنی مثال آپ ہو سکتی ہے کہ پیغمبرؐ کے سامنے دو مجتہدوں کی اجتہادی رائے ایک قرآنی حکم کی تاویل و توجیہ میں مختلف ہو جاتی ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی رائے پر قائم رہنے کی سند خود دربارِ نبوت سے عطا ہوتی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ بالکلیہ اختلاف کا مٹانا ہی اسلام کا صحیح مقصد اگر ہوتا تو اس وقت جب وحی نازل ہو رہی تھی اور علم کی روشنی نبوت کی جس مشکوٰۃ سے ضیا باریوں میں مصروف تھی اس کا پٹ بھی بند نہیں ہوا تھا۔ فریقین میں ہر ایک پیغمبرؐ کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار تھا مگر باوجود ان تمام باتوں کے جیسا کہ شاہ صاحب کا خیال ہے دونوں فریق کو چھوڑ دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول ان کے

صَوَّبَ کِلَا التَّاوِیْلَیْنِ وَتَرَكَ کُلَّ مُوْقِفٍ عَلٰی تَاوِیْلِہٖ۔ دونوں تاویلوں کو درست قرار دیا اور جس نے جو مطلب سمجھا تھا اس کو اپنے سمجھے ہوئے مطلب پر چھوڑ دیا گیا۔

اور خواہ لوگوں نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن مسلمانوں کا دین کے غیر بیناتی شعبہ کے اختلافات کے متعلق جو حیرت انگیز رویہ عام طور گزشتہ تیرہ صدیوں میں رہا ہے میرا خیال تو یہی ہے کہ اس میں ابتداء اسلام کی ان ہی بنیادی کوششوں کو دخل ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس قسم کے مسائل میں صحابہؓ کے اختلافات کی حالانکہ کافی طویل فہرست ہے لیکن ان قدرتی اختلافات نے ارادی و اختیاری مخالفتوں اور مخاصمتوں کی صورت کبھی نہیں اختیار کی، ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتا رہا اور جس احترام کا جو مستحق تھا اختلاف رکھنے والوں کے قلوب میں بھی ہمیشہ وہی احترام باقی رہا۔ یہی حضرت عمرؓ ہیں بیسیوں مسائل ہیں ان سے بعض صحابہ کو اختلاف تھا اختلاف رکھتے ہوئے بھی لوگوں نے ہمیشہ ان کو امیر المومنین ہی سمجھا اور جو اختلاف ان مسائل میں ان سے رکھتے تھے سلوک اور برتاؤ میں اس سے ذرہ برابر کبھی فرق پیدا نہیں ہوا چونکہ بجائے خود یہ ایک مستقل مضمون کا مواد ہے، ان چند اشاروں سے زیادہ تفصیلات کی اپنی کتاب میں گنجائش نہیں پاتا۔

البینات کے متعلق اختلاف

البتہ یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اختلاف رکھنے کے بلال کو سیدنا بلالؓ کہتے ہیں عمار بن یاسرؓ ان کے دربار میں اسی احترام کو حاصل کئے ہوئے ہیں جو اتفاق رکھنے والوں کو حاصل ہے لیکن یہ ساری رواداریاں ان ہی مسائل کی حد تک محدود تھیں جو "البینات" کے دائرہ سے خارج تھے اور سچی بات یہ ہے کہ عہدِ فاروقی تک اختلافات نے دین کے "البینات" کے دامن کو چھوا بھی نہ تھا صرف ایک ہی روایت اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص جس کا نام صبیغؒ تھا، لوگ اس کو صبیغ العراقی کہتے تھے، حضرت عمرؓ تک پہنچانے والوں نے اسی کے متعلق یہ خبر پہنچائی کہ

یسال عن اشیاء من القرآن فی اجناد المسلمین۔ مسلمانوں کی چھاؤنیوں میں وہ قرآن کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کرتا پھرتا ہے۔

ؒ صبیغ بروزن عظیم۔ اصابہ

افسوس ہے کہ بیان کرنے والوں نے یہ نہیں بتایا کہ قرآن کے متعلق کس قسم کے سوالات اس نے اٹھائے تھے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے "متشابہات" کے متعلق وہ گفتگو کرتا تھا، لیکن خود متشابہات سے کیا مراد ہے؟ ایک مشتبہ مسئلہ ہے اس لئے صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس شوریدہ دماغ آدمی کے اندر کس قسم کے وساوس پیدا ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً اس کی گفتگو اور چھیڑ چھاڑ کا تعلق قرآن کے بینات ہی سے تھا، ورنہ غیر بیناتی مسائل کے متعلق تو آپ دیکھ چکے کہ حضرت عمرؓ کی تربیت میں کتنی فراخ دلی اور سیر چشمی کے پیدا کرنے کی کوشش خود قرآن ہی کے الفاظ بلکہ معانی تک کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

خیر قصہ مختصر یہ ہے کہ اسلامی چھاؤنیوں میں اپنے وساوس واوہام کا پرچار کرتے ہوئے صبیغ مصر پہنچا، یہاں اس وقت عمرو بن عاص والی تھے ان کو اس کی باتوں کی جب خبر پہنچی تو سیدھے مدینہ منورہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اس کو روانہ کر دیا ساتھ ہی قاصد کے ہاتھ عمرو بن عاصؓ نے اپنا ایک مراسلہ بھی بھیجا تھا جس میں اس کی فتنہ زائیوں کا ذکر تھا۔ لکھا ہے کہ خط کے پڑھنے سے حضرت عمرؓ جس وقت فارغ ہوئے تو قاصد سے آپ نے دریافت کیا کہ وہ شخص کہاں ہے؟ غصہ سے بے تاب تھے اور اسی غصہ میں آپ نے قاصد سے کہا کہ دیکھ! اگر اس عرصہ میں وہ کہیں بھاگ گیا تو پھر تیری پوری خبر لی جائے گی۔ بے چارہ بھاگتا ہوا وہاں پہنچا جہاں صبیغ کو اس نے ٹھہرایا تھا، ساتھ لئے ہوئے دربارِ خلافت میں حاضر ہوا، ادھر حضرت عمرؓ کھجور کی شاخوں کی تازہ چھڑیوں کا ایک گٹھا بھی منگوا چکے تھے۔ صبیغ حضرت عمرؓ کے سامنے حاضر ہوا، پوچھا تو کون ہے؟ میں اللہ کا بندہ صبیغ ہوں! یہ اس نے جواب دیا۔ سن کر حضرت عمرؓ نے ہاتھ میں چھڑی لی اور یہ کہتے ہوئے کہ میں بھی اللہ کا بندہ عمرؓ ہوں اس کے سر پر بے تحاشا آپ نے مارنا شروع کیا لکھا ہے کہ اتنا مارا کہ

حَتّٰی اَدْمٰی رَاْسَهٗ — صبیغ کا سر لہولہان ہو گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ پہلی مار ہی کے بعد صبیغ کے دماغ میں عقل واپس آگئی، لکھا ہے کہ مار کھا ہی رہا تھا کہ صبیغ نے چلانا شروع کیا :

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ حَسْبُكَ قَدْ ذَهَبَ الَّذِي كُنْتُ أَجِدُ فِي رَأْسِي۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۱)

امیر المومنین! بس کیجئے، اپنے سر میں جو کچھ میں پاتا تھا، وہ باہر نکل گیا۔ [۱]

بعضوں کا بیان ہے کہ متعدد دفعہ پٹائی کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ "قَدْ بَرِئْتُ" (میں بالکل چنگا ہو چکا ہوں) بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "البینات" میں اختلافی رنگ پیدا

---

[۱] جیسا کہ میں نے عرض کیا "صبیغ" کیا باتیں بناتا تھا اس کی کوئی تفصیل کتابوں میں مجھے اب تک نہیں ملی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں صبیغ کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے بھی اس مسئلہ میں اجمال ہی سے کام لیا۔ ایک روایت اصابہ میں پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الذاریات کے متعلق اس نے کچھ شکوک پیدا کئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک اجمالی بات ہی ہوئی۔ کچھ بھی ہو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیدا کردہ اشتباہات کا تعلق قرآن ہی سے تھا اور اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے شکوک و شبہات کی اشاعت میں وہ کوشاں تھا مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیاں میں پہنچ کر سادہ دل سپاہیوں کو بہکاتا تھا۔ اسی چیز نے اس کے جرم کی نوعیت کو ذرا زیادہ سخت کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ تائب ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس کو بصرہ بھیج دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے ملنے جلنے نہ دیا جائے، لیکن بعد کو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش سے یہ قید بھی اٹھالی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ صبیغ اسی قسم کی باتیں شاید کرتا تھا جیسا کہ بعض لوگ قرآن کے حکم کو یعنی میتہ (مردار) دم (خون) لحم خنزیر (سور کے گوشت) کا مطلب یہ بیان کرتے تھے کہ عرب جاہلیت میں میتہ ایک عورت کا اور دم و لحم خنزیر دو مردوں کے نام تھے مسلمانوں کو ان سے ملنے جلنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اسی بنیاد پر وہ مردار، خون اور سور کے گوشت کو حلال سمجھتے تھے۔ یا اس زمانہ میں بعض لوگوں نے قرآنی حکم جو الربوٰا (سود) کے متعلق ہے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہے، اس زمانہ میں سود جس معاملہ کا نام ہے وہ الربوٰا سے مراد نہیں ہے، بلکہ ایام جاہلیت میں معاملہ کی ایک خاص شکل تھی جو اب دنیا میں مروج نہیں ہے۔ یا اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے متعلق قرآن میں دو جگہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ زندہ رہتے ہیں اس کا مطلب بعض لوگوں نے اس زمانہ میں یہ پھیلانا شروع کیا ہے کہ ان کا نام زندہ رہتا ہے۔ یا اس زمانہ میں جنت و دوزخ جن کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ طرح طرح کے مطالب بیان کرنے شروع کئے ہیں نیکی سے جو خوشی ہوتی ہے یا پاپ سے روح میں قدرتاً انقباض و کدورت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے یا مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک کے باغ دریا وغیرہ یا اسی طرح بعض بے معنی الفاظ روحانی جنت و دوزخ وغیرہ جو بولے جاتے ہیں، صبیغ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفسیروں کا تاریخی پیشوا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب

کرنے کے خطرے کو شروع ہی میں بھانپ لیا تھا اور آپ نے اندازہ فرمالیا کہ اس قسم کے لوگوں کا علاج افہام و تفہیم سے نہیں ہو سکتا سمجھانا بجھانا تو اسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو لیکن "البینات" کا تعلق انسانی فطرت سے ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں غلط فہمی کی گنجائش ہو، ان میں شاخسانے وہی نکالتے ہیں یا نکال سکتے ہیں جو قصداً و عمداً فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہوں۔ اور اس قسم کی شرارتوں کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے حضرت عمرؓ نے صبیغ کی اصلاح کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔

بہر حال یہ طرزِ عمل حضرت عمرؓ کا "قرآنی بینات" کے اختلافات کے ساتھ تھا باقی شریعت کے غیر بیناتی شعبہ کے قدرتی اختلافات جن کا خبر آحاد کے متعلقہ معلومات کے اختلافات اور تفقہ کے سلسلہ میں مختلف اجتہادی نقاطِ نظر کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو جانا، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ناگزیر تھا عام طور پر ان اختلافات کے متعلق حضرت عمرؓ کی روش وہی معلوم ہوتی ہے کہ اختلافات کے دونوں پہلوؤں کی سمجھتے تھے کہ دین میں گنجائش ہے جس پہلو کو اختیار کیا جائے اختیار کرنے والا دین ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔

تاہم ان کے ایام خلافت کی طویل تاریخ میں بعض چیزیں ایسی ملتی ہیں جن کا بظاہر "بیناتی شعبہ" سے تعلق معلوم نہیں ہوتا بلکہ الواحد بعد الواحد کی راہ سے جو معلومات ان کے متعلق صحابہؓ تک پہنچے تھے ان ہی کے اختلاف پر ان مسائل کے اختلافات مبنی تھے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت و امارت کی قوت سے کام لیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کو آمادہ کیا کہ ان مسائل کے اختلافات کو ختم کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز مُتعہ کا مسئلہ ہے، اگرچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ متعہ کی حرمت کو دین کے "البینات" میں شمار کرتا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اس فعل کی حرمت قرآن کے نص صریح کا اقتضاء ہے مگر ان ہی لوگوں میں جو متعہ کی حرمت کے قائل ہیں۔ بعض ایسے افراد بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ "البینات" میں متعہ کی حرمت کو داخل کرنا ذرا مشکل ہے۔ بہر حال یہ الگ مسئلہ ہے مجھے تو

صرف یہ کہنا ہے کہ متعہ[1] کی حرمت کا تعلق خواہ "البینات" سے ہو یا نہ ہو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی صحابہ میں کچھ لوگ اس کی حرمت کے قائل نہ تھے اگرچہ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم یہی[2] ہے کہ متعہ کو قطعی طور پر فعل حرام سمجھا جائے۔

---

[1] متعہ کا مطلب جیسا کہ لوگ جانتے ہیں عورتوں سے استفادے کے ایک خاص طریقے کا نام ہے جس میں مرد کا عورت سے صرف وقتی تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لئے بھی معاوضہ طے کر کے مرد عورت سے استفادہ کر سکتا ہے۔ بظاہر زنا کی جبری شکل کے سوا عام بازاری عورتوں سے بھی استفادے کی عام شکل چونکہ یہی ہوتی ہے، اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام وعلی آبائہ الکرام سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ سے متعہ کے متعلق کسی نے پوچھا تو جواب میں حضرت نے فرمایا کہ "ھی الزنا بعینہٖ" (یہ تو وہی بجنسہ زنا ہے) (دیکھو فتح الملہم ج ۳ ص ۴۴۲ بحوالہ بیہقی) تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجموعی طور پر متعہ کے متعلق جو مواد قرآن و حدیث میں پایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر غلط فہمی میں اگر کوئی مبتلا ہو جائے تو یہ "البینات" سے اختلاف کی شکل نہ ہوگی۔ بعضوں نے اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ فَالْمُتْعَةُ عِنْدِیْ مَرْتَبَةٌ بَرْزَخِیَّةٌ بَیْنَ النِّکَاحِ الْمُطْلَقِ وَالسِّفَاحِ الْمُطْلَقِ (یعنی متعہ گویا خالص نکاح اور خالص زنا کا ایک درمیانی درجہ ہے) کہتے ہیں کہ ممتوعہ عورت وارث نہیں ہوتی، لیکن متعہ میں چونکہ گواہ کی بھی ضرورت ہے اور مرد سے علیحدگی کے بعد فوراً دوسرے مرد سے متعہ کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی جب تک ایک دفعہ حیض نہ آجائے، اس لئے بالکلیہ اس کو زنا نہ کہنا چاہیے۔ (فتح الملہم ج ۳ ص ۴۴۴)

باقی مشہور آیت قرآنی اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ سے متعہ کی حرمت کو جو لوگ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ممتوعہ عورت لونڈی (مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ) میں تو داخل ہی نہیں ہے، اب رہا اس کا ازواج میں ہونا، سو قرآن نے ازواج کا حصہ وراثت میں مقرر کیا ہے۔ چونکہ بالاتفاق ممتوعہ عورت وارث نہیں ہوتی اس لئے وہ ازواج میں بھی داخل نہ ہوئی۔ قرآن نے عورتوں کی ان ہی دو قسموں کو چونکہ حلال قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ممتوعہ عورت قرآن کی رو سے مرد پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں صاحب فتح الملہم نے فرمایا ہے کہ ھٰذِہِ الْمَرْاَةُ الْمُسْتَمْتَعُ مِنْهَا اِنْ كَانَتْ زَوْجَةً نَاقِصَةً (ممتوعہ عورت بھی ازواج میں داخل ہے خواہ ناقص ہی قسم کی زوجہ ہو)۔ لکھا ہے کہ اس میں "بعض معنی الزوجیۃ" پائی جاتی ہے یعنی دہی گواہی اور حیض سے استبراء کی شرط اس کو زانیہ سے ممتاز کر دیتی ہے۔ میں نے جو یہ عرض کیا کہ البینات میں بعض لوگ حرمت متعہ کو شمار جو نہیں کرتے ہیں زیادہ سے زیادہ ان کی طرف سے یہی بات کہی گئی ہے۔ ۱۲

[2] متعہ کا مسئلہ اپنی ایک خاص خصوصیت کی وجہ سے جس کا تذکرہ کتابوں میں کیا گیا ہے خاص اہمیت رکھتا ہے یعنی سمجھا جاتا ہے کہ دو دفعہ یہ حلال کیا گیا اور دو ہی دفعہ یہ حرام کیا گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ پہلی دفعہ خیبر میں حلال کیا گیا لیکن خیبر سے واپسی کے وقت اس کی حرمت کا اعلان کیا گیا۔ پھر جب مکہ فتح ہوا (باقی بر صفحہ آئندہ)

اس اختلاف کو اختلاف ہی کی شکل میں باقی رہنے دیا جائے یا مسلمانوں کو اس مسئلہ میں کسی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) اور مسلمان طائف کی طرف بڑھے تو اس عرصہ میں پھر اعلان کیا گیا کہ متعہ حلال کیا جاتا ہے لیکن اس کے کچھ دن بعد پھر اعلان کیا گیا کہ متعہ ہمیشہ کے لئے حرام کیا جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ جن الفاظ میں راویوں نے متعہ کے حلال و حرام ہونے کے قصہ کو بیان کیا ہے ان کے پڑھنے سے آدمی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے یہ عجیب بات ہے حافظ ابن قیم نے بھی لکھا ہے کہ اگر واقعہ کی صورت حال یہی ہے تو یہ مسئلہ اپنی آپ نظیر ہے شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ اس سلسلہ میں فقیر ایک خاص خیال رکھتا ہے تفصیل کا تو یہاں موقعہ نہیں۔ لیکن اجمالاً اپنے خیال کو ان الفاظ میں ادا کر سکتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ متعہ کی حرمت کے ساتھ عموماً اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ خیبر سے واپسی کے موقعہ پر پالتو گدھوں کے گوشت کی حرمت کا بھی اعلان کیا گیا۔ میں یہی پوچھتا ہوں گدھے کے گوشت کی حرمت کے اعلان کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ شریعت نے پہلے اس کو حلال قرار دیا تھا، یہ کیوں نہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی جاتا ہے کہ اس وقت تک اس کی حرمت کا چونکہ اعلان نہیں ہوا تھا اور جاہلیت والے گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے اس لئے اسی جاہلی رواج کی بنیاد پر بعض لوگوں نے خیبر میں گدھوں کو ذبح کیا اور ہانڈیوں میں پکنے کے لئے اس کے گوشت کو چڑھا دیا جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے کہ دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ ہانڈیوں میں گدھے کا گوشت پک رہا ہے اسی وقت آنحضرتؐ نے ہانڈیاں الٹوا دیں اور اعلان کرا دیا گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے۔ متعہ کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ جب خیبر سے واپسی ہونے لگی تو بعض عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ رو رہی ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان سے بعضوں نے متعہ کیا تھا اور اب ان کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، اسی غم میں رو رہی ہیں۔ اس علم کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ "متعہ حرام ہے"۔ پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ جیسے گدھے کے گوشت کو جاہلی رواج کی بنیاد پر لوگ پکا رہے تھے اسی طرح متعہ بھی جاہلی رواج ہی کی بنیاد پر لوگوں نے کیا تھا ایسی صورت میں یہ کہنا کہ متعہ کو اسلام نے کسی زمانہ میں حلال کیا درست نہ ہوگا، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں فوج در فوج ہزار ہا ہزار کی تعداد میں نئے لوگ داخل ہوئے، مقام اوطاس میں ان ہی نومسلموں نے جن کو خیبر والے حکم کا علم نہ تھا قدیم جاہلی رواج کی بنیاد پر متعہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علم ہوا تو پھر آپ نے دوبارہ ان نومسلموں کے لئے متعہ کی حرمت کا اعلان کیا۔ اگر واقعہ کی تعبیر اس طریقہ سے کی جائے تو خواہ مخواہ دو دفعہ کی حلت اور دو دفعہ کی حرمت، یا جائز ہے نہیں جائز ہے پھر جائز ہے نہیں جائز ہے اس قسم کی باتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دو دفعہ تو خیر بڑی بات ہے ایک دفعہ بھی اسلام میں حلال نہ ہوا۔ کرنے والوں نے جو کچھ بھی کیا تھا تو جاہلی رواج کی بنیاد پر کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ راویوں نے متعہ کی حرمت و حلت کے واقعات کی تعبیر جن الفاظ میں کی ہے ان پر میری تعبیر کا منطبق ہونا میں خود جانتا ہوں کہ مشکل ہے لیکن واقعات کی تعبیر سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی واقعہ کی شکل بھی وہی تھی، خاکسار نے جو بات عرض کی ہے، غور کیا جائے گا تو سارے خلجانوں کا اس سے ازالہ ہو جاتا ہے اور مسئلہ کی جو اصلی صورت جیسا کہ میرا خیال ہے سامنے آ جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲۰

ایک نقطۂ نظر پر متفق کر دیا جائے ؟ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی بصیرت نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور بر سرِ منبر جب صحابہؓ کا مجمع نیچے بیٹھا ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ

مَا بَالُ رِجَالٍ يَنْكِحُونَ هٰذِهِ الْمُتْعَةَ بَعْدَ نَهْيِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ متعہ کے طریقہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے بعد بھی نکاح کر رہے ہیں۔

(فتح الملہم ص ۴۴۲ بحوالہ بیہقی وابن المنذر وغیرہ)

کسی روایت سے ثابت نہیں ہے کہ کسی صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سوال کے جواب میں یہ کہا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہم اس کو کیوں ناجائز سمجھیں۔ اسی کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے متعہ کی حرمت کا اعلان عام فرمادیا۔ علماء نے اسی بنیاد پر قرار دیا ہے کہ متعہ کی حرمت کا مسئلہ صحابہؓ کی اجماعی حرمت کا مسئلہ ہے اور سارے شکوک و شبہات جو اس مسئلہ میں تھے ان کا ازالہ اس اجماع سے ہوگیا ورنہ ناممکن تھا کہ صحابہؓ حضرت عمرؓ کو نہ ٹوکتے جب کہ ثابت ہے کہ معمولی بڑھی عورت بھی حضرت عمرؓ کو ٹوک کر ان کے حکم میں ترمیم کرا سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو یہ پہلا اہم مسئلہ ہے جس میں بجائے اس کے کہ اختلاف کو باقی رکھا جاتا امت کو ایک ہی اتفاقی مسلک پر جمع کرنے کی کوشش حضرت عمرؓ نے کی۔ اسی کے ساتھ لوگ حج والے متعہ یعنی تمتع کے متعلق بھی حضرت عمرؓ کے خاص حکم کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ مسئلہ معمولی ہے جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں، البتہ دو اور مسئلے جن کا دین کے "غیر بیناتی" شعبہ سے حالانکہ تعلق ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان دو مسئلوں میں بھی مسلمانوں کے اختلافی طرزِ عمل کے باقی رکھنے کو پسند نہیں فرمایا۔

جنازے کی نماز میں تکبیروں کی تعداد کتنی ہے ؟ اس سلسلہ کا یہ پہلا مسئلہ ہے۔ عہدِ فاروقی تک معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ چار بعض پانچ بعض چھ تکبیریں تک جنازے کی نماز میں کہنے کے عادی

تھے، یہ بھی بیان گیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت کے زمانے میں بھی لوگ یہی کر رہے تھے۔ ابراہیم نخعیؒ والی روایت کے الفاظ ہیں:

فَفَعَلُوْا ذٰلِكَ فِیْ وِلَایَتِهٖ (ازالۃ الخفا، ج ۲ ص ۹۸) حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں لوگوں نے یہی کیا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ نے کسی خاص تعداد کی پابندی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اختلاف کی وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طرزِ عمل تھا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی خلافت کے کچھ دن گزر جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کو جمع کیا اور اپنا خیال ان کے سامنے پیش کیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف کا باقی رہ جانا کچھ مناسب نہیں ہے۔ چاہیئے کہ آپ لوگ کوئی خاص تعداد تکبیروں کی طے کر لیں اور اس پر سب متفق ہو جائیں تاکہ

یَجْتَمِعُ بِهٖ عَلَیْهِ مَنْ بَعْدَکُمْ آپ کے بعد بھی مسلمان اسی پر متفق ہو جائیں۔

روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے کو قبول کیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد رائے یہ طے ہوئی کہ جنازے کی آخری نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پڑھائی ہے اس میں جتنی تکبیریں آپؐ نے کہی تھیں اسی پر سب لوگ جمع ہو جائیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ آخری فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں چار تکبیروں کا تھا یعنی چار تکبیروں سے آپ نے جو نماز جنازے کی پڑھائی تھی اس کے بعد کسی کے جنازے پر نماز پڑھانے کا موقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ملا پس آپ کے اسی آخری فعل کو اختیار کر لیا گیا۔

یقیناً یہ سوال ہوتا ہے کہ جیسے بیسیوں مسائل ایسے تھے جن میں اختلاف کو باقی رہنے دیا گیا تھا تو جنازے کی ان تکبیروں کی تعداد کا مسئلہ ایسا کونسا اہم مسئلہ تھا جس کے لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختلاف کو مناسب نہ خیال کیا۔ کوئی خاص بات اس سلسلہ میں اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے البتہ اسی روایت کا ایک فقرہ جو یہ ہے کہ صحابہؓ کو سمجھاتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا تھا:

وَالنَّاسُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِالْجَاهِلِيَّةِ — جاہلیت سے لوگوں کا رشتہ ابھی پرانا نہیں ہوا ہے پس یہی
فَاجْمَعُوْا عَلٰى شَيْءٍ۔ — مناسب ہے کہ کسی ایک پہلو پر سب لوگ اکٹھے ہو جاؤ۔

ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عمرؓ نے مسئلہ کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہو[1]۔

دوسرا مسئلہ اسی سلسلہ میں غسل جنابت سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں کہ غسل ہم بستری سے کس وقت واجب ہوتا ہے؟ ابتدائے اسلام میں بعض صحابہ کا خیال تھا کہ جب تک انزال نہ ہو صرف ہم بستری سے غسل واجب نہیں ہوتا یہی مسئلہ ہے جس کی تعبیر

إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ — پانی پانی ہی سے واجب ہوتا ہے۔

سے کرتے ہیں، یعنی پانی سے غسل کرنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ پانی خارج ہوا ہو، حضرت عمرؓ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور جن کا یہ خیال تھا ان سے آپ نے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے یہ بات کہاں سے پیدا کی ہے گو روایات اس باب میں مختلف ہیں، مگر

---

[1] اس وقت مجھے حضرت الاستاذ الامام الکشمیریؒ کا ایک نفسیاتی نکتہ یاد آگیا جس کا ذکر اپنے درس حدیث میں حضرت عموماً فرمایا کرتے تھے آپ کا خیال تھا کہ شادی اور بیاہ کے مواقع میں عوام جن لایعنی حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں مثلاً گشت دولہے کو کرانا آتش بازی، شور و ہنگامہ وغیرہ یا طول فضول مصارف ان کو "بدعت" کی مد میں بعض مولوی جو داخل کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ ممانعت تو ان امور کی کرنی چاہئے لیکن نہ اس لئے کہ وہ بدعت ہیں، اس لئے کہ بدعت تو دین میں اضافہ کا نام ہے اور اس قسم کے مواقع میں جن افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے کوئی بھی ان کو دین سمجھ کر نہیں کرتا یعنی یہ خیال سامنے نہیں رہتا کہ کرنے سے خدا خوش ہوگا یا ناخوش ہوگا۔ ہاں ان چیزوں کی ممانعت دوسرے شرعی دفعات کے تحت ہو سکتی ہے یعنی اسراف (فضول خرچی) کو اسلام نے جو حرام قرار دیا ہے یا سفاہت اور بیوقوفی کے حرکات یہ ہو سکتے ہیں شاہ صاحب فرماتے تھے مگر موت کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ موت کا تعلق چونکہ دوسری دنیا سے ہے اس لئے جو افعال موت کے سلسلہ میں کئے جاتے ہیں عموماً سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کا دین ہی سے تعلق ہے اسی لئے غیر شرعی امور جن کا رواج موت کے وقت لوگوں میں ہے ان پر بدعت کے لفظ کا اطلاق صحیح ہے۔ میں یہاں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جنازے کی نماز کا تعلق ظاہر ہے کہ موتی سے ہے اسی چیز نے اس میں دینی اہمیت کا اضافہ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمانا کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہیں شاید اسی طرف اشارہ ہو کہ موتی سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں اس اختلاف میں زیادہ شدت پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کی دینی تفریق کا سبب بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی مصلحت نے اختلاف کے ختم کرنے پر آپ کو آمادہ کیا ہو۔ فقہائے حنفیہ نے بعض کتابوں میں لکھ بھی دیا ہے کہ چار تکبیروں سے زائد تکبیر جنازے میں کوئی امام اگر کہے تو مقتدی کو چاہئے کہ اس کی پیروی نہ کرے۔ مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس سے اختلاف کیا ہے (دیکھو عرف الشذی) میں یہ کہتا ہوں کہ اس حنفی فقہ کا تشدد اس کی شہادت ہے کہ مسئلہ میں شدت کے پیدا ہونے کی صلاحیت تھی راز وہی ہے کہ اس کا تعلق موت سے ہے۔

زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ ان لوگوں نے وجہ صرف یہ بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم لوگ ایسا کرتے تھے لیکن ہمیں ممانعت نہیں کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے اس فعل کا علم تھا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ حضرت عمرؓ نے تب مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور دریافت کیا کہ آپ لوگوں کا خیال اور علم کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ لوگوں کی رائیں مختلف ہیں حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ کو اصرار تھا کہ صرف ہمبستری وجوب غسل کے لئے کافی ہے اسی کی تعبیر تھی کہ

إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ۔	جب مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

لیکن دوسرے فریق کو اپنے خیال پر اصرار تھا آخر اس مسئلہ میں ازواج مطہرات سے دریافت کیا گیا حضرت علیؓ اور معاذؓ کا جو فتویٰ تھا اس کی تائید وہاں سے ہوئی اسی کو حضرت عمرؓ نے فیصلہ قرار دیا اور اس کے بعد آپ نے اعلان عام کرتے ہوئے فرمایا۔

لَا أَسْمَعُ بِرَجُلٍ فَعَلَ ذٰلِكَ إِلَّا أَوْجَعْتُهُ ضَرْبًا۔ (ازالۃ الخفاء، ج ۲ ص ۸۸)	اس کے بعد بھی اگر میں نے یہ سنا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے مار کا دکھ پہنچاؤں گا۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بھی دین کے فروع سے تعلق رکھتا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں بھی مصلحت محسوس کی کہ اسی وقت اگر اس کو طے نہ کر دیا گیا تو آئندہ کسی بڑے فتنہ کا یہ مقدمہ نہ بن جائے۔ اسی موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا کہ

أَنْتُمْ أَصْحَابُ بَدْرٍ وَقَدِ اخْتَلَفْتُمْ فَمَنْ بَعْدَكُمْ أَشَدُّ اخْتِلَافًا۔	تم لوگ ان صحابیوں میں ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں شریک تھے، تم اختلاف کرتے ہو تو تمہارے بعد والے زیادہ اختلاف میں سخت ہو جائیں گے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حد اعتدال سے تجاوز کی صلاحیت آپ کو اس اختلاف میں بھی نظر آئی جیسے جنازے کی نمازوں کی تکبیروں کے متعلق بھی آپ کا یہی خیال تھا اس وقت بھی یہ کہتے ہوئے کہ لوگ جاہلیت سے ابھی نکلے ہیں آئندہ یہ اختلاف زیادہ شدت اختیار کر لے گا۔ جنازے والے

مسئلہ میں تو خیر ایک حد تک خصوصیت نظر بھی آتی تھی لیکن غسل والے مسئلہ میں اختلافات کی شدت کا اندیشہ کیوں ہوا میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا بجز اس کے یہ فاروقی بصیرت تھی اور ان کو حق تھا کہ اس قسم کے امور میں اپنی بصیرت کے مطابق فیصلہ کریں۔

اس میں شک نہیں جنازے والے مسئلہ میں بھی ایک اچھی نظیر یہ ملتی ہے کہ چار رکعتوں سے زیادہ جب کسی وقت کی کوئی نماز نہیں ہے تو تکبیریں جو جنازے کی نماز میں رکعتوں ہی کی قائم مقامی کرتی ہیں ان کو بھی چار سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ بعض روایتوں میں حضرت عمرؓ کے اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے (دیکھو ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹۸) اسی طرح غسل والے مسئلہ میں یہ نظیر پیش کی جاتی ہے کہ زنا کی سزا رجم یا تازیانہ انزال پر موقوف نہیں ہے بلکہ صرف وقاع کافی ہے تو غسل کے لئے بھی وقاع ہی کیوں کافی نہ ہوگا اس نظیر کا بھی ذکر آثار میں کیا گیا ہے (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۸)

مگر اس قسم کے ترجیحی وجوہ تو قریب قریب غیر بیناتی مسائل کے سارے اختلافات میں ملتے ہیں پس مناسب یہی ہے کہ ان دونوں مسائل میں بجائے اختلاف کے تمام مسلمانوں کو ایک ہی نقطہ پر متفق کرنے کی وجہ صرف فاروقی بصیرت کے فیصلہ ہی کو قرار دیا جائے۔ آخر جس کی زبان پر خود پیغمبر نے حق کو گردش کرتے ہوئے پایا تھا اور جس کے منشار کے مطابق وحی ایک سے زیادہ دفعہ نازل ہوئی خیال کرنے کی بات ہے کہ اسی کو اس قسم کے فیصلوں کا اختیار نہ دیا جائے گا تو کس کو دیا جائے گا۔[۱]

---

[۱] اصول فقہ کی ایک اصطلاح "مصالح مرسلہ" بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود صاحب شریعت سے وجہ منقول نہ ہو مگر باوجود اس کے کسی حکم کا فیصلہ کیا جائے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے مصالح مرسلہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے اَلْحُکْمُ عَلٰی اعْتِبَارِ عِلَّۃٍ لَمْ یَثْبُتْ اعْتِبَارُھَا مِنَ الشَّارِعِ (العرف الشذی ص ۲۳۵) حضرت الاستاذ الکشمیری قدس سرہ العزیز نے اسی موقعہ پر اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ اِنَّ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدُوْنَ مُجَازُوْنَ فِیْ اِجْرَاءِ الْمَصَالِحِ الْمُرْسَلَۃِ وَ ھٰذِہٖ مَرْتَبَۃٌ فَوْقَ مَرْتَبَۃِ الْاِجْتِھَادِ وَدُوْنَ مَرْتَبَۃِ التَّشْرِیْعِ (یعنی خلفائے راشدین مصالح مرسلہ کی بنیاد پر فیصلہ کا اختیار رکھتے تھے اور اجتہاد جو ائمہ مجتہدین سے متعلق ہے، مصالح مرسلہ والا حکم اس سے تو بلند مرتبہ کی چیز ہے لیکن تشریع یعنی کسی جدید قانون کا اضافہ جو فقط پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہے اس سے مصالح مرسلہ والا اختیار کم درجہ رکھتا ہے (کتاب مذکور ص ۲۳۶) حضرت الاستاذ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اجتہادی اختیارات کی جو نوعیت ہے بس یہی نوعیت خلفائے راشدین کے اختیارات کی بھی ہے ان کو مزید اور کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں مگر شاہ صاحب نے اس خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصالح مرسلہ کی بنیاد پر حکم لگانے کا اختیار خلفائے راشدین کو حاصل تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے مسائل کی تحقیقات کے سلسلے میں مثلاً غسل کے وجوب میں صرف ہم بستری کافی ہے یا مادۂ تولید کا خروج بھی اس کے لئے ضروری ہے، اس باب میں امہات المؤمنین سے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا علم حاصل نہ ہوتا تو صحابہؓ کے جس اختلاف کو مٹا کر ایک ہی نقطہ نظر کے قائم کرنے میں حضرت عمرؓ کو کامیابی ہوئی نہ ہو سکتی تھی آخر جن کا خیال اس کے برعکس تھا ان کو اپنے مسلک سے ہٹانے کے لئے حضرت عمرؓ بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اس خطرے کا اظہار کر کے رہ جاتے کہ اس مسئلہ کو اختلاف کے اسی رنگ میں آج اگر چھوڑ دیا جائے گا تو اس میں صلاحیت معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اس کے متعلق اختلاف کی کیفیت خطرناک حد تک شدید ہو جائے۔

لیکن جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یاں سے یہ علم حضرت عمرؓ کے پاس آیا کہ صرف ہم بستری وجوب غسل کے لئے کافی ہے، تب آپ کے قلب میں قوت پیدا ہوئی اور کیسی قوت؛ اسی کے بعد آپ نے وہ فقرہ فرمایا تھا جسے پہلے نقل کر چکا ہوں یعنی

لَا اَسْمَعُ بِرَجُلٍ فَعَلَ ذٰلِكَ اِلَّا اَوْجَعْتُهٗ ضَرْبًا۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۸۸) — اس کے بعد بھی میں نے سنا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے مار کا دکھ پہنچاؤں گا۔

اسی طرح ایک اور اہم تاریخی مسئلہ حضرت عمرؓ ہی کے عہد میں اس وقت پیش آیا جب ایک دفعہ آپ شام تشریف لے گئے تھے، ابھی شام نہ پہنچنے پائے تھے بلکہ عرب اور شام کے درمیان شام کے حدود پر سرغ نامی جو مقام تھا وہیں تک پہنچے تھے کہ شامی فوجوں کی چھاؤنیاں جہاں قائم تھیں وبا یعنی طاعون پھوٹ پڑا۔ فوجی سپہ سالاروں نے مناسب خیال کیا کہ حضرت عمرؓ کو اس واقعہ سے آگے بڑھ کر مطلع کر دیا جائے۔ سرغ میں ان سے ملاقات ہوئی، سپہ سالاروں کے سردار حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے بلکہ حضرت عمرؓ کو فوج میں طاعون کے پھوٹ پڑنے کی خبر سنائی حضرت عمرؓ وہیں ٹھہر گئے اور حکم دیا کہ میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کو فوج سے بھیج دو جنہوں نے مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اصطلا

جن کا نام اس زمانہ میں "مہاجرین اولین" تھا جتنے افراد شامی فوج میں اس جماعت کے موجود تھے وہ حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے مشورہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے آیا اس وبازدہ علاقہ میں داخل ہو جاؤں یا سرغ ہی سے مدینہ لوٹ جانا مناسب ہوگا؟ جواب میں رائیں لوگوں کی مختلف ہوگئیں، بعض کہتے تھے کہ آخر جن اغراض کو پیش نظر رکھ کر آپ نے سفر اختیار فرمایا تھا جب وہ اتنے اہم تھے کہ مدینہ چھوڑ کر سفر کی مشقت برداشت کرتے ہوئے سرغ تک آپ پہنچ چکے ہیں تو ان اغراض کی تکمیل کر کے واپس لوٹنا مناسب ہوگا، ان کا مقصد یہ تھا کہ طاعون واعون کا خیال نہ کیجئے اور چلے چلیے۔

لیکن دوسرا طبقہ ان ہی مہاجرین اولین میں ان حضرات کا بھی تھا جس نے اصرار کیا کہ آپ واپس لوٹ جائیے۔ کہتے تھے کہ ایسے خطرناک موقع پر آپ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص صحابیوں کو لے کر اقدام کرنا مناسب نہ ہوگا۔ رائے کے اس اختلاف کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ تشریف لے جائیے۔ وہ فیصلہ چاہتے تھے اور ان بزرگوں نے بجائے فیصلہ کے مسئلہ میں اور زیادہ تذبذب پیدا کر دیا تھا، پھر آپ نے ان لوگوں کو فوج سے بلوایا جو طبقہ انصار سے تعلق رکھتے تھے، یہی سوال ان کے سامنے بھی پیش کیا ان میں بھی اسی اختلاف رائے کو حضرت عمرؓ نے پایا ان کو بھی آپ نے رخصت کر دیا اور حکم دیا کہ قریش کے ان سربرآوردہ لوگوں میں سے جو جو فوج میں موجود ہوں بھیج دو جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچے یعنی جنہیں "مہاجرۃ الفتح" کہتے تھے، کہتے ہیں کہ قریش کے یہ مشیخہ (بھاری بھرکم بڑے لوگ) جب حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے اس مسئلہ میں مشورہ لیا گیا تو اب کی ان میں سے ہر ایک کی رائے یہی ہوئی کہ آپ ہرگز ہرگز آگے بڑھنے کا ارادہ نہ فرمائیں اور یہیں سے مدینہ منورہ لوٹ جائیں حضرت عمرؓ نے ان کے مشورہ کو قبول کر لیا اور اعلان کر دیا گیا کہ سرغ ہی سے آپ واپس ہو جائیں گے۔

بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے اس ارادہ پر اعتراض کیا، خصوصاً ابوعبیدۃ بن الجراح نے کہا کہ آپ خدا کی تقدیر سے بھاگتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے ان ہی کے اس

اعتراض کے جواب میں وہ مشہور حکیمانہ فقرہ فرمایا کہ

نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ إِلَى قَدَرِ اللّٰهِ [1] میں خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔

ابھی حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں یہ گفتگو ہی ہو رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عبدالرحمن بن عوف صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے وہ کسی ضرورت سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے دونوں کی گفتگو کو سن کر فرمایا کہ میرے پاس اس مسئلہ کے متعلق ایک "علم" ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل و تقریر ہی کا نام علم تھا، پھر اپنے علم کا اظہار ان الفاظ میں فرمانے لگے:

---

[1] تقدیر و تدبیر کی پرانی جنگ کو جن تقریروں سے طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے میرے خیال میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ چند الفاظ سب پر بھاری ہیں۔ مقصود حضرت کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تقدیر" خدا وند تعالیٰ کے مقرر قوانین ہی کا تو نام ہے، پس جیسے مرض اور بیماری بھی خدا کے قانون ہی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے اسی طرح مرض کا علاج جن دواؤں سے کیا جاتا ہے یہ دوائیں بھی کسی دوسرے کی بنائی ہوئی نہیں ہوتیں، بلکہ جیسے بیماری خدا کا قانون ہے اسی طرح دوا میں شفا بخشی کی قوت یہ بھی خدا کا قانون اور اس کی تقدیر ہی کا نتیجہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے تمثیلاً ابو عبیدہ سے کہا بھی تھا کہ تمہارے پاس اگر اونٹ ہوں اور ان کو چرانے کیلئے گھر سے باہر نکلو، سامنے دو وادیاں نظر آئیں ایک میں سبزہ لہلہا رہا ہو، مرغزار ہو۔ اور دوسری خشک میدان کی شکل میں ہو اور تم اس خشک وادی کو چھوڑ کر ہری بھری وادی کی طرف اگر رُخ کرو گے تو کیا خدا کی تقدیر سے یہ بھاگنا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے جس وادی میں چرانے کا موقعہ تم کو ملے گا دونوں خدا کی تقدیر ہی ہوگی۔ طاعون کا مسئلہ حضرت عمرؓ کے عہد سے اس وقت تک مختلف فیہا بنا ہوا ہے۔ حنفی مکتب خیال کے علماء کی رائیں بھی مختلف ہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے درس حدیث میں ہمیشہ درمختار کے اس جزئیہ کو نقل فرمایا کرتے تھے جس کا ذکر "مسائل شتّٰی" کے عنوان کے تحت اس کتاب میں کیا گیا ہے یعنی طاعون زدہ آبادی سے ہٹ جانے کی اجازت دی گئی ہے، اسی میں لکھا ہے کہ ممانعت صرف ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جو سمجھتے ہیں کہ ان کی تدبیر سے جان بچ گئی۔ اس قسم کے اعتقاد رکھنے والے کو تو شاید دوا کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ خود بخاری میں لَا يُخْرِجُكُمْ إِلَّا فِرَارًا مِنْهُ کے الفاظ سے بھی لوگوں نے طاعون زدہ آبادیوں سے نقل مکان کا جواز نکالا ہے یعنی فراراً نکلنا ناجائز اور علاجاً نکلنا جائز ہے، جیسے علاج و معالجہ کے سارے طریقے خدا کی بیماریوں سے بھاگنا نہیں ہے، اسی طرح وبا زدہ علاقے سے ہٹ جانا علاج ہی کا ایک طریقہ ہے۔ ۱۲

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا سَمِعْتُمْ بِہٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَیْہِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَّاَنْتُمْ بِھَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْہُ۔ (ج ۲ ص ۱۳۵)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ کسی علاقہ میں اس وبا کے پھوٹ پڑنے کی خبر جب تمہیں معلوم ہو تو اس علاقہ کی طرف نہ جاؤ اور جس علاقہ میں تم مقیم تھے اگر وہیں یہ وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے بھاگنے کے قصد سے اس علاقہ سے نہ نکلو۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلہ کی تائید موجود تھی جو اس طاعون زدہ علاقہ میں نہ جانے کے متعلق آپ نے اختیار فرمایا تھا گویا عین منشاء نبوی کی تعمیل فرما رہے تھے، لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے حدیث سن کر حضرت عمرؓ نے الحمدللہ کہا اور اپنے فیصلہ کے مطابق جس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی ہو چکی تھی، آپ سرغ ہی سے مدینہ لوٹ گئے۔

تدوینِ حدیث کا خیال لیکن پھر بربنائے مصلحت تامل

بہر حال طاعون زدہ علاقوں میں رہنے نہ رہنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث جسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پیش کیا یا وجوبِ غسل کے مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے متعلق صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو علم تھا یہ اور اسی قسم کے متعدد ایسے واقعات حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آتے رہے ہیں جن سے ایک طرف تو اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ دین کے اس حصہ کی تبلیغ ایسے رنگ میں کی گئی تھی کہ مہاجرین و انصار صحابہ کا عام گروہ بسا اوقات اس سلسلہ کی حدیثوں سے ناواقف نظر آتا ہے اور کتنا ناواقف کہ ہزارہا ہزار صحابیوں کے درمیان ایک دو صاحب تک ان حدیثوں کا علم محدود تھا اور دوسری طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالباً ان ہی تجربات کے تسلسل نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان حدیثوں کے متعلق طرزِ عمل کے بدلنے پر شاید آمادہ کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ بیہقی نے مدخل میں اور ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں زُہری کے حوالہ سے حضرت عروہ بن زبیرؓ کے اس بیان کو جو نقل کیا ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ	عمر بن خطابؓ نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے
اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ السُّنَنَ فَاسْتَفْتٰی اَصْحَابَ النَّبِیِّ	تب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں
صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ ذٰلِکَ فَاَشَارُوْا عَلَیْہِ	سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں
اَنْ یَّکْتُبَھَا۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴)	لکھوالی جائیں۔

صحابہ سے فتویٰ لینے کے لئے ان کی مجلس شوریٰ میں حضرت عمرؓ کا اپنی تجویز کو رکھنا۔ بہ ظاہر اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کی تبلیغ میں بجائے عمومیت کے خاص خاص افراد تک ان کے علم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مصلحت کے پیشِ نظر پہنچایا تھا اور ایک زمانہ تک خود حضرت عمرؓ بھی اسی مصلحت کی بنیاد پر ان خدیثوں کے بیان کرنے میں اقلال پر جو اصرار کرتے رہے تھے۔ یہی دریافت کرنا چاہتے تھے کہ کیا اس مصلحت کی رعایت کی ضرورت اب بھی باقی ہے؟ کیونکہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں کہ اس خدمت کی نوعیت ایک وقتی خدمت کی تھی، نبوت اور نبوت سے قریب تر زمانوں میں عمومیت کا رنگ ان حدیثوں میں اگر پیدا ہو جاتا تو یقیناً آئندہ زمانے میں ان کے مطالبات میں زیادہ سختی پیدا ہو جاتی جو شارع علیہ السلام کا مقصود نہ تھا، سوال یہی تھا کہ وہ زمانہ گزر گیا یا ابھی ان اسباب کی مزاحمت کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے جن سے ان حدیثوں کے مطالبات میں شدت کے پیدا ہونے کا خطرہ پیش آسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی اس مجلس شوریٰ نے یہی طے کیا کہ وہ وقت گزر گیا اور اب قلم بند ہو کر مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل تک اگر حدیثیں منتقل بھی ہوتی رہیں گی تو لوگ ان کے مطالبات کو اسلام کے بنیادی مطالبات کے برابر نہ قرار دیں گے۔

لیکن مجلس شوریٰ کے اس فیصلہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہیں ہوا، لکھا ہے کہ استشارہ کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرے مسنون طریقہ یعنی استخارہ سے بھی فیصلہ کی یکسوئی میں مدد حاصل کرنی چاہی، فاروقی احتیاط اور اس کی نزاکتوں کی یہ انتہا ہے کہ بجائے ایک دو دفعہ کے عروہ کا بیان ہے کہ

فَطَفِقَ عُمَرُ یَسْتَخِیْرُ اللہَ	کامل ایک مہینے تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں استخارہ کرتے

فِيهَا شَهْرًا۔ (ص ۶۴) ہے (یعنی جو پہلو خیر کا ہو اسی پر عمل کی توفیق عطا ہو، اس کی دعا کرتے رہے)۔

ایک ماہ تک استخارہ کی نماز اور جو دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے سکھائی ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو جاری رکھا، آخر ایک ماہ کے بعد جس فیصلہ کو اپنے قلبِ مبارک میں آپ نے پایا عروہ نے اس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ثُمَّ أَصْبَحَ يَوْمًا وَقَدْ عَزَمَ اللّٰهُ لَهُ فَقَالَ إِنِّي كُنْتُ أُرِيدُ أَنْ أَكْتُبَ السُّنَنَ وَإِنِّي ذَكَرْتُ قَوْمًا كَانُوا قَبْلَكُمْ كَتَبُوا كِتَابًا فَأَكَبُّوا عَلَيْهَا وَتَرَكُوا كِتَابَ اللّٰهِ وَإِنِّي لَا أَشُوبُ كِتَابَ اللّٰهِ بِشَيْءٍ أَبَدًا۔ (ج ۱ ص ۶۴)

پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ یک سوئی کی کیفیت ان کے قلب میں پیدا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان ہی پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

بیہقی کے مدخل سے صاحب فتح الملہم نے اسی روایت کو درج کیا اس میں بجائے "لَا أَشُوبُ" کے "لَا أَلْبِسُ كِتَابَ اللّٰهِ بِشَيْءٍ" یعنی اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مشتبہ ہونے نہ دوں گا۔ کے الفاظ ہیں۔

معنیً "اشوب" اور "البس" دونوں کے قریب قریب ایک ہی ہیں اور یہی چیز دراصل دریافت طلب تھی یعنی کتاب اللہ کے مطالبوں کی جو کیفیت ہے آیا وہی کیفیت ان حدیثوں میں بھی تو نہیں پیدا ہو جائے گی اگر اسی زمانہ میں ان کو قلمبند کر دیا گیا؟ استخارے نے حضرت عمرؓ میں اسی احساس کو استوار اور مستحکم کیا کہ ابھی اس کا خطرہ باقی ہے۔

اور واقعہ بھی یہی تھا کیونکہ گو نبوت کا زمانہ گزر چکا تھا، نبوت کے بعد خلافت کا ایک دور بھی ختم ہو چکا تھا اور دوسری خلافت پر بھی کافی عرصہ گزر چکا تھا، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ خلافت اور حکومت کی جانب سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدون و مرتب کی ہوئی یا کرائی ہوئی حدیثوں کی

کوئی کتاب دنیا میں اس وقت اگر موجود ہوتی تو کیا نفسیاتی طور پر مسلمانوں کے قابو کی یہ بات تھی کہ ان حدیثوں کے ساتھ اور ان سے پیدا ہونے والے احکام و مطالبات کے ساتھ تعلق کی اسی کیفیت کو کیا باقی رکھ سکتے تھے جو آج خبر آحاد کی روایتوں کے ساتھ ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے، چونکہ واقعہ سامنے نہیں ہے اس لئے کہنے والے جو کچھ چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے استخارے کی دعاؤں میں جس خطرے کا احساس ہوا تھا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ خلط و ملط لبس اور گڈمڈ ہو جانے کا خطرہ جس کا اظہار

فَوَاللّٰہِ لَا اَلْبِسُ کِتَابَ اللّٰہِ بِشَیْءٍ خدا کی قسم اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مشتبہ ہونے نہ دوں گا۔

کے الفاظ میں انھوں نے فرمایا ہے۔ یقیناً یہ اندیشہ واقعہ کی شکل اختیار کر لیتا آخر مسلمان بھی انسان ہی ہیں ان کے عواطف و جذبات، احساسات و تاثرات بھی وہی ہیں جو دوسرے انسانوں کے ہیں ان ہی بے احتیاطیوں اور مراتب کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ دوسری قوموں میں بایں شکل ظاہر ہو چکا تھا جس کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ میں نے تم سے پہلے کی قوموں کو دیکھا کہ انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن پر وہ اس طرح ٹوٹ کر گریں کہ اللہ کی کتاب چھوڑ دی گئی بظاہر ان کا اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب و ادیان میں یہی خلط مبحث پیدا ہوا یعنی ان کے یہاں دین کے بنیاتی اور غیر بنیاتی حصہ کی کوئی تقسیم باقی نہ رہی۔ مذہب کی طرف کسی چیز کا انتساب اس طاقت کو پیدا کر دینے کے لئے کافی ہے جس قوت کو صرف ان مطالبات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہئے جن کی براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری بندوں پر عائد کی گئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ کتاب و سنت و قیاس سے پیدا ہونے والے نتائج کی گرفت اور لزوم کی قوت میں فرق سمجھا جاتا ہے[1]۔

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ آج بائیبل کے نام سے کتابوں کا جو مجموعہ پایا جاتا ہے، ان کے متعلق اس کا پتہ چلانا کہ براہ راست موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں عطا کی گئی تھیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام (باقی بر صفحہ آئندہ)

بہر حال کچھ بھی ہو، عروہ کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ خیال کر کے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہی سوچ کر پانسو حدیثوں کا مجموعہ تیار بھی کر لیا تھا لیکن بعد کو اپنے خیال کی غلطی آپ پر واضح ہوئی اور اسی وقت اس مجموعہ کو نذرِ آتش فرما دیا! اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کے ابتدائی سالوں میں تو اسی پر مصر رہے کہ حدیثوں کی اشاعت میں عمومیت کی کیفیت کو پیدا ہونے نہ دیا جائے لیکن جیسا کہ میرا خیال ہے خلافت کے آخری سالوں میں ان تجربات سے متاثر ہو کر جس کی چند مثالیں میں نے درج کی ہیں، آپ کے ارادے میں بھی تذبذب پیدا ہوا اور جو صورت حال بھی تھی اسی کو دیکھتے ہوئے اس کیفیت کا پیدا ہونا بعید بھی نہ تھا۔ خیال تو کیجئے کہ مہاجرین اولین بلائے جاتے ہیں اور طاعون زدہ علاقہ کے متعلق کوئی علم ان کے پاس نہیں ہوتا۔ انصار آتے ہیں ان سے بھی دریافت کیا جاتا ہے ان کے پاس بھی قطعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی روایت اس باب میں نہیں ملتی، فتح مکہ کے قریش سرداروں کو بلایا جاتا ہے وہ اس علم سے خالی نظر آتے ہیں آخر میں ایک آدمی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے اور ایک مسئلہ جس میں مہاجرین میں بھی اور انصار میں بھی شدید اختلاف

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) مشکوٰت نبوت کی روشنی میں جو باتیں فرماتے تھے اور بعد کو موسیٰ علیہ السلام کے جانشینوں نیز احبار و فقہاء یہود نے دینِ موسوی میں جن اجتہادی امور کا اضافہ کیا ان سب سے پیدا ہونے والے نتائج کے مطالبہ میں کسی قسم کا کوئی فرق پایا نہیں جاتا۔ پھر خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ دیا گیا تھا اس کی تشریح و توضیح و تفسیر بعد کو جو لوگوں نے کی اصل متن توراۃ کے ساتھ سب مخلوط ہو چکے ہیں، ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن سے گوشت کو جدا کرنے کے مرادف ہے۔ اور یہود کا دین تو خیر کسی نہ کسی شکل میں پایا بھی جاتا ہے، کچھ نہیں تو دوسری چیزوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کی کچھ باتیں ان میں ابھی باقی ہیں دوسرے مذاہب کا حال تو یہ ہے کہ کتابوں پر کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا، تا اینکہ آخر میں چند رزمی افسانوں پران کے دین کی بنیاد آج قائم ہے۔ ہندوستان میں جس دین کا رواج ہے کہنے کو تو اس میں آسمانی کتاب کا بھی پتہ دیا جاتا ہے، تصوف و کلام (اپنشد) اور فقہ (شاستر) کا بھی نام لیا جاتا ہے لیکن پرانوں کے مروج ہونے کے بعد عمومی طور پر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہر چیز کو چھوڑ کر ایک سچا مخلص ہندو صرف بالمیکی کی رزمیہ نظم رامائن اور مہابھارت کو روپانڈو کے جنگ نامے کو پڑھ لینا کافی سمجھتا ہے۔ قطعی طور پر اس کتاب کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ "برہما" پر وہ نازل ہوئی تھی ۱۲

پیدا ہوگیا تھا خود حضرت عمرؓ کے پاس بھی کوئی علم اس باب میں پیغمبرؐ کا عطا کیا ہوا موجود نہ تھا اپنی بصیرت سے وہ ایک رائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بعض جلیل القدر صحابی کا حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر اعتراض باقی رہتا ہے مسلمانوں میں خلفشار مچا ہوا ہے کہ اچانک ایک جاننے والا ان کے سامنے اس علم کو پیش کرتا ہے جس سے مسئلہ صاف ہو جاتا، ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے، جس علم کے نتائج اتنے قیمتی ہوں جس وقت خیال حضرت عمرؓ کو آتا ہوگا کہ یہی علم افراد میں منتشر بکھرا ہوا ہے۔ مرنے والے مر رہے ہیں جس کے پاس جو علم ہے اپنے ساتھ لئے چلا جا رہا ہے اگر اس حال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی تو یقیناً یہ چیز ہی ایسی تھی کہ اس مقام پر جو بھی ہوتا اس کی بھی یہی کوشش ہوتی کہ علم کے اس قیمتی ذخیرے کو ضائع ہونے سے بچا لیا جائے مگر دوسری طرف خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک تھا کہ معلومات کے اس ذخیرے کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ آئندہ مسلمانوں کی بدبختیوں میں بدبختیوں کے اضافہ کا ذریعہ وہ بن جائے اور یہ چیز بھی ایسی نہ تھی کہ اس سے قطع نظر کر کے کوئی اقدام کر دیا جاتا، آج لوگوں کے سامنے اس قسم کی روایتیں گزرتی ہیں پڑھنے والے ان کو پڑھ کر گزر جاتے ہیں، ٹھہر کر ذرا کوئی نہیں سوچتا کہ پیغمبر کی حدیثوں کے قلم بند کرانے کا مسئلہ بھی کیا کسی مشورے کا محتاج تھا۔ نیکی کے کام میں بھی کیا پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کے مجلس شوریٰ میں اسی نیکی کے کام کو آخر کیوں پیش کرتے ہیں اور پیش کرنے کے بعد مجلس کی رائے ان کو مطمئن کیوں نہیں کرتی، کام بھی نیک، مشورہ دینے والوں کی جماعت بھی نیک، اس میں فکر و تامل کی کیا ضرورت تھی لوگ اپنا فیصلہ دے چکے تھے۔ چاہئے تھا کہ اسی کے مطابق جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کی تدوین کا ایک دفتر خلافت کی طرف سے قائم کر کے قرآنی سورتوں کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا کام انجام دلا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ بھی "تدوینِ حدیث" کا ایک دفتر قائم کر دیتے، چند ہی دنوں میں "قرآن" کے ساتھ اس زمانہ میں حدیثوں کا بھی ایک مجموعہ حکومت کی طرف سے مدون کرایا ہوا مسلمانوں کو مل جاتا۔ اس سے بہتر تجویز اور کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن عمرؓ یہی نہیں کہ صرف تامل سے

کام لیتے ہیں بلکہ مخلوق سے ہٹ کر مسئلہ کی اہمیت ہی کا تو تقاضا تھا کہ خالق کے آستانہ پر اپنے
آپ کو گرا دیتے ہیں اور کامل ایک مہینے تک خدا کی چوکھٹ پر ان کی جبینِ نیاز جھک جھک کر
"خیر ہو، اسی کی توفیق عطا کی جائے" کی مسلسل درخواست میں مصروف رہتی ہے۔

آخر بات اگر اتنی ہی آسان تھی تو ان طول طویل قصوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مگر سچ یہ
ہے کہ جس دین کے بعد قدرت طے کر چکی تھی کہ نسلِ انسانی کو کوئی دین نہیں دیا جائے گا، اگر شروع
ہی سے اس کے ہر ہر پہلو کی نگرانیوں میں ان نزاکتوں سے کام نہ لیا جاتا تو آج جس روز روشن
کی شکل میں اس دین کے سارے عناصر ہر عامی وخاصی کے سامنے واضح ہیں، کیا یہ کیفیت ان
کوششوں کے بغیر یوں ہی پیدا ہو جاتی۔

بلاشبہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ الہامی فیصلہ تھا کہ اپنی خلافت وحکومت کی جانب سے حدیثوں کے
قلم بند کرانے کا خیال جو ان کے اندر حالات نے پیدا کر دیا تھا، اس خیال کو آپ نے دماغ سے
نکال دیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس استشارہ واستخارہ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اور جن خطرات
کا اندیشہ تھا ان کے تمام گوشوں کو نئے سرے سے تازہ کر کے آپ کے سامنے پیش کیا بظاہر اسی کا نتیجہ
معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکومت ہی کی طرف سے "تدوینِ حدیث" کے کام کو اپنے زمانہ میں ایک
خطرناک اقدام آپ نے قرار دیا بلکہ آپ کے عہدِ خلافت تک تقریباً ایک قرن یا جگ (بارہ سال)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو گزر چکا تھا، اس عرصہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ انفرادی طور پر لوگ حدیثوں کو پھر قلم بند کرنے لگے تھے۔ ابن سعد نے قاسم بن محمد کے حوالہ
جو روایت طبقات میں درج کی ہے اس کے ان الفاظ سے یعنی

اِنَّ الْاَحَادِیْثَ قَدْ کَثُرَتْ عَلٰی عَھْدِ	عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں حدیثوں کی پھر کثرت ہوگئی تب حضرت
عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَنْشَدَ النَّاسَ	عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان
اَنْ یَّاْتُوْهُ بِهَا۔	کے پاس پیش کریں۔

سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ سال کے عرصہ میں پھر حدیثوں کے کافی مجموعے لکھے جا چکے تھے

شاید اس عرصہ میں حضرت عمرؓ کی طرف سے کچھ ڈھیل بھی لوگوں کو مل گئی ہو کیونکہ جب خود ان ہی کے دل میں حدیثوں کے لکھوانے اور مدون کرانے کا خیال پیدا ہو چکا تھا، تو ایسے زمانے میں دوسروں کو روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی مگر استخارہ نے آپ کے اندر جس عزم راسخ کو پیدا کیا اس کے بعد خود تو خیر آپ اس ارادے سے ہٹ ہی گئے لیکن اسی کو کافی خیال نہ کیا۔ آپ کو محسوس ہوا ہو گا کہ حکومت کی طرف سے نہ سہی لیکن عمر فاروق کے زمانے کی مدون کی ہوئی حدیث کی کتاب بھی عہدِ فاروقی ہی کی تدوین یافتہ قرار پائے گی بہر حال قاسم بن محمد کا بیان ہے۔

فَلَمَّا اَتَوْهُ بِهَا اَمَرَ بِتَحْرِيْقِهَا۔ حسب الحکم حضرت عمرؓ کے پاس اپنے اپنے مجموعہ کو لوگوں نے پیش کر دیا تب آپ نے ان کو جلانے کا حکم دیا۔ (طبقات ج ۵ ص ۱۴۱)

گویا سمجھنا چاہئے کہ حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا تاریخی واقعہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک پیش آتا رہا ہے۔ پہلی دفعہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں سے لے کر اس کو ختم کیا پھر ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدونہ مجموعہ کے ساتھ یہی کارروائی کی اور تیسرا واقعہ "تدوینِ حدیث" کی تاریخ میں یہ پیش آیا کہ بکثرت حدیثوں کے مجموعے تیار ہوئے لیکن سب کو قسمیں دے دے کر حضرت عمرؓ نے منگوا لیا پھر سب کو تیسری دفعہ آپ نے نذرِ آتش فرما دیا۔[1]

اور یہ کام تو پایۂ تخت خلافت میں کیا گیا، باقی فتوحاتِ فاروقی نے اسلامی علاقوں کے طول و عرض کو جتنا پھیلا دیا تھا اور ان علاقوں کی حفاظت و صیانت کے لئے "الامصار" یعنی مسلمانوں کی جو چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں اور صحابہ کی بہت بڑی تعداد ان ہی "الامصار" میں جا جا کر جو آباد

---

[1] اور ان لوگوں کو جنھوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ سامانِ کتابت کی کمی یا جہالت وغیرہ کی وجہ سے ڈھائی تین سو سال تک حدیثوں کو قلمبند ہونے کا موقع نہ ملا۔ سوچنا چاہئے کہ واقعات سے وہ کس درجہ جاہل ہیں۔ حضرت عمرؓ ہی کے عہد تک آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین تین دفعہ قلم بند ہونے کے بعد حدیثیں نذرِ آتش کی گئی ہیں۔ عہدِ فاروقی میں قاسم بن محمد کا یہ کہنا کہ قَدْ كَثُرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَلٰى عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ کیا اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ حدیثوں کے بکثرت مجموعے ان کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے مگر مطالعہ کے بغیر رائے قائم کرنے والوں کو اس زمانہ میں کون روک سکتا ہے ۱۲

ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان امصار میں ہر مصر اور چھاؤنی میں بھی حضرت عمرؓ نے گشتی فرمان جاری کیا۔ حافظ ابو عمرو بن عبد البر نے جامع بیان العلم میں یحییٰ بن جعدہ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ السُّنَّةَ ثُمَّ بَدَا لَهٗ اَنْ لَّا يَكْتُبَهَا ثُمَّ كَتَبَ فِي الْاَمْصَارِ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ شَيْءٌ فَلْيَمْحُهُ۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۵)	عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (پہلے تو) چاہا کہ حدیثوں کو قلمبند کر لیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دوسرے اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس (حدیثوں کے سلسلے کی) کوئی چیز ہو چاہیئے کہ اسے محو کر دے یعنی ضائع کر دے۔

اس روایت سے بھی حضرت عروہ کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ ارادہ کرنے کے بعد حدیثوں کے لکھوانے کے خیال سے حضرت عمرؓ دست بردار ہو گئے۔ اور دوسرے مسلمانوں سے بھی آپ نے مطالبہ کیا کہ قرآن کے سوا ان کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی دوسرا نوشتہ آئندہ پیدا ہونے والے مسلمانوں میں نہ پہنچنے پائے اس میں ان کی مدد کریں۔ یہ مسئلہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس گشتی فرمان کی تعمیل میں کتنی سرگرمی دکھائی گئی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ بجز دو تین مکتوبہ سرمایہ کے حدیثوں کے متعلق ایسا کوئی نوشتہ سرمایہ مسلمانوں میں باقی نہ رہا جس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہو کہ عہدِ فاروقی سے پہلے وہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا۔

بحث کے ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، یعنی حضرت عمرؓ کے متعلق مذکورہ بالا روایتوں میں عموماً "السنن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے کسی موقعہ پر دعویٰ کیا ہے کہ عام حالات میں "السنن" کا لفظ جب "الفرائض" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے مراد قرآنی مطالبات یعنی الفرائض کے عملی تشکیلات ہی ہوتے ہیں، اس بنیاد پر سوال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کیا قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات کو لکھوانے کا ارادہ کیا تھا، یا ان کے سوا عام

خبر آحاد کی ان حدیثوں کو قلم بند کرا لینا چاہتے تھے جن کا علم انفرادی طور پر صحابہ میں پھیلا ہوا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے ان روایتوں میں چونکہ "السنن" کا استعمال "الفرائض" کے مقابلہ میں نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس کو صرف قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات تک محدود کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اگر مان بھی لیا جائے کہ یہاں بھی "السنن" سے مراد قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی تھے تو مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے آخر قرآن کے سوا جب قرآنی مطالبات کی عملی شکلوں کو بھی مکتوبہ شکل میں آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے پر حضرت عمرؓ آمادہ نہ ہوئے تو عام انفرادی حدیثوں کے متعلق اس باب میں جو منشا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی طے کیا کہ قرآن کے سوا جو چیز بھی ان کے زمانہ تک نوشتہ کی شکل میں آئندہ نسلوں میں پہنچے گی وہ تورات کے مثناۃ کی حیثیت اختیار کر لے گی اسی لئے نہ خود اپنی حکومت کی جانب سے اس کام کے انجام دلانے پر آمادہ ہوئے اور جہاں تک ان کے بس میں تھا دوسروں سے بھی انھوں نے یہی چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی تبلیغ میں عمومیت کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا تھا ان کو ایسے زمانے میں قلمبند نہ کریں جس کے بعد اس مصلحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا جسے پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اندیشے کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو بعد کو پیش آیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حدیثوں کے نہ لکھوانے کے اس ارادے کو طے کرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی بعض علمی و عملی چیزیں جن کا قرآن میں کم از کم صراحۃً ذکر نہ تھا یعنی چاہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے[1] کہ قرآن کے رو سے ان کا ماننا ضروری نہیں ہے اپنے اس فیصلہ

---

[1] مثناۃ کا یہ لفظ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے جس کا ذکر ابن سعد نے طبقات میں اور دوسری کتابوں میں بھی لوگوں نے کیا ہے کہ اپنے زمانے میں حدیثوں کے قلم بند کرانے کے متعلق حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ یہودیوں کے ہاں توراۃ کے ساتھ جو مثناۃ کی حیثیت ہے وہی حیثیت قرآن کے ساتھ حدیثوں کی اسلام میں ہو جائے گی۔ یہ مثناۃ کیا چیز ہے؟ یہودیوں کا خیال ہے کہ تورات کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو زبانی روایات کا (باقی بر صفحۂ آئندہ)

کے بعد یعنی قرآن کے سوا نوشتہ کی شکل میں کوئی چیز باقی نہ رہے ۔حضرت عمرؓ کو ایک دوسرا خطرہ ستانے لگا یعنی ایسا نہ ہو کہ آئندہ کسی زمانے میں انکار کرنے والے ان چیزوں کا انکار کر بیٹھیں اور دلیل میں اسی واقعہ کو پیش کریں کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے، خصوصاً شادی شدہ زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کے متعلق رجم (سنگسار) کرنے کی جو سزا ہے اس کے متعلق تو یہی نہیں کہ قرآن اس کے ذکر سے ساکت ہے بلکہ سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا جلد (تازیانہ) جو بیان کی گئی ہے یعنی فرمایا گیا ہے کہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (غ. پ ۱۸) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ہر ایک کے سو سو کوڑے مارو۔

اس کو پیش کر کے یہ غلط فہمی بھی پھیلائی جا سکتی ہے کہ "رجم" کے قانون کی قرآن سے تو نفی ثابت ہوتی ہے، حالانکہ ایک بے بنیاد غلط فہمی کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے[1]۔

بہرحال قانونِ رجم کے انکار کے اس خطرے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس درجہ

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گزشتہ) یہی ایک ذخیرہ یا گیا تھا تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک زبانی روایتوں کا یہ سلسلہ یہودیوں کے ہاں قلم بند نہ ہوا، دوسری صدی عیسوی یعنی حضرت موسیٰؑ سے ایک ہزار سات سو سال بعد ابی یہودا حق دوش نے پہلی دفعہ ان کو قلم بند کیا۔ یہی کتاب مشناۃ کے نام سے مشہور ہوئی پھر ایک شرح اس کی یروشلم میں ہوئی اور دوسری بابل میں اسی شرح کو مکرا کہتے ہیں جس کے معنی کمال ہیں مشناۃ اور مکرا کو ملا کر تالمود کہتے ہیں آدم کلارک اور ہارن وغیرہ مفسرینِ توراۃ نے لکھا ہے کہ پچھلے زمانے میں یہودیوں کے ہاں مشناۃ اور تالمود کی اہمیت تورات سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ توراۃ کو علماء یہود ناقص، مغلق غیر مفہوم قرار دیتے تھے اور دین کی حقیقی بناء انھوں نے بجائے تورات کے مشناۃ پر آخر زمانہ میں قائم کردی تھی جیوفس اور دوسری انسائیکلو پیڈیاؤں میں تفصیلات پڑھئے انگریزی نہ جاننے والوں کو مولانا رحمۃ اللہ الہندی کی کتاب اظہار الحق عربی ایڈیشن مطبوعہ مصر ۱۳۱۵ھ ج ۲ ص ۵۶ میں اس سلسلہ میں معلومات مل سکتی ہیں ۱۲

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا) [1] معتزلہ وغیرہ فرقوں نے اس کا دعویٰ کیا بھی ہے حالانکہ رجم کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں تو صرف جلد (تازیانہ) کی سزا کا ذکر ہے لیکن زانی کو رجم کی سزا نہ دی جائے یقیناً قرآن سے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ سے بخاری میں ان کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ رَجَمْتُهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (اس عورت کو رجم کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر میں نے دی ہے) اس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ قرآن پر نہیں بلکہ سنت پر اس قانون کی بنیاد قائم ہے۔ یوں بھی کنوارے اور محصن (شادی شدہ) زانیوں کی سزا میں فرق ایک قدرتی امر ہے ۱۲

متاثر تھے کہ قرآن کے سوا حالانکہ طے کر چکے تھے کہ اپنے زمانہ کی کسی نوشتہ چیز کو مسلمانوں میں منتقل ہونے نہ دوں گا، لیکن اس انکار کے خطرے کی شدت کا احساس کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا تھا کہ اپنے خطبوں میں آپ فرماتے

لَوْلَا اَنْ یَقُوْلَ قَائِلُوْنَ زَادَ عُمَرُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مَا لَیْسَ مِنْہُ لَکَتَبْتُ فِیْ نَاحِیَۃِ الْمُصْحَفِ (بخاری ص۱۳۶ صحاح)

اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ کہنے والے یہ کہنے لگیں گے کہ عمرؓ نے اللہ کی کتاب میں اس چیز کا اضافہ کر دیا جو قرآن کا جزنہ تھا تو قرآن کے حاشیہ پر اس کو (یعنی رجم کے قانون کو) لکھ دیتا۔

لیکن مصحف کے حاشیہ پر لکھنے کی جرأت تو وہ کیا کرتے یوں بھی آپ نے اس قانون کو قلم بند کر دینے کی ہمت نہ فرمائی۔ کبھی کبھی "رجم" کے اس قانون کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں فرماتے کہ

اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ مِنْ بَعْدِکُمْ قَوْمٌ یُکَذِّبُوْنَ بِالرَّجْمِ وَبِالدَّجَّالِ وَبِالشَّفَاعَۃِ وَبِعَذَابِ الْقَبْرِ وَبِقَوْمٍ یَخْرُجُوْنَ مِنَ النَّارِ بَعْدَ مَا امْتَحَشُوْا۔ (ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۳۶)

کچھ لوگ عنقریب آئندہ زمانے میں ایسے بھی آنے والے ہیں جو رجم کے قانون کا اور دجال کے ظہور کا، واقعہ شفاعت کا، عذاب قبر کا اور اس بات کا کہ جلنے کے بعد جہنم سے بعض لوگ نجات یاب ہوں گے ان ساری باتوں کا انکار کریں گے۔

کیونکہ بظاہر قرآنی آیات سے ان چیزوں کا استنباط بھی ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا[1] اسی لئے

---

[1] جن امور کا ذکر حضرت عمرؓ کے اس بیان میں کیا گیا ہے ان میں عذاب قبر کا مسئلہ ایسا ہے جس کے اشارات قرآن میں بھی ملتے ہیں، آل فرعون والی آیت اور یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ میں بھی لوگوں نے ان اشاروں کو پایا ہے موت کے وقت مرنے والوں کے سامنے جن غیبی حقائق کا ظہور ہوتا ہے ان کا ذکر بھی ایک سے زائد جگہ پر قرآن میں کیا گیا ہے ماسوا اس کے سورہ النبا کی آخری آیتیں یعنی اِنَّا اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدَاہُ وَیَقُوْلُ الْکَافِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا (ہم نے دھمکایا تم کو قریب والے عذاب سے جس دن دیکھے گا آدمی ان چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے آگے روانہ کیا تھا، اور کہے گا منکر کہ کاش ہم ہوتے خاک) اس آیت میں "عذاب قریب" میں قریب کا لفظ بتاتا ہے کہ کسی بعید عذاب کے مقابلہ میں آدمی قریبی زمانے میں اس سے دوچار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب بعید کے مقابلہ میں یہ قبر ہی کا عذاب عذاب قریب ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ آگے جو یہ کہا گیا کہ بھیجے ہوئے اعمال کو دیکھے گا یہ بھی، برزخی عذاب ہی کی خاصیت ہے کہ بجائے بدلہ بھگتنے کے آدمی کے اعمال مختلف شکلوں میں اس کے آگے پیش ہوں گے جن کو دیکھ دیکھ کر (باقی بر صفحہ آئندہ)

ان کو خطرہ گزرتا تھا کہ لوگ ان باتوں کا کسی زمانہ میں انکار نہ کر بیٹھیں، بظاہر اسی خطرے کے انسداد کی یہ تدبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکالی کہ اقلال یعنی جہاں تک ممکن ہو روایتیں کم بیان کی جائیں بجائے اس اقلال کے ان خاص امور کے متعلق اکثار یعنی کثرتِ ذکر کا طریقہ اختیار فرمایا خصوصاً اپنے خطبوں میں چرچا کر کے ان باتوں کو آپ نے اتنا مشہور کر دیا کہ خبر احاد کی حیثیت باقی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ علماء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق مزید ایک اور قسم کا اضافہ کرنا پڑا یعنی متواتر اور خبر آحاد کے بیچ میں مشہور حدیثوں کی ایک اصطلاح مقرر کی گئی جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت نہ تو دین کے ان قطعی عناصر اور یقینی اجزا کی ہے جن کا انکار آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے یعنی تواتر کی راہ سے مسلمانوں کی ہر اگلی نسل سے پچھلی نسلوں میں، جو چیزیں منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں یہ حیثیت بھی مشہور روایتوں کی نہیں ہے اور نہ ان کی حیثیت خبر آحاد کی ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ درجۂ شہرت کو طے کر کے مسلمانوں تک جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر پہنچی ہیں ان کا انکار بھی دین سے انکار کرنے والوں کو خارج کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور حنفی امام ابوبکر جصاص کا یہی خیال تھا لیکن عام طور پر علماء اس کے قائل نہیں ہیں، میں نے شاید پہلے بھی شمس الائمہ سرخسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قانونِ رجم اور مسح خفین جیسے مسائل کے منکر کے متعلق ان کا خیال تھا کہ

لٰکِنْ یُخْشٰی عَلَیْہِ الْاِثْمُ گناہ کا اندیشہ کیا جاتا ہے۔

بعضوں نے ان مشہور روایات کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے، رجم والے قانون کی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گزشتہ) گھبرائے گا اور اذیت محسوس کرے گا اور یہی وہ وقت ہے جب آدمی تمنا کرے گا کہ موت کے متعلق اس کا جو یہ خیال تھا کہ ازالہ احساس کی یہ تعبیر ہے یعنی مر کر آدمی مٹی میں مل جاتا ہے خاک دھول بن کر اڑ جاتا ہے کاش وہی واقعہ ہوتا۔ لیکن صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی یہ ہے وہ مطلب جو ان آیتوں سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اسی بنیاد پر برزخی عذاب کو قرآنی عذاب قرار دیتا ہوں یعنی عذاب قریب میرے نزدیک عذابِ قبر ہی کی تعبیر ہے۔ نیز سورۃ الانعام میں اور سورۃ الواقعہ کی بعض آیتوں سے عذابِ قبر کی طرف اشارے ملتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ اسی طرح دجال کے شخصی وجود کے سوا شفاعت اور اہل ایمان کا آخری انجام نجات پر ہوگا۔ ان مسائل کو قرآن سے چاہا جائے تو فکر و تامل کے بعد مستنبط کیا جا سکتا ہے ۱۲

مثال دے کر لکھا ہے کہ اس قسم کی مشہور روایتوں کے منکر کو گمراہ قرار دیا جائے گا۔ صاحب کشف بزدوی نے عیسیٰ بن ابان حنفی امام کا قول نقل کیا ہے کہ

قِسْمٌ یُضَلَّلُ جَاحِدُہٗ وَلَا یُکَفَّرُ مِثْلَ خَبَرِ الرَّجْمِ۔ (کشف ج ۲ ص ۳۶۹)

ایک قسم مشہور روایتوں کی ایسی بھی ہے کہ اس کے منکر پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگایا جائے گا مگر اس کو گمراہ ٹھہرایا جائے گا مثلاً رجم کی روایت کا یہی حال ہے۔

بہر حال ان مسائل کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ مشہور روایتوں کے متعلق یہ مانتے ہوئے کہ

ھُوَاسْمٌ لِخَبَرٍ کَانَ مِنَ الْاٰحَادِ فِی الْاَصْلِ اَیْ فِی الْاِبْتِدَاءِ۔ (کشف ص ۳۶۸)

کہ خبر مشہور درحقیقت ان ہی خبروں کو کہتے ہیں جو ابتدا میں آحاد ہونے کی حیثیت رکھتی تھیں۔

لیکن محض اس لئے یعنی

لِاتِّفَاقِ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ وَالثَّانِیْ عَلٰی قُبُوْلِہٖ۔ (ص ۳۶۹)

صدر اول (عہد صحابہ) اور دوم (یعنی عہد تابعین) کے علماء نے چونکہ ان کے ماننے پر اتفاق کر لیا تھا۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ خبر آحاد کی جو نوعیت ہوتی ہے وہ ان کی باقی نہ رہی بلکہ "صدر اول" میں نہ سہی اس کے بعد بھی یعنی قرن ثانی و ثالث تک کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے تک جن خبروں میں شہرت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا، ان کا شمار بجائے خبر آحاد کے خبر مشہور میں کیا جائے گا۔ صاحب کشف نے لکھا ہے کہ

وَالْاِعْتِبَارُ لِلْاِشْتِہَارِ فِی الْقَرْنِ الثَّانِیْ وَالثَّالِثِ وَلَا عِبْرَۃَ لِلْاِشْتِہَارِ فِی الْقُرُوْنِ الَّتِیْ بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَۃِ۔[1] (کشف ص ۳۶۹)

بہر حال قرن دوم و سوم (تابعین و تبع تابعین) کے عہد میں جو چیزیں شہرت کے درجہ تک پہنچ گئی تھیں (ان کی شہرت کا تو اعتبار کیا جائے گا) مگر ان تینوں قرون کے بعد کی شہرت ناقابل لحاظ غیر مؤثر قرار پائے گی۔

---

[1] لکھا ہے کہ قرون ثلثہ کے بعد تو تقریباً ساری آحاد خبریں چونکہ مشہور ہو گئیں اس لئے پچھلے قرون کی شہرت کا اعتبار نہ کیا جائے گا ۱۲

جس کا مطلب یہی ہوا کہ "خبر آحاد" والی حدیثوں کے ذخیرہ سے جن روایتوں میں شہرت کی کیفیت عہد صحابہ ہی میں نہیں بلکہ عہد تابعین و تبع تابعین میں پیدا ہوگئی ہو، ان کو بھی مشہور خبروں میں شمار کر لیا گیا ہے[1]۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ قلم بند ہوئے بغیر صرف زبانی چرچے کی زیادتی کی وجہ سے عہد صحابہ ہی نہیں بلکہ اس کے بعد والے دو قرنوں میں بھی جن معدودے چند روایتوں میں شہرت کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، جب ان کو "خبر آحاد" کے زمرے سے علماء نے خارج کر دیا تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلافت و حکومت کی طرف سے لکھوایا ہوا حدیثوں کا کوئی مجموعہ مسلمانوں کی پچھلی نسلوں تک منتقل ہوتا ہوا اگر پہنچتا تو اس کے ساتھ لوگوں کے قلبی تعلقات کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو احاد خبروں کی شکل میں چھوڑا تھا ان میں سے بعض چیزوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواہ زبانی تذکروں کے ذریعہ ہی شہرت کا رنگ کیوں پیدا کیا؟ یا حضرت عمرؓ کے بعد قرن ثانی و ثالث والوں نے ان روایتوں کو کیوں مشہور کر دیا یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور علاوہ "مصالح مرسلہ" کے جسے خلفاء راشدین کے خصوصی اختیارات میں شمار کیا جاتا ہے قرون مشہود لہا بالخیر کے فیصلوں کے متعلق بھی یہ مانا گیا ہے کہ خاصی دینی بصیرت ہی کے تحت ان کو بھی مناسب نظر آیا کہ بجائے خبر آحاد کی شکل میں باقی رکھنے کے ان میں شہرت کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔

کچھ بھی ہو مجھے اس سے بحث بھی نہیں اور علماء نے لکھا بھی ہے کہ صحابہ کے بعد والے قرون میں جو روایتیں مشہور ہوئی ہیں، ان کے انکار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ خطاکار قرار دیا

---

[1] اگرچہ ان مشہور روایتوں میں ایسی روایتیں جن میں شہرت کا رنگ عہد صحابہ میں پیدا ہو چکا تھا اس کو مشہور روایتوں کی ان قسموں پر ترجیح دی جاتی ہے جن میں یہی کیفیت بعد والے قرون میں پیدا ہوئی، تاہم اجمالی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شہرت کے درجہ تک ان تینوں قرون میں سے کسی قرن کے اندر جو روایتیں پہنچ گئی تھیں ان کو خبر آحاد کی مد سے نکال کر مشہور روایتوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ تفصیل کے لئے اصولِ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے ۱۲

جاسکتا ہے، لیکن کفر ہی نہیں بلکہ گمراہی کا انتساب بھی انکار کرنے والے کی طرف مشکل[1] سے ہے جیسے خلفاءِ راشدین کے عہد میں مشہور ہونے والی روایتوں کے منکروں کی تضلیل کا فیصلہ کیا گیا ہے یعنی ان لوگوں کو گمراہ سمجھا جائے گا جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں مشہور ہو جانے والی روایتوں کے نتائج کا انکار کرتے ہیں اور میرے نزدیک مؤمن کے ایمان کا اقتضاء بھی یہی ہے۔

یہ تھی روئداد ان خدمات کی جو عہدِ فاروقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق انجام دی گئی جن کا حاصل یہی ہے کہ بجز چند خاص روایتوں کے خبر آحاد کے سارے ذخیرے کو خبر آحاد ہی کی شکل میں باقی رکھنے کی جو ممکنہ تدبیریں ہو سکتی تھیں حضرت عمرؓ نے ان کے اختیار کرنے میں پوری مستعدی اور بیدار مغزی سے کام لیا۔ کوشش کا کوئی دقیقہ اس راہ میں اٹھا نہ رکھا، اور ان چند روایتوں کو شہرت کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش آپ نے جو کی اس کی وجہ یا تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بصیرت کو اسی میں مصلحت نظر آئی، یا ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص منشار کا علم ان امور کے متعلق کچھ ہو جس سے نبوت کے خصوصی مذاق شناس حضرات ہی واقف ہو سکتے تھے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی یہ بھی ہے کہ "مشہور حدیث" کا مطلب چونکہ یہ ہے کہ ابتداء میں خبر آحاد کی شکل میں رہنے کے بعد صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں عام طور پر اتنی مشہور ہو گئی کہ رَوَتْهُ جَمَاعَةٌ لَا يُتَصَوَّرُ تَوَاطُؤُهُمْ عَلَى الْكِذْبِ. (کشف ج ۲ ص ۳۶۷) اتنے آدمیوں نے ان کو بیان اور روایت کیا ہے جن کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ مخواہ وہ جھوٹ پر متفق ہو گئے تھے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ متواتر اور مشہور میں فرق صرف اس قدر ہے کہ متواتر روایات میں تو ضروری ہے کہ ابتداء سے آخر تک ایسی جماعت اس کو بیان کرتی ہو جس کے متعلق غلط بیانی کا احتمال باقی نہ رہے۔ عقل کے لئے ناممکن ہو جائے کہ اس کو جھوٹ قرار دے اور مشہور روایتوں میں بھی گو یہی کیفیت پائی جاتی ہے الا یہ کہ ابتداء میں اس کی حیثیت چونکہ خبر آحاد کی تھی اس لئے متواتر

---

[1] تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں خصوصاً کشف بزدوی میں پڑھیے ۱۲

روایتوں کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس معیار پر عہدِ فاروقی میں مشہور ہو جانے والی روایتوں کی تعداد بہت تھوڑی نکلے گی، شاید وہی چند باتیں جن کا تذکرہ حضرت عمرؓ اپنے خطبات میں کرتے تھے اور ان کو خطرہ تھا کہ آئندہ انکار کرنے والے کہیں ان کے انکار پر جری نہ ہو جائیں، ان کے سوا مشکل ہی سے کسی چیز کا ان پر اضافہ ہو سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جیسے مشہور روایتوں کی شکل ان چند چیزوں نے اختیار کی، وہیں آپ ہی کے زمانہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی واحد خبر کا مفاد اگر قرآنی نص کے خلاف ہو تو ترجیح ہمیشہ قرآن ہی کو دی جائے گی۔ غیر حاملہ یعنی حامل عورت کو جب ایسی طلاق دی جائے جس کے بعد نکاحِ جدید کے بغیر پھر اس عورت کو طلاق دینے والا زن و شوہر کے تعلقات کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس کے نان ونفقہ اور سکنیٰ (جائے سکونت) کے متعلق یہ سوال جب[1] اٹھا کہ عدت کے زمانے میں طلاق دینے والے شوہر پر یہ چیزیں یعنی نان ونفقہ وغیرہ واجب ہے یا نہیں اور ایک خاتون صاحبہ فاطمہ بنت قیس نامی جن کے ساتھ طلاق کی یہی صورت پیش آئی تھی انھوں نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفقہ اور سکنیٰ کو شوہر پر عائد نہیں کیا تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک چونکہ فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت کتاب یعنی قرآنی نص کے خلاف تھی آپ نے اعلان کیا کہ

لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ بِقَوْلِ امْرَأَةٍ حَفِظَتْ اَمْ نَسِيَتْ۔ (صحاح)

ہم اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبی کے طریقہ کو کسی ایسی عورت کے کہنے سے چھوڑ نہیں سکتے جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔

---

[1] یہ مسئلہ کہ قرآن کی کس آیت کے خلاف حضرت عمرؓ نے فاطمہ والی روایت کو قرار دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کس سنت کا حضرت کو علم تھا فاطمہ کی روایت اس کے مخالف تھی یہ بڑا تفصیلی مسئلہ ہے حدیث و شروح حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل ملے گی ۱۲

عہدِ عثمانی اور تدوینِ حدیث

بہر حال عہدِ فاروقی ان ہی حالات میں ختم ہوا آپ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ آیا، علمی خدمات کے لحاظ سے عثمانی عہدِ خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی وجہ سے آج تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال تک سارے جہان کے مسلمانوں میں قرآن مجید کا ایک ہی نسخہ مروج ہے۔"تدوینِ قرآن" نامی کتاب میں اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے[1]۔ حدیث کے سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تدوینِ حدیث کی تاریخوں میں لوگوں نے کسی خاص واقعہ کا ذکر اگرچہ نہیں کیا ہے لیکن حضرت عثمانؓ سے جو روایتیں کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ہم ان ہی میں ایک اس روایت کو بھی پاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

مَا یَمْنَعُنِیْ اَنْ اُحَدِّثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَّا اَکُوْنَ اَوْعٰی اَصْحَابِہٖ عَنْہُ وَلٰکِنِّیْ اَشْھَدُ لَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ مَنْ قَالَ عَلَیَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔ (ص ۶۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں مجھے یہ چیز نہیں روکتی کہ دوسرے صحابیوں سے حدیثوں کے یاد رکھنے میں کچھ کم ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے میری طرف کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو میں نے نہ کہی ہو تو چاہئے کہ اپنا ٹھکانا وہ دوزخ میں بنالے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی حدیثیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی یاد تھیں، لیکن ان کی عمومی اشاعت سے آپ بھی پرہیز کرتے تھے، کیوں کرتے تھے؟ ممکن ہے کہ مذکورہ الفاظ سے یہ نتیجہ بھی نکالا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے منسوب ہو جانے کا اندیشہ حضرتِ عثمانؓ کو تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب دوسرے صحابیوں کے مقابلہ میں خود ان کا دعویٰ تھا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کم حدیثیں محفوظ نہیں ہیں۔

---

[1] اسی کتاب کا جوہری خلاصہ ہمارے عزیز شاگرد مولوی غلام ربانی ایم۔ اے حیدر آبادی نے کیا، ندوۃ المصنفین دہلی کے مکتبہ نے اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔ اس خلاصہ کے بعد یہ واقعہ ہے کہ میری اصل کتاب بھی شائع نہ ہو تو اس کی ضرورت باقی بھی نہیں رہتی ہے ۱۲

توحفظ اور یاد کے اس دعوے کے بعد ان کے کلام کو اس پر محمول کرنا کہ اپنی یاد پر حضرتؓ کو کامل بھروسہ نہ تھا اس لئے روایت سے پرہیز کرتے تھے، کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ وہی بات یعنی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اشاعتِ عام کا طریقہ اگر وہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ ہر طرح کے لوگ ان سے سنی ہوئی روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کرتے۔ حضرت عثمانؓ کو زیادہ سے زیادہ اعتماد اپنے حافظہ اور اپنی یاد پر ہو سکتا تھا لیکن ان سے سن کر روایت کرنے والے بھی صحیح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی بات کو منسوب کریں گے، جو کچھ انہوں نے سنا ہے حضرت عثمانؓ کو چونکہ اس پر بھروسہ نہ تھا اندیشہ تھا کہ اس راہ سے پیغمبر کی طرف غلط بات منسوب نہ ہو جائے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں آپ نے سنی تھیں ان کی اشاعت عام نہیں فرماتے تھے اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خبر آحاد کی ان روایتوں کو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں میں اشاعت ضروری خیال نہ فرمائی، اسی طرح آپ کے خلفاء نے بھی یہی طرزِ عمل دین کے اس غیر بنیاتی حصہ کے متعلق اپنے اپنے زمانہ میں اختیار فرمایا اسی سے اندازہ کیجئے کہ ایک دفعہ بر سرِ منبر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے، مسند احمد ہی میں ہے:۔

عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ مَوْلٰی عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ یَقُوْلُ اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ کَتَمْتُکُمْ حَدِیْثًا سَمِعْتُہٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَرَاھِیَۃَ تَفَرُّقِکُمْ عَنِّیْ۔ (ص ۶۵)

حضرت عثمانؓ کے غلام ابو صالح سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے لوگو! ایک حدیث جسے میں نے رسول اللہ سے سنا ہے اسے تم لوگوں سے اب تک اس لئے چھپاتا رہا کہ تم کو یہ حدیث مجھ سے جدا کر دے گی۔

پھر آپ نے فرمایا کہ

ثُمَّ بَدَا لِیْ اَنْ اُحَدِّثَکُمُوْہُ لِیَخْتَارَ امْرُؤٌ مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اس حدیث کو تم سے بیان ہی کر دوں

لِنَفْسِہٖ مَا بَدَا لَہٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ رِبَاطُ یَوْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ یَوْمٍ فِیْمَا سِوَاہُ مِنَ الْمَنَازِلِ۔

پھر اس حدیث کے سننے کے بعد جو اپنے لئے جس پہلو کو چاہے آدمی اختیار کرے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط (یعنی اسلامی سرحدوں کی چھاؤنیوں میں بہ نیت جہاد قیام) دوسری جگہوں میں ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے۔

اور یہی خبر آحاد کی حدیثوں کے استعمال کا صحیح مقام ہے جس کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ ان سے عمل کی محرومی عام دینی ثمرات سے گو آدمی کو محروم نہیں کرتی لیکن دین میں جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں وہ چاہیں تو ان حدیثوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ حضرت عثمانؓ ہی کو ہم دیکھتے ہیں کہ الواحد بعد الواحد ہی کی راہ سے سہی، جب کبھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی خبر ہو جاتی تھی تو بجائے اپنی رائے کے اسی خبر واحد کی تعمیل کو اپنی سعادت خیال فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے ارادے سے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے جب قدید نامی مقام پر پہنچے تو آپ کے باورچی خانے میں چند چکور گاؤں والوں نے شکار کر کے پہنچا دیئے، چکوروں کو بھون کر اور کھانوں کے ساتھ طشت میں مرتب کر کے حضرت عثمانؓ کے دسترخوان پر لوگوں نے چن دیا، راوی کا بیان ہے کہ

كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی الْحَجْلِ حَوَالِیِ الْجِفَانِ۔

ہم ان بھنے ہوئے چکوروں کو گویا طشت کے کنارے چنا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ اپنے رفقاء کے ساتھ جب دسترخوان پر بیٹھے تو دیکھا کہ بعض لوگ کھانے سے رک رہے ہیں وجہ دریافت کی تو لوگوں نے کہا کہ قافلہ میں حضرت علیؓ بھی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حج کے احرام کی حالت میں شکار کے گوشت کا کھانا جائز نہ ہوگا، سننے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ نے بلا بھیجا، دونوں میں گفتگو ہوئی، حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ

یہ شکار ہے جسے نہ میں نے شکار کیا ہے، اور نہ اس کے شکار کرنے کا حکم میں نے دیا تھا گاؤں والے جو احرام کی حالت میں نہ تھے یہ ان کا شکار کیا ہوا ہے اور میرے پاس ان ہی لوگوں نے کھانے کے لئے بھیجا ہے، پھر اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

علی کرم اللہ وجہہ نے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ احرام ہی کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گورخر کی ران تحفہ میں ایک شخص نے پیش کی تھی لیکن رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم لوگ احرام کی حالت میں ہیں، پس چاہئے کہ یہ ران ان لوگوں کو کھلادی جائے جو احرام کی حالت میں نہیں ہیں۔

بعض دوسرے صحابی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں ساتھ تھے انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ جوں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت حضرت عثمان رض کو پہنچی لکھا ہے کہ دستر خوان سے اٹھ گئے اور

فَدَخَلَ رَحْلَهُ وَاَكَلَ ذٰلِكَ الطَّعَامَ اَهْلُ الْمَاءِ۔ (مسند احمد ص ۱۰۰) — اپنے خیمے میں چلے گئے اور گاؤں والوں نے اس کھانے کو کھالیا۔[1]

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد و تفقہ کی روشنی میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس نتیجہ تک پہنچے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر اس سے دست بردار ہو گئے حالانکہ چاہتے تو گفتگو کر سکتے تھے اور بعد کو جیسا کہ حاشیہ کے تفصیلات سے معلوم ہوا ہوگا ائمہ اجتہاد

---

[1] اس مسئلہ میں کہ خشکی کے شکار کو بحالتِ احرام کسی نے خود شکار نہ کیا ہو بلکہ جو حالتِ احرام میں نہ ہو اسی کا شکار کیا ہوا ہو، محرم یعنی جو احرام باندھے ہوئے ہو کیا اس شکار کے گوشت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہی نقل کیا جاتا ہے کہ کھا سکتے ہیں لیکن شوافع حضرت علی رض کی اسی روایت کی بنیاد پر کھانے کی اجازت نہیں دیتے۔ مسئلہ میں ہر فریق کے دلائل فقہ و حدیث کی شروح میں تلاش کیجئے۔ حنفیہ کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ران اس لئے واپس نہ کی تھی کہ اس کا کھانا بحالتِ احرام ناجائز تھا کیونکہ دوسری روایت صحاح ہی کی حضرت ابو قتادہ والی سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے خود بھی احرام کی حالت میں اس قسم کے شکار کے گوشت کو استعمال فرمایا اور دوسروں کو بھی اجازت دی۔ پس ران کے واپس کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کھونے کی ہمت افزائی نہ ہو یعنی ممانعت سد الذریعہ کے تحت کی گئی تھی ۱۲

کی اکثریت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیان کی ہوئی اس روایت کے مقابلہ میں ابو قتادہؓ[۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو ترجیح دی، حنفیوں اور مالکیوں کا وہی مذہب ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

صَیْدٌ لَمْ نَصْطَدْہُ وَلَمْ نَأْمُرْ شکار ہے جسے نہ ہم نے خود شکار کیا اور نہ شکار کرنے کا اس کے حکم دیا،

---

[۱] یہ روایت صحاح ستہ کی ہر کتاب میں مل سکتی ہے، روایت چونکہ ذرا دلچسپ ہے جی چاہتا ہے کہ اس کا تذکرہ کر دوں۔ ابو قتادہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھ کر صحابیوں کے ساتھ مکہ معظمہ کے قصد سے تشریف لے جا رہے تھے، یہ صلح حدیبیہ والے سفر کا واقعہ ہے، ابو قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے احرام نہیں باندھا تھا لیکن احرام بند لوگوں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے آگے تشریف لے جا رہے تھے بہرحال میں ان ہی احرام بند لوگوں کے قافلہ میں تھا میری چپل ٹوٹ گئی تھی اُسے درست کر رہا تھا۔ اچانک ان ہی لوگوں کی جو احرام کی حالت میں تھے ایک گورخر پر نظر پڑی، میں تو چپل کے سینے میں مشغول تھا گورخر کے دیکھنے والے چونکہ حالتِ احرام میں تھے اور قاعدہ ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی بھی ممانعت ہے اور شکار کی طرف اشارہ کرنے کی بھی، گورخر کے دیکھنے والے سخت کش مکش میں تھے مجھ سے وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن دل سب کا چاہتا تھا کہ میں چونکہ احرام کی حالت میں نہیں ہوں کاش میری نظر اس گورخر پر پڑ جاتی۔ ابو قتادہؓ سے بعض روایتوں میں یہ بھی مروی ہے کہ گورخر کے دیکھنے والی جماعت میں بعض لوگوں نے بعض کو دیکھ کر آپس میں ہنسنا شروع کیا۔ شاید ان کے ہنسنے پر ان کی نظر اٹھی، سامنے دامنِ کوہ میں گورخر کھڑا ہوا تھا، اس پر نظر پڑ گئی، ابو قتادہ بڑے مشاق شکاری تھے۔ نظر پڑنے کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چاہا کہ گورخر پر حملہ کریں لیکن جلدی میں نہ کوڑا ہی لے سکے تھے اور نہ نیزہ، تب ان احرام بند لوگوں سے کہا کہ میرا کوڑا اور نیزہ تو دے دو لیکن سبھوں نے شکار کرنے کے اس فعل میں امداد دینے سے انکار کیا۔ حضرت ابو قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے ان کے انکار پر غصہ بھی آیا مگر کرتا کیا، گھوڑے سے اترا، کوڑے اور نیزے کو لے کر میں نے گھوڑے کو گورخر پر ڈال دیا بہت جلد وہ میری زد میں آگیا۔ نیزے سے میں نے اس کو گرا لیا، جب شکار ہو چکا تو ان احرام بندوں نے گوشت کے کھانے میں شرکت کی مگر بعد کو لوگ شک میں مبتلا ہوئے۔ ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ اس گورخر کی ایک ران میں نے چھپا لی تھی۔ اسی حال میں قافلہ آگے روانہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قصہ پیش کیا گیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ گوشت باقی بھی رہ گیا ہے۔ ران جسے میں نے چھپا رکھی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کو پیش کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا گوشت تناول فرمایا حالانکہ آپ بھی احرام ہی کی حالت میں تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دریافت کیا کہ احرام بندوں سے کسی نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا ۱۲

بِصَیْدِہٖ اصْطَادَہٗ قَوْمٌ حِلٌّ یہ ان لوگوں نے شکار کیا ہے جو احرام بند نہ تھے انہوں نے میرے فَاَطْعَمُوْنَاہُ فَمَا بَأْسَ۔ پاس کھانے کے لئے بھیجا تو اس کے کھانے میں کیا مضائقہ ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ فطرۃً وہ بڑے نرم دل آدمی تھے، اختلاف اور مقابلہ پر ڈٹنے سے ان کی طبیعت کو دور کا لگاؤ بھی نہ تھا، حدیث پیش کی گئی، خاموش ہو گئے اور اسی پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

مگر اسی کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی اسی فطری نرم مزاجی اور رشیلی طبیعت نے لوگوں کی ہمتیں بلند کر دیں گو اپنی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کے متعلق جو کچھ وہ کر سکتے تھے کرتے رہے لیکن عنقریب معلوم ہوگا کہ "حدیث" میں فتنے کی ابتدا جن لوگوں کی راہ سے ہوئی یہ وہی تھے جن کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نرم حکومت نے بدبختانہ جسارتوں کے ارتکاب کے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔

عہدِ مرتضوی اور تدوینِ حدیث

میں نے پہلے بھی کہیں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عام عادت تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات آپ کے سامنے اگر کوئی بیان کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے شاید اس کی ایک وجہ عہدِ عثمانی کے وہ فتنے اور فساد بھی ہوں جو مسلمانوں میں پھوٹ پڑے تھے، یوں بھی اسلام کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو چکا تھا، نہ صرف مفتوحات کا بلکہ مختلف اقوام اور طبقات کے لوگ مسلمان ہو ہو کر اسلامی جماعت میں فوج در فوج شریک ہوتے چلے جاتے تھے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا ان میں طرح طرح کے لوگ تھے، سب کے ایمان و اسلام کی وہی حالت نہ تھی جو صحابہ کرام کی تھی۔ ان ہی امور کے احساس کا غالباً یہ نتیجہ بھی تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ عموماً منبر سے اس حدیث کا اعلان فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ يَكْذِبْ عَلَيَّ يَلِجُ فِي النَّارِ۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۸۳) میری طرف جھوٹی بات ہرگز منسوب نہ کیا کرو جو میری طرف منسوب کرکے جھوٹی بات بیان کرے گا وہ آگ میں جھونکا جائے گا۔

نہ صرف دوسروں ہی کے متعلق یہ فرماتے تھے بلکہ خود اپنی طرف اشارہ کرکے آپ نے متعدد موقعوں پر اس فقرے کو دہرایا ہے کہ

لَأَنْ أَخِرَّ مِنَ السَّمَاءِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَكْذِبَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مسند احمد ج ۱ ص ۸۱) آسمان سے میں گر پڑوں یہ میرے لئے زیادہ آسان ہے اس بات سے کہ رسول اللہ کی طرف غلط بات کو منسوب کرکے بیان کروں۔

اور جیسے دوسروں سے آپ قسم لیتے تھے اسی طرح یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پوچھنے والا حضرت علیؓ کی کسی حدیث کے بیان کرنے کے بعد اگر پوچھتا کہ کیا واقعی آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے تو جواب میں خود بھی قسم کھاتے ہوئے فرماتے:

إِيْ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۲۱) ہاں! (آنحضرتؐ نے فرمایا) قسم ہے کعبہ کے رب کی۔

حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت تک نبوت سے زمانہ کا فاصلہ کافی دور ہو چکا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں آحاد کی شکل میں حضرت علیؓ تک پہنچی تھیں، میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ خود ذاتی طور پر ان کا ایک حصہ حضرت علیؓ کے پاس منتوبہ شکل میں بھی تھا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حدیثوں کو آپ نے کس زمانہ میں قلمبند فرمایا تھا تاہم لکھی ہوئی شکل میں ان کے پاس کچھ حدیثیں ضرور تھیں۔ لوگوں کے دریافت کرنے پر جن کے متعلق آپ یہ اقرار بھی فرماتے تھے کہ میری تلوار کی نیام میں وہ نوشتہ رکھا ہوا ہے لیکن اس کی اشاعتِ عام نہ ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں آپ نے کی اور نہ عمرؓ کے عہد میں اور نہ عثمانؓ کے عہد میں حتی کہ خود آپ کے خلافت کے زمانہ میں بھی لوگوں نے چاہا کہ عام لوگوں میں ان حدیثوں کی اشاعت کر دی جائے مگر جہاں تک روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس سے انکار ہی کرتے رہے، لیکن جب اصرار حد سے زیادہ لوگوں کا گزر گیا، نیز خیال بعضوں کا یہ ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کچھ خاص باتوں کی وصیت کی ہے اور اس سے مختلف قسم کے خود آفریدہ مغالطوں میں

مبتلا کرنے کا موقع ان لوگوں کو مل رہا تھا جنھوں نے حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ میں فساد اور فتنے کا ایک باضابطہ پروگرام تیار کیا تھا تو جیسا کہ مسند احمد میں ہے کہ آخر ایک دن آپ نے کہا کہ

مَاعَهِدَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا خَاصَّةً دُوْنَ النَّاسِ اِلَّا شَیْءٌ سَمِعْتُهُ مِنْهُ فَهُوَ فِیْ صَحِيْفَةٍ فِیْ قِرَابِ سَيْفِیْ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں سے الگ مجھ سے کوئی ایسی بات بطور عہد کے نہیں فرمائی ہے۔ بجز اس کے کہ میں نے آپ سے چند باتیں سنی ہیں وہ اس صحیفہ میں لکھی ہوئی ہیں جو میری تلوار کی نیام میں رکھا ہوا ہے۔

آگے راوی کا بیان ہے کہ

فَلَمْ يَزَالُوْ بِهٖ حَتّٰی اَخْرَجَ الصَّحِيْفَةَ۔ (مسند احمد ص۱۱۹)

لوگ اس (صحیفہ کے دکھانے) پر مُصر ہوئے یہاں تک کہ آپ نے اس صحیفہ کو (نیام سے) نکالا۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کی خواہش تو یہی تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں جنھیں آپ نے اپنی یادداشت کے لئے قلم بند فرمالیا تھا، عمومیت کا رنگ پیدا نہ ہو، لیکن لوگوں کی طرف سے اصرار میں شدت بڑھتی چلی گئی۔ نیز خطرہ اس کا ہوا کہ خدا جانے لوگ کیا سمجھ بیٹھیں، آپ نے لوگوں کو دکھا دیا کہ اس میں معمولی دینی مسائل ہیں، اس قسم کے شکوک کا ازالہ بھی ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ راز میں ان کو کچھ خاص رموز و اسرار کی نوعیت کی چیزیں وصیت فرمائی تھیں جنھیں مختلف طریقوں سے لوگوں نے پھیلانا شروع کیا تھا۔ خود ان ہی روایتوں سے جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس صحیفہ کا ذکر ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضؓ کے متعلق اس قسم کی باتیں لوگوں میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ مثلاً قتادہ ابوحسان کے حوالہ سے اسی صحیفۂ علی کے قصے کو جب بیان کیا کرتے تھے تو شروع میں کہتے کہ ابوحسانؒ کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے اور لوگ آکر عرض کرتے کہ جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی تو زبانِ مبارک پر بے ساختہ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (اللہ اور اللہ کے رسول نے سچ کہا) کے الفاظ جاری ہو جاتے الاشتر النخعی نے ایک

دن حضرت سے آکر کہا کہ آپ کے اس طریقہ کا یعنی اس قسم کے مواقع میں صدق اللہ ورسولہ عام طور پر جو آپ فرمادیتے ہیں اسی سے لوگوں میں آپ کے متعلق یہ بات پھیل گئی ہے اشتر نے اس کے بعد کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں آپ سے کہی ہیں؟ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمیاں ضرور پھیلی ہوئی تھیں، مسند احمد ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ

يَرْحَمُ اللّٰهُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ كَانَ مِنْ كَلَامِهٖ لَا يَرٰى شَيْئًا يُعْجِبُهٗ اِلَّا قَالَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَيَذْهَبُ اَهْلُ الْعِرَاقِ يَكْذِبُوْنَ عَلَيْهِ وَيَزِيْدُوْنَ عَلَيْهِ فِي الْحَدِيْثِ۔ (ج ۱ ص ۸۷)	علیؓ پر خدا رحم کرے بات کرنے میں ان کی عادت تھی جب کوئی حسب دلخواہ بات دیکھتے تو کہتے کہ سچ کہا اللہ اور اس کے رسول نے، عراق والے (ان کے اسی عام نقرے کی بنیاد پر) ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے لگے اور بڑھا چڑھا کر ان کی طرف باتوں کو منسوب کرنے لگے۔

بلکہ مسند احمد ہی میں طارق بن شہاب کے حوالہ سے جو روایت نقل کی گئی ہے، یعنی طارق کہتے تھے:

رَأَيْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ سَيْفٌ حِلْيَتُهٗ مِنْ حَدِيْدٍ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا عِنْدَنَا كِتَابٌ نَقْرَؤُهٗ عَلَيْكُمْ اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ اَعْطَانِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهَا فَرَائِضُ الصَّدَقَةِ۔ (ج ۱ ص ۱۱۹)	میں نے منبر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ان کی کمر میں تلوار تھی جس کے (قبضے کی) زینت لوہے کی گئی تھی میں نے اس وقت سنا وہ فرما رہے تھے کہ اللہ کی قسم ہے ہمارے ہاں اللہ کی کتاب (قرآن) اور اس صحیفہ کے سوا کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے تم لوگوں کے آگے پڑھوں اور یہ صحیفہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں صدقہ کے حصوں کی تفصیل ہے (یعنی قانونِ زکوٰۃ کی تفصیل)۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں حضرت والا نے ضرورت محسوس فرمائی کہ برسرِ منبر ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جو آپ کے متعلق پھیل گئی تھیں یا پھیلائی جا رہی تھیں عنقریب

جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

لیکن کچھ بھی ہو باوجود ان تمام باتوں کے کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اپنے "نیامی صحیفہ" کی نقل لینے کی عام اجازت مسلمانوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دی ہو، بلکہ یہ واقعہ یعنی "صحیفہ علی" کے مضامین جن متعدد راویوں سے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، ان میں یہ بات جو پائی جاتی ہے کہ ایک راوی جن اجزار کا ذکر کرتا ہے دوسرا ان کے ذکر سے خاموش ہے بلکہ بجائے اس کے وہ دوسرے اجزار کا تذکرہ کرتا ہے، اگرچہ بعض اجزار ساری روایتوں میں مشترک ہیں، میرے نزدیک تو یہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ ان راویوں میں سے کسی راوی کے پاس اس صحیفہ کی نقل موجود نہ تھی، بلکہ سن سنا کر جو باتیں یاد رہ گئی تھیں ان ہی کو وہ بیان کرتا تھا[1]۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں سے دریافت کرنے سے پہلے اس صحیفہ کے مضامین کو اپنی ذات ہی کی حد تک محدود رکھنا پھر ان لوگوں کے اصرار پر ان کو بتانا، بتانے کے بعد بھی عام نقل اس صحیفہ کی لوگوں میں جو نہ پھیلی تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جیسے آپ کے پیش رو خلفاء راشدین نے یہ خیال کیا تھا کہ ان کے زمانہ میں عمومیت کا رنگ اختیار کر کے آئندہ نسلوں تک جو چیزیں پہنچیں گی ان میں شریعت کے ان عناصر اور اجزار کی وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جسے شارع علیہ السلام نے صرف "البینات" کی حد تک محدود رکھنا چاہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے بھی اپنے عہدِ خلافت تک یہ خیال باقی رہا تھا، جہاں تک ممکن تھا اس کی نگرانی میں آپ نے بھی کمی نہیں فرمائی۔

---

[1] مسند احمد میں پانچ راویوں سے "صحیفہ علی" کے مضامین منقول ہیں یعنی ابو حسان[1]، یزید[2] بن شریک (ابراہیم تیمی کے والد) طارق[3] بن شہاب، قیس[4] بن عباد، حارث[5] بن سوید، سبھوں نے بیان کیا ہے کہ صحیفہ علی میں فلاں فلاں مسائل تھے بعض مسائل تو سب کے بیان میں مشترک ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک کی روایت میں ہیں اور دوسرے کے یہاں بجائے ان کے دوسرے مسائل کا تذکرہ پایا جاتا ہے اسی حال کو دیکھ کر علمار نے لکھا ہے کہ صحیفہ علی میں کافی مسائل تھے بظاہر ملاطفہ کی شکل میں یہ صحیفہ تھا اسی لئے تلوار کی نیام میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کے فتووں کی ایک کتاب کا ذکر آگے آ رہا ہے جس کی بہت سی چیزوں کو ابن عباس نے قلم زد کر دیا تھا۔ لکھا ہے کہ وہ بھی "ملاطفہ" ہی کی شکل میں تھا ۱۲

لیکن پھر بھی اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مسئلہ میں حزم و احتیاط اور اس کے متعلق دارو گیر میں جس تشدد اور سختی سے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کام لیا تھا، حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی شدت اور کڑی نگرانی آپ کے نزدیک ضروری نہ رہی تھی، آخر سوچنا چاہیئے کہ اسی خبر آحاد کے مجموعہ کو لکھ لینے کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے جلا دیا تھا یا استشارہ و استخارہ کے بعد حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ ان کے عہدِ خلافت میں حدیثوں، کا جو مجموعہ حکومت کی طرف سے مدون کرا دیا جائے گا آئندہ چل کر قرآن کی ہمدوش و ہم سطح کتاب (یعنی مثناۃ کمثناۃ تورات) کی شکل اختیار کرلے گا اور اسی فیصلہ کی بنیاد پر صرف یہی نہیں کہ اس خیال سے خود ہی دست بردار ہوئے بلکہ گزر چکا کہ آپ کے زمانہ میں جس کسی کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں تھیں جہاں تک آپ کے امکان میں تھا سب کو ضائع کر دینے کا جو حکم آپ نے دیا تھا ان بزرگوں کے اس عمل کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اس طریقہ سے کیا نسبت ہے اپنی ذاتی یادداشت ہی کے لئے سہی، لیکن بہرحال آپ نے چند خاص حدیثوں کو قلم بند تو فرمایا اور اپنی تلوار کی نیام میں اس کو محفوظ کر دیا تھا۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ طرزِ عمل کے اس اختلاف کے اسباب کیا تھے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کا جو زمانہ تھا، عہدِ نبوت کی قرب کی وجہ سے قدرتاً خود اس زمانے کے متعلق اور اس زمانے کی چیزوں کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں احترام و تقدس کے جو جذبات تھے، جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے احترام و تقدس کی اس کیفیت میں اضمحلال کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے طرزِ عمل کی تبدیلی میں کچھ اس کو بھی دخل ہو، ماسوا اس کے سیاسی حالات کے پیش رفت نے مدینہ منورہ چھوڑ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں کوفہ کو پایۂ تخت خلافت جو قرار دینا پڑا! اور اس کی وجہ سے کوفہ میں آپ کو قیام کرنا پڑا جیسا کہ معلوم ہے یہاں مسلمانوں کی بہت بڑی فوجی چھاؤنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں قائم ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ

هَبَطَ الْكُوْفَةَ ثَلَاثُمِائَةٍ مِّنْ اَصْحَابِ الشَّجَرَةِ وَ سَبْعُوْنَ مِنْ اَهْلِ بَدْرٍ۔ (ابن سعد ج ۶ ص ۴)

کوفہ کو وطن بنا کر رہنے والوں میں تین سو تو ایسے صحابی تھے جنہوں نے الشجرہ (درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی تھی) اور ستّر صحابی وہ تھے جو میدانِ بدر میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے) ساتھ جنگ میں شریک تھے۔

لیکن جس کوفہ کا حال یہ ہو جیسا کہ طبقات ہی میں ہے کہ

بِهَا بُيُوْتَاتُ الْعَرَبِ (ص ۶)

اس میں عرب کے تمام قبیلوں اور خاندانوں کے لوگ تھے۔

اور بقول ابن خلدون عرب کے ان بیوتات کا حال یہ تھا کہ اس میں

سَائِرُ الْعَرَبِ مِنْ بَنِيْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ وَعَبْدِ الْقَيْسِ وَ سَائِرُ رَبِيْعَةَ وَالْاَزْدُ وَكِنْدَةُ وَ تَمِيْمُ وَ قُضَاعَةُ وَ غَيْرُهُمْ فَلَمْ يَكُوْنُوْا مِنْ تِلْكَ الصُّحْبَةِ بِمَكَانٍ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ (ج ۲ ص ۱۲۸)

سارے عرب قبائل کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے (یعنی) بنو بکر بن وائل والے عبد القیس والے اور ربیعہ قبیلہ کی تمام شاخوں کے لوگ اور قبیلہ ازد کے کندہ والے تمیم والے قضاعہ والے اور ان کے سوا بھی ان لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کرنے والے بہت کم تھے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دولت سے تو سرفراز ہوئے تھے لیکن ان بیچاروں کو جمال جہاں آرائے محمدی سے اپنی مشتاق آنکھوں کو روشن کرنے کی سعادت میسر نہ آئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرظہ بن کعب الانصاری کو رخصت کرتے ہوئے جو یہ فرمایا تھا:

اِذَا رَءَوْكُمْ مَدُّوْا اِلَيْكُمْ اَعْنَاقَهُمْ وَ قَالُوْا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (جمع الفوائد ص۳۸ بحوالہ دارمی)

جب تمہیں وہ دیکھیں گے تو اپنی گردنیں تمہاری طرف دراز کریں گے اور کہا کریں گے کہ دیکھو! یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔

یہ فاروقی بصیرت تھی جس نے اندازہ کر لیا تھا کہ صحبتِ نبوت سے محروم رہ جانے والے

مسلمانوں کے قلوب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے جاننے کا ولولہ اور شوق کس طرح بھڑک اٹھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کو دیکھ کر اپنے پیغمبر کے حالات کے جاننے کے لئے بیتابانہ کس طرح دوڑ پڑیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ پیش گوئی کتنی سچی نکلی اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ صحابہ نہیں بلکہ صحابہ کے دیکھنے والوں کے ساتھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان ہی چھاؤنیوں میں رہنے والے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوگئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد ثابت البنانی ان لوگوں سے جو ان سے حدیث سننے کے لئے آیا کرتے تھے، کہتے

لَوْلَا تَصْنَعُوْا بِیْ مَا صَنَعْتُمْ بِالْحَسَنِ لَحَدَّثْتُکُمْ اَحَادِیْثَ مُؤْنِقَۃً۔	اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے ساتھ بھی وہی معاملہ تم لوگ نہ کرنے لگو گے جو (خواجہ) حسن بصری کے ساتھ تم ہی لوگوں نے کیا تو میں تم ہی لوگوں کو، بہت اچھی اچھی حدیثیں سناتا۔

پھر حسن بصری کے متعلق اپنی چشم دید شہادت یہ بیان کیا کرتے تھے کہ

مَمْنُوْعُ الْقَائِلَۃِ وَمَمْنُوْعُ النَّوْمِ۔ (طبقات ابن سعد حصہ دوم ج، ص۴)	بے چارے کو لوگ نہ دن ہی کو لیٹنے کا موقع دیتے اور نہ سونے کا۔

حسن بصری جو تابعی یعنی صحابۂ کرام کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں ان کا یہ حال، پھر عبداللہ بن عون جو تابعی نہیں بلکہ تبع تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی داستان سناتے ہوئے اسی سلسلہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ

قَدْ قَطَعُوْا عَلَی الطَّرِیْقِ مَا اَقْدِرُ اَنْ اَخْرُجَ لِحَاجَتِیْ یَعْنِیْ مِمَّا یَسْئَلُوْنَہٗ عَنِ الْحَدِیْثِ۔ (ابن سعد حصہ دوم ج، ص ۲۵)	لوگوں نے میرا راستہ روک رکھا ہے، کسی ضرورت سے بھی میں نہیں نکل سکتا یعنی لوگ مجھ سے حدیث پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

سمجھا آپ نے ابن عون کیا کہہ رہے ہیں؟ اپنے پیغمبر کے حالات کے دریافت کرنے والوں کا حال ان کے ساتھ یہ ہوگیا تھا کہ راستہ تک چلنا ان کے لئے دشوار ہوگیا تھا، پوچھنے والوں کے ڈر کے

مارے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

خیال تو کیجئے کہ جب حسن بصری جو خود صحابی نہیں ہیں بلکہ صحابیوں کے دیکھنے والے اور ان سے استفادہ کرنے والوں یعنی تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ابن عون تو تابعی بھی نہیں، تبع تابعین کے طبقہ سے ان کا تعلق ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحبت میں رہنے والے بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ جب تابعین اور تبع تابعین کی یہ حالت تھی، تو خود اپنی آنکھوں سے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا اور براہِ راست مجلسِ نبویؐ میں حضوری کی سعادت جنھیں میسر آئی تھی ان کو دیکھ کر ان مسلمانوں کا کیا حال ہو جاتا ہوگا جنھوں نے صرف سنا تھا، لیکن اپنے محبوب پیغمبر (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) کو دیکھا نہیں تھا۔

میرا خیال ہے کہ کوفہ آجانے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی اسی قسم کے حالات سے سابقہ پڑا، مدینہ منورہ میں جب تک تھے تو وہاں ان کے زمانے تک صحابیوں ہی کی کثرت تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ نہ پوچھنے والوں ہی کی وہاں اتنی کثرت تھی اور نہ بتانے والوں کی اتنی کمی تھی جو کیفیت مدینہ منورہ کے سوا دوسرے مقامات کی پائی جاتی تھی یا اس کو پایا جانا چاہئے تھا ماسوا اس کے بارگاہِ نبوت میں قرب و نزدیکی کے جو مواقع مختلف وجوہ سے مرتضٰی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھے ظاہر ہے کہ یہ ان ہی کی خصوصیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تقلیل فی الروایۃ یعنی حدیثوں کے بیان کرنے میں زیادتی سے پرہیز اسی اصول کی آپ نے بھی پابندی کی لیکن زیادہ دن یہ چیز آپ کے عہد میں معلوم ہوتا ہے کہ نبھ نہ سکی۔ آخر میں پوچھتا ہوا: کہ ایک طرف آپ ہی کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ تلوار کے نیام والے صحیفہ کی حدیثوں کے دکھلانے پر بھی آمادہ نہ تھے لیکن اصرار لوگوں کا حد سے زیادہ گزر گیا، نیز غلط فہمیوں کے پھیلنے کا اندیشہ ہوا، تب آپ نے لوگوں کو اس صحیفہ کی حدیثوں سے مطلع فرمایا۔ اب ایک طرف کتابوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کے متعلق یہ معلومات بھی ملتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی جیسی کتابوں میں حضرت ہی کے متعلق ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں، ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ

اَنَّ عَلِيَّ ابْنَ اَبِي طَالِبٍ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِيْ عِلْمًا بِدِرْهَمٍ فَاشْتَرَى الْحَارِثُ الْاَعْوَرُ صُحُفًا بِدِرْهَمٍ ثُمَّ جَاءَ بِهَا عَلِيًّا فَكَتَبَ لَهٗ عِلْمًا كَثِيْرًا۔ (ج ۶ ص ۱۱۶)	ایک دن (کوفہ) میں حضرت علی خطبہ دے رہے تھے اسی خطبہ میں فرمایا کہ ایک درم میں کون علم خریدنا چاہتا ہے، حارث اعور ایک درم میں کچھ کاغذ خرید کر لائے اور ان کاغذوں کو لئے ہوئے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت والا نے حارث کے لائے ہوئے اوراق میں بہت سا علم لکھ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا روایت میں صراحۃً اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حارث کو حدیثیں لکھ کر دی تھیں لیکن میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے اور یوں بھی جاننے والے جانتے ہیں۔ اس زمانہ کی اصطلاح ہی یہ تھی کہ ”علم“ کے لفظ کا زیادہ تر اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں ہی پر کیا جاتا تھا، اگر کل نہیں تو اس اصطلاح کی بنیاد پر اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس میں کچھ حصہ حدیثوں کا بھی چاہئے کہ شریک ہو، اور بات کیا صرف اسی حد تک محدود رہی۔ حجر بن عدی[1] جن کی شہادت کا قصہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ابن سعد نے ان ہی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

كَانَ ثِقَةً مَّعْرُوْفًا وَلَمْ يَرْوِ عَنْ غَيْرِ عَلِيٍّ شَيْئًا۔ (ج ۶ ص ۱۵۴)	وہ بڑے معتبر مشہور آدمی تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوا اور کسی سے کوئی روایت انھوں نے نہیں کی ہے۔

[1] امیر معاویہ کے زمانہ میں زیاد بن ابیہ جب عراق کا گورنر تھا حجر پر حکومتِ قائمہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا خود کوفہ کے لوگوں نے ان کے خلاف شہادتیں دیں زیاد نے ایک جماعت کے ساتھ جن پر بغاوت میں حجر کی رفاقت کا الزام تھا، امیر معاویہؓ کے پاس شام بھیج دیا، فیصلہ ان سب کے قتل کا امیر معاویہ نے صادر کیا مشکیں کسے ہوئے مقتل میں سب لائے گئے۔ حجر نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ لوگوں نے الزام لگایا کہ نماز میں قصداً دیر لگائی تاکہ جتنی دیر قتل سے بچ سکوں، قسم کھا کر بولے کہ آج تک وضو کرنے کے بعد اس سے زیادہ خفیف نماز میں نے کبھی نہیں پڑھی۔ جلاد نے کہا کہ گردن بڑھاؤ۔ بولے کہ اپنے قتل پر اعانت نہیں کر سکتا، آخر شہید کر دیئے گئے۔ حجر بن عدی کی جلالتِ شان کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ کوفہ سے شام گرفتار کر کے بھیجے گئے اور یہ خبر مدینہ پہنچی تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی وقت امیر معاویہؓ کے پاس قاصد دوڑایا کہ حجر کو ہرگز ہرگز قتل نہ کرنا لیکن قاصد اس وقت پہنچا جب وہ شہید ہو چکے تھے۔ (طبقات ج ۶ ص ۱۵۳)

ان ہی کے متعلق یہ روایت بھی درج کی ہے کہ پانی سے استنجاء کرنے کا ذکر ان کے سامنے ہوا تو حجر نے کہا کہ

نَاوِلْنِي الصَّحِيفَةَ مِنَ الْكُوَّةِ فَقَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ هٰذَا مَا سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ يَذْكُرُ أَنَّ الطُّهُورَ نِصْفُ الْإِيْمَانِ۔ (ص۱۵۲)

طاق میں جو صحیفہ (نسخہ) رکھا ہوا ہے ذرا اسے لاکر مجھے دو، (جب لاکر دیا گیا) تو ابن عدی یہ پڑھنے لگے بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ وہ روایتیں ہیں جنہیں میں نے علی بن ابی طالبؓ سے سُنا ہے، وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ طہور ایمان کا نصف ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سنی ہوئی حدیثوں کا کوئی لکھا ہوا مجموعہ حجر بن عدی کے پاس بھی تھا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفیہ کے پاس بھی حضرت علیؓ کی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا عبدالاعلیٰ بن عامر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

كُلُّ شَيْءٍ رَوٰى عَبْدُ الْأَعْلٰى عَنِ ابْنِ الْحَنِيفِيَّةِ إِنَّمَا هُوَ كِتَابٌ أَخَذَهٗ وَلَمْ يَسْمَعْهُ[1]۔ (ص۹۴)

عبدالاعلیٰ محمد بن حنیفیہ سے جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ دراصل ایک کتاب تھی اور عبدالاعلیٰ نے براہِ راست محمد بن حنیفیہ سے ان روایتوں کو نہیں سنا تھا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حالات جو رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس بھی حدیثوں کا کوئی مکتوبہ مجموعہ تھا، فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگوں سے جو حدیثیں بیان کیا کرتا ہوں یہ

رِوَايَةٌ رَوَيْنَاهَا عَنْ آبَائِنَا۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۰۳)

وہ روایتیں ہیں جو اپنے باپ دادوں سے ہم لوگ روایت کرتے ہیں۔

اور فرماتے کہ اپنے والد امام باقر کے حوالہ سے جن حدیثوں کو میں بیان کرتا ہوں

إِنَّمَا وَجَدْتُهَا فِي كُتُبِهٖ۔ (تہذیب ج ۲ ص۱۴۲)

میں نے ان سب کو ان کے (امام باقر کی) کتابوں میں پایا۔

---

[1] بعضوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عامر بن جہنی نامی شخص نے ابن الحنیفیہ کی ان حدیثوں کو قلمبند کیا تھا عامر کو اگرچہ ابن حبان نے "ثقات" میں شمار کیا ہے لیکن عام طور پر محدثین کو اس شخص پر اعتماد نہیں ہے۔ دیکھو میزان لسان المیزان وغیرہ۔

اگر مذکورہ بالا روایات پر اعتماد کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیثوں کے تین چار مجموعے لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے جن میں حارث اعور والا نسخہ تو براہِ راست حضرتِ والا کے دستِ مبارک ہی کا لکھا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کوفہ پہنچنے کے بعد "تقلیل فی الروایۃ" کے اصول پر حضرت علیؓ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور روایتوں کی عمومیت کے جس دروازے کو ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد میں شدت کے ساتھ بند رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ دروازہ کھل گیا، آخر حارث والی روایت اگر صحیح ہے تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ خود کاغذ منگوا کر آپ نے لکھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دو صحابیوں یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے سوا حضرات صحابہ میں سے جن جن بزرگوں کی طرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے بھی رسول اللہؐ کی حدیثیں قلم بند کی تھیں یہ سارے قصے حضرت علیؓ کے طرزِ عمل کی تبدیلی ہی کے بعد کے واقعات ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس زمانے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس کسی کے پاس حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ ہو، اس کو وہ ضائع کر دے ان دونوں بزرگوں یعنی عبداللہ بن عمرو عاص اور حضرت انس نے اس حکم تعمیل اپنے لئے ضروری خیال نہ کی، ان کا عذر غالباً یہی ہو گا کہ براہِ راست رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے لکھا تھا۔ بلکہ انس بن مالک کا بیان جیسا کہ گزر چکا یہ تھا کہ لکھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں اس کو پیش بھی کر چکا ہوں۔ بہرحال ان دو استثنائی خاص واقعہ کے اور جن جن صحابیوں کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں جن کا تفصیلی ذکر ابتدائے کتاب میں گزر چکا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی سے ان صحابیوں میں اس کی جرأت پیدا ہوئی اور کیسی ہمت افزائی؟ کسی اور موقعہ پر بھی میں نے تذکرہ کیا ہے یعنی کوفہ میں خلیفہ ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست راست آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق مغازی کے امام موسیٰ بن عقبہ کہتے تھے کہ

وَضَعَ عِنْدَنَا كُرَيْبٌ (مَوْلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْعَبَّاسِ) حِمْلَ بَعِيْرٍ اَوْ عِدْلَ بَعِيْرٍ مِّنْ كُتُبِ ابْنِ عَبَّاسٍ. (ج ۵ ص ۲۱۶)

میرے پاس عبداللہ بن عباسؓ کے غلام کریب نے ابن عباسؓ کی کتابیں رکھوائی تھیں جو ایک یا نصف بار شتر تھیں۔

"حمل بعیر او عدل بعیر" یعنی ایک بار شتر یا نصف بار شتر) یہ شک کس کی طرف سے ہے ابن سعد نے اس کو واضح نہیں کیا ہے، شک کسی کی طرف سے ہو، مگر مان لیا جائے کہ کتب ابن عباس ایک بار شتر نہ سہی، اس کا نصف ہی سہی ان کی آنکھوں کے کھولنے کے لئے کیا کم ہے جو کہتے ہیں کہ سب سے پہلے زہری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلم بند کیں، میں یہ مانتا ہوں کہ کتب ابن عباس کے اس ذخیرے میں اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا بھی کوئی مجموعہ تھا لیکن اس روایت کے آخر میں جب یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں:

كَانَ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اِذَا اَرَادَ الْكِتَابَ كَتَبَ اِلَيْهِ ابْعَثْ اِلَيَّ الصَّحِيْفَةَ كَذَا وَكَذَا فَيَنْسِخُهَا فَيَبْعَثُ اِلَيْهِ بِاَحَدِهِمَا.

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے علی کو (ابن عباس) کی ان کتابوں میں سے کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو لکھ بھیجتے کہ فلاں فلاں صحیفہ بھیج، تو اس صحیفہ کی کریب نقل کرتے پھر نقل یا اصل کو علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھیج دیتے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عنوانوں اور مختلف مضامین پر مشتمل الگ الگ صحیفے "کتب ابن عباس" کے اس ذخیرے میں تھے پس اس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن جب ہمیں معلوم ہے کہ ابن عباسؓ ان صحابیوں کے پاس جا جا کر جو ان سے بڑے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دریافت کرتے تھے اور صرف دریافت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ الکتانی نے رویانی کی مسند سے بسند متصل یہ روایت ابن عباسؓ ہی کے متعلق جو نقل کی ہے کہ

كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَاْتِيْ اَبَا رَافِعٍ فَيَقُوْلُ مَاصَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابن عباس کا حال یہ تھا کہ ابو رافع (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے مولی وصحابی) کے پاس آتے اور کہتے کہ فلاں دن رسول اللہ

يَوْمٍ كَذَا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ مَنْ يَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ۔ (ج ۲ ص ۲۴۷)

نے کیا کیا اور ابن عباسؓ کے ساتھ ایک شخص ہوتا جو ان ساری باتوں کو جنھیں ابو رافع بیان کرتے وہ شخص لکھتا جاتا

اور اس میں تو خیر اسی قدر ہے کہ ابن عباسؓ کا منشی حدیثوں کو لکھتا جاتا تھا، الکتانی ہی نے بحوالہ طبقات ابن سعد ابو رافع کی بیوی سلمیٰ[1] کی یہ روایت جو نقل کی ہے کہ

رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ مَعَهُ أَلْوَاحٌ يَكْتُبُ عَلَيْهَا عَنْ أَبِي رَافِعٍ شَيْئًا مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (الکتانی فی التراتیب الاداریہ ص ۲۴۷)

میں نے ابن عباسؓ کو دیکھا کہ ان کے پاس تختیاں ہیں جن پر وہ ابو رافع کی بیان کی ہوئی ان روایتوں کو لکھا کرتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے متعلق ابو رافع بیان کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ کتب ابن عباس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو انھوں نے خود قلم بند فرمایا تھا یا اپنے کاتب سے لکھوایا تھا ان کا ابن عباسؓ کی ان کتابوں میں نہ رہنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔

---

[1] سلمیٰ آنحضرتؐ کی لونڈی تھیں، ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے جتنے بچے پیدا ہوئے قابلہ کا کام سلمیٰ ہی نے انجام دیا تھا اور ابراہیم علیہ السلام ماریہ قبطیہ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جب پیدا ہوئے تھے تو اس وقت بھی قابلہ سلمیٰ ہی تھیں، ابو رافع جو دراصل حضرت عباس کے غلام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عباس نے ہبہ کر دیا تھا ان کی شادی سلمیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی اور ابو رافع کو آزاد کر دیا تھا ان کے لڑکے جن کا نام عبید اللہ بن ابی رافع۔ حضرت علی علیہ السلام کے کاتب (سکریٹری) تھے غلاموں کو یہ بلندیاں اسلام نے عطا کی تھیں اس موقعہ پر بیساختہ سلمیٰ اور ابو رافع کا قصہ جس کا مسند احمد میں تذکرہ کیا گیا ہے یاد آگیا۔ سلمیٰ ایک دن روتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شکایت کی کہ ابو رافع نے بلا وجہ مجھے آج مارا ہے۔ ابو رافع بلائے گئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ بھائی تم نے اس بے چاری کو کیوں مارا۔ ابو رافع نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے یہ ستاتی ہے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمیٰ سے دریافت کیا کہ تم نے ابو رافع کو کیا تکلیف پہنچائی۔ سلمیٰ نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ شخص نماز پڑھ رہا تھا اسی حال میں اس کا وضو ٹوٹ گیا اس پر میں نے کہا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ریاح اگر خارج ہو جائے تو وضو کر لیا کریں۔ بس اسی پر یہ شخص مجھے مارنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میاں بیوی کے اس قصے کو سن کر ہنسنے لگے اور ابو رافع سے کہا کہ اس بیچاری نے تم سے اچھی بات کو کہی تھی۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۲۷۲)

بہر حال کتب ابن عباس کا یہ ذخیرہ ہو یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق میں نے جو نقل کیا تھا کہ حسن ابن عمرو بن امیہ الضمری کو اپنے گھر لے گئے اور لکھی ہوئی حدیثوں کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اسے جب دکھایا تو حسن ابن عمرو کہتے تھے کہ

فَأَرَانَا كُتُبًا كَثِيرَةً مِّنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ مجھے ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی لکھی ہوئی کتابیں دکھائیں۔

اور پھر ابو ہریرہؓ کا یہ فرمانا کہ

قَدْ أَخْبَرْتُكَ أَنِّي إِنْ كُنْتُ حَدَّثْتُكَ بِهِ فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدِي۔ (مقدمہ فتح الباری) میں نے تم کو مطلع کیا تھا کہ تم سے جو کچھ بھی حدیثیں میں نے بیان کی ہیں وہ سب میرے پاس لکھی ہوئی ہیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حدیثوں کو بیان کیا کرتے تھے جن کی تعداد پانچہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے یہ سب ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔

اس کے سوا اور بھی جن جن صحابیوں کے متعلق ذکر کر چکا ہوں کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی روایتیں قلم بند ہو چکی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے بعد ہی کے یہ واقعات ہیں، آخر جب خود رسول کا خلیفۂ راشد اپنے دستِ مبارک سے لکھ لکھ کر لوگوں کو دینے لگا ہو تو دوسروں کو اس سے روکنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی تھی، رہی وہ مصلحت جس کی وجہ سے عہدِ نبوت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں حدیثوں کی کتابت اور عام اشاعت میں مزاحمت کی جاتی تھی اور خود حضرت علیؓ کو بھی اسی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے شروع میں پایا جاتا ہے پھر کتابت و اشاعت کی اس عام اجازت اور اس کی ہمت افزائی کے بعد اسی خطرے کے پیدا ہونے کا اندیشہ کیا باقی نہیں رہا تھا؟ مانا کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں اور عہدِ نبوت میں نسبتاً کافی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، لیکن کتنا فاصلہ؟ پچیس سے تیس سال ہی تک کا تو فاصلہ؟ پھر کیا یہ بڑا فاصلہ تھا؟ آخر کچھ بھی ہو اس پر تو امت کا اتفاق ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ خلافتِ راشدہ ہی کا زمانہ تھا۔ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ کی مکتوبہ

چیزوں کے متعلق یہ خطرہ کہ آئندہ نسلوں میں غیر معمولی اہمیت ان روایتوں کو حاصل ہو جائے گی، اسی وجہ سے تو تھا کہ خلافتِ راشدہ کا وہ زمانہ تھا پس اسی خلافتِ راشدہ کا عہد جب حضرت علیؓ کے زمانہ تک موجود تھا تو اس خطرے کا احساس علی کرم اللہ وجہہ کو کیوں نہیں ہوا؟

بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کو پیدا کرنا چاہیئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کے اٹھانے سے بعض ایسے واقعات و حقائق لوگوں کے سامنے آجائیں گے جن کی طرف اس وقت تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

اجمالی جواب تو اس سوال کا یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جو چیزیں لکھی گئیں پچھلی نسلوں میں ان کو وہ اہمیت جو نہیں حاصل ہوئی جس کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا، آخر یہ تو ایک واقعہ ہے پھر توقع سے بیشتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی پیش آنے والے واقعہ کو اگر سمجھ لیا تو تاریخی رفتار نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو جن نقاط تک پہنچا دیا تھا ان کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت علیؓ تو خیر حضرت علیؓ ہی تھے میں تو سمجھتا ہوں کہ معمولی فہم و فراست رکھنے والے آدمی کے لئے بھی اس کا اندازہ چنداں دشوار نہ تھا، میں کیا کہنا چاہتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے۔ میرے نزدیک تدوینِ حدیث کی تاریخ کی چند اہم منزلوں میں ایک بڑی اہم منزل یہ بھی ہے۔ پڑھنے والوں سے امید کرتا ہوں کہ ذرا زیادہ سنبھل کر اس تفصیل کا مطالعہ کریں گے۔

"صحابیت" اور "حدیثِ رسول" کے خلاف پہلا ناپاک اقدام

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی روش میں یہ تغیر کوفہ تشریف لانے کے بعد ہی کرنا پڑا، اور یہ وہی زمانہ ہے جس سے کچھ ہی دن بیشتر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے

آخری چند سالوں میں ایک عجیب وغریب اندرونی تحریک کے پھیلانے کی کوشش عام مسلمانوں میں ہماری ہو چکی تھی، یوں کہنے کے لئے اس تحریک کے متعلق بیسیوں باتیں کہی جاتی ہیں لیکن جس چیز نے اس تحریک کو عجیب وغریب چیز بنادی تھی وہ اس کی اصل روح تھی یعنی اس جوہری قوت کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا گیا تھا جو اسلام کی پشتیبانی اور نصرت کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد "صحابیت" کی شکل میں قدرت کی طرف سے جمع کر دی گئی تھی۔ کھلی ہوئی بات تھی کہ اسی خداداد قوت کو لے کر پیغمبر آگے بڑھے تھے، عرب کے دس لاکھ مربع میل پر پیغمبر کی زندگی میں جس اقتدار کے حاصل کرنے میں اسلام کامیاب ہوا تھا یا آپ کے بعد چند ہی سالوں میں روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کا قالب اسلام نے اچانک جو اختیار کرلیا تھا یہ سب کچھ جو ہوا تھا خدا کی عطا کی ہوئی اسی قوت کے بل بوتے پر ہوا تھا اسلام کے بچے کھچے حریف، عرب کے مختلف گوشوں میں جو چھپے دبے تھے عہد عثمانی کے آخری زمانے کے ماحول کے بعض پہلوؤں کو اپنے پوشیدہ اغراض کی تکمیل کے لئے مناسب اور موزوں پاکر مخفی راہوں سے یہی ارادہ کر کے اٹھے کہ

"صحابیت"

کی اس قوت پر کوئی ایسی کاری ضرب لگائی جائے جس کے بعد اسلام کا دینی سرمایہ ہو یا دنیوی خود بخود صفر بن کر رہ جائے گا۔ تحریک چلانے والے بڑے ہوش وگوش کے لوگ تھے، قیادت جنوب عرب (یمن) کے یہود کے ہاتھ میں تھی جو آغاز اسلام سے پہلے ہی اگرچہ اس علاقہ کی حکومت کھو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کی ذہنی اور دماغی سطح عرب کے عام باشندوں سے بلند تھی، جو حکمراں قوم کی وراثت کا لازمی نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تحریک کے چلانے کے لئے جس وقت کو ان لوگوں نے تاکا تھا اور جن لوگوں کا انتخاب، تحریک سے متاثر کرنے کے لئے کیا گیا تھا مختلف وجوہ سے تحریک کے قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پائی جاتی تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ کام کا آغاز جن لوگوں میں تحریک کے بانیوں نے کیا تھا، یہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو بادیۂ عرب سے نکل نکل کر مسلمانوں کی فوجی نوآبادیوں میں آکر مقیم ہو گئے تھے یعنی بصرہ، کوفہ، شام و مصر میں جو نئی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، ان ہی میں یہ پھیلے ہوئے تھے اور گو شروع شروع میں ان چھاؤنیوں میں کافی تعداد ان بزرگوں کی بھی شریک تھی، جن کے تزکیہ و تصفیہ اور تعلیم و تربیت کا کام براہِ راست صحبتِ نبویہ میں انجام پایا تھا لیکن جس زمانے میں اس منحوس تحریک کا آغاز ان چھاؤنیوں میں شروع ہوا اس وقت تک نبوت کی صحبت سے استفادہ کرنے والوں کی بڑی تعداد بتدریج دنیا سے رخصت ہو چکی تھی، ابن خلدون نے ان فوجی نوآبادیوں کے صحابۂ کرام کا ان الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد یعنی

لَمَّا اسْتَکْمَلَ الْفَتْحُ وَاسْتَکْمَلَ لِلْمِلَّةِ الْمُلْکُ وَ نَزَلَ الْعَرَبُ بِالْاَمْصَارِ فِیْ حُدُوْدِ مَا بَیْنَهُمْ وَبَیْنَ الْاُمَمِ مِنَ الْبَصْرَةِ وَالْکُوْفَةِ وَالشَّامِ وَمِصْرَ وَکَانَ الْمُخْتَصُّوْنَ بِصَحَابَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالْاِقْتِدَاءِ بِهَدْیِهٖ وَاٰدَابِهٖ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ مِنْ قُرَیْشٍ وَاَهْلِ الْحِجَازِ وَمَنْ ظَفَرَ بِمِثْلِ ذٰلِكَ مِنْ غَیْرِهِمْ۔	جب فتح کی تکمیل ہو گئی اور ملت کا حکومت پر قبضہ کامل ہو گیا اور عرب کے لوگ ان الامصار (فوجی چھاؤنیوں) میں جا کر مقیم ہو گئے جو عربوں اور دوسری قوموں کے درمیان قائم کی گئی تھیں یعنی بصرہ، کوفہ، شام و مصر میں ان چھاؤنیوں میں وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ کی صحبت مبارک سے استفادہ کیا تھا اور آپ کی روش کی پیروی کی سعادت ان لوگوں کو میسر آئی تھی اور آپ کے طور و طریق کو اختیار کیا ان میں مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی، قریش اور حجاز کے بھی، نیز اور بھی جن جن لوگوں کو اس کا موقعہ ملا۔

آخر میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن کی اکثریت کثیرہ سے یہ چھاؤنیاں بھری ہوئی تھیں لکھا ہے کہ۔

وَاَمَّا سَائِرُ الْعَرَبِ مِنْ بَنِیْ بَکْرِ بْنِ وَائِلٍ	لیکن باقی عرب کے لوگ جو بنو بکر بن وائل اور قبیلہ

وَعَبْدِ الْقَيْسِ وَسَائِرُ رَبِيْعَةَ وَالْاَزْدُ وَكِنْدَةَ وَتَمِيْمٌ وَقُضَاعَةُ وَغَيْرُهُمْ فَلَمْ يَكُوْنُوْا مِنْ تِلْكَ الصُّحْبَةِ بِمَكَانٍ اِلَّا قَلِيْلًا مِنْهُمْ۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۳۰)

عبد القیس اور ربیعہ قبیلہ کی شاخوں سے تعلق رکھنے والے اور قبیلہ ازد قبیلہ کندہ، قبیلہ تمیم قبیلہ قضاعہ وغیرہ کے لوگ سوان کو صحبتِ نبویہ سے حصہ بجز چند معدودے افراد کے کسی کو میسر نہ آیا تھا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا سازشی تحریک نے ان چھاؤنیوں میں جس زمانے میں سر نکالا ہے اس وقت زیادہ تر ان میں ان ہی قبائل کے افراد کی کثرت ہو گئی تھی، جن کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بجز معدودے چند لوگوں کے نبوت کی صحبت سے ان کو کوئی حصہ نہ ملا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ عمرو بن معدی کرب یا بشر بن ربیعہ جیسے لوگ جن کا نام بڑے اہم معرکوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یرموک اور قادسیہ کے جو سورما سمجھے جاتے ہیں حافظ ابن حجر نے اصابہ میں سابق الذکر یعنی عمرو بن معدی کرب کے حال میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ قرآن میں ان کا امتحان لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تمہیں کچھ قرآن بھی یاد ہے، تو نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ

شَغَلْتُ بِالْجِهَادِ عَنْ حِفْظِہٖ۔ جہاد کی مشغولیت نے مجھے قرآن یاد کرنے نہ دیا۔

اسی طرح دوسرے صاحب بشر بن ربیعہ سے بھی جب یہی سوال کیا گیا تو حافظ ابن حجر ہی نے نقل کیا ہے کہ صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سنا کر چپ ہو گئے۔ جس کا بظاہر مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ کے سوا غالباً کوئی چیز قرآن کی اس بندۂ خدا کو شاید یاد نہ تھی[1]۔

---

[1] دیکھو اصابہ جلد ا ص ۱۸ اسی کتاب سے آپ کو معلوم ہو گا کہ جنگی خدمات کے لحاظ سے ان دونوں کی حیثیت کتنی نمایاں تھی۔ عمرو بن معدی کرب کے متعلق تو لکھا ہے کہ قادسیہ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ جو ایرانیوں اور مسلمانوں میں پیش آیا اس میں عمرو کو دیکھا جاتا تھا کہ ایرانی سپاہیوں کو گھوڑوں کی پیٹھ سے اس طرح اٹھا لیتے تھے جس طرح چھوکریوں کو کوئی اٹھالے اور دونوں صفوں کی بیچ میں لاکران کو اس طرح کاٹ کر رکھ دیتے کہ گویا گاجر اور مولی کاٹی گئی۔ کاٹ کر کہتے کہ ان لوگوں کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا چاہئے۔ یرموک میں بھی عمرو بن معدی کرب کا نام نمایاں نظر آتا ہے پُرخوری میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

جب عمرو بن معدی کرب اور بشر جیسی ممتاز ہستیوں کا یہ حال تھا جو حافظ کی زبانی آپ نے سنا اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ بادیۂ عرب کے ان عام صحرائی سپاہیوں کی کیفیت کیا ہوگی اور اس حد تک تو پھر بھی غنیمت ہے، عہدِ عثمانی کے آخری دنوں کی روئیدادیں ان چھاؤنیوں کی تاریخ میں جب ہم پڑھتے ہیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ گو صحراءِ عرب کے یہ سارے بدو مسلمان ہو ہو کر فوج میں شریک ہونے کی حد تک شریک ضرور ہو گئے تھے لیکن ان میں بہت سی بدویانہ عادتیں اب بھی باقی رہ گئی تھیں یا دب جانے کے بعد ابھر آئی تھیں۔ سچ پوچھئے تو اس سازش کے شکار ہونے میں زیادہ دخل انہی علمی و کرداری کمزوریوں کو تھا جن میں الامصار کی یہ عمومیت مبتلا تھی بلکہ کارروائی کی ابتداء ان ہی لوگوں سے کی گئی جن میں نمایاں طور پر اس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔

لیکن جو اصل مقصد تحریک کا تھا یعنی صحابیت کی قوت کا بالکلیہ اختتام اس نتیجہ تک ان لوگوں کو بھی کھینچ کر لے آنا آسان نہ تھا کیونکہ کچھ بھی ہو بہرحال وہ مسلمان ہو چکے تھے، پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر اور اسلام کو خدا کا سچا دین مان چکے تھے خیال تو کیجئے کہ ان ہی کو یہ باور کرانا کیا آسان تھا کہ صحابیت کی یہ ساری قوت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت پر خرچ ہوتی رہی اور یہ کہ ان صحابیوں میں نہ کوئی اسلام ہی کا دوست تھا اور نہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ان میں کوئی اخلاص و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ چھاؤنیوں کے یہ عام لوگ مسلمان

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) یہی حال بشر کا ہے "بشر" کی عظمت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ کوفہ کا ایک محلہ ان کے نام "جبانہ بشر" کے نام سے موسوم تھا، قادسیہ کے ابطال میں شمار ہوتے ہیں اس جنگ کو جیت لینے کے بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں جو قصیدہ انھوں نے لکھ بھیجا تھا اس کے دو شعروں کا ترجمہ یہ ہے۔

ؔ یاد کیجئے خدا آپ کو ہدایت کرے اس دن کو جب قادسیہ کے دروازہ پر ہماری تلواریں چمک رہی تھیں اور لوگوں کے دل سینوں سے اٹے چلے جاتے تھے ایک ٹڈی دل فوج کو ختم کرکے دوسرے دستہ کی طرف ہم بڑھے چلے جاتے تھے جو پہاڑ کی طرح ہماری طرف بڑھا آتا تھا وہی دن جب ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش! پرندوں سے بازو مستعار لے کر وہ اڑ جاتا۔

نہ بھی ہوتے جب بھی صرف انسان ہی ہونا ان کا اس عجیب و غریب پیش کش کو مسترد کر دینے کے لئے کافی تھا جس کے اتارنے کا ارادہ ان کے قلوب میں کیا گیا تھا، دن دن نہیں ہے رات ہے، زمین ہی آسمان ہے اور آسمان کو غلط فہمی سے لوگ آسمان سمجھ رہے ہیں ورنہ درحقیقت وہی زمین ہے، سفیدی سفیدی نہیں سیاہی ہے چار کا عدد چار نہیں تین ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بدیہی البطلان دعووں کو جب تک آدمی ہے اور آدمی کے احساسات رکھتا ہے کیا ایک لمحہ کے لئے ان جہلات کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔

صحابیت کی قوت کا اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق تھا کیا وہ کسی بحث و تحقیق کا محتاج تھا؟ جن لوگوں میں اس بدیہی حقیقت کے متعلق شک و اشتباہ وہ پیدا کرنا چاہتے تھے، گو خود صحابی نہ تھے لیکن ان کی بڑی تعداد صحابہ کی دیکھنے والی تھی یا کم از کم صحابہ کے دیکھنے والوں سے ان کے حالات تواتر کی شکل میں ہر ایک کے کانوں تک پہنچے ہوئے تھے ساری فضا اس وقت کی صحابیت کی اس وقت کی گونج سے معمور تھی، یقیناً جس نصب العین کو وہ لے کر اٹھے تھے، کامیاب ہو جانے کے بعد اسلام کی فاش شکست پر ان کی یہ کوشش منتج ہوتی۔ خدانخواستہ اگر یہ ہو جاتا تو پہلی صدی ہجری میں جیسا کہ ان بد اندیشوں نے سوچا تھا اسلام کا سارا ایوان سربسجود ہو کر رہ جاتا گویا شروع ہونے کے ساتھ ہی اسلام کی تاریخ ہمیشہ کے لئے اسی وقت ختم ہو جاتی؛ اس لئے اس کی تو داد دینی پڑتی ہے کہ تاکنے والوں نے ٹھیک اسی بنیادی اساس کو ضرب لگانے کے لئے تاکا تھا جس پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو جانے کے بعد وہ بازی جیت لیتے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا دن کی کھلی روشنی میں خواہ دیکھنے والے جیسے کچھ بھی ہوں ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر یہ باور کرا دینا کہ آفتاب غروب ہو چکا ہے اور بجائے دن کے رات آگئی ہے کوئی آسان بات نہ تھی، آخر مغالطی مقدمات کی اثر اندازی بھی ایک خاص حد تک محدود ہوتی ہے آپ لاکھ نفسیاتی کرتبوں سے کام لیتے ہوئے چلے آیئے، لیکن آنکھیں کھولے

جو چمکتے ہوئے آفتاب کو دیکھ رہا ہے اس کو یہ باور کرانے میں کیا آپ کامیاب ہوسکتے ہیں؟ آدمی بہر حال آدمی ہے چوپایہ اور جانور نہیں ہے خصوصاً شکار کھیلنے والے جن میں شکار کھیلنا چاہتے تھے مسلمان تھے اور غیر منافق مخلص مسلمان تھے۔

کوئی تدبیر اس کے سوا کارگر نہیں ہوسکتی تھی کہ جھوٹ کا دھواں اٹھایا جائے اور اسی سے ایسی تاریکی پھیلادی جائے کہ بینائی رکھتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دن رات کی شکل میں نظر آنے لگے، یہی واحد تدبیر مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے باقی رہ گئی تھی جسے بالآخر اختیار کرنے والوں نے اختیار ہی کیا تفصیل اس اجمال کی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ کا انتساب قطع نظر اس کے کہ مآلاً وہ افتراء علی اللہ یعنی اللہ کی طرف جھوٹ باندھنے کے جرم کی شکل اختیار کرلیتا تھا اور قرآن میں اس جرم کے مجرم کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی کرنے والوں کی صف میں سب سے بڑا ظالم اور مجرم بیسیوں جگہ قرار دیا گیا تھا اسی کے ساتھ ساتھ جیسا کہ گزر چکا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ والی روایت کا صحابہ کرام نے اتنا چرچا کیا تھا اور اس کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اتنی کثرت سے ہر مجلس و محفل میں وہ دہراتے رہتے تھے کہ روایت میں قریب قریب تواتر کی کیفیت پیدا ہوچکی تھی اس ذریعہ سے قلوب میں اس جرم کی اہمیت کو دلنشیں کرانے میں وہ اس حد تک کامیاب ہوچکے تھے کہ شاید قتل و زنا، و سرقہ وغیرہ جرائم کی بھی اس جرم کے مقابلہ میں اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس عہد کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس جرم کی اہمیت سے اتنے زیادہ متاثر تھے کہ دعویٰ کرنے والا اگر یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ گویا ان میں اس جرم کے ارتکاب کی صلاحیت ہی جاتی رہی تھی تو شاید واقعات کی روشنی میں اس دعویٰ کا مسترد کرنا آسان نہ ہوگا۔

آخر اس کے بھی کوئی معنی ہیں کہ "صحابہ کرام" کی یہی جماعت جس میں ہر قسم کے لوگ تھے یعنی اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ مدارج میں ان کو بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے، جیسے ہر جماعت کے افراد میں یہ تقسیم جاری ہوتی ہے تاہم یہ مسلم تھا کہ پیغمبر کے سوا کوئی بشر چونکہ معصوم پیدا نہیں کیا جاتا اس لئے

نہ اس زمانے میں اور نہ اس کے بعد اس وقت تک کسی طبقہ کے صحابیوں کو معصوم قرار دینے کا عقیدہ مسلمانوں میں کبھی پیدا ہوا، اور غیر معصوم ہونے کی وجہ سے جس قسم کی بھی کمزوریاں اس جماعت کے بعض افراد سے سرزد ہوئی ہیں بغیر جھجک کے مسلمان ہمیشہ ان کا تذکرہ زبانی بھی اور کتابوں میں بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ آخر خود سوچئے حضرت ماعز اسلمی، یا نعمان بن عمرو الانصاری، یا مغیرہ بن شعبہ، یا وحشی یا عمرو بن عاص یا خود امیر معاویہ وغیرہم حضرات[1] (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی طرف حدیث و سیر و تاریخ وغیرہ کتابوں میں کون کون سی باتیں نہیں منسوب کی گئی ہیں اور یہ تسلیم کر کے منسوب کی گئی ہیں کہ واقعی ان لغزشوں میں وہ مبتلا ہوئے تھے، جرائم جنھیں ہم کبائر

---

[1] سیر صحابہ و تاریخ کی کتابوں میں ان صحابیوں کے حالات آپ کو ملیں گے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ماعز کی طرف زنا کا جرم منسوب کیا گیا ہے اسی طرح مغیرہ بن شعبہ کی طرف بھی بعضوں نے اس جرم کو منسوب کیا ہے۔ نعمان بن عمرو انصاری تو وہی مشہور شگفتہ مزاج صحابی ہیں جن کی بعض ادائیں عجیب تھیں۔ لکھا ہے کہ مدینہ میں موسمی پھل وغیرہ جیسی چیزیں بیچنے کے لئے کوئی آتا تو ادھار اس سے خرید لیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیہ پیش کر دیتے، یہ خیال کر کے کہ نعمان کی طرف سے یہ ہدیہ ہے رسول اللہ خود بھی نوش جان فرماتے اور دوسروں میں تقسیم کر دیتے، جب قیمت مانگنے والا نعمان کے پاس آتا تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ رسول اللہ کے سامنے لا کر اس سے کہتے کہ قیمت آپ سے مانگ لو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ تم نے تو ہدیۃً پیش کیا تھا، کہتے کہ ہاں! پیش تو ہدیۃً ہی کیا تھا لیکن میرے پاس دام کہاں ہیں جو ادا کروں؟ ایک دفعہ ایک غریب بدو کے اونٹ کو جب وہ رسول اللہ کے پاس بیٹھا تھا انھوں نے بعضوں کے اشارے سے ذبح کر دیا بدو نے باہر نکل کر یہ تماشا جو دیکھا تو چیخنے لگا، رسول اللہ سے فریاد کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ نعمان کا نام لیا گیا۔ وہ بھاگ کر ایک شخص کے گھر میں چھپے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھتے ہوئے اس گھر میں گھس کر نعمان کو گرفتار کیا، دریافت کیا کہ یہ کیا حرکت تھی۔ کہنے لگے کہ جن لوگوں نے میرا پتہ آپ کو بتایا ہے ان ہی کے اشارے سے میں نے کیا تھا آخر رسول اللہ نے اپنی طرف سے اونٹ کی قیمت بدو کو ادا کی اور کباب بنا کر اونٹ کو لوگ کھا گئے ان ہی نعمان پر متعدد دفعہ شراب خواری کا الزام لگا، ثابت ہوا، حد لگی۔ وحشی بھی صحابیوں ہی میں شمار ہوتے ہیں حمص میں رہتے تھے شراب خواری کے الزام میں ان پر بھی حد لگی۔ رہے عمرو بن عاص اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سو ان کے متعلق مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں، عام تاریخوں میں ان کے حالات لوگ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔

کہہ سکتے ہیں "یہ واقعہ ہے ان کی شاید ہی کوئی قسم ہو گی جو اس فہرست میں نظر نہ آتی ہو، مگر حیرت ہوتی ہے کہ ان ہی صحابیوں کی طرف جہاں تک میرے معلومات ہیں اس جرم کے انتساب کی جرأت کسی زمانہ میں نہیں کی گئی ہے کہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی صحابی نے کوئی غلط بات منسوب کر دی تھی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس سے جو فعل بھی سرزد ہو جاتا تھا محض صحابی ہونے کی وجہ سے لوگ اس فعل کے انتساب سے نہیں جھجکتے تھے تو خدانخواستہ کذب علی النبیؐ کے جرم کا تجربہ ان ہی صحابیوں میں سے کسی صحابی سے اگر ہوتا، تو اس کے ذکر سے لوگوں کو کون سی چیز مانع آسکتی تھی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ بیان کہ

كُنَّا لَا نَتَّهِمُ بَعْضُنَا بَعْضًا۔ — ہم لوگ (یعنی صحابہ) باہم ایک دوسرے کو متہم نہیں کرتے تھے (یعنی قصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کر رہا ہے)۔

(طبقات ابن سعد قسم دوم ج، ص۱۳)

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ماننے پر آپس کے باہمی تجربات نے ان کو قطعی طور پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہی حدیثوں کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس اعتراض کے سوا عموماً دوسری قسم کی تنقیدوں کا ان ہی صحابیوں میں عام رواج[1] تھا۔ لیکن احادیث و آثار کے اس عظیم ذخیرے کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی

---

[1] حدیث کے معمولی طلبہ بھی جانتے ہیں کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صحابیوں کی بیان کی ہوئی کتنی حدیثوں پر تنقید فرمائی إِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ (مردے پر رونے والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے) یہ حدیث ہو یا سماع موتیٰ والی روایت ہو، یا قطع صلوٰۃ کے سلسلہ میں یہ روایت کہ عورت کے سامنے آجانے سے بھی نماز منقطع ہو جاتی ہے، یا نحوست نہیں لیکن مکان گھوڑے و عورت میں وغیرہا۔ روایتوں پر حدیث کی کتابوں میں صدیقہ عائشہؓ کی تنقیدیں اس وقت نقل کی جاتی ہیں۔ اَلْوُضُوْءُ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ (یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنا چاہیے) ابوہریرہؓ کی اس حدیث پر ابن عباس ان کے شاگرد کی تنقید کہ کیا گرم پانی سے بھی وضو کروں اور یہ تو چند سرسری مثالیں ہیں، چلا جائے تو صحابہ کرام کی تنقیدوں کا ایک کافی ذخیرہ جمع کیا جا سکتا ہے جو دوسرے صحابیوں کی روایتوں پر ان کی طرف سے کی گئی ہیں ۱۲

بات نہیں ملتی جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جائے کہ صحابی نے دوسرے صحابی پر کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا الزام کبھی لگایا تھا؟ وہی حدیث یعنی گھر والوں کے رونے کی وجہ سے موتیٰ پر عذاب ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حضرت عمرؓ اور حضرت کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس روایت کو بیان کیا کرتے تھے، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب سنا تو اس پر آپ نے اعتراض کیا، لیکن کن الفاظ میں، مسند احمد میں ہے صدیقہ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰهُ عُمَرَ وَابْنَ عُمَرَ فَوَاللّٰهِ مَا هُمَا بِكَاذِبَيْنِ وَلَا مُكَذَّبَيْنِ وَلَا مُتَزَيِّدَيْنِ۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۲۸۱)

رحم کرے اللہ عمرؓ اور ابن عمرؓ پر بس قسم ہے خدا کی نہ تو یہ دونوں غلط بیانی سے کام لینے والے ہیں اور نہ جھوٹ منسوب کرنے والے اور نہ بڑھا کر بات بنانے والے ہیں۔

اور عمر و ابن عمر تو خیر بڑے لوگ ہیں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بے چاری فاطمہ بنت قیس جن کی طلاق والی روایت کا شاید کہیں پہلے بھی ذکر آیا ہے، مسلمانوں کا خلیفہ اور وہ بھی کون خلیفہ؟ عمر فاروقؓ! فاطمہ بنت قیس کی اس روایت کو سمجھتے ہیں کہ قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، لیکن بایں ہمہ زیادہ سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاطمہ اور ان کی اس روایت کے متعلق کچھ کہہ سکے تو یہی کہہ سکے کہ

لَا نَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِ امْرَءَةٍ لَا نَدْرِيْ اَحَفِظَتْ اَوْ نَسِيَتْ۔ (صحاح)

اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبی کی سنت کو کسی ایسی عورت کے بیان سے ہم نہیں چھوڑیں گے جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ اسے یاد رہا یا بھول گئی۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ بھول چوک اور نسیان سے زیادہ اور کسی چیز کے انتساب کی یعنی عمداً غلط بیانی کے انتساب کی ہمت حضرت عمرؓ میں بھی فاطمہ جیسی عورت کے متعلق پیدا نہ ہو سکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بحث و تنقید کی آزادی کا حال تو یہ تھا کہ صحابہ صحابہ ہی پر نہیں یا ان کے چھوٹے بڑوں ہی پر نہیں بے جھجک جہاں موقعہ ہوتا، اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے تھے، بلکہ

صحابیت کے شرف سے جو محروم تھے، دیکھا جا رہا تھا کہ بے محابا وہ بھی صحابہ کو ٹوک رہے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے روک رہے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی کو اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ العیاذ باللہ پیغمبر کو خدا کا سچا پیغمبر مانتے ہوئے ان کی طرف کسی غلط بات کے منسوب کرنے کی کوئی جرأت کر سکتا ہے، یہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اپنے ایک پرانے قدیم شاگرد ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف جو صحابی نہ تھے ان کے سامنے وہ حدیث آپ نے روایت کی کہ جذام کا مرض جسے ہو گیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس سے اس طرح بھاگنا چاہئے جیسے آدمی شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے، ابو سلمہ کہتے ہیں کہ سننے کے ساتھ میں نے ابوہریرہؓ سے کہا کہ آپ ہی نے تو یہ روایت بیان کی تھی کہ "عدویٰ" کوئی چیز نہیں ہے یعنی بیماریوں کے متعلق چھوت اور تعدی کا خیال صحیح نہیں ہے، مطلب یہ تھا کہ آپ اس کے خلاف ایسی روایت بیان کر رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماریوں میں تعدی اور چھوت کے قانون کو دخل ہے، اعتراض سخت تھا دونوں روایتوں میں کھلا ہوا تضاد محسوس ہو رہا تھا۔ اس تضاد کو ابو سلمہ ظاہر بھی کرتے ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب میں حضرت ابوہریرہؓ نے جو کچھ کہا وہ بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا[1] لیکن باوجود ان تمام باتوں کے حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق ابو سلمہ اپنے اندر جس

---

[1] ابو سلمہ کہتے ہیں کہ میرے اعتراض کے جواب میں فَرَطَنَ بِالْحَبَشِيَّةِ (یعنی ابوہریرہؓ حبشی زبان میں کچھ بولنے لگے) یہی وجہ ہوئی جو ان کی سمجھ میں حضرت ابوہریرہؓ کا جواب نہ آیا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عدوی جس کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد تعدی یا چھونے کا طبی قانون نہیں ہے جو تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے بلکہ وحشی اقوام جیسے ہندوستان وغیرہ میں بعض امراض کو خبیث روحوں کی طرف منسوب کرنے کا وہم جو پایا جاتا ہے مثلاً سیتلا دیوی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ جب کسی سے خفا ہو جاتی ہے تو اسے چیچک میں مبتلا کر دیتی ہے، ہندوستان کے مختلف مقامات میں سیتلا دیوی کے مندر پائے جاتے ہیں کچھ اسی قسم کا خیال ایام جاہلیت میں عربوں کا بعض امراض کے متعلق تھا اسی وہم کا ازالہ عدوی کی نفی سے مقصود ہے۔ بعض جدید کتابوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جذام کے جراثیم کی شکل بالکل شیر جیسی ہوتی ہے سنا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے پیغمبر کی اس حدیث کو سن کر تعجب کیا گویا حدیث میں جذامی جراثیم کی اس شکل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ باقی ابوہریرہؓ نے جواب میں حبشی زبان کیوں استعمال کی بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے مزاج میں کچھ ظرافت تھی اسی موقعہ پر نہیں بلکہ دوسرے مواقع پر بھی ابوہریرہؓ کو ہم پاتے ہیں کہ فارسی میں جواب دے رہے ہیں۔ فارسی اور حبشی زبانیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتے تھے۔ جب جی چاہتا استعمال فرماتے۔ انشاء اللہ ان کی سوانح عمری میں اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔ ان یسر اللہ لی ۱۲

تجرباتی تاثر کو پاتے تھے، اس کا اظہار ان الفاظ میں انھوں نے کیا تھا آج بھی حدیث کی عام کتابوں میں ان کا یہ فقرہ موجود ہے، یعنی ابوسلمہ کہتے تھے کہ

فَمَا رَأَيْتُهُ نَسِيَ حَدِيْثًا غَيْرَهُ۔ پس میں نے نہیں پایا کہ اس حدیث کے سوا کسی اور حدیث کو وہ بھولے ہوں۔ (جمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد وغیرہ)

ابوسلمہ جو حضرت ابوہریرہؓ کے حلقہ کے پرانے شاگرد ہیں ہزارہا حدیثیں ان سے ابوسلمہ نے اس عرصہ میں سنی ہوں گی لیکن اس طویل صحبت اور تجربہ کے بعد یہ کہنا کہ بجز اس روایت کے ان کو میں نے بھولتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق ایک وزنی شہادت ہے۔ بہرحال اس ایک موقعہ پر بھی خیال ابوسلمہ میں کسی چیز کا اگر پیدا ہوا بھی تو وہ صرف نسیان کا تھا حالات ہی ایسے تھے کہ اس کے سوا کسی دوسرے خیال کے پیدا ہونے کا امکان ہی کیا تھا۔

الخطیب نے الکفایہ میں یہ لکھنے کے بعد یعنی

عَلٰى اَنَّهُ لَوْ لَمْ يَرِدْ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَرَسُوْلِهٖ فِيْهِمْ شَيْءٌ مِّمَّا ذَكَرْنَا لَاَوْجَبَتِ الْحَالُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا مِنَ الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ وَالنُّصْرَةِ وَ بَذْلِ الْمُهَجِ وَالْاَمْوَالِ وَقَتْلِ الْاٰبَاءِ وَالْاَوْلَادِ وَالْمُنَاصَحَةِ فِي الدِّيْنِ وَقُوَّةِ الْاِيْمَانِ وَالْيَقِيْنِ۔ (ص ۴۹)

صحابہ کے متعلق اللہ کے بیان یعنی قرآن میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں وہ تعریفی الفاظ اگر نہ بھی پائے جاتے جن کا میں نے ذکر کیا جب بھی جو حال تھا اس کا بھی یہی اقتضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات صحابہ کرام منسوب نہیں کر سکتے تھے، یعنی ہجرت، جہاد اور پیغمبر کی نصرت، اپنی جانوں کی اور مالوں کی قربانیاں اپنے ماں باپ بچے اولاد کو اس راہ میں نثار کرنا اور دین کی بہی خواہیاں، ان کا ایمان ان کا یقین (ان ساری باتوں کو جو بھی پیش نظر رکھے گا وہ بھی اسی فیصلہ پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عمداً غلط بات کا انتساب وہ نہیں کر سکتے تھے)۔

اس نتیجہ پر جو پہنچے ہیں کہ دین کے ان ہی سربازوں اور جان فروش معماروں کے متعلق یہ

کیسے مانا جا سکتا ہے کہ جو باتیں دین نہ تھیں یعنی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی فرمائی ہوئی نہ تھیں قصداً وارادۃً ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کر کے اس دین کو خود اپنے ہاتھوں انہوں نے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا، جس کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اپنے اور اپنے بال بچوں کے خون سے جس دیوار کی انہوں نے تعمیر کی تھی، سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ خواہ مخواہ بلاوجہ اسی دیوار کو منہدم کر کے رکھ دینے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی لیکن جب صحابیت ہی کی قوت کو چاہا گیا کہ اسلامی تاریخ میں اس کے وجود کو صفر کر دیا جائے۔ صفر ہی نہیں بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش ہونے لگی کہ اسلامی دین کو ضعیف کرنے میں اول سے آخر تک یہی قوت مسلسل کام کرتی رہی۔ یہ دعوٰی جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اتنا غیر معقول اور عجیب وغریب ہے کہ دلوں میں اس کا عام حالات میں اتارنا آسان نہ تھا آخر فوجی نوآبادیوں کے وہ سادہ لوح عرب سپاہی جن میں کام کرنے والے کام کر رہے تھے، جیسے کچھ بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے وہ مسلمان تھے، عام انسانی احساسات اور حق و باطل کی تمیز کی عام فطری قوت سے وہ محروم نہ تھے۔ چارہ کار اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ راہ کی ہر وہ منزل جس میں دسیسہ کاریوں کی ہر دوسری تدبیر بے اثر ہو کر رہ جاتی تھی اسی منزل کو ان جھوٹی حدیثوں سے وہ بھر دیتے تھے جنھیں عین وقت پر گھڑ کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان بزرگوں کی طرف وہ منسوب کر دیا کرتے تھے جن کو صحابہؓ کی عام جماعت سے مستثنیٰ کر کے کہتے تھے کہ ان ہی گنے چنے چند صحابیوںؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلصانہ تعلق تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے یہ دونوں انقلابی حوادث یعنی صحابیت کے خلاف جو طوفان اٹھایا گیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کر کے جھوٹی حدیثوں کا جو دھواں اسلامی فضا میں پھیلایا گیا، اگرچہ بظاہر دیکھنے میں یہ دونوں حادثے الگ الگ حادثے نظر آتے ہیں مطالعہ کرنے والے بھی ان دونوں حوادث کا مطالعہ اس طریقے سے کرتے چلے آئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے گویا کوئی تعلق نہ تھا لیکن اور کچھ نہیں صرف یہی بات کہ ان دونوں انقلابی حوادث

کی ابتداء کی تاریخ درج کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا تھا کہ دونوں کی ابتدا ایک ہی سرچشمہ سے ہوئی تھی، میرے نزدیک تو دونوں حوادث کے باہمی تعلق کے سمجھنے کے لئے یہی واقعہ کافی تھا۔

لسان المیزان اٹھا کر دیکھئے، عبداللہ بن سبا کا ذکر کرتے ہوئے حافظ نے جہاں یہ لکھا ہے کہ صحابیت کے خلاف وہ طوفانِ عام جس میں ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شریک کر لیا گیا تھا بلکہ بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی کہ ان ہی دونوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے منشا کے خلاف کاروبار شروع کیا اور صحابہؓ کی عمومیت نے ان کا ساتھ دیا۔ گویا بنیادی الزام ان ہی دونوں پر لگایا گیا تھا اس واقعہ کے ذکر کے بعد تصریح کی ہے کہ

كَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ سَبَا أَوَّلَ مَنْ أَظْهَرَ ذٰلِكَ۔ (ج ۳ ص ۲۹۰)

عبداللہ بن سبا ہی پہلا آدمی ہے جس نے اس خیال کو ظاہر کیا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحابیت کے خلاف جس نے سب سے پہلے مخالفانہ باتیں شروع کیں وہ بھی یہی عبداللہ بن سبا تھا اور اسی کے ساتھ حافظ ہی نے عامر شعبی کے حوالہ سے ان کا دعویٰ نقل کیا ہے کہ

أَوَّلُ مَنْ كَذِبَ عَبْدُ اللهِ بْنُ سَبَا۔ (ج ۳ ص ۲۸۹)

اور سب سے پہلے جو جھوٹ بولا (یعنی جھوٹی حدیث بنائی) وہ عبداللہ بن سبا ہی تھا۔

دونوں انقلابی حادثوں کی اولیت کا اسی ایک شخص میں جمع ہونا یقیناً کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک کی تکمیل کے لئے دوسرے کا وجود ناگزیر تھا۔

عہدِ عثمانیؓ میں اس تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ

اس میں شک نہیں کہ خلافتِ عثمانی سے پہلے بھی مخالفانہ قوتیں جو عرب کے مختلف گوشوں میں پوشیدہ تھیں موقع پا کر سر نکالتی رہتی تھیں۔ عہدِ صدیقی کا واقعہ ردہ نہیں ہو سکتا کہ ان مخالفانہ مخفی قوتوں سے بے تعلق تھا اور گو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتوحات کی وسعت

کی وجہ سے بادیۂ عرب کے ان سپاہیوں کو کسی ایک جگہ سمٹ کر بیٹھنے کا موقعہ نہ ملتا تھا، ان کو دنیا کے اس طول وعرض میں پھیلا دیا گیا جس کا دامن ایک طرف مغربی افریقہ کے حدود سے اور دوسری طرف مشرق میں چینی ترکستان سے ملا ہوا تھا ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کسی دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی گنجائش ہی کب پیدا ہوتی تھی۔ ان کی حالت جیسا کہ تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے یہ تھی کہ

لَا يَكُوْنُ هَمُّ اَحَدٍ هِمْ اِلَّا نَفْسُهٗ وَمَا هُوَ فِيْهِ مِنْ دُبُرَةِ دَابَّتِهٖ اَوْ قَمْلِ فَرْوَةٍ۔ (طبری ج ۵ ص ۹۴)	ان کے سامنے اپنی جان اور جس جانور پر سوار ہوتے تھے اس کے کیڑے اور اپنے پوستین کے جوں کے سوا اور کسی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ تھا۔

لیکن بایں ہمہ صبیغ ہی کے جس واقعہ کا آپ ذکر سن چکے ہیں جو اجناد المسلمین (مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیوں) میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات قرآنی آیتوں کے متعلق پھیلاتا پھرتا تھا اور بظاہر اس کی تحریک گرچہ ایک ذہنی اور فکری تحریک معلوم ہوتی تھی لیکن العسکری کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ

اِتَّهَمَهٗ عُمَرُ بِرَأْيِ الْخَوَارِجِ - (اصابہ ج ۲ ص ۲۵۹)	حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ وہ یعنی صبیغ خوارج کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

"الخوارج" کے لفظ سے یہاں مراد یقیناً اس کے وہ اصطلاحی معنی نہیں ہیں جو خاص قسم کے عقائد واعمال رکھنے والے ایک مستقل اسلامی فرقہ کی تعبیر ہے، کیونکہ خارجیوں کا یہ فرقہ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوا، بلکہ "الخوارج" سے مقصود اس کے عام معنی ہیں یعنی حکومتِ قائمہ کے خلاف باغیانہ خیال وعمل رکھنے والے لوگ، جس کا مطلب یہی ہوا کہ صبیغ کی تحریک میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کوششوں کی جھلک نظر آتی تھی جنہیں اسلام اور دولت اسلامی کے خلاف لوگ اٹھانا چاہتے تھے مگر جیسا کہ آپ نے دیکھا عہدِ فاروقی کے حکام اتنے بیدار تھے کہ صبیغ کو فوراً پایۂ تخت خلافت روانہ کر دیا گیا، حالات کا اندازہ کر کے جس حد

تک خود حضرت عمرؓ اس کی اصلاح کر سکتے تھے حالانکہ کرچکے تھے، وہ تائب بھی ہو چکا تھا لیکن باوجود اس کے زمانہ تک بصرہ جہاں صبیغ نے قیام اختیار کر لیا تھا وہاں کے والی اور حاکم حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ پر شدید تاکید حضرت عمرؓ کی طرف سے تھی کہ صبیغ پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ حکم تھا کہ اس کے ارد گرد لوگ جمع ہونے نہ پائیں حکم کی تعمیل جس طریقہ سے اس زمانے میں کی جاتی تھی، اس کا اندازہ ابوعثمان النہدی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو اسی صبیغ کے متعلق ان کی طرف منسوب ہے یعنی کہتے ہیں:

كَتَبَ إِلَيْنَا عُمَرُ أَنْ لَا تُجَالِسُوهُ قَالَ فَلَوْ جَاءَ وَنَحْنُ مِائَةٌ لَتَفَرَّقْنَا۔ (ج ۳ ص ۲۵۷)

عمرؓ نے لکھ بھیجا تھا کہ صبیغ کے ساتھ کوئی نشست و برخاست نہ کرے (اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ) جب صبیغ ہم لوگوں کی طرف آتا اور سو آدمیوں کی ٹولی بھی بیٹھی ہوتی تو ہم بکھر جاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان معاملات میں کتنے محتاط، بیدار اور چوکنے رہتے تھے، ذرا ان کے اس طرزِ عمل کو ملاحظہ کیجیے، جس کا ذکر ابن سعد نے احنف بن قیس کے تذکرہ میں کیا ہے یعنی مسلمان ہو کر حضرت عمرؓ کے پاس جب احنف آئے تو ان کی تقریری اور فکری صلاحیتوں کو دیکھ کر لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو کامل ایک سال تک اپنے پاس روکے رکھا جب سال پورا ہو گیا، تب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بصرہ اس فرمان کے ساتھ روانہ کیا کہ "اس شخص کو اپنے پاس رکھنا اور مہمات میں اس سے مشورہ لیتے رہنا، جو مشورہ دے اس پر عمل کرنا"۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ جب احنف روانہ ہونے لگے، تب حضرت عمرؓ نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

> تم جانتے ہو، کامل سال بھر تک اپنے پاس تم کو میں نے کیوں روک رکھا تھا، میں تم کو بانچنا جانچتا تھا، اور خوب جانچا، پرکھا اب میں اپنے اس احساس کا اعلان کرتا ہوں کہ بجز بھلائی کے تم میں اور کوئی پہلو مجھے نظر نہ آیا۔ ظاہر تمہارا جہاں تک تجربہ ہوا مجھے بہت اچھا معلوم

معلوم ہوا اور میں امید کرتا ہوں کہ تمہارا باطن بھی ظاہر ہی کی طرح بہتر ہوگا۔[1] (ابن سعد ج ۲، ص ۶۱، قسم دوم)

لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آخر زمانہ میں پہلی بات تو یہی نظر آتی ہے کہ اچانک جہادی مہموں کی سرگرمیوں پر ایک قسم کا جمود طاری ہوگیا۔ ۳۳ھ سے ۳۵ھ تک یعنی جس سال حضرت والا کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اس سے دو سال پہلے کی روئداد پڑھیے، ان میں آپ کو کسی فوجی مہم یا دشمنوں سے مسلمانوں کی آویزش کا کوئی تذکرہ نہ ملے گا خود اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے۔ علاوہ اس کے جب ملک کے مختلف اطراف و جوانب سے فتنوں کی خبریں آنے لگیں اور حضرت عثمانؓ نے مختلف صوبوں کے والیوں کو جمع کرکے مشورہ فرمایا تو مشورہ دینے والوں میں سے بعضوں نے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اپنی طرف سے علاج کی تدبیر یہی پیش کی تھی۔

اَرٰی لَکَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْ تَشْغَلَهُمْ بِالْجِهَادِ عَنْکَ۔ (کامل ج ۳ ص ۵۰) — امیر المؤمنین میرا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کو جہاد میں مشغول کرکے اپنی طرف سے ہٹا دیجئے۔

اور حضرت عثمانؓ نے ان کی اس تجویز کے مطابق حکم بھی دیا جیسا کہ لکھا ہے:

اَمَرَهُمْ بِتَجْهِیْزِ النَّاسِ فِی الْبُعُوْثِ۔ (ایضاً) — حکم دیا کہ لوگ فوجی مہموں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔

لیکن ثابت ہوا کہ یہ علاج بعد از وقت ہے۔ بنانے والے فوجیوں کے بیکار اور خالی دماغوں میں فتنوں کے جن گھونسلوں کو بنانا چاہتے تھے بنا چکے تھے، اس پر بھی جس قسم کی کامیابی ان کو ہوئی شاید نہ ہوتی اگر عہدِ فاروقی کے بیدار مغز حکام کی جگہ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ نہ چلی جاتی جس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوتا ہے کہ یہی عبداللہ بن سبا جب شروع

---

[1] حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ایک روایت بھی بیان کی کہ آپ ان لوگوں سے ڈرایا کرتے تھے جو صاحب علم و فکر ہوں لیکن دین سے ان کا قلب بے تعلق ہو، یہ بھی کہا تھا کہ ہم لوگ آپس میں یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ اس امت کی ہلاکت اسی قسم کے لوگوں سے ہوگی جو علیم و منافق ہوں گے یعنی تعلیم یافتہ بے دینوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کی بربادی مقدر ہے۔ اصل الفاظ حضرت عمرؓ کے یہ ہیں کہ کنا نتحدث انما یھلک ھذہ الامۃ کل منافق علیم (قسم اول ج ۳، ص ۶۷)

اسلامی چھاؤنیوں میں داخل ہوا اور بصرہ میں پہلی دفعہ اس نے سر نکالا، حالانکہ جس قسم کے لوگوں میں وہ ٹھہرا تھا حکومت کی نگاہوں میں وہ خود مشتبہ تھے، اس وقت بصرہ کے حاکم ایک قریشی نوجوان عبداللہ بن عامر تھے۔ لوگوں نے ابن سبا کے مشکوک طرز عمل کی خبریں ان تک پہنچائیں بھی لیکن انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اس کو بلوایا پوچھا کہ بھائی تم کہاں سے آئے ہو؟ جواب میں ابن سبا نے کہا کہ میں یمن کا رہنے والا ہوں، پہلے یہودی تھا اور اب مذہب اسلام کو میں نے قبول کر لیا ہے اور اب آپ کی پناہ میں یہاں آیا ہوں، ابن عامر نے یہ سن کر کہا کہ

"جس قسم کی خبریں تمہارے متعلق مجھے مل رہی ہیں ان کا اقتضاء ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" (ص ۵۵)

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرہ سے وہ کوفہ چلا آیا، کوفہ میں بھی اس کے ساتھ بہ ظاہر کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی، صرف کوفہ سے باہر ہو جانے کا حکم دیا گیا وہ مصر چلا گیا، یہاں کی حکومت ایسے حالات میں مبتلا تھی کہ اس نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور مصر میں کیا کر رہا ہے، اطمینان کے ساتھ اس کو موقعہ مل گیا، کامل ابن اثیر وغیرہ میں ہے:

فَاسْتَقَرَّ بِهَا وَجَعَلَ يُكَاتِبُهُمْ وَيُكَاتِبُونَهُ وَتَخْتَلِفُ الرِّجَالُ بَيْنَهُمْ (ج ۳ ص ۵۵)

مصر ہی میں ابن سبا ٹھہر گیا اور اس کی سازش میں جو شریک تھے، ان سے وہ خط و کتابت کرنے لگا، وہ انہیں لکھتا اور وہ اسے لکھتے اور لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

مصر ہی سے اس نے صحابیت کے خلاف طوفان اٹھایا، اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے:

بَثَّ دُعَاتَهُ وَكَاتَبَ مَنِ اسْتَفْسَدَ فِي الْأَمْصَارِ وَكَاتَبُوهُ وَدَعَوْا فِي السِّرِّ إِلَى مَا عَلَيْهِ رَأْيُهُمْ۔ (ص ۵۹)

اس نے اپنے گوئندوں اور نمائندوں کو (اطراف ملک میں) بھیجا اور ان لوگوں سے خط و کتابت شروع کی جو الامصار (فوجی چھاؤنیوں) میں بگڑ چکے تھے وہ بھی انہیں لکھتا اور وہ اس کو لکھتے اور پوشیدہ طریقوں سے لوگوں کو ان ہی باتوں کی دعوت دینے لگے جو ان کی رائے تھی۔

عہد مرتضوی رضؓ میں اس کو ختم کرنے کی کوشش

جیساکہ میں عرض کر چکا ہوں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے منجملہ دوسرے ذرائع کے ایک بڑا حربہ جسے ابن سبا اور اس کے دُعاۃ و کارندے جو تمام امصار میں بکھرے ہوئے تھے استعمال کر رہے تھے وہ جھوٹی حدیثوں کا سلسلہ تھا جسے جہاں ضرورت ہوتی وہ پیغمبرؐ کی طرف منسوب کر کے لوگوں میں پھیلاتے رہتے تھے، آخر فتنے نے زور پکڑا، حضرت عثمانؓ شہید ہوئے، ان کے شہید ہونے کے بعد بھی فتنہ نہ دبا، مسلمان خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا اور جن لوگوں کو اپنے زیر اثر لانے میں وہ کامیاب ہوا تھا اصطلاحاً جنہیں "السبائیہ" کہتے تھے، ان خانہ جنگیوں میں عموماً یہ حضرت علیؓ کی فوج میں گھلے ملے رہتے تھے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلا معرکہ جو اس سلسلہ میں جنگِ جمل کے نام سے پیش آیا قطعاً پیش نہ آتا اگر غلط فہمی میں طرفین کو مبتلا کر کے عین وقت پر سبائیوں کی جماعت صلح کو جنگ سے بدل دینے میں کامیاب نہ ہو جاتی۔ جمل کے بعد صفین اور خوارج وغیرہ کی لڑائیوں کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہا، سبائی اندر اندر کیا کر رہے ہیں، مسلمانوں میں کس قسم کے خیالات اور بے سر و پا حدیثیں پھیلا رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ایک زمانے تک نہ ملا حالانکہ سبائی جو کچھ بھی کر رہے تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کی فوج اور آپ ہی کے آدمیوں کے ساتھ مل جل کر کر رہے تھے، لیکن بات آخر کہاں تک چھپی رہتی۔ لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کے مشہور بزرگ مسیبؒ[1] بن نخبہ ایک دن عبداللہ بن سبا کو پکڑے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر کے سامنے کھڑا کر کے اعلان کر رہے تھے کہ

---

[1] ثقہ راویوں میں ان کا شمار ہے، حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، علاوہ قادسیہ کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ صفین وغیرہ کی جنگ میں بھی شریک تھے لیکن زیادہ شہرت ان کی اس خاص واقعہ کی بناپر ہوئی جو حضرت امام حسینؓ کی کربلا میں شہادت کے بعد عین ابوردہ کے مقام پر اس وقت پیش آیا جب توابین کے نام سے قتل حسینؓ کا بدلہ لینے کے لئے ابن زیاد کی فوج سے کوفہ کی ایک جماعت لڑی، مسیب بن نخبہ اسی واقعہ میں شہید ہوئے۔ توابین کی جماعت میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ۱۲

يَكْذِبُ عَلَى اللّٰهِ وَعَلٰى رَسُوْلِهٖ ۔ یہ (یعنی ابن سبا) اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھوٹی باتیں بنا بنا کر منسوب کرتا ہے۔

(لسان المیزان ص ۲۸۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی اس کی دسیسہ کاریوں کا راز آخر میں واضح ہوا۔ "صحابیت کے خلاف جس طوفان کو اس نے اٹھایا تھا آپ نے پہلے تو اس فتنہ کی طرف توجہ فرمائی۔ اعلان عام آپ کی طرف سے کرا دیا گیا تھا کہ اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو کوڑے کی سزا دی جائے گی خود ابن سبا کو بلا کر آپ نے پہلے بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ یہ جو وہ پھیلاتا پھرتا تھا کہ قرآن کے سوا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی علوم حضرت علیؓ تک پہنچے ہیں۔ بھری مجلس میں آپ نے اس کے سامنے انکار فرمایا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے حرکات سے جب باز نہیں آیا تو اس کے منہ پر آپ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے تیسؔ دجالوں کے پیدا ہونے کی جو خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک تو بھی ہے اور حکم دیا کہ کوفہ سے اس کو باہر کر دیا جائے۔ لیکن ایک اس کے باہر ہونے سے کیا ہوتا وہ تو ایک گروہ اپنا پیدا کر چکا تھا جو ہر طرف فتنے کی آگ بھی سلگاتے پھرتے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں میں جھوٹی حدیثوں کو رواج دے رہے بیان کیا گیا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ آخر میں

قَدْ اَحْرَقَهُمْ عَلِيٌّ فِيْ خِلَافَتِهٖ [1] جلا دیا حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو اپنی خلافت کے زمانے میں۔

(ص ۲۹۰)

قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان جلنے والوں میں خود ابن سبا بھی شریک تھا یا نہیں لیکن الذہبی کا بیان ہے کہ

---

[1] حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خصوصی طور پر ان لوگوں کو نذر آتش کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اس کی توجیہ میں لوگوں نے مختلف باتیں لکھی ہیں اگرچہ یہ خیال کیا جاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیث کے بیان کرنے کی سزا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ اپنا ٹھکانہ وہ لوگ "النار" کو بنالیں، ممکن ہے کہ اس النار کو حضرت علیؓ دنیا اور آخرت دونوں آگوں پر حاوی خیال فرماتے ہوں تو شاید یہ توجیہ بھی بعید نہ ہو نیز اس روایت میں بھی جس کا ذکر گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکی طرف جھوٹ منسوب کرنے والے کے لئے حکم دیا تھا کہ اس کو جلا دیا جائے۔ استدلال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۲

اَحْسَبُ اَنَّ عَلِیًّا حَرَّقَہٗ بِالنَّارِ ۔ (ص ۲۸۹) — میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے اس کو بھی آگ ہی میں جلا دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کی طرف سے دار و گیر میں سختی سے اگر کام نہ لیا جاتا تو خدا ہی جانتا ہے کہ کچھ دن اور بھی فرصت ان بدبختوں کو اگر مل جاتی تو کیا کچھ کر گزرتے، تاہم کم و بیش چار پانچ سال کے عرصہ میں کام کرنے کا جو موقعہ ان کو مل چکا تھا اس میں دوسرے مفاسد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے امصار اور فوجی نوآبادیوں کے اندر بے سروپا حدیثوں کا وہ ذخیرہ بھی تھا جسے وہ پھیلا چکے تھے جعل سازی و افترا پردازی کی اس مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام یا آپ کے بعض خاص خاص صحابیوں میں جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوا ابوذر غفاری سلمان فارسی، مقداد بن اسود وغیرہم حضرات بھی تھے، ان کے ناموں سے بھی کام لیا گیا تھا اس لئے سیدھے سادے عام مسلمان ان ہی گھڑی ہوئی بے سروپا روایتوں کا تذکرہ اس اعتماد کے ساتھ دوسرے کے آگے کرتے کہ گویا واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابیوں کی بیان کردہ یہ روایتیں ہیں۔ اس فتنہ کے سدباب کے لئے کیا کیا جائے؟ یقیناً وقت کا یہ بہت بڑا سوال تھا کتابوں میں لکھا ہے کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کر کے جن باتوں کو عبداللہ بن سبا اور اس کے رفقاء کار مسلمانوں میں پھیلاتے پھرتے تھے اور لوگ آپ سے آکر ان کا ذکر کرتے تو حضرت بے چین ہو جاتے۔ بے ساختہ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے:

مَالِیْ وَلِھٰذَا الْخَبِیْثِ الْاَسْوَدِ (لسان ج ۳ ص ۲۹) — اس سیاہ کالے گندے خبیث کو مجھ سے کیا تعلق

پھر آپ کی طرف منسوب کر کے جن باتوں کو لوگوں میں وہ پھیلاتا تھا اس کی تردید فرماتے:

لیکن قصہ کسی ایک جگہ کا تھا؟ کوفہ، بصرہ، شام، حجاز، مصر ان تمام مقامات میں ابن سبا خود گھومتا تھا اور ہر جگہ اس کے نمائندے اور دعاۃ بکھرے ہوئے تھے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ جھوٹ کا ایک سیلاب تھا جو ان تمام علاقوں پر چھا گیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ایک طرف بادیۂ عرب کے عام سپاہیوں کی جماعت تھی پیغمبرؐ اور پیغمبرؐ کے صحابیوںؓ کے نام سے منوا لینے والے جو کچھ چاہتے

ان سے منوا لیتے تھے لیکن دوسری طرف ارباب خرد وبصیرت کا بھی آخر ایک طبقہ مسلمانوں میں بہرحال موجود تھا۔ اسلام کی روح اور اس کے کلیات کا وہ علم رکھتے تھے، خصوصًا ان میں جو شرف صحبت سے بھی فیض یاب تھے، ان کے کانوں تک جب سبائیوں کی خود تراشیدہ روایتیں پہنچتیں تو ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر یہ ہے کیا؟

فتنۂ سبائی کے بعد

حدیث کی روایت میں احتیاطی اصول

میرا تو خیال ہے کہ اس قسم کی روایتیں جن کا تدوین حدیث کی تاریخوں میں لوگوں نے ذکر کیا ہے مثلاً امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں جو یہ واقعہ درج کیا ہے کہ بشیر بن کعب العدوی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں ایک دن آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیثیں بیان کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ حضرت ابن عباسؓ ان حدیثوں کو خاص توجہ سے سنیں گے لیکن حیرت کی انتہا نہ تھی جب دیکھا کہ

اِبْنُ عَبَّاسٍ لَا يَأْذَنُ لِحَدِيْثِهٖ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِ.	ابن عباسؓ نہ ان کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں اور نہ ان کو دیکھتے ہیں۔

بشیر نے گھبرا کر عرض کیا کہ حضرت! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں آپ کو سنا رہا ہوں اور آپ اس بے التفاتی سے کام لے رہے ہیں؟ ابن عباسؓ نے اس وقت بشیر کو سمجھاتے ہوئے پہلے تو خود اپنے ایک حال کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

اِنَّا كُنَّا مَرَّةً اِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَدَرَتْهُ اَبْصَارُنَا وَاَصْغَيْنَا اِلَيْهِ	ایک زمانہ ہم ہی پر گزرا ہے کہ کوئی شخص جب یہ کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو فورًا ہماری نگاہیں اس کی طرف بے ساختہ اٹھ جاتی تھیں اور اپنے کانوں کو

بِاٰذَانِنَا۔ اسی کی طرف ہم جھکا دیتے۔

اور اس کے بعد عدمِ التفات کی وجہ ان الفاظ میں حضرت نے ظاہر فرمائی کہ

اِنَّا کُنَّا نُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا لَمْ یَکُنْ یُکْذَبُ عَلَیْہِ فَلَمَّا رَکِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ وَالذَّلُوْلَ تَرَکْنَا الْحَدِیْثَ عَنْہُ۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۲۸)

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثیں اس زمانے میں بیان کیا کرتے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط حدیثوں کو منسوب کرکے بیان کرنے کا رواج نہیں ہوا تھا مگر لوگ جب ہر سرکش اور غیر سرکش (اونٹوں) پر سوار ہونے لگے (یعنی جھوٹ سچ کی تمیز جاتی رہی) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کا بیان کرنا ہی ہم نے چھوڑ دیا۔

قرائن کا اقتضاء ہے کہ بشیر جو بصرہ کے رہنے والے ہیں ان کے ساتھ ابن عباسؓ کی یہ گفتگو اس زمانے میں ہوئی ہے جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے ابن عباسؓ بصرہ کے والی اور حاکم تھے، جہاں تک میرا خیال ہے ابن عباسؓ کے اس بیان میں سبائیوں کے اس فتنے کی طرف اشارہ ہے جو غلط روایتوں کے پھیلانے کی وجہ سے مسلمانوں میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ ہی نے نہیں بلکہ ان کے ساتھ اور بھی لوگ شریک تھے جنہوں نے اس فتنے کے بعد حدیثوں کی روایت کے قصہ ہی کو ختم کر دیا تھا، ان کی سمجھ میں اس فتنے کے مقابلہ کی کوئی دوسری شکل باقی نہ رہی تھی۔ اسی مکالمہ کو دوسری سند سے امام مسلم نے جو نقل کیا ہے اس میں اتنا اضافہ بھی پایا جاتا ہے کہ

لَمْ نَاْخُذْ مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَا نَعْرِفُ۔ اب لوگوں سے ہم ان ہی حدیثوں کو قبول کرتے ہیں جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں۔

میں نے جو یہ کہا کہ اس فتنے کے بعد حدیثوں کی روایت کے متعلق ابن عباسؓ نے جس طریقۂ عمل کو اختیار کیا تھا اس میں وہ تنہا نہیں تھے، اس کا ایک قرینہ تو خود ان کے اسی بیان میں پایا جاتا

ہے کہ بجائے صیغۂ واحد کے ترکنا الحدیث عنہ یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روش کے اختیار کرنے میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شریک تھے۔ علاوہ اس لفظی قرینہ کے اسی بصرہ کے متعلق ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی تھی جو کہا کرتی تھی کہ

لَا تُحَدِّثُوْنَا اِلَّا بِالْقُرْاٰنِ (کفایہ ج ۱ ص ۱۵) قرآن کے سوا ہم سے اور کچھ نہ بیان کیا کرو۔

اور تو اور عمران بن حصین صحابی رضی اللہ عنہ جن کا قیام بصرہ ہی میں تھا ان کے پاس بھی آکر لوگ یہی کہنے لگے تھے کہ قرآن کے سوا اور کچھ نہ بیان کیجیے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، اس فتنے نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوسرے فتنہ کو پیدا کیا یعنی چاہا گیا کہ سرے سے حدیث کے قصے ہی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ عجیب کشمکش کی حالت تھی خود ابن عباسؓ ترکِ روایت کے اسی طرز عمل کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کرتے:

اِنَّا كُنَّا نَحْفَظُ الْحَدِيْثَ وَالْحَدِيْثُ يُحْفَظُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اسی کی مستحق ہیں کہ انہیں یاد کیا جائے۔

مگر پھر کذب علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتنہ کا تذکرہ فرماتے، اسی کے بعد یہ بھی فرماتے کہ

فَاَمَّا اِذَا رَكِبْتُمْ كُلَّ صَعْبٍ وَّذَلُوْلٍ فَهَيْهَاتَ (مقدمہ مسلم) لیکن جب ہر سرکش اور غیر سرکش سواریوں پر تم چڑھنے لگے تو پھر اس سے دُور ہی رہنا مناسب ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے سبائی فتنہ کو ممکنہ حد تک کچل دینے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی توجہ اسی مسئلہ کی طرف غالباً منعطف ہوئی یعنی آپ کے سامنے دو باتیں تھیں، ایک تو یہی کہ زنادقہ کی اس جماعت نے مسلمانوں میں جن غلط حدیثوں کو پھیلا دیا ہے، اس زہر کے ازالہ کے لئے کیا کیا جائے، اور دوسری بات یہ تھی کہ اس زہر کی شرکت کی وجہ سے لوگوں میں یہ رجحان جو بڑھتا جا رہا ہے کہ قطعی طور حدیثوں کی روایت اور ان کے سننے سنانے کے قصے ہی کو بالکلیہ

ختم کر دیا جائے۔ بجائے خود ایک مستقل فتنہ کی شکل ہو نکہ یہی تھی کہ اس رجحان کے روکنے کی یہی تدبیر اختیار کی جائے۔

یہ ثانی الذکر ہی فتنہ تھا جس کی خبر حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب ہوئی تو آپ نے لوگوں کو بلا کر وہی باتیں سمجھائی تھیں جن کا ذکر کسی موقعہ پر آچکا ہے یعنی آپ نے فرمایا کہ حدیثوں سے الگ ہو کر دینی زندگی گزارنے کی شکل ہی کیا ہوگی، صرف قرآن سے کوئی اگر چاہے کہ نمازوں کی کتنی تعداد ہے، ان کے اوقات کیا کیا ہیں، ہر نماز میں کتنی رکعتیں، کتنے رکوع، کتنے سجدے وغیرہ ہونے چاہئیں۔ ان سوالات کے جواب حاصل کرے تو قطعاً اس کو ناکام واپس ہونا پڑے گا اور صرف نماز ہی نہیں، حضرت عمرانؓ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ سارے اسلامی ارکان کے عناصر و اجزا، کا تذکرہ کر کر کے پوچھتے جاتے تھے کہ ان باتوں کو کہاں پاؤ گے؛ پھر ان لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے جنھوں نے ارادہ کیا تھا کہ آئندہ نہ کسی سے ہم حدیثیں سنیں گے اور نہ اُن سُنی ہوئی حدیثوں کو قبول کریں گے، حضرت عمران نے بلند آواز میں گرجتے ہوئے فرمایا:

خُذُوا عَنَّا فَاِنَّكُمْ وَاللّٰهِ اِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا لَتَضِلُّنَّ۔ (کفایہ ص ۱۵)	ہم لوگوں (یعنی رسول اللہ کے صحابیوں سے دین) کو لو قسم ہے اللہ کی اگر تم نے یہ نہیں کیا تو راہ کھو بیٹھو گے۔

اور میں قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف مختلف طریقوں سے حدیث کی کتابوں میں یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے صرف مسند احمد بن حنبل میں کم و بیش آٹھ سندوں سے یہ روایت درج ہے حدیثوں کی روایت ہی سے اس کا تعلق ہے، بہرحال حضرت والا کا وہ قول یہ ہے، آپ لوگوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے:

اِذَا حَدَّثْتُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثًا فَظُنُّوْا بِهِ الَّذِيْ هُوَ اَهْدٰى وَالَّذِيْ هُوَ اَهْيَا۔ وَالَّذِيْ هُوَ اَتْقٰى۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۲۲)	جب تمہارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث بیان کی جائے تو تمہیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ سب سے زیادہ راہ نمائی کرنے والی بات وہ ہے سب سے زیادہ بہتر ہے سب سے زیادہ تقویٰ کی ضمانت اس میں ہے۔

بعض روایتوں میں ایک دو حرف کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے لیکن مطلب ہر حال میں وہی ہے جسے میں نے ترجمہ کے خانہ میں درج کیا ہے۔

جس لب و لہجہ میں حضرت کے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے سامنے کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے قلوب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی طرف سے گونہ بے نیازی اور استغنار کی کیفیت کسی وجہ سے پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی اور ظاہر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے تک حدیثوں کے متعلق اس قسم کی افسردگی دلوں میں اگر کسی وجہ سے پیدا ہو سکتی تھی تو وہ سبائیوں کا ہی فتنہ ہو سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول گزر چکا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثوں کے منسوب کرنے کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا ہم لوگوں کا حال یہ تھا کہ کسی سے قال الرسول کا لفظ جونہی کہ ہم سنتے ہماری آنکھیں اس کی طرف بے ساختہ اٹھ جاتیں اور کانوں کو اس کی طرف ہم لگا دیا کرتے تھے اور میں بتا چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی ابتدا، سبائیوں ہی کی جماعت سے ہوئی تھی، الشعبی کی تاریخی شہادت گزر چکی کہ

اَوَّلُ مَنْ کَذِبَ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ سَبَا۔ — سب سے پہلے جو جھوٹ بولا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کی) وہ عبداللہ بن سبا تھا۔

بہر حال جوں کے خوف نے لبادے ہی کو نذر آتش کر دینے کا خیال جن لوگوں میں پیدا ہو چلا تھا یعنی سبائیوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹی روایتوں کی وجہ سے یہ غلط فیصلہ کر بیٹھے تھے کہ آئندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت ہی ترک کر دیں گے۔ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مذکورہ بالا ارشاد کا رُخ ان ہی غیر صحیح رجحانات کی طرف ہے، آپ ان ہی لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو لیکن یہ طریقہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی جائے اس کی طرف توجہ نہ کی جائے یہ صحیح طریقہ نہیں ہے بلکہ اب بھی یہی سمجھنا چاہیے جیسے ہمیشہ سے لوگ یہی سمجھتے چلے آتے تھے کہ

"اسی میں سب سے زیادہ راہ نمائی ہے، وہی سب سے بہتر بات ہے، اسی میں سب سے زیادہ تقویٰ کی ضمانت ہے"۔

باقی سبائیوں کی خود تراشیدہ روایتوں نے جن اشتباہی تاریکیوں کو پھیلا دیا تھا، پہلا علاج ان کا جہاں تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے یہی اختیار کیا گیا تھا کہ اس قسم کی بے سر و پا باتیں خود آپ کی طرف منسوب کر کر کے جو پھیلائی جاتی تھیں، جس وقت کسی ذریعہ سے اس کی خبر آپ تک پہنچتی تھی، منبر پر پہنچ کر بر سر عام اس کی تردید فرمادیا کرتے تھے مشہور تابعی حضرت سوید بن غفلہ جن کا شمار کبار تابعین میں کیا گیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص حلقہ کے آدمی ہیں ان ہی کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کیا کہ ابھی چند آدمیوں کو میں دیکھ کر آ رہا ہوں جو آپس میں یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق آپ کے خیالات بھی درحقیقت اچھے نہیں ہیں، لیکن مصلحتاً ان کا اظہار نہیں فرماتے۔ سوید بن غفلہ نے اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ جس مجمع میں یہ تذکرہ ہو رہا تھا اس میں عبداللہ بن سبا بھی تھا۔ لکھا ہے کہ سننے کے ساتھ ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی بے ساختہ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

مَالِي وَلِهٰذَا الْخَبِيْثِ الْاَسْوَدِ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ اَقُوْلَ لَهُمَا اِلَّا الْحَسَنَ الْجَمِيْلَ۔	مجھے اس کالے گندے سے کیا سروکار، اللہ کی پناہ کہ میں ان دونوں (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے متعلق بجز اچھی بات کے کچھ اور کہوں۔

اسی پر بس نہیں فرمایا بلکہ راوی کا بیان ہے کہ

ثُمَّ نَهَضَ اِلَى الْمِنْبَرِ حَتّٰى اجْتَمَعَ النَّاسُ فَذَكَرَ الْقِصَّةَ فِي الْمَدْحِ عَلَيْهِمَا بِطُوْلِهٖ۔ (لسان المیزان ج ۳ ص ۲۹۰)	پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگ اکٹھے ہوئے تب حضرت علیؓ نے ان دونوں کی تعریف پوری تفصیل کے ساتھ فرمائی۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی تقریر کے آخر میں آپ نے اسکا بھی اعلان کیا تھا کہ میں اس شخص کو افترا پردازی اور غلط بیانی کی سزا دوں گا، جس کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک پہنچیں گی۔ (لسان ج ۳ ص ۲۹۰)

ظاہر ہے کہ آپ کی طرف منسوب کر کے جو جھوٹی باتیں مسلمانوں میں پھیلائی جاتی تھیں، ان کے علاج کی یہ آخری صورت ہو سکتی تھی، گزر چکا کہ آخر ان ہی قصوں کے سلسلے میں حضرت والا کے حکم سے سبائیوں کو دنیا ہی میں آگ کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑا جس سے معلوم ہوا کہ سزا کی جس دھمکی کا منبر سے آپ کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا وہ صرف دھمکی نہ تھی بلکہ عمل کی شکل بھی اس نے اختیار کی رہا روایتوں کا وہ عام ذخیرہ جسے اپنی مختلف ناپاک ضرورتوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کر کے مسلمانوں میں بد بختوں کی اس ٹولی نے پھیلا دیا تھا۔ مختلف قرائن و اسباب کی روشنی میں کم از کم اسی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اسی زہر کے ازالہ اور اسی کے مقابلہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس رویہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس فرمائی جو حدیثوں کے متعلق اب تک آپ بھی اختیار کئے ہوئے تھے اور آپ سے پیشتر خلفائے راشدین منشاء نبوت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس پر زور دیتے چلے آئے تھے، میرا اشارہ تقلیل فی الروایہ کی طرف ہے یعنی روایتوں میں کمی کا طریقہ جس کے تفصیلی مباحث گزر چکے۔ اس طریقہ میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس آپ میں پیدا ہوا۔

یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ براہ راست خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے چشم دید ذاتی مشاہدات و مسموعات جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ رکھتے تھے۔ معلومات کے اس قیمتی ذخیرے کے مقابلے میں ان بے سر و پا روایتوں کی بھلا مسلمانوں کی نگاہوں میں کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی جو ان کے کانوں تک مختلف ذرائع سے سبائیوں نے پہنچا دیا تھا۔

اسی صورت حال کا اندازہ کر کے کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اگر اپنا رویہ بدل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار و رفتار عادات و اطوار سیرت و کردار کے متعلق

آپ کے جو معلومات تھے ان کی تحریرًا و تقریرًا وسیع پیمانے پر اشاعت حضرتِ والا نے شروع کر دی تو خود سوچنا چاہیئے کہ سبائی روایات کی طرف سے مسلمانوں کی توجہ کے موڑنے کی اس وقت کوئی دوسری ممکن تدابیر اور کیا ہو سکتی تھیں۔

خیال تو کیجئے کہ کہاں آپ ہی کا ایک حال یہ تھا کہ قراب سیف (یعنی تلوار کی نیام) میں جو حدیثیں آپ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، ان کے دکھانے پر بھی اصرار شدید کے بعد آمادہ ہوتے ہیں اور کوفہ پہنچنے کے بعد آپ ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ بر سر منبر اعلان عام فرماتے ہیں کہ

ایک درم میں علم کا کثیر ذخیرہ مجھ سے کون خریدتا ہے؟

لانے والے کاغذ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور براہِ راست دستِ مبارک سے لکھ کر حدیثیں اس کے حوالہ کی جاتی ہیں۔ یہی کوفہ کا منبر ہے، بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ دوسروں کے دریافت کرنے پر نہیں بلکہ لوگوں کو خود خطاب کر کر کے فرماتے:

> پوچھو مجھ سے اور دریافت کرو، خدا کی قسم جس چیز کے متعلق مجھ سے دریافت کرو گے میں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ مجھ سے اللہ کی کتاب کے متعلق دریافت کرو، کیونکہ خدا کی قسم قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق میں یہ نہیں جانتا کہ رات کو اتری ہے یا دن کو میدانی علاقہ میں اتری ہے یا پہاڑ پر۔ (تہذیب وغیرہ ص ۳۳۸)

مجمع کے سامنے بھی آپ کا یہی حال تھا اور انفرادی طور پر بھی، جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ بجائے تقلیل کے روایتوں کی اشاعت میں تکثیر سے کام لے رہے ہیں، تذکرۃ الحفاظ میں الذہبی نے کمیل بن زیاد کے ساتھ حضرتِ والا کی جس طویل گفتگو کا تذکرہ کیا ہے تو اس میں یہ نہیں ہے کہ زیاد نے آپ سے آکر کچھ دریافت کیا تھا، بلکہ لکھا ہے، زیاد کا بیان ہے کہ

اَخَذَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ بِیَدِیْ فَاَخْرَجَنِیْ اِلٰی نَاحِیَۃِ الْجَبَّانِ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۱)

میرے دونوں ہاتھوں کو حضرت علیؓ نے پکڑا اور صحرائی میدان کی طرف مجھے نکال کر لے گئے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو خود پکڑ پکڑ کر آپ لے جاتے اور بغیر پوچھے جو علم آپ تک

پہنچا تھا، اس کی تبلیغ فرماتے بجنسہ قریب قریب اسی کے مصفح عامری کا بیان تھا۔ ابن سعد نے نقل کیا ہے، مصفح کہتے تھے کہ میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے خطاب کر کے فرمایا

يَا اَخَا بَنِي عَامِرٍ سَلْنِي عَمَّا قَالَ اللهُ وَ رَسُوْلُهٗ فَاَنَا اَهْلُ الْبَيْتِ اَعْلَمُ بِمَا قَالَ اللهُ وَ رَسُوْلُهٗ۔

(ابن سعد ج ۶ ص ۲۶۷)

اے قبیلۂ بنی عامر کے آدمی پوچھ مجھ سے ان امور کے متعلق جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے کیونکہ ہم گھر کے لوگ ہیں (یعنی رسول اللہؐ کے گھر کے آدمی ہیں) اللہ اور رسول کی باتوں کو زیادہ جانتے ہیں۔

آگے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایک طویل گفتگو مصفح سے آپ نے فرمائی جس کا ابن سعد نے ذکر نہیں کیا ہے۔ آخر ایک ہی شخص کے طرزِ عمل میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف بلاوجہ پیدا نہیں ہو سکتا، لوگ سوچتے نہیں ورنہ عام کتابوں میں آپ کا جو یہ قول نقل کیا جاتا ہے، الذہبی نے بھی خزیمہ بن نصیر کے حوالہ سے اس کو تذکرۃ الحفاظ میں درج کیا ہے یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے:

قَاتَلَهُمُ اللهُ اَيُّ عِصَابَةٍ بَيْضَاءَ سَوَّدُوْا وَ اَيُّ حَدِيْثٍ مِّنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْسَدُوْا۔ (ج ۱ ص ۱۲)

خدا انہیں غارت کرے کتنی روشن جماعت کو انہوں نے سیاہ کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی حدیثوں کو انہوں نے بگاڑ دیا۔

بلاشبہ اس میں خاص جماعت کا آپ نے نام نہیں لیا ہے اور راوی نے چونکہ حضرت سے ان الفاظ کو اس وقت سنا تھا جب صفین میں آپ معرکہ آرائی میں مصروف تھے۔ لیکن تفصیلات جو آپ کے گوش گزار ہو چکے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا اس میں شک کی گنجائش ہے کہ آپ کا اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے صحابیت کے خلاف طوفان اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیوں کی جیسی قدسی جماعت کو رسوا اور بدنام کرنے کی کوشش کی اور اپنی اسی ناپاک غرض کی تکمیل کے سلسلہ میں بے سروپا روایات کے جس ذخیرے کو مسلمانوں میں انھوں نے پھیلا دیا تھا جن کی وجہ سے صحیح حدیثوں کا مسئلہ بھی مشتبہ ہو گیا گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا

چلا جا رہا تھا، یقیناً ان ہی دونوں فتنوں کے جو بانی تھے، ان ہی کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔
بہر حال اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی حدیثوں کے متعلق اشتباہی تاریکیاں جو پھیلا دی گئی تھیں اس کا آپ کو کس قدر افسوس تھا۔

پھر اسی دینی مصیبت کے مقابلہ میں اگر مذکورہ بالا تدبیر آپ نے اختیار فرمائی تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے؟ افسوس ہے کہ حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ کے متعلق آپ کے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی جیسا کہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کوفہ پہنچنے کے بعد ہوئی، کوفہ کے قیام کی مدت ہی کتنی ہے کم و بیش یہ چار ساڑھے چار سال کا زمانہ ہے اور یہ چند سال حضرت کے جن حالات میں گزرے ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔ جمل کے فتنہ سے فارغ ہو کر کوفہ تشریف لائے پھر کیا ایک دن بھی آپ کو اس کے بعد چین سے بیٹھنے کا موقعہ ملا، زیادہ وقت تو صفین کی جنگ کے نذر ہوا، پھر خوارج نکل پڑے۔ الغرض شامیوں اور خارجیوں کی آویزش ہی میں یہ ساری مدت قریب قریب ختم ہوئی اور اسی عرصہ میں جب فتنوں کا یہ سیلاب مختلف شکلوں میں برپا ہی تھا کہ آپ کی شہادت کا فاجعہ پیش آگیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس شخص کے عزم و استقامت کا یہ حال ہو کہ صفین کی مشہور خطرناک رات جس کا تاریخ میں لیلۃ الھریر کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے، دونوں صفیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی تھیں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا لیکن لکھا ہے کہ رات کی نماز اور اوراد و وظائف کا وقت اسی حال میں آگیا، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، لیکن حضرت نے حکم دیا کہ نطع (چمڑے کا فرش) ٹھیک اسی مقام پر بچھا دیا جائے جہاں صف میں آپ کھڑے ہوئے تھے، حضرت والا گھوڑے سے اتر کر جا نماز پر اسی حال میں جم گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ

فَيُصَلِّي عَلَيْهِ وِرْدَهُ وَالسِّهَامُ تَقَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَمُرُّ صِمَاخَيْهِ يَمِيْنًا وَشِمَالًا فَلَا يَرْتَاعُ لِذٰلِكَ وَلَا يَقُوْمُ حَتّٰى

اسی پر اپنے مقررہ وظائف آپ نے پورے کیے حالانکہ تیر ان کے آگے بھی گر رہے تھے اور کان کے پردوں کے سامنے دائیں بائیں گذر رہے تھے مگر دل میں کسی قسم کی

يَفْرُغَ مِنْ وَظِيفَتِهٖ ۔ (شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ص۹)

دہشت پیدا نہیں ہوتی تھی اور جب تک اپنے وظیفے فارغ نہ ہوجاتے نہ اٹھتے۔

آپ کے عزم وارادے کی یہی قوت تھی جس نے ان ہی حالات میں آپ کو آمادہ کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح معلومات کا جو ذخیرہ آپ کے پاس تھا اس کی اشاعت ان روایتوں کے مقابلہ میں کی جائے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے سبائیوں نے مسلمانوں میں پھیلادیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ کوفہ کے قیام کی اسی مختصر مدت میں بے اطمینانی اور انتشار وتشویش کے اسی ماحول میں خدا جانے کتنوں کو آپ نے قرآن مجید پڑھایا، اگر ایک طرف کوفہ کے مشہور قاری بوعبدالرحمن السلمی کہا کرتے تھے:

اَخَذْتُ الْقِرَاءَةَ عَنْ عَلِيٍّ (ابن سعد ص۱۱۹) میں نے قرات علیؓ سے سیکھی۔

تو دوسری طرف ابوالاسود دیلی جیسا کہ دنیا جانتی ہے، عربیت اور نحو وصرف کے بنیادی قواعد کے متعلق کہا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ ہی سے پہلی دفعہ ان کو میں نے سیکھا اور قرات وعربیت کیا، اسلام کی فقہ، اسلام کا تصوف، حتیٰ کہ مسلمانوں میں فن سپہ گری کے خاص رموز واسرار کا انتساب حضرت والا کی تعلیم ہی کی طرف کیا جاتا ہے، اور جہاں تک قرائن کا اقتضا ہے استفادہ کرنے والوں نے زیادہ تر ان امور کا استفادہ آپ سے اسی زمانہ میں کیا ہے، جب آپ کوفہ کی جھونپڑیوں میں مقیم تھے[1]

بہرحال جو کچھ بھی ہو آپ نے اسی مختصر مدت میں اپنے ان معلومات کی اشاعت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ رکھتے تھے جس وسیع پیمانے پر فرمائی اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے

---

[1] ابن سعد نے لکھا ہے کہ کوفہ میں حالانکہ قصر الامارہ موجود تھا لیکن حضرت امیر علیہ السلام نے کوفہ میں قیام کا جب ارادہ فرمایا اور لوگوں نے قصر الامارہ میں فروکش ہونے کی آرزو کی تو آپ نے انکار فرمایا اور رحبۃ الکوفہ (کوفہ کے شہری میدان) میں پھوس کی چند جھونپڑیاں جو پڑی ہوئی تھیں ان ہی میں اہل وعیال کے ساتھ آپ اتر گئے اور اسی حال میں آپ شہید ہوئے۔

کہ علاوہ صحابہ کے حافظ ابن حجر نے تہذیب میں صرف ان لوگوں کی فہرست جنھوں نے عموماً قیام کوفہ کے بعد آپ سے حدیثیں سنی ہیں تقریباً پچاس آدمیوں کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وخلائق" یعنی ان کے سوا بھی بہت بڑی جماعت آپ سے روایت کرنے والی ہے۔ (دیکھو تہذیب ج ۷ ص ۳۷۵)

اور واقعہ تو یہ ہے کہ ایک نہیں متعدد مجموعے جب اپنے دستِ مبارک سے لکھ لکھ کر آپ نے لوگوں میں تقسیم کئے تھے جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اس زمانے میں تحریری اشاعت کا جس کا یہ حال ہو، زبانی تقریراً روایتوں کے پہنچانے میں اس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

باطل کے مقابلہ میں حق کا یہ سیلاب جو آپ کی طرف سے بہایا گیا تھا یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے باطل کے زور کے توڑنے میں مدد نہ ملی ہوگی، لیکن آپ ہی سے ذہبی نے آپ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگوں سے خطاب کرکے آپ فرمایا کرتے تھے:

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ وَ دَعُوا مَا يُنْكِرُونَ (تذکرہ ص ۱۲) — اپنی باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کرو جنہیں جانتے پہچانتے ہو اور جنہیں نہ پہچانتے ہو انہیں چھوڑ دو۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جعلی حدیثوں کی روایت کرنے کا جو سلسلہ جاری ہو گیا تھا اس کو رد کرنے کے لئے آپ کی طرف سے روایت کی تکثیر کا جو طریقہ بطور رد عمل کے اختیار کیا گیا تھا، غالباً کافی ثابت نہ ہوا، اسی لئے جعلی روایتوں کو صحیح حدیثوں سے جدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایک اور کسوٹی کے اختیار کرنے کا یہ نیا مشورہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے دیا گیا، حاصل جس کا بظاہر یہی ہے کہ اسلامی کلیات اور اسلامی تعلیم کی روح سے جو حدیثیں مطابق ہوں صرف ان ہی کو قبول کرنا چاہئے اور قرآن[۱] جس دانش و عقل کو آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے جو چیزیں اس کے مخالف ہوں

---

[۱] میں نے ان الفاظ کا قصداً اضافہ کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اگر مطلق عقل کو معیار بنایا جائے تو ہر زمانے کی عقل کا معیار مختلف ہوتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ آج سے سو سال پہلے کی عقل ایک چیز کو قبول نہ کرتی ہو لیکن سو سال بعد اسی کو قبول کرنے لگے۔ پس اصلی معیار حدیثوں کے رد و قبول کا قرآنی عقل کو قرار دینا چاہئے۔

ان کو ترک کر دینا چاہئے کیونکہ یہ مطلب ان الفاظ کا اگر نہ لیا جائے اور ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے اس کا مآل تو پھر وہی ہو گا جو کذب علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فتنے کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختیار کیا تھا یعنی بالکلیہ حدیثوں کے سننے اور سنانے کے قصّے کو ختم کر دیا جائے حالانکہ نہ خود اس پر آپ عامل تھے اور نہ عقلاً یہ بات آدمی کی سمجھ میں آتی ہے، آخر حضرت والا کی زندگی میں بڑے بڑے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود تھے۔ پھر کیا ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان کی ان ہی روایتوں کو تسلیم کرنا چاہئے، جن سے تم پہلے سے واقف ہو اور جن کا علم پہلے سے نہ ہو، ان کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ حدیثوں کے ردّ و بدل کا ایک معیار مذکورہ بالا الفاظ میں آپ نے پیش کیا ہے اور یہ وہی معیار ہے جس پر آخر وقت تک محدثین عامل رہے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ ابن جوزی نے یہ کلیہ بیان کرتے ہوئے کہ

كُلُّ حَدِيْثٍ رَأَيْتَهُ يُخَالِفُ الْعُقُوْلَ أَوْ يُنَاقِضُ الْأُصُوْلَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ مَوْضُوْعٌ

جس حدیث کو تم پاؤ کہ عقول اور اصول کے مخالف ہے تو سمجھ لیا کرو کہ وہ موضوع یعنی جعلی اور گھڑی ہوئی ہے۔

اسی کی تشریح ان الفاظ میں جو کی ہے کہ

أَوْ يَكُوْنُ مِمَّا يَدْفَعُهُ الْحِسُّ وَالْمُشَاهَدَةُ أَوْ مُبَايِنًا لِلنَّصِّ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمُتَوَاتِرَةِ أَوِ الْإِجْمَاعِ الْقَطْعِيِّ حَيْثُ لَا يَقْبَلُ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ التَّأْوِيْلَ (فتح الملہم للعثمانی ص ۱۶)

یا حدیث ایسی ہو کہ حواس و مشاہدہ اسے مسترد کرے یا اللہ کی کتاب اور متواتر حدیث یا قطعی اجماع کے مخالف ہو یعنی کسی تاویل کی گنجائش اس حدیث میں باقی نہ رہے۔

یہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے پیش کردہ معیار ہی کی دوسری تعبیر ہے، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف مقدمۂ صحیح مسلم میں ایک روایت یہ بھی جو منسوب کی گئی ہے کہ جعلی حدیثوں کے فتنہ کا تذکرہ کر کے آپ نے فرمایا کہ

لَمْ نَأْخُذْ مِنَ النَّاسِ إِلَّا مَا نَعْرِفُ.

ہم لوگوں سے نہیں لیتے مگر ان ہی حدیثوں کو جنھیں

(ص ۱۲۸) ہم جانتے پہچانتے ہیں۔

حالانکہ دوسری روایت میں ان ہی ابن عباسؓ کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس فتنے کا تذکرہ کرکے کہتے تھے:

تَرَکْنَا الْحَدِیْثَ عَنْهُ۔ اسی وجہ سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

اگر تعددِ روایت پر ابن عباسؓ کے ان دو مختلف بیانوں کو محمول کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے تو انہوں نے بھی ارادہ کیا تھا کہ آئندہ سے حدیثوں کے سننے سنانے کے قصے کو ختم ہی کر دیا جائے لیکن پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس پیش کردہ معیار کو آپ نے قبول کر لیا اور اسی کے بعد یہ مسلک اختیار فرمایا کہ صرف ان ہی حدیثوں کو ہم قبول کریں گے جنہیں ہم پہچانتے ہوں یعنی "مانعرف" کو قبول کریں گے۔ ابن عباسؓ کے اسی قول کی تشریح کرتے ہوئے الاستاذ العلامہ العثمانیؒ نے بھی لکھا ہے کہ

اَیْ مَا یُوَافِقُ الْمَعْرُوْفَ اَوْ نَعْرِفُ فِیْهِ اَمَارَاتَ الصِّحَّةِ وَسِمَاتَ الصِّدْقِ (فتح الملہم ص ۱۲۸) یعنی مانوس جانی پہچانی ہوئی روایتوں کے جو موافق ہوں یا ان میں صحت کی نشانیاں اور سچائی کے علامات پائے جائیں

اور یہ بجنسہ وہی مطلب ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے الفاظ سے فقیر سمجھنا چاہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عجیب و غریب فتنے کے مقابلے میں جس کو اگر بڑھتے ہوئے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو پیغمبرؐ کے صحابیوں اور پیغمبرؐ کی حدیثوں دونوں کا معاملہ ایسے اشتباہی وساوس کا شکار ہو جاتا جن کی تاریکیوں کا دور کرنا آسان نہ تھا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان ہی بے چینیوں اور پریشانیوں میں جن میں آپ کی خلافت کا پورا زمانہ ختم ہوا، اس فتنے کی اہمیت کو محسوس کرکے علماً و عملاً آپ سے اس کے مقابلے میں جس قسم کی کوشش ممکن تھی کرتے رہے جھوٹ کے مقابلہ میں صحیح معلومات کا جو ذخیرہ آپ کے پاس تھا اس کی اشاعت فرماتے رہے اور صحیح حدیثوں کو جعلی و مصنوعی روایتوں سے جدا کرنے کے لئے ایک ایسا علمی معیار مسلمانوں کے

حوالہ آپ نے کردیا جو اسی زمانے میں نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر وقت تک اہل علم اس سے کام لیتے رہے اور آئندہ لیتے رہیں گے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ پیش کردہ معیار بہرحال ایک علمی معیار ہے اس سے صحیح معنوں میں وہی لوگ زیادہ کام لے سکتے تھے یا اب بھی لے سکتے ہیں جن کے متعلق ابن دقیق العید نے یہ سچی بات لکھی ہے کہ

حَصَلَتْ لَهُمْ لِكَثْرَةِ مُحَاوَلَةِ اَلْفَاظِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَيْئَةٌ نَفْسَانِيَّةٌ وَمَلَكَةٌ قَوِيَّةٌ يَعْرِفُوْنَ بِهَا مَا يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْفَاظِ النُّبُوَّةِ وَمَا لَا يَجُوْزُ۔ (فتح الملہم ص ۱۶)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک کی کثرت استعمال اور ان کے برتنے میں مشغولیت کی شدت ان لوگوں میں ایک خاص قسم کا سلیقہ پیدا کردیتی ہے اور اور ایسی غیر معمولی حذاقت جس کی وجہ سے وہ اس کو پہچاننے لگتے ہیں کہ کون سے الفاظ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب درست ہوسکتا ہے اور کس کا انتساب درست نہ ہوگا۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہی نہیں اسی زمانہ میں جس وقت یہ معیار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے مسلمانوں میں پیش کیا گیا تھا جو اہلِ علم کا طبقہ تھا وہ تو اس سے مستفید ہوا، گزر چکا کہ ابن عباسؓ نے اسی مسلک کو اختیار فرمالیا تھا، اور ابن عباسؓ تو خیر ابن عباسؓ ہی تھے واقعہ یہ ہے کہ کوفہ کو پایۂ تخت خلافت مقرر کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب یہاں قیام اختیار فرمایا تو اس سے پہلے اس شہر میں ایک گروہ ان بزرگوں کا پھیل چکا تھا جن کی تعلیم و تربیت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحبت میں ہوئی تھی، یہ وہی لوگ تھے جن کو کوفہ میں پاکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا:

اَصْحَابُ عَبْدِ اللّٰهِ سِرَاجُ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ (ابن سعد ج ۶ ص ۴)	عبداللہ کے صحبت یافتہ لوگ اس آبادی (کوفہ) کے چراغ ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا کوفہ میں کم و بیش بیس سال تک قیام رہا تھا[1] اور ایک بڑا گروہ آپ کے تلامذہ کا کوفہ میں پیدا ہو گیا۔ اہلِ علم کا یہ گروہ پہلے سے کافی صلاحیتوں کا مالک ہو چکا تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تشریف فرمائی نے ان کے لئے وہی کام کیا جو سونے میں سہاگہ کرتا ہے، گویا ان کی علمی شراب دوآتشہ ہو گئی، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی و علمی قیادت کا بہت بڑا حصہ اس وقت تک کوفہ کے ان ہی بزرگوں کو حاصل ہے[2]۔

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے مسائل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس غیر مترقبہ صحبت سے اس طبقہ نے فائدہ اٹھایا تھا، اسی طرح آپ نے حدیثوں کی جانچ کا جو معیار کوفہ والوں کو دیا، ایک طرف عبداللہ بن مسعودؓ کے حلقہ کے مشہور رکن علقمہ کہتے تھے کہ

إِنَّ مِنَ الْحَدِيْثِ حَدِيْثًا لَهُ ضَوْءٌ كَضَوْءِ النَّهَارِ، تَعْرِفُهُ وَإِنَّ مِنَ الْحَدِيْثِ حَدِيْثًا لَهُ ظُلْمَةٌ كَظُلْمَةِ اللَّيْلِ تُنْكِرُهُ۔ (ص ۱۲۹)

حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی روشنی دن کی روشنی کے مانند پہچانی جاتی ہیں اور ان ہی حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ جن کی تاریکی رات کی تاریکی جیسی ہے جس سے تم مانوس نہ ہو گے۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں عالمانہ باتیں ان بزرگوں سے کتابوں میں منقول ہیں جنہیں ابن مسعودؓ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوش قسمتی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صحبت اتفاقاً کوفہ میں قیام کی وجہ سے میسر آ گئی تھی لیکن اسی کوفہ میں حضرت والا کے ارد گرد ایک اور طبقہ بھی جمع ہو گیا تھا جس کو اس ماحول سے استفادہ کا موقعہ نہیں ملا تھا، جو ماحول عہدِ فاروقی کے ولاۃ و حکام خصوصًا

---

[1] آپ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرمان کے ساتھ کوفہ بھیجا تھا کہ میں تم لوگوں کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں میں نے یہ قربانی کی ہے کہ بجائے اپنے تم لوگوں کو ابن مسعودؓ سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دے رہا ہوں، چاہئے کہ ان سے جو کچھ حاصل کر سکتے ہو حاصل کرو۔ ابن مسعودؓ اس فرمان کے ساتھ کوفہ آئے اور حویلی بنا کر یہیں مقیم ہو گئے بعد ۳۲ھ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں مدینہ واپس ہوئے اور مدینہ ہی میں وفات ہوئی۔

[2] میرا اشارہ حنفی مذہب کی طرف ہے جو اس وقت روئے زمین کے مسلمانوں کی اکثریت کی دینی زندگی کا سب سے زیادہ مقبول و پسندیدہ ہر دل عزیز قالب ہے۔ ۱۲

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدولت کوفہ میں پیدا ہو گیا تھا، زیادہ تر ان میں بادیہ عرب کے وہی سادہ دل سپاہی تھے جو مسلمان ہو ہو کر اسلام کی فوجی چھاؤنیوں میں جنگی اغراض کو پیش نظر رکھ کر آئے دن شریک ہوتے رہتے تھے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبائی جو عام مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے اور جس میں صلاحیت پاتے ان کو اپنے خاص خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بدقسمتی سے سبائیوں کے خیالات کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ جس قسم کی ذہنیت ان خیالات کے قبول کر لینے کے بعد پیدا ہو جاتی تھی، قدرتاً جس ذہنیت کے لوگ سبائیوں کی صحبت میں جاتے تھے اس ذہنیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صحیح کو غلط روایتوں سے جدا کرنے کا جو معیار بارگاہ مرتضوی سے مسلمانوں کو ملا تھا اس معیار کے استعمال کی صلاحیت ہی اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں میں باقی نہیں رہ سکتی تھی، خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق ان کے خیالات عجیب وغریب تھے اور ان ہی خیالات کی بنیاد پر حضرت والا کے سامنے آپ ہی کو خطاب کر کے ایسی باتیں کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کے ذکر سے بھی قلم ہچکچاتا ہے۔ اسی روایت سے اندازہ کیجئے، جس کا ذکر حافظ ابن حجر نے حبیب بن صہبان کے حوالہ سے لسان المیزان میں درج کیا ہے یعنی حبیب کہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، اسی سلسلہ میں ذکر 'دابۃ الارض' کا بھی آپ کی زبان مبارک پر آیا اور آپ نے اس کے صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

تَاکُلُ بِفِیْھَا وَتُحْدِثُ بِاِسْتِھَا۔ — منہ سے کھاتا ہے اور چوتڑ سے فضلہ نکالتا ہے۔

حبیب کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ رشید ہجری (جو کوفہ کے فوجیوں میں ایک ممتاز اور نمایاں سپاہی تھا) عین خطبہ کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ

اَشْھَدُ اَنَّکَ تِلْکَ الدَّابَّۃُ[1] (ص ۴۶۰) — میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دابہ تم ہی ہو۔

---

[1] قرآن مجید کی سورہ نمل کی مشہور آیت وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَابَّۃً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُھُمْ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ میں دابّۃ کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مفسرین کی رائیں مختلف پہلوؤں سے اتنی مختلف ہیں کہ صاحب بحر کو لکھنا پڑا کہ اِنَّھُمْ اخْتَلَفُوْا فِیْ مَاھِیَّتِھَا وَشَکْلِھَا وَمَحَلِّ خُرُوْجِھَا وَعَدَدِ خُرُوْجِھَا وَمِقْدَارِ مَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَفْعَلُ بِالنَّاسِ وَمَا الَّذِیْ تَخْرُجُ بِہٖ (باقی بر صفحہ آئندہ)

افسوس ہے کہ حبیب نے اس کے بعد قصہ کو مختصر کر دیا۔ یعنی آگے صرف یہ بیان کیا کہ

فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ قَوْلاً شَدِيداً۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر نہایت سخت بات رشید کو کہی۔

لیکن اس کی تشریح نہیں کی کہ وہ کیا سخت بات تھی۔

اسی رشید الہجری کے متعلق ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں الشعبی کے حوالہ سے یہ واقعہ جو نقل کیا ہے، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ بادیۂ عرب کے ان سادہ لوح سپاہیوں کی ذہنیت کتنی بگاڑ دی گئی تھی، یہ قصہ تو طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ شعبی کو ایک شخص رشید ہجری کے پاس لے گیا۔ اس شخص کے ساتھ الشعبی کو دیکھ کر خاص طریقہ سے رشید نے انگلیاں بند کیں، یہ ایک رمزی اشارہ تھا کہ یہ نیا آدمی ہماری جماعت سے تعلق رکھتا ہے یا کوئی اجنبی شخص ہے۔ شعبی کو جو لے گیا تھا اس نے بھی انگلیوں کی بندش کے اشارے سے جواب دیا جس کا مطلب تھا کہ اپنا آدمی ہے، تب رشید نے قصہ سنانا شروع کیا:

میں ایک دفعہ حج کے ارادے سے مکہ گیا اور حج سے جب فارغ ہو گیا تو دل میں خیال آیا کہ امیر المومنین سے تازہ ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے مدینہ چلوں، یہ سوچ کر میں مدینہ پہنچا اور حضرت علیؓ کے دروازے پر حاضر ہو کر میں نے ایک آدمی سے کہا کہ اندر جا کر سید المسلمین سے عرض کرو کہ رشید الہجری ملاقات کی اجازت چاہتا ہے اس آدمی نے یہ سن کر کہا کہ وہ تو مرے ہوئے ہیں، رشید کا بیان ہے کہ سید المسلمین کے لفظ سے اس آدمی نے سمجھا کہ میں امام حسنؓ

(بقیہ از صفحہ گزشتہ) اِخْتِلَافًا مُضْطَرِبًا مُعَارِضًا بَعْضُهُ بَعْضًا فَاطَّرَحْنَا ذِكْرَهُ لِاَنَّ نَقْلَهُ تَسْوِيدٌ لِلْوَرَقِ وَتَضْيِيعُ لِزَمَانٍ نَقْلِهِ (یعنی دابۃ الارض کی ہیئت وحقیقت، اس کی شکل وصورت اور کہاں سے نکلے گا کتنی دفعہ نکلے گا اور ان کی تعداد کیا ہے نیز یہ کہ دابۃ الارض لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا اور جس دمیہ سے نکلے گا، ان ساری باتوں میں اتنا اختلاف اور اضطراب ہے کہ روایتوں میں سخت قسم کا تعارض پایا جاتا ہے، ان ہی وجوہ سے ان تفصیلات کو میں نے قلم انداز کر دیا ہے کیونکہ کاغذ سیاہ کرنے اور وقت کے ضائع ہونے کے سوا اس کا کوئی حاصل نہیں ہے)۔ سچ پوچھئے تو اس قسم کی باتوں میں سلامتی کی راہ یہی ہے کہ قرآن میں جب اس کی تفصیل نہیں کی گئی اور اجمال سے کام لیا گیا تو ہم بھی لاحاصل تفصیلات کے درپے کیوں ہوں۔ بعض شیعہ فرقوں کا عقیدہ تھا کہ دابۃ الارض سے مراد حضرت علی ہیں، رشید الہجری کا بھی یہی عقیدہ تھا۔

مراد لے رہا ہوں، اسی لئے ان کے سونے کی خبر اس نے دی، تب میں نے کہا کہ حسنؓ سے اجازت لینے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ امیر المؤمنین امام المتقین قائد الغر المحجلین کو اطلاع دو کہ رشید ہجری حاضر ہوا ہے، میرے ان الفاظ کو سن کر آدمی نے کہا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ ان کی تو وفات ہو چکی، تب میں نے اس شخص سے کہا کہ نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا ہے وہ زندہ ہیں اور جیسے زندہ آدمی سانس لیتا ہے اسی طرح سانس لے رہے ہیں، گرم کپڑا آپ کے پسینے سے شرابور ہے۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ "خیر جب ابو محمد یعنی حضرت کے حقیقی راز سے تم واقف ہی ہو تو آؤ اندر چلے آؤ۔ حاضر ہو کر حضرت کو سلام کر کے واپس ہو جانا لیکن ان کو پریشان نہ کرنا۔[1]

الشعبی نے بیان کیا کہ رشید نے اس کے بعد دعویٰ کیا کہ میں امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا،

فَأَنْبَأَنِي بِأَشْيَاءَ تَكُونُ (تذکرہ ج ا لسان ج ۲ ص ۴۶۱) — پھر آئندہ پیش آنے والی بعض چیزوں سے مجھے حضرت علیؓ نے آگاہ کیا۔

حافظ ابن حجر نے ابن حبان کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

كُوفِيٌّ كَانَ يُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ (ص ۴۶۱) — وہ (یعنی رشید ہجری) "الرجعة" کے عقیدے کو مانتا تھا۔

سمجھا آپ نے "الرجعت" کے اس لفظ کا مطلب؟ امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح کے مقدمہ میں اس کی تشریح ان الفاظ میں سفیان ثوری کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ

إِنَّ عَلِيًّا فِي السَّحَابِ فَلَا يَخْرُجُ مَعَ مَنْ يَخْرُجُ مِنْ وَلَدِهِ حَتَّى يُنَادِيَ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ يُرِيدُ عَلِيًّا أَنَّهُ — حضرت علیؓ بادل میں ہیں پھر ان کی اولاد میں سے اسی شخص کے ساتھ لوگ نکلیں گے جس کے متعلق آسمان سے پکارنے والا پکارے گا کہ فلاں کے ساتھ نکلو آسمان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۷۸، میں اور لسان المیزان ج ۳ ص ۴۶۰ میں شعبی کے حوالہ سے رشید ہجری کا بیان نقل کیا گیا ہے، دونوں کتابوں کی عبارت میں اجزاء کی کمی بیشی پائی جاتی ہے میں نے دونوں کتابوں کی عبارت کو پیش نظر رکھ کر رشید کے بیان کا خلاصہ اور ترجمہ درج کیا ہے۔ ۱۲

يُنَادِيْ اُخْرُجُوا مَعَ فُلَانٍ (ص ۱۳۹) — سے پکارنے والے یہ حضرت علیؓ ہوں گے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کی عقلی اور ذہنی سطح اتنی پست اور دماغی حال جن کا اتنا زبوں ہو صرف یہی نہیں کہ شہید ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی واپسی کے اسی دنیا میں جو منتظر بنا دیئے جا سکتے ہوں بلکہ منوانے والوں نے جن سے یہ تک منوالیا ہو کہ حضرت والا بادل میں چھپے ہوئے ہیں، بھلا ایسے سادہ لوحوں کے لئے صحیح اور غلط روایتوں کی تمیز کا وہ معیار کیا کارآمد ہو سکتا تھا جس کے استعمال کے لئے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خاص قسم کی حذاقت اور نبوی الفاظ کے شناخت کی خاص بصیرت ہونی چاہیئے، قرآنی کلیات اور اسلامی روح سے مناسبت اور عدم مناسبت کا پتہ ان غریبوں کو کیا چل سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر پیدا کرنے والوں نے اس عقیدے تک کو پیدا کر دیا تھا، حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان ہی لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

هُمْ يَعْتَقِدُوْنَ اِلٰهِيَّةَ عَلِيٍّ (لسان ج ۳ ص ۲۹) — وہ حضرت علیؓ کے متعلق اس کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خدا تھے۔

سارے قصے یعنی وفات کے بعد آپ سے ملاقات کا ادعا، آئندہ ہونے والے واقعات سے حضرت کا انتقال ہونے کے بعد آگاہ کرنا اور بادل پر سوار ہو کر فضاء آسمانی میں اس لئے گھومتے رہنا کہ اپنی اولاد میں سے جس کسی کی رفاقت پر لوگوں کو آپ آمادہ فرمانا چاہتے ہیں جب وہ اٹھ کھڑا ہو تب بادل ہی سے لوگوں کو پکار پکار کر آگاہ کرنا کہ میری اولاد میں سے یہ شخص جو کھڑا ہوا ہے ساتھ دینے والوں کو چاہیئے کہ اسی کا ساتھ دیں۔ شاید الوہیت ہی کے اس عقیدے کے شاخسانے تھے جو عام طور پر بادیہ عرب کے ان سادہ دل فوجیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ کوئی ایک دو آدمی ہی نہیں تھے، یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ

قَدْ رَاَى الشَّعْبِيُّ رُشَيْدَ الْهَجَرِيَّ وَ حَبَّةَ الْعُرَنِيَّ وَاَصْبَغَ بْنَ نُبَاتَةَ لَيْسَ يُسَاوِيْ هٰؤُلَاءِ شَيْئًا (لسان ج ۲ ص ۴۶)

شعبی نے اس گروہ کے لوگوں میں رشید ہجری، حبۃ العرنی اور اصبغ بن نباتہ کو دیکھا تھا کسی چیز کے برابر نہیں تھے۔ (یعنی ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی)

بلکہ ان ہی عامر الشعبی جو حدیث اور فقہ دونوں کے امام الائمہ تابعی ہیں، ان کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ ٹولی جو کوفہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی تھی، اور اپنے آپ کو "اصحاب علی" کے نام سے عموماً موسوم کرتی تھی، ان لوگوں کے متعلق شعبی عموماً اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ زکریا بن ابی زائدہ نے جو شعبی کے مشہور تلامذہ میں ہیں، ایک دفعہ پوچھا بھی کہ

مَالَكَ تَعِيبُ أَصْحَابَ عَلِيٍّ وَإِنَّمَا عِلْمُكَ عَنْهُمْ۔ — آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ "اصحاب علیؓ" پر آپ نکتہ چینی کرتے ہیں حالانکہ آپ کا علم ان ہی لوگوں سے ماخوذ ہے؟

اس پر الشعبی نے کہا کہ میں نے ان میں سے کس کس سے علم حاصل کیا ہے؟ زکریا نے بطور مثال کے حارثِ اعور اور صعصعہ کا نام لیا حالانکہ کے اس گروہ کے یہ ممتاز لوگ تھے، لیکن شعبی نے ہر ایک کے متعلق اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اچھے خیالات ظاہر نہیں کئے، حارثِ اعور کے بارے میں کہا کہ حساب اور فرائض اگرچہ اسی شخص سے میں نے سیکھا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شخص وسواس کے مرض میں گرفتار تھا، صعصعہ کے متعلق کہا کہ بڑا اچھا بولنے والا آدمی تھا لیکن دین کی سمجھ اس میں بھی نہ تھی۔ شعبی کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

كَانَ خَطِيبًا وَلَمْ يَكُنْ بِفَقِيهٍ (تذکرہ ص۸) — وہ واعظ بڑا اچھا تھا لیکن فقیہ نہ تھا۔

الذہبی نے اسی کے قریب الشعبی کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک دفعہ کہنے لگے کہ کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں و مستفیدوں کے سوا میں نے تو کسی کو فقیہ کبھی خیال نہیں کیا، اس پر ایک شخص نے ٹوکتے ہوئے ان لوگوں کا نام لینا شروع کیا جو ابن مسعودؓ سے مستفید نہیں ہوئے تھے اور صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت میں شریک ہو گئے تھے اس فہرست میں بھی حارث، ابن صبوہ، صعصعہ، رشید وغیرہ کا نام ہے، اس وقت بھی الشعبی نے ہر ایک کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا، جن کا ذکر زکریا سے کیا تھا، بلکہ رشید الہجری کا وہ قصہ یعنی مدینہ پہنچنے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے وفات کے بعد ملاقات کرنے کا قصہ اسی موقع پر

بیان کیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ، لسان المیزان وغیرہ میں آپ کو ان چیزوں کی تفصیل مل سکتی ہے۔

بہرحال بادیہ عرب کے مختلف گوشوں سے کوفہ کی چھاؤنی میں اس قسم کا ایک خاص طبقہ جو جمع ہوگیا، جن کے ممتاز افراد کا میں نے ذکر کیا ان کے متعلق یہ سمجھنے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اسلام کو انہوں نے اخلاص و صداقت کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا، ان ہی لوگوں کے دوسرے حالات بھی ان ہی کتابوں میں ملتے ہیں جو ان کی راستبازی اور سرفروشی کی واضح شہادتوں پر مشتمل ہیں بلکہ آگے بڑھ کر میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ رشید ہجری کے اس قصہ کے سوا جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں ملاقات کا اس نے دعویٰ کیا ہے جو ظاہر ہے کہ بے اصل واقعہ ہے، اس کے سوا قصداً غلط بیانی کا انتساب بھی اگر کل کی طرف نہیں تو ان کے سربرآوردہ افراد کی طرف مشکل ہے۔ مثلاً حارث اعور ہی میں، آج ہی نہیں، الشعبی کے بعض بیانات میں ان کی طرف کذب کے انتساب کو پاکر اسی زمانے میں بعض جلیل القدر بزرگوں نے اس پر اعتراض کیا تھا، حافظ ابن حجر نے تہذیب میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کے سامنے کسی نے شعبی کے اس دعویٰ کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ

أَظُنُّ الشَّعْبِيَّ عُوقِبَ بِقَوْلِهِ فِي الْحَارِثِ. (ج ۲ ص ۱۴۷)

میں خیال کرتا ہوں کہ الشعبی کو اسی کی سزا[1] ملی جو حارث کے متعلق وہ کہتے تھے۔

اور یہ بھی یہی بات کہ حارث معمولی آدمی نہیں ہیں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تعلیمی حلقہ کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، حافظ ہی نے لکھا ہے کہ

تَعَلَّمَ الْفَرَائِضَ مِنْ عَلِيٍّ (ج ۲ ص ۱۴۷)

فرائض کا علم حضرت علیؓ ہی سے حارث نے سیکھا تھا۔

اور شعبی نے حارث ہی سے اس علم کو سیکھ کر کوفہ میں اس علم کی اشاعت کی، گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں فرائض کا علم جو پایا جاتا ہے شاید اس کی تعلیمی سند حارث ہی پر ختم ہوتی ہو۔

---

[1] حجاج کے زمانہ میں امام شعبی غیر معمولی آزمائشوں میں جو مبتلا ہوئے غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ جن کی تفصیل تاریخ کی عام کتابوں میں پڑھئے۔ ۱۲

ابن سعد کے حوالہ سے خود اسی کتاب میں کسی موقعہ پر میں نے بھی نقل کیا ہے کہ اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حارث کو وہ نوشتہ دیا تھا جس میں علم کثیر تھا۔

اور ایک حارث ہی کا یہ حال نہیں ہے، حارث تو شعبی کے استاذ تھے۔ کوفی اسی جماعت کی مشہور شخصیت جابر بن یزید الجعفی کی ہے۔ شعبی سے ہمعصری کا تعلق تھا۔ رائے قائم کرنے والوں کی رائیں اس شخص یعنی جابر جعفی کے متعلق بھی عجیب ہیں۔ ایک بڑا طبقہ جابر پر معترض ہے لیکن جابر کے مداحوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ واللہ اعلم اصل واقعہ کیا ہے، لیکن جہانتک اس طبقہ کے حالات کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کردار سے زیادہ ان کا اصلی عیب یہ تھا کہ جعلی روایتوں کو صحیح حدیثوں سے جدا کرنے کا معیار یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں جس کی تعبیر کی تھی کہ

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ وَدَعُوْا مَا يُنْكِرُوْنَ.	لوگوں سے وہی باتیں (یعنی حدیث کے متعلق) بیان کرو جنہیں لوگ جانتے پہچانتے ہوں، اور جن سے نامانوس ہوں انہیں چھوڑ دو۔

اس علوی معیار کے استعمال سے اپنی خاص قسم کی دماغی کیفیت کی وجہ سے وہ معذور تھے آخر خود سوچنا چاہئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مواجہہ مبارک میں اور وہ بھی بحالتِ خطبہ بھری مجلس میں بے دھڑک

أَشْهَدُ أَنَّكَ تِلْكَ الدَّابَّةُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دابہ تم ہی ہو۔

کہنے سے جو نہ جھجکتے ہوں اور اس قسم کے دوسرے رکیک وسخیف خیالات پر جنہیں اصرار ہو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ان لوگوں کی عقلیت اس کا فیصلہ کیسے کر سکتی تھی کہ اسلامی تعلیمات سے مانوس وغیر مانوس باتیں کونسی ہیں، ان کی اسی حمقی سادگی سے نفع اٹھانے والے نفع اٹھاتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے قدرتاً حضرت والا کے ساتھ ان کی عقیدت غیر معمولی طور چونکہ بڑھی ہوئی تھی، حریفوں نے اسی کو ہتھکنڈہ بنا لیا، حضرت کی طرف

منسوب کرکر کے جس قسم کی باتیں چاہتے ان سے منوا لیتے تھے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حارث اعور کے متعلق احمد بن صالح مصری کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے یعنی کسی نے احمد کے سامنے الشعبی کے اعتراض کا ذکر کیا تو جواب میں احمد نے کہا :

لَمْ يَكُنْ يَكْذِبُ فِي الْحَدِيثِ إِنَّمَا كِذْبُهُ فِي رَأْيِهِ۔ (ص ۱۴۷)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حارث حدیث کی روایت میں غلط بیانی سے کام لیتے تھے، بلکہ غلطی کا تعلق حارث کی رائے سے ہے۔

تقریباً یہ وہی توجیہ ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں کہ قصداً حضرت علی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی جرأت یہ لوگ نہیں کر سکتے تھے، ان کے دوسرے حالات سے اس کی تردید ہوتی ہے، البتہ ان لوگوں کی رائے یعنی عقائد و خیالات غلط تھے جن میں مبتلا ہو جانے کے بعد پھر صحیح و غیر صحیح روایتوں میں تمیز کی صلاحیت ہی آدمی میں باقی نہیں رہ سکتی، آخر بادل سے حضرت علیؓ کی آواز سننے کا جو انتظار کر سکتے ہوں، آپ ان لوگوں سے کیا چیز نہیں منوا سکتے۔ الشعبی ہی سے براہ راست ذہبی نے حارث کے متعلق جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ

فَخَشِيتُ عَلَى نَفْسِي مِنْهُ الْوَسْوَاسَ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۰)

مجھے اس شخص کے متعلق اس کا اندیشہ ہے کہ وہ وسواس کے مرض میں مبتلا تھے۔

اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شعبی کو حارث اعور کی عقلیت پر بھروسہ نہ تھا میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں ایک دوسری مثال سے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، مذکورہ بالا طبقہ کی ممتاز اور نمایاں شخصیتوں کی فہرست جو میں نے پیش کی ہے، دیکھئے اسی میں ایک صاحب ہیں حبۃ العرنی جن کا نام ہے، ابن معین کے حوالہ سے لسان المیزان کا وہ فقرہ ابھی گزرا ہے جس میں دوسروں کے ساتھ حبۃ کے متعلق ان کا یہ فیصلہ تھا کہ لَا يُسَاوِي شَيْئًا کسی چیز کے برابر نہیں ہے یعنی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن اسی کے ساتھ حافظ ابن حجر نے ہی تہذیب میں

سلمہ بن کہیل جیسی باوقار اور مستند بزرگ ہستی کی یہ چشم دید شہادت بھی نقل کی ہے:

مَا رَأَيْتُهُ قَطُّ إِلَّا يَقُولُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، إِلَّا أَنْ يُصَلِّيَ أَوْ يُحَدِّثَنَا۔

(تہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۷۶)

میں نے کبھی اس کو (یعنی حبۃ العرنی کو) نہیں دیکھا مگر اسی حال میں پایا کہ سبحان اللہ الحمدللہ لاالٰہ الااللہ کا ورد کرتے ہوں، البتہ نماز پڑھ رہے ہوں یا ہم لوگوں سے حدیث بیان کرتے ہوں۔ (اس وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر جاری نہ ہوتے)۔

عقلاً اسی قسم کی شخصیت کے متعلق یہ خیال کہ قصداً وہ جعلی روایتیں بنا بنا کر حضرت علیؓ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، شاید صحیح نہیں ہو سکتا اور یہی سوال ہے کہ نقدِ رجال کے ائمہ آخر حبۃ کی روایتوں کی ایک حبہ بھی قیمت جو نہیں لگاتے۔ ابن معین ہی نہیں، دوری، جوزجانی، نسائی، ابن خراش اور ان کے سوا بھی اس راہ کے اربابِ تحقیق کی یہی رائے نقل کی گئی ہے کہ حدیث میں وہ کچھ نہ تھے۔ (دیکھئے تہذیب لفظ حبۃ العرنی ج ۲ ص ۱۷۶) اور اب میں اسی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ عہدِ عثمانی کے آخری سالوں میں غلط اور بے سر و پا بے بنیاد روایتوں کا سیلاب مسلمانوں میں بہا دیا گیا تھا۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جیسا کہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے ذاتی معلومات کی اشاعت سے اس طوفان کا مقابلہ مناسب خیال فرمایا اور اسی کے ساتھ صحیح اور غلط روایتوں کے جانچنے کا فطری اور عقلی معیار یعنی معروف و مانوس اور منکر و غیر مانوس باتوں میں تمیز کی جو کسوٹی مسلمانوں کو آپ نے عطا فرمائی، اس کو دیکھ کر حریفوں کو دوسری چال سوجھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی زندگی کی حد تک تو خاموش رہے اور گو فتنہ کے سرغنوں کو بھی جہاں تک آپ سے ہو سکا ختم کر چکے تھے، لیکن چند ہی دنوں کے بعد آپ کی شہادت کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا۔ حکومت کی باگ جن ہاتھوں میں چلی گئی، سیاسی مہمات کی مشغولیت نے دوسری طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ان کے لئے باقی نہ رکھا تھا۔ چھپی دبی

چنگاریاں فساد کی ملک کے مختلف گوشوں میں جو باقی رہ گئی تھیں، ان کو بھڑکنے اور چمکنے کا ایک مغتنم موقعہ مل گیا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ بقیۃ السیف افراد فتنہ پردازوں کے جو پوشیدہ تھے وہ پھر باہر نکل آئے جیسا کہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فوجیوں میں گھلے ملے تھے وہ حضرت کی فوج اور آپ کے طرفداروں کے حالات سے بھی خوب واقف تھے جانتے تھے اور ان کی ذہنی اور دماغی کیفیتوں کا ساتھ رہنے کی وجہ سے بہت اچھا اور کافی تجربہ رکھتے تھے جیسا کہ معلوم ہے حضرت کے ساتھ دینے والوں میں غالب تعداد کوفہ کی چھاؤنی کے فوجیوں کی تھی، کوفہ والوں میں عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانہ کے جو لوگ تھے ان کو متاثر کرنا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ البتہ بادیۂ عرب کے ان سادہ دل سپاہیوں میں کام کرنے کی کافی گنجائش نظر آئی خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ اقدس سے جو زیادہ عقیدت رکھتے تھے اور ان کے قلوب مخالفوں کی سیاسی کامیابیوں اور اپنی ناکامیوں سے جیسا کہ چاہئے تھا محزون و مغموم تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ امام برحق کے مقابلہ میں مخالف جماعت کیسے کامیاب ہوگئی۔ بہرحال اسی جماعت کے مختلف افراد کا انتخاب کیا گیا اور کسی دوسرے کے نام سے نہیں بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کے ان بے چاروں میں اپنی خود تراشیدہ روایتوں کی ترویج میں نفسیاتی اصول کے تحت جن میں وہ غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، بتدریج کوشش شروع کی۔ پھر زیادہ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ دیکھا گیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی واقعی روایت کردہ حدیثوں کے ساتھ مصنوعی اور جعلی روایتوں کا ایک انبار ان ہی لوگوں میں جمع ہوگیا جن کو اپنے اس عمل کے لئے فتنہ پردازوں کی اس ٹولی نے چنا تھا۔ خیال تو کیجئے کہ جابر بن یزید الجعفی جو تقریباً اسی زمانے کا آدمی ہے یعنی الشعبی، عکرمہ وغیرہ کا شاگرد ہے۔ ابتداء میں بے چارے کی دینی حالت غیر معمولی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہتر تھی، اچھے اچھے لوگ اس کے مداح تھے، سفیان ثوری، شعبہ، وکیع جیسے اکابر اس کے ساتھ خاص عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اسی آسیب زدہ جماعت سے جابر کا تعلق ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جابر کے استاذ شعبی کو جب اس کی بھنک لگی تو بطور فہمائش کے اس کو

بھایا بھی کہ جابر دیکھ! میں خیال کر رہا ہوں کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھ کر مرے گا" (میزان ج ا ص ۱۴۵) مگر بدقسمت جابر فتنہ کا شکار ہو چکا تھا۔ اسی کے بعد یہ دعویٰ کرتا ہو گا

اِنْتَقَلَ الْعِلْمُ الَّذِیْ کَانَ فِی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی عَلِیٍّ ثُمَّ مِنْ عَلِیٍّ اِلَی الْحَسَنِ ثُمَّ لَمْ یَزَلْ حَتّٰی بَلَغَ جَعْفَرًا۔ (میزان ج ا ص ۱۵۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو علم تھا وہ حضرت علیؓ تک منتقل ہوا اور علیؓ سے امام حسنؓ تک یونہی وہ منتقل ہوتا ہوا جعفر تک (یعنی اسی شخص تک پہنچا)۔

ان روایتوں کی تعداد جن کے متعلق جابر مدعی تھا کہ امام جعفر کے والد حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے اس کو پہنچی ہیں جو کچھ بتاتا تھا خود اس کی زبان سے براہ راست سننے والوں کا بیان ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ

سَمِعْتُ جَابِرًا یَقُوْلُ عِنْدِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفَ حَدِیْثٍ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّھَا (مقدمہ صحیح مسلم)

میں نے سنا ہے جابر کہتا تھا کہ میرے پاس ستر ہزار ایسی روایتیں ہیں جو کل کی کل ابو جعفر (امام باقر علیہ السلام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچیں۔

مسلم کے اسی مقدمہ میں ایک روایت پچاس ہزار کی بھی ہے، امام ابو حنیفہؒ تک کے سامنے اس نے تیس ہزار روایتوں کا دعویٰ کیا تھا۔ تہذیب میں ہے:

اَنَّ عِنْدَہٗ ثَلٰثِیْنَ اَلْفُ حَدِیْثٍ لَمْ یُظْھِرْھَا (تہذیب ج ۲ ص ۴۸)

تیس ہزار روایتیں ایسی ہیں (جسے کہتا تھا) کہ اس نے (یعنی جابر نے) لوگوں پر ظاہر نہ کیا۔

واللہ اعلم بالصواب، جابر کے یہ دعوے اس کے خود تراشیدہ دعوے تھے یا جس جماعت میں وہ شریک ہو گیا تھا یعنی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن حبان نے لکھا ہے کہ

کَانَ سَبَائِیًّا مِنْ اَصْحَابِ عَبْدِ اللّٰہِ

جابر دراصل سبائی تھا، یعنی عبداللہ بن سبا کے

---

[1] اسی مقصد کو کبھی ان الفاظ میں ادا کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلایا اور جو کچھ آپ کو خدا سے علم ملا تھا سب آپ کو سکھایا۔ حضرت علیؓ نے امام حسنؓ کو امام حسنؓ نے امام حسینؓ کو امام حسینؓ نے اپنے بیٹے کو، تاآنکہ امام جعفر صادق تک اس قصہ کو پہنچایا۔ (میزان ج ا ص ۱۵۳)

بنی سبا۔ (میزان ج ۱ ص ۱۵۴) لوگوں میں سے تھا۔

ان لوگوں سے یہ چیزیں اس تک پہنچی تھیں، اس کے ابتدائی حالات جو بیان کئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ قرین عقل و قیاس یہی ہے کہ جھوٹ کا یہ طومار دوسروں ہی سے اس تک پہنچا تھا[1]۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میری غرض تو صرف یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے پھیلانے والوں نے جھوٹ کے جس سمندر کو انڈیل دیا تھا اس کا اندازہ آپ کو صرف اسی ایک قطرے سے ہو سکتا ہے، آخر جب ایک ایک آدمی اپنے پاس ستر ستر ہزار، پچاس پچاس ہزار روایتوں کا پشتارہ رکھتا ہو تو مجموعی طور پر ان روایتوں کی مقدار کیا ہوگی، جو حضرت والا کے اسم مبارک کی طرف منسوب کر کر کے اس قسم کے مفتون لوگوں میں پھیلا دی گئی ہوں گی۔

انتہا یہ ہے کہ جیسے حضرت علیؓ کی طرف سے تحریری شکل میں بعض روایتوں کی اشاعت عمل میں آئی تھی، ان لوگوں نے اس سے بھی نفع اٹھایا یعنی سینوں سے سینوں میں جو کچھ وہ منتقل کر رہے تھے وہ تو خیر کر رہے تھے، واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھ لکھ کر جعلی روایتوں کی کتابوں کو بھی حضرت والا کے اسم گرامی کی طرف منسوب کر کے پھیلانے والے پھیلا رہے تھے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ

أُتِيَ ابْنُ عَبَّاسٍ بِكِتَابٍ فِيهِ قَضَاءُ عَلِيٍّ فَمَحَاهُ إِلَّا قَدْرَ وَأَشَارَ سُفْيَانُ بِذِرَاعِهِ۔ (ص ۱۲۹)

ابن عباسؓ کے سامنے ایک کتاب پیش ہوئی جس میں لکھا جاتا تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فیصلے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کتاب کو لے کر مٹانا شروع کیا مگر اتنا۔ سفیان نے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا یعنی ایک ہاتھ کے برابر کتاب کو باقی رکھا۔

---

[1] آخر خود خیال کیجئے وکیع بن الجراح جیسے امام تک جس کے متعلق یہ کہتے ہوں کہ خواہ اور کسی چیز میں تم شک کرو لیکن جابر معتبر اور ثقہ آدمی ہے اس میں شک نہ کرنا چاہئے۔ سفیان ثوری کی عقیدت کا حال ابتداء میں اسی کے متعلق اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ نقد رجال کے امام شعبہ نے جابر پر جب جرح کا ارادہ کیا تو سفیان نے کہلا بھیجا تھا کہ جابر پر اگر تم کلام کرو گے تو میں پھر تم پر کلام کروں گا۔ ۱۲

مگر ظاہر ہے کہ ابن عباسؓ ہی جیسی ہستی اس کی جرأت کر سکتی تھی، بلکہ قاضی ابن ابی ملیکہ جو طائف کے قاضی تھے ان کے جس قصہ کا ذکر اسی مقدمہ میں امام مسلم نے کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابن عباسؓ کو ابن ابی ملیکہ نے لکھ بھیجا کہ آپ میری راہ نمائی کے لئے کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے، حضرت ابن عباسؓ نے اسی "قضاء علی" نامی کتاب کو منگوایا، آپ نے چاہا کہ اسی کی نقل کر کے بھیج دوں، لیکن جب لکھنے بیٹھے تو راوی کا بیان ہے

يَمُرُّ بِهِ الشَّيْءُ فَيَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا قَضٰى بِهٰذَا عَلِيٌّ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ قَدْ ضَلَّ ۔ (ص ۱۲۹)

ان کے سامنے کوئی بات آتی تو فرماتے قسم ہے خدا کی نہ فیصلہ کیا علیؓ نے یہ مگر یہ کہ وہ راہ سے بھٹک گئے۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ قطعاً نہ تھا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف ضلالت اور بھٹک جانے کا العیاذ باللہ الزام لگا رہے تھے بلکہ اس کی مثال ٹھیک ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے یہ دعویٰ تو وہی کر سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ مقصد اس قسم کے طرز بیان سے یہ ہوتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے یہ دین اسلام کا ایسا بدیہی اور واضح عقیدہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی اس دعوے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ابن عباسؓ کا مقصد بھی مذکورہ بالا تعبیر سے محض اس جعلی اقوال کی نوعیت کا اظہار ہے یعنی ان کا مصنوعی ہونا اتنا واضح ہے کہ گمراہ ہوئے بغیر ایسا فیصلہ حضرت علیؓ کر ہی نہیں سکتے۔ الغرض روایت کا وہی معیار جس سے خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روایات کی تنقید میں کام لینے کی ہدایت فرمائی تھی اور آپ سن چکے کہ ابن عباسؓ نے بھی

فَلَا نَأْخُذُ إِلَّا مَا نَعْرِفُ ۔

اب ہم نہیں قبول کرتے مگر ان ہی روایتوں کو جو جانی پہچانی مانوس ہیں۔

کے الفاظ سے اسی طریقۂ کار کا اظہار بھی فرمایا تھا لیکن ظاہر ہے کہ ابن عباسؓ ہونا تو خیر بڑی بات ہے جس قسم کی بصیرت اور پختہ نظری کثرت مشق اور مزاولت، نیز دوسرے اسباب کے تحت ان میں پیدا ہو گئی تھی، یہ بات ہر کس و ناکس کو کیسے میسر آ سکتی تھی نتیجہ وہی ہوا جو بد اندیشوں

نے سوچا تھا، یہی نہیں کہ جھوٹ کا ایک سیلاب سارے اسلامی علاقوں میں پھیل گیا. عبدالملک بن مروان نے اپنے ایک مدنی خطبہ میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا کہ

وَقَدْ سَالَتْ عَلَيْنَا اَحَادِيْثُ مِنْ قِبَلِ هٰذَا الْمَشْرِقِ وَلَانَعْرِفُهَا (ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۷۲) المشرق (عراق وغیرہ جس میں کوفہ، بصرہ وغیرہ الامصار تھے وہاں) سے حدیثوں کا ایسا سیلاب بہہ کر ہماری طرف آگیا ہے جنہیں ہم نہیں پہچانتے.

ظاہر ہے کہ هٰذَا الْمَشْرِقِ سے عبدالملک کا اشارہ اسی مشرقی شمالی حصہ کی طرف تھا، جہاں سے یہ طوفان اٹھایا گیا تھا. شاید پہلے بھی اس کا کہیں ذکر آچکا ہے کہ یہ اموی فرمازوا عبدالملک زمانے تک علم حدیث کا طالب العلم رہ چکا تھا اور ممتاز و نمایاں طلبہ میں اس کا شمار تھا اس لئے اس کے قول کو میں نے نقل بھی کیا ہے کہ اس وقت وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حدیث کے ایک طالب العلم کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد اس فتنہ کے نتائج و آثار کو کتنے دنوں تک اور کتنے دور دور فاصلوں پر لوگ محسوس کر رہے تھے.

اور قصہ صرف اسی پر ختم ہو جاتا تو سمجھا جاتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کے آخری سالوں میں جو مصیبت دراندازوں کے ہاتھوں حدیث کے اس علم پر نازل ہوئی تھی، یعنی وہی مصیبت جس کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جیسا کہ گزر چکا تَرَكْنَا الْحَدِيْثَ عَنْهُ (یعنی رسول اللہ سے حدیثوں کی روایت کو ہم نے چھوڑ دیا) کا فیصلہ کر لیا تھا. گویا یہی مصیبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد پھر واپس ہو گئی لیکن اس مصیبت کے مقابلہ کے لئے عوام کے لئے نہ سہی مگر خواص کے لئے تو لَمْ نَاخُذْ مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَانَعْرِفُ (ہم نہیں قبول کریں گے لوگوں سے مگر ان ہی حدیثوں کو جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں) کا معیار تو رہ گیا تھا.

مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کوفہ پہنچ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے جن معلومات اور مسموعات کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی تھی، ظاہر ہے کہ وہ معمولی معلومات نہ تھے

یوں بھی سوچنا چاہئے کہ حضرت علیؓ جو آٹھ نو سال کی عمر سے آخر وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور بقول شخصے اس وقت بہ ظاہر علیحدہ ہوئے جب دیکھا گیا کہ دفن کر کے روضۂ مبارک سے وہ باہر نکل رہے ہیں، اس دوامی رفاقت و استمراری معیت کے ساتھ ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے جو گوناگوں روابط تھے اور ان روابط کی وجہ سے نبوت کے متعلق معلومات کا جو قیمتی سرمایہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ معلومات کا یہی سرمایہ جب وقفِ عام کر دیا گیا ہو تو اس غیر مترقبہ نعمت کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے بقول حافظ الدنیا شیخ ابن حجر کہ پیغمبر کے متعلق جس شخص کے معلومات کا یہ حال ہو کہ

هٰذِهٖ عَائِشَةُ اَخَصُّ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقُوْلُ لِسَائِلِهَا عَنْ شَيْءٍ مِّنْ اَحْوَالِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلْ عَلِيًّا (تہذیب ج۵ ص۳۳۹)

یہ عائشہ صدیقہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں سب سے زیادہ خصوصیت رکھتی ہیں، جب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے متعلق کوئی کچھ دریافت کرتا تو فرماتیں کہ علیؓ سے پوچھو۔

یہ آخری مہر توثیق اس علم کی وسعت کے متعلق ہو سکتی ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس تھا لیکن اس علم کا انجام بھی کیا ہوا؟ کسی دوسری جماعت کے آدمی نے نہیں بلکہ ایک ایسے شخص نے جو "اصحاب علی" میں شمار ہوتے تھے ان ہی سے مشہور کوفی امام ابو اسحاق السبیعی نے براہ راست یہ شہادت سنی۔ امام مسلم ہی نے اپنے مقدمہ میں اس کو بھی نقل کیا ہے یعنی

عَنْ اَبِيْ اِسْحَاقَ قَالَ لَمَّا اَحْدَثُوْا تِلْكَ الْاَشْيَاءَ بَعْدَ عَلِيٍّ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَيَّ عِلْمٍ اَفْسَدُوْا۔ (ص۱۲۹)

ابو اسحاق سے ان کا یہ بیان نقل کیا جاتا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد جو نئی باتیں لوگوں نے پھیلائیں تو ایک شخص جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صحبت یافتوں میں تھا کہا کرتا تھا، (ہائے!) کس علم کو ان لوگوں نے غارت کیا۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے جن

معلومات کی اشاعت کوفہ پہنچ کر فرمائی تھی وہ ان جعلی اقوال اور خود تراشیدہ روایتوں کے ساتھ مخلوط ہو کر جنہیں مفسدوں کے اس گروہ نے حضرت والا کی طرف منسوب کر کے زبانی اور کتابی دونوں شکلوں میں پھیلادی تھیں ان ہی میں گم ہو گئے یا شارح علامہ[1] کے الفاظ میں مذکورہ قول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تَقَوَّلُوا عَلَيْهِ الْاَبَاطِيْلَ وَاَضَافُوْا اِلَيْهِ الرِّوَايَاتِ وَالْاَقَاوِيْلَ الْمُفْتَعِلَةَ وَ الْمُخْتَلِفَةَ وَخَلَطُوْهُ بِالْحَقِّ فَلَمْ يَتَمَيَّزْ مَاهُوَ صَحِيْحٌ عَنْهُ مِمَّا اخْتَلَقُوْهُ۔ (فتح الملہم ص ۱۲۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف جھوٹی منگھڑت خود ساختہ روایتیں ان لوگوں نے منسوب کیں اور جو صحیح روایتیں تھیں اس حق کے ساتھ جھوٹ کو انہوں نے ملا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کی صحیح روایتوں اور ان جعلی روایتوں میں ایسا اشتباہ پیدا ہو گیا کہ دونوں گڈمڈ ہو گئے۔

اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ حق کی اشاعت باطل کے زور کو توڑنے کے لئے کی گئی تھی لیکن باطل والوں نے اسی اشاعتِ حق کو اباطیل اور خرافات کی ترویج کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کوفہ پہنچ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حدیثوں کی اشاعت نہ فرمائی، یہ تو ایک واقعہ تھا، حریفوں نے اسی سے فائدہ اٹھایا یعنی پانچ صحیح روایتوں کے ساتھ پچاس اپنی جعلی روایتوں کو بھی شریک کر دیا کرتے تھے۔ الغرض پانچ سچی باتوں کے ساتھ پچاس جعلی روایتوں کا انتساب اسی لئے آسان ہو گیا ورنہ سرے سے حضرت کی طرف سے اگر کسی چیز کی اشاعت عمل میں نہ آتی تو شاید اتنی آسانی کے ساتھ اپنی مختلفہ وخود تراشیدہ منگھڑت روایتوں کو چلتا کرنے میں ان کو کامیابی نہ ہوتی، گویا شاعر کی وہی بات ایک حیثیت سے صادق آئی کہ ؎

شد غلامے کہ آب جو آرد　　آب جو آمد و غلام ببرد

شاید وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر علم نحو کے متعلق مورخین کرتے ہیں یعنی ابو الاسود دیلی کو جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے حضرت علیؓ نے نحو کے چند بنیادی کلیات کی طرف رہنمائی فرمائی تھی۔

---

[1] حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحاق الزجاجی کی امالی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بتائے ہوئے یہ کلیات

نَحْوًا مِّنْ عَشْرَةِ أَسْطُرٍ (ج ۲ ص ۲۳۲) — تقریباً دس سطروں سے

زیادہ نہ تھے لیکن ابراہیم نے جو ابکری الکرمانی کی نسبت سے مشہور تھے، ان حضرت نے دس سطروں کو دس ورقوں میں پھیلا کر سب کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر دیا اور نام اس کا "التعلیقہ" رکھ دیا تھا، ابن عساکر کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ ان ہی دس سطروں کو

جَعَلَ هٰذَا الشَّيْخُ إِبْرَاهِيْمُ قَرِيْبًا مِّنْ عَشْرَةِ أَوْرَاقٍ (تاریخ دمشق ج ۲ ص ۲۳۲) — انہیں شیخ ابراہیم نے ان ہی دس سطروں کو دس ورق بنا دیئے۔

اور ایک یہی کیا زندگی کے کن کن شعبوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسم مبارک سے پھیلانے والوں نے دنیا میں کیا کچھ نہیں پھیلایا ہے جس کی داستان طویل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد کا یہ حملہ اس حملہ سے کہیں زیادہ تباہ کن اور زیادہ سخت تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں علم حدیث پر کیا گیا تھا، ایسی گہری اشتباہی تاریکیاں پھیلا دی گئیں کہ حق و باطل کے امتیاز کی کوئی شکل باقی نہ رہی تھی اور قریب تھا کہ ہمیشہ کیلئے اس کا جہاز غرقاب ہو جائے، پس لے دے کر وہی معیار رہ گیا تھا لیکن بار بار عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ ہر عامی و خاصی کہہ دمہ میں اس معیار کے استعمال کا صحیح سلیقہ ہو، یہ مسئلہ آسان نہیں کیونکہ کچھ بھی ہو روایتوں کی پرکھ اور جانچ کا یہ وہی معیار ہے، جس کی عام تعبیر اس زمانہ میں "معیار درایت" سے کرتے ہیں، درایت کے اس معیار کی حقیقت یہی تو ہے کہ چند کلی ضوابط و اصول بنا دیئے گئے ہیں، چاہا گیا ہے کہ جو جزئی روایت سامنے آئے اس کو ان ہی کلیات و ضوابط کی روشنی میں دیکھ کر فیصلہ کیا جائے لیکن درایت کے اس معیار ہی کی حد تک بات محدود نہیں ہے بلکہ کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی ضرورت جہاں کہیں پیش آتی ہے کافی دشواریوں سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ مشق مزاولت، تکرار، تجربہ و مشاہدے کی کثرت ہی سے

حذاقت و مہارت اس راہ میں حاصل ہوتی ہے، اب طب ہی کو لیجئے تشخیص امراض کے کلی علامات وآثار اسباب وعلل کے جان لینے کے ساتھ ہی آدمی طبیب صادق نہیں بن جاتا بقول شخصے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اس قسم کی تمام چیزوں کا عام قاعدہ ہے اسی میں درایت اور عقل کے وہ قوانین بھی شریک ہیں، جن سے روایات کی تنقید وتنقیح یا چھان بین جانچ پڑتال میں کام لیا جاتا ہے، دشواریاں بھی پیش آتی ہیں تاہم دنیا کی عام روایتوں میں تو درایت کے اس معیار سے کام چل بھی جاتا ہے لیکن درایت کا بھی معیار جب دین کے میدان میں داخل ہوتا ہے یعنی روایتوں کے جس ذخیرے کو کسی مذہب یا دین کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اس وقت درایت کا یہی معیار دیکھا جاتا ہے کہ اپنی ساری قوت وطاقت کو کھو کر بے اثر بنا ہوا پڑا ہوا ہے۔

سچی بات تو یہی ہے کہ کہنے کے لئے جس کے جی میں آئے جو کچھ چاہے کہہ دے لیکن درایت کا یہ غریب عقلی وذوقی معیار ان مذہبی روایتوں کے رد وقبول کے لئے اگر کافی ہوتا تو آج دنیا کے اکثر مذاہب وادیان کی پیٹھیں متھالوجی یا دیومالا یا اساطیر الاولین جیسے خرافاتی اوہام کے ان پشتاروں سے جھکی اور دبی نظر نہ آتیں، خرافات اور اوہام کا وہی پشتارہ جس کی بدولت آج مذاہب وادیان دیوار قہقہہ یا ضحوکۂ اطفال بنے ہوئے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ مذہب کی طرف منسوب ہوجانے کے ساتھ ہی روایتوں کے اس ذخیرے میں ہمیشہ ایک خاص قسم کا تقدس پیدا ہوجاتا تھا، ایسا تقدس جس کے بعد پوچھنے والوں کے لئے یہ پوچھنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی کہ آخر ان کے منسوب کرنے والے کون لوگ ہیں انہوں نے مذہب کی طرف ان روایتوں کو کس بنیاد پر منسوب کیا؟ کب منسوب کیا؟ کیوں منسوب کیا؟ بس اتنی بات کہ مذہب میں یوں ہی آیا ہے، مذہب یہی کہتا ہے، مذہبی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے مذہب کے علماء یہی کہتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے چند گنے چنے ڈھلے ڈھلائے فقروں میں اتنا زور تھا کہ منہ اور زبان ہی نہیں بلکہ دلوں اور دماغوں پر خاموشی طاری ہوجاتی تھی، ان کے مقابلہ

کچھ کہنا تو خیر بڑی بات تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچنا بھی آدمی کو دینی مجرم بنانے کے لئے کافی تھا، یہی ہوتا چلا آرہا تھا کہ مذہب کا غلاف روایتوں پر چڑھا نہیں کہ اب ردوقدح جرح وتعدیل کی ساری جھنجھٹوں سے ایسی روایتیں محفوظ ہوجاتی تھیں، ہر اعتراض یا سوال کے سامنے مذہب کا تقدس دھمکی بن کر کھڑا ہوجاتا تھا اور بات اسی پر ختم نہیں ہوجاتی تھی بلکہ مذہب کے اس مقدس غلاف میں داخل ہوجانے کے بعد روایتوں کا یہ ذخیرہ ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا تھا، جہاں حواس کے ہاتھ کوتاہ اور عقل کا چراغ گل ہوجاتا ہے، یعنی غیب کے اس عالم میں یہ ذخیرہ داخل ہوجاتا تھا جس کا مذہب اور صرف مذہب عالم کے اس محسوس نظام میں تنہا سفیر اور واحد ترجمان ہے، درایت کے معیار پر رکھ کر غیب میں شریک ہوجانے والے روایات کے پرکھنے اور جانچنے کی شکل ہی کیا تھی؟ غیب سے مذاہب کا جو جوہری تعلق ہے اس سے قطع نظر کرکے اگر ان کی تنقید میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا جاتا جس سے دنیا کے عام حوادث وواقعات کی خبروں کی چھان بین میں کام لیا جاتا ہے تو غیب سے بے تعلق ہوجانے کے بعد مذہب، مذہب ہی کب باقی رہتا ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ مذہبی حقائق اور دین کے غیبی امور کی جانچ پڑتال میں جن لوگوں نے یہ راہ جس زمانہ میں بھی اختیار کی ہے۔ آخری انجام ان کی کوششوں کا یہی ہوا ہے کہ مذہب چند بے جان مادی رسوم کا صرف ایک ایسا خشک ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے کہ غیر تو غیر خود تنقید کرنے والوں کے لئے بھی اس نام نہاد مذہب میں کوئی دلآویزی اور دلچسپی باقی نہیں رہتی ہے اس قسم کی کوششوں کا پہلے بھی ہمیشہ یہی انجام ہوا ہے اور آج بھی دیکھا جارہا ہے کہ اسی انجام تک پہنچ پہنچ کر ختم ہورہی ہیں۔

لیکن مذہب کے اس غیبی رشتہ کو زندہ تروتازہ رکھتے ہوئے درایت کے اس معیار کو مذہبی روایتوں اور ان کے مشتملات کی تنقید کے لئے جنہوں نے ہاتھ اٹھایا، اٹھانے کے ساتھ ہی ان کو خود بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اچٹ جانے والے ایک اوچھے ہتھیار سے زیادہ کوئی کام وہ انجام نہیں دے رہے ہیں اس کا اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن ہوتا یہی ہے اور واقعہ کی جو صورت مذہب میں ہے اس کا یہ لازمی، قدرتی منطقی نتیجہ ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب و

ادیان کا خزانہ روایاتی خرافات سے جو اٹا ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درایت کے اس معیار سے ان مذاہب کے ماننے والے ناواقف تھے۔ میرے خیال میں تو یہ واقعہ کا انکار ہوگا۔ تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے بلکہ اجمالا اتنا اشارہ کافی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے خرافاتی مذاہب یعنی متھالوجی سے جن کے دامن بھرے ہوئے ہوتے ہیں ان کے ماننے والوں نے دُنیا کے حوادث و واقعات کی متعلقہ روایتوں کی تحقیق و تنقیح درایت کے اسی معیار کی مدد سے عموماً کی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف ان کا مذہب صرف خرافات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ تو دوسری طرف ایسے بے شمار علوم و فنون کے وہ بانی بھی نظر آتے ہیں جن میں حق کو باطل سے صحیح کو غلط سے درست کو نادرست سے الگ کرنے کی کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔ بھلا ان ہی لوگوں کے متعلق کسی حیثیت سے بھی یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ واقعات کی تنقیح میں درایت کے اس معیار سے کام لینا وہ نہیں جانتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ درایت کا یہ معیار بجائے خود جتنا بھی اہم ہو لیکن زیادہ تر یہ ان روایتوں کی جانچ پڑتال میں زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے جن کا تعلق عام حوادث و واقعات سے ہے، بلاشبہ ان کی متعلقہ خبروں کی تنقید میں اس کی گرفت سخت ہوتی ہے لیکن بات جب غیب میں چلی جائے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا اس وقت ایک معمولی اوچھے ہتھیار سے زیادہ درایت کے اس معیار کی وقعت نہ باقی رہتی ہے اور نہ رہ سکتی ہے اسی لئے مذہبی روایات جو بہرحال غیبی تعلقات کا سہارا لئے رہتے ہیں ان کی تنقید و تنقیح میں یہ تو غلط ہے کہ سرے سے اس معیار کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہمارے محدثین نے انتہائی فراخ چشمیوں کے ساتھ حدیثوں کی تنقید میں اس سے کام لیا ہے اور کام لینے کی ہدایت کی ہے اور محدثین کیا، آپ سن چکے کہ خود سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی نے اس کی تعلیم دی تھی۔ ابن عباسؓ بھی لوگوں کو روایتوں کے ردو قبول میں ہدایت کیا کرتے تھے کہ درایت کے اس معیار سے چاہیئے کہ کام لیا جائے، بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی اس معیار کے استعمال کی

ہدایت فرمائی گئی ہے، آگے بڑھ کر کوئی چاہے تو قرآن میں بھی اس کے اشارے پا سکتا ہے۔[1]

بہرحال درایت کا یہ معیار روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن جیسا کہ آپ دیکھ چکے ایسی روایتیں جن کا تعلق کسی دین اور مذہب سے ہو، ان کی راہوں میں درایت کا یہ معیار اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے چنداں کارگر ثابت نہیں ہوتا، پھر بنی نوع انسانی کے لئے دین کا جو آخری نظام تھا کیا یہ ممکن تھا کہ اس خطرے کے انسداد کا قدرت کی طرف سے اس میں انتظام نہ کیا جاتا۔

جو نہیں جانتے ہیں ان میں شاید یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ روایتوں کی تنقیح و تنقید میں درایت کے معیار کو محدثین نے بعد کو استعمال کیا۔ اور روایتوں ہی کی تنقید کا ایک طریقہ جس

---

[1] حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی کتاب جامع العلم میں اور الخطیب نے الکفایہ میں، نیز دوسری کتابوں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسی حدیثیں روایت کی گئی ہیں جن کا حاصل یہی ہے کہ مسلمان اپنے احساسات سے مانوس جن روایتوں کو پائیں ان کو قبول کرنا چاہئے اور جن میں ان کے احساسات اجنبیت محسوس کریں ان کو رد کر دینا چاہئے۔ الفاظ یہ نقل کئے جاتے ہیں اِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ تَعْرِفُہٗ قُلُوْبُکُمْ وَتَلِیْنُ لَہٗ اَشْعَارُکُمْ وَاَبْشَارُکُمْ وَتَرَوْنَ اَنَّہٗ مِنْکُمْ قَرِیْبٌ اَوْلَاکُمْ بِہٖ وَاِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنِّیْ تُنْکِرُہٗ قُلُوْبُکُمْ وَتَنْفِرُ مِنْہُ اَشْعَارُکُمْ وَاَبْشَارُکُمْ وَتَرَوْنَ اَنَّہٗ مِنْکُمْ بَعِیْدٌ فَاَنَا اَبْعَدُکُمْ مِنْہُ (دیکھو کفایہ ص ۴۳۲) یعنی جب میری طرف منسوب کر کے حدیث بیان کی جائے تو تمہارے دل جسے پہچانتے ہوں اور تمہارے بال اور کھال جس کے لئے نرم پڑ جائیں اور پاؤ کہ وہ تم سے قریب ہے تو اس حدیث کے متعلق سمجھو میں تم سے قریب ہوں اور اس کے برخلاف پاؤ تو میں اس حدیث سے دور ہوں مگر ظاہر ہے کہ ان احساسات سے مقصود مسلمانوں کے وہی احساسات ہیں جو قرآن کے زیر اثر ان میں پیدا ہوتے ہیں عموماً خاکسار جس کی تعبیر میں قرآنی عقلیت یا ایمانی ذہنیت سے کیا کرتا ہے۔ باقی دین باختوں کی وہ عقلیت جس سے قرآنی تعلیمات بھی بسا اوقات اچٹ جاتے ہیں جو اپنی اسی عقلیت کو دینی روایات کی تنقید کا معیار بنائیگا وہ حدیث تو حدیث شاید بیسیوں قرآنی آیات کو بھی قرآن سے العیاذ باللہ نکالنے پر مجبور ہوگا بہرحال مذکورہ بالا روایت اگر صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی روایت کے اسی معیار کو استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح قرآن میں امن اور خوف کی خبروں کے متعلق یہ حکم جو دیا گیا ہے کہ عوام ان کی اشاعت نہ کریں بلکہ رسول یا رسول نہ ہوں تو مسلمانوں میں امر اور حکم کا اختیار جن لوگوں کو ہو ان تک پہنچا دیں اور اس کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ یہی لوگ استنباط سے کام لیں گے یعنی صحیح اجزاء کو غلط اجزاء سے جدا کر لیں گے۔ دیکھو سورۂ نساء۔ ظاہر ہے کہ روایتوں اور خبروں کے متعلق یہ حکم درایت ہی کے استعمال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ۱۲

میں روایتوں کے راویوں اور رجال کی جرح و تعدیل سے کام لیا جاتا ہے یہی پرانا طریقہ تھا جو محدثین میں مروج تھا مگر میرے نزدیک یہ واقعات و حالات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے روایت کے اس معیار کی تاریخ آپ دیکھ چکے کہ کتنی پرانی ہے۔ اپنا خیال تو یہی ہے کہ اس معیار کی بعض قدرتی خامیوں اور کوتاہیوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ الدین الخاتم کے ماننے والوں کے قلوب میں روایتوں کی جانچ پڑتال کے ایک اچھوتے اور قطعاً نئے طریقے کا الہام قدرت کی طرف سے ہوا اور یہ وہی طریقہ ہے جس کی تعبیر محدثین کے حلقوں میں

فن جرح و تعدیل

سے کی گئی ہے جس میں روایت کی سند کے ایک ایک راوی کو لیا جاتا ہے اور جن کتابوں میں ان راویوں کے ان صفات و خصوصیات کو کافی تحقیق و تنقیح کے بعد درج کیا گیا ہے جن سے ان کی بیان کردہ روایتیں متاثر ہو سکتی ہیں، ان ہی رجسٹروں کو سامنے رکھ کر ہر راوی کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس فیصلہ کے بعد "روایت" کی جو نوعیت متعین ہوتی ہے، جس درجہ میں شریک ہونے کا حق وہ حاصل کرتی ہے، اسی درجہ میں اس روایت کو جگہ دی جاتی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، مذہبی روایات کی تنقیح و تحقیق، تنقید، تغلیط و تصحیح کا یہ خاص طریقہ آخری دین کے ماننے والوں کا خاص الہامی طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ان خامیوں اور کوتاہیوں کی تلافی ہو جاتی ہے جو درایت والے معیار میں باقی رہ جاتی تھی، اس نئے فن کا الہام مسلمانوں کو کیسے ہوا، کن بزرگوں کا ذہن تحقیق کے اس نئے طریقہ کی طرف شروع میں منتقل ہوا اور بتدریج تکمیل کے مدارج تک مسلمانوں کا یہ نیا ایجاد کردہ فن کب اور کیسے پہنچا۔ اس فن سے کام لینے کا صحیح طریقہ کیا ہے، یہ اور اسی قسم کے سارے متعلقہ مباحث کے لئے آئندہ باب کا انتظار کرنا چاہئے۔ وَالْاَمْرُ بِیَدِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی

تمت بالخیر